

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
 سنسنیشن ڈائجسٹ
 ماہنامہ

نومبر 2017

معارف
 معراج رسول

PP
 PAKISTANI
 POINT
 PAK RABTA APP
 پاکستانی پوائنٹ

مدیر اعلیٰ

08

آپ کے خط

جون ایلیا

07

انشائیہ



مدیر اعلیٰ
عذرار رسول



مدیرہ
نائب مدیر
یعنی احمد
اطہر حسین



مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789



سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285267

منظر امام

45

اعلیٰ ظرف

علی اختر

16

دربان

محبت کی تشنگی اور دست
برداری کی انوکھی مثال

ماضی کا آئینہ یا اختیار اور بے اختیار
انٹولیک کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

58

لے، آن، راجپوت

رنگ آسمان

تنویر ریاض

49

سازش

مشرق و مغرب کے عجیب و غریب اجتماع اور تاریخی تفریقوں
کے عبرت انگیز اشاروں میں لہریں لہجے پستان

رفت رفتہ مٹتے زہرے شکار
کرنے والی ایک حسینہ کی چالاک

133

شاہ زین رضوان

بدلہ

مرزا امجد بیگ

102

ٹارگٹ

ثمر عباس

93

غلط فہمی

آستین کے کپڑے پہلے کے دوسریاں
ادھوئے شبنم کی تکمیل کا ماحیرا

ایک جرم کی ہولناک تباہی سے بچنے
والے احساندان کی خوش قسمتی کا ماجرا

مخالف سمت میں چلنے والے ایک
جوڑے کے ملاپ کا انوکھا انداز

جلد 47 • شماره 11 نومبر 2017 • زیر سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) نیکس 35802551 (021) E-mail: jdpdgroup@hotmail.com

150

قارئین

ظفر اقبال ظفر

143

محفل شعر سخن

عشق نامہ

عشق کی منازل طے کرنے والے دو عاشقوں کی دلگداز روداد
آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

197

حسامیٹ

160

محمد الیاس

153

زندگی اور اس

وقت

سایہ

تخلیق عمل سے گزرنے والی
ایک ماں کے دل کا خوف کڈے

ایک عزم بازی مری بازی گری..... سنسی
خیزوا تھات پھرتل ایک طر با طویل داستان

فطرت سے دور ہونے
والوں کی تباہی کا منظر نامہ

شاکر لطیف

219

رضوانہ ساجد

207

سلیم انور

203

شاطر

حضرت یوسف علیہ السلام

دیدہ دلیر

ناحق کو سٹکی دلائی میں کالے
ہاتھ کرنے والوں کی بے بسی

اللہ کے ایک طلیل القدر پیغمبر کی
سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

پہیلی کے مانند حرفوں میں
بند..... نقب زنی کی انوکھی واردات

طاہر جاوید مغل

244

محمد یاسر اعوان

235

مہتاب خان

229

شکست کی فتح

دیو قامت

گھیراؤ

مستدم کی شکست کھانے
والی دوشیزہ کی حیران کن رخ

و رشتہ کا اصولوں پر پورا اترنے کے لیے
ایک بے اصول انسان کا قصہ

معاشرتی ناسوروں کے دلوں
پر لگے گھاؤ کا پرشکر قصہ

مخول

سرحد بین کر ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہے اور انہیں ان کی چٹائی میں ڈھکاف ڈال دینے والی نگہ بولی سے، ایک ماجرائی کی ہنسی ہنسی ہوئی نکالوں سے گھور کر دیکھتا ہے اور حالت حال میں ایک شعر سر کرتا ہے اور ہوا کے سا شیوں میں آگ لگا دیتا ہے۔

”پریت کہ افسانہ تصور کہن شد۔ من از سر نو جلوہ وہم داروں رن۔“ منصور علاج کا افسانہ پرانا ہو چکا ہے۔ میں جسے سرے سے داروں کی جلوہ دہی کر دیا۔“

وہ یہ کہہ کر قہقہہ لگاتے ہوئے، ایک اسرار آگئیں اور صہب قہقہہ لگاتے ہوئے سہر کے جنوبی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور ایک سناٹا ہے کہ چھا جاتا ہے۔ لمحے لمحے کی نذران، اداسی اور فحش کا سناٹا۔ تاریخ ہند کی 17 ویں صدی کا سب سے اداس اور پُر فحش سناٹا۔

مسافر اپنے پونے سات سو برس کے وطن میں مسافر اور انجینی، اس مقدس سر بلندی کو اذیت زدہ نگاہ سے دیکھ رہا ہے، دیکھے جا رہا ہے اور پھر بڑا اذیتا ہے۔

”میں ایک ذہنی ہوں، ایک دوزخی ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میرا نور بزرگ مرزا نوشا ایک ذہنی اور دوزخی تھا۔ میں نے اور میرے اس بزرگ نے اس مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھی ہے میرا دل، مجھ ذہنی کا دل اس مسجد کا دعا گو ہے۔“

مسجد کے میناروں کی سر بلندی وندھن میں کھنکی ہے۔ مسافر سر اٹھاتے ہوئے اس سر بلندی کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کی گردن دیکھنے لگی ہے مگر اپنے دل میں اپنی دل میں ایک مسافر، ان گنبدوں اور ان میناروں کو دعا دینے کے سوا اور کر کیا کر سکتا ہے؟

”اے گنبد اور مینار! تمہارا کوئی بھی متولی، بیسویں صدی کے پہلے دہے سے لے کر دسویں دہے تک کا کوئی بھی متولی، کوئی بھی بڑبلا متولی، کوئی بھی سیاست پیشہ متولی اس کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔“ مسافر گریہ ناک آواز میں کلام کرتا ہے۔

”تیرے گنبد، گنبد نیلی قام کے مانند ہمیشہ ہمیش فضا پر دوڑ رہی ہیں۔ تیرے میناروں کی سر بلندی اور اور جہندی پر کبھی ہستی کی دراز دہی کا زور نہ چلے۔ یہ دعا ایک ذہنی اور ایک دوزخی کی دعا ہے، اپنے صدیوں کے وطن میں ایک بیہوش ذہنی اور دوزخی کی دعا۔

”یہ گنبد اور مینارے ایک ہمارے بارے، بدلتے ہوئے اور دہائیوں کے گروہ کے ہمد عروج کی وقت آزمایا دگا رہیں اور میں جو کوئی بھی نہیں ہوں، وہ ”میں“ ہمارے بارے گروہوں کا گروہ ہوں۔ میں تاریخ کے بارے ہمارے گروہوں کا نوہ خواں رہا ہوں اور ہوں۔ سوائے گنبد اور مینارو! میں تمہارا یہ مینار ہوں، تمہارا نوہ خواں، تمہارا سرخیز گنبد، تمہارے سینے میں کراہتے لگتا ہے۔

مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے کچھ فحش عدم کی ایڈری نڈس سور ہے ہیں۔ ان میں سے ایک لکس جب زندہ تھا تو اپنی خطابت کا بے تاثیر اور بے حاصل اثر دکھایا کرتا تھا۔ اس نے اس مسجد، شاہ جہانی مسجد میں جانے لگی بارے حقوق خطابت کی ہوں پوری کی۔

”عزیز ابن گرامی! میرے لیے شاہ جہاں کی اس بیوگار مسجد میں یہ اجتماع کیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی تم سے نہیں خطاب کیا تھا، جب تمہارے چہروں پر اصطلاح کے سہائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شک کے سہائے اطمینان تھا۔ آج تمہارے چہروں کا منظر اب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بھری کہاں یاد آ جاتی ہیں۔

”تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں نہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کا ٹلی۔ میرا احساس ذہنی ہے۔ سوچو تو سہی، تم کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ اور کیا تمہارے حواس میں احتمال نہیں آ سکیا ہے خوف تم نے خود فرما ہم کیا ہے۔“

مسافر اپنے سینے میں کراہے جا رہا ہے۔ اس انشا میں اس کی نگاہ داغیں جانب اٹھتی ہے۔ داغیں جانب ایک سرخ عقیق، جم کھائی ہوئی ایک طویل عقیق سبز لہلائے کھڑی ہے اور وقت سے فصول کر رہی ہے، ایک عالی شان فصول۔ اور وقت، باجبر وقت، اس سے فصول کر رہا ہے۔ ایک باجبر وقت اور پھر جلال فصول اور یہ سلسلہ کی شہوں سے جاری ہے۔ ”نگاہ بدو! نگاہ بدو!“

در بارعام کی حضور، بدبخت حضور، حاضری اور بد انجام ترین حاضری لسل ہاسل کے حافظ کا حضور بن چکی ہے، ایک بے رحم، بے حد بے رحم اور بیکر بھا۔ اگر وقت سے تحول کی جائے گی تو اس کی سزا بھی کھنکی جائے گی۔ انہوں نے وقت سے تحول کی اور اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا کہ وقت سب سے احوال کرنے والا ہے۔

اور بارعام سے ایک آواز آتی ہے۔

اگر فردوس بروئے زمین است

میں است و ہمیں است و ہمیں است

مسافر یہ آواز سن کر ہنسی کے مارے بے قابو ہو جاتا ہے اور اتنا ہنستا ہے کہ انجام کار روئے لگتا ہے مگر نہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلتی ہے اور نہ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو۔



عزیزان من!
السلام علیکم!

نومبر 2017ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ جی جناب موسم بدل رہا ہے اور نہ صرف سال کیلنڈر میں سن بدلے کی تیاریاں کر رہا ہے بلکہ جاتی گرمیاں بھی آتی سردیوں کے حوالے قے داریاں سوئ کر اطمینان سے اپنے سرکل کی جانب محو سفر ہیں۔ خدا جانے ایسا اطمینان حضرت انسان کے اندر کیوں نہیں اتر جاتا اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے..... بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے والے قدرت کی اتنی چھوٹی سی ترکیب کو کیوں ذہن نشین نہیں کر لیتے جبکہ ہر سال 9 نومبر کی تاریخ حالات میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امید لیے گزر جاتی ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال کا خواب بہ زبان خاموشی تعبیر کے معنی تلاش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ خدا کرے اس خواب کے ثمرات اپنے معنی اور اثرات کے ساتھ عوام کے حصے میں بھی آجائیں۔ (آمین)..... ورنہ عرصہ ہوا اچھے بیمار معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کوئی نہ کوئی وبائی مرض پھیل کر عوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور سیاسی سطح پر کوئی نہ کوئی جرم شکل بدل بدل کر اس معصوم قوم کے درمیان خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے بہت سے کمزوروں میں ماتم بھی پیا کر دیتا ہے..... مگر سرکاری سطح پر اس کی دیکسی نیشن کے لیے کوئی نثر غلطی کو کش نہیں کی جاتی بلکہ اکثر عملی اقدامات میں اتنی تاخیر کر دی جاتی ہے کہ کتنے ہی بے گناہ انسان فقیر اجل بن چکے ہوتے ہیں۔ کبھی ہتھیوار مار کر روپ، کبھی ٹارگٹ کلنگ، کبھی خودکش دھماکے، کبھی معصوم بچوں کا اغوا اور اب اس جھری مار کے خوفناک وار..... جس کے مقابلے میں لاتعداد بے گناہ شہری قانون کی اندھی زدش آ رہے ہیں۔ بہر حال اچھے دنوں کی آس لیے کتنے ہی انسان دنیا سے جا چکے اور آنے والی نسلوں کے لیے اچھے اور پر امن ماحول کا خواب بھی موجودہ نسل کی آنکھوں میں محض ایک اذیت بن کر رہ گیا ہے۔ اس جھری مار کے بعد دیکھیے کوئی یا معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس ارض وطن کو ہر معصیت سے بچائے اور اس ملک کی قوم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ (الہی آمین)۔ اب چلتے ہیں جناب اپنی اس پُر بہار محفل کی جانب..... جہاں کا موسم کبھی سرد تو کبھی گرم ہوتا رہتا ہے کہ..... یہی تو زندگی ہے۔

✽ عبدالجبار رومی انصاری کی آمد قصور سے۔ ”مکمل صورت، پردے کو پکڑے، آنکھوں میں آنسو ٹھہرے، خاموشی کی زبان میں دل کا غبار، مکمل آنکھوں سے بولے، کہتے ہیں ایک تصویر ہزار لفظوں کا خزانہ ہوتی ہے جسے سمجھنے والے گہرائی تک سمجھ جاتے ہیں۔ ایسے ہی یمن مہینہ سی دوشیزہ سرورق پر اپنے پتا تاثرات نکھیر رہی ہے لیکن ذرا ٹھنڈا ذرا دنیا کے سرورق پر بھی ایک نظر ڈالو۔ لالہ کشمیر و فلسطین، چین، افغانستان و عراق تو اک عرصے سے لہو رنگ تصویریں پیش کر رہے ہیں مگر دنیا میں آج تک ان کی شنوائی نہیں ہوئی۔ ذرا مینا مار کی تصویریں بھی ملاحظہ کر لیں۔ روہنگیائی مسلمانوں کو کبھی دیکھ لیں۔ ان کی حالت زار سے عام مسلمانوں کے دل تو خون کے آنسو رو رہے ہیں، کیا مسلم حکمرانوں کو کبھی ان کا احساس ہے؟ آنسو کوئی حکمران مسلم دنیا میں ایسا نہیں ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی، نور الدین زنگی اور محمد بن قاسم کی طرح مظلوموں کی پکار پر لبیک کہے۔ جون ایلیا بھی تو سمجھا رہے ہیں کہ خود سے باہر نکل کر کبھی بھی طرح شاید اسی طرح ہمیں وہ مظلوم نظر آجائیں جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سب سے پہلے خود کا لغوہ لگائیں گے تو پھر اسی خودی میں مر جائیں اور خودی غرور و تکبر کے زمرے میں آتی ہے جو اللہ کو پسند نہیں۔ یقیناً خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ بڑی دیر بعد حاضری لگائی، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر حالت میں مبرور و استقامت عطا فرمائے۔ ریاض بیٹ بہت اچھا لگتے ہیں۔ تبصرہ بہترین تھا، اسی طرح ادريس احمد خان نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ دھوپ چھاؤں کی قناتز محسوس کرتی اور اشار اٹھی کا بھر پور تبصرہ بھی زبردست تھا۔ ساتھ میں زرین آفریدی بھی تبصرے کے ساتھ سپنس کلاسک کے لیے ووٹ دیتی اچھی لگیں۔ رمضان پاشا نے بھی خوب لکھا۔ محمد قدرت اللہ نازمی اور انا تاثیر احمد ایاز کے بھر پور تبصرے عمدہ رہے۔ بانی اشفاق شاہین، محمد صفدر محادیہ، خلیق ربانی انجم، انعم کمال اور کرن عمران نے بھی بہت عمدہ تبصرہ لگاری کی، اپنے اپنے خطوط میں بھی نے خوب صورت الفاظ لکھے۔ غریب الوطنی سے غلامی میں اور پھر جیل میں رہے لیکن بایہ استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوب مبرور و استقامت کا مظاہرہ کیا اور کٹھن حالات کو من جانب اللہ جان کر سہرا دیتے۔ رضوان ساہا کی خوب صورت اور سبق آموز تقریر بہت عمدہ اور قابل تحسین ہے۔ حیا اور سانلو جب میوزیم میں داخل ہوئے تو اچھا ہوتا ان کی گود میں ایک بچہ بھی ہوتا اس طرح حیا کی فطرت بھی پوری ہوئی۔ بانی تہی الہی پر یہ نہ کر جیسی کبھی سمجھو۔ یکراں پہلے بھی لکھا تھا سانلو کی صورت اب بھی یکراں ماہر کی صورت۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی تحریر نے دل موہ لیا۔ صفیہ نے خود کو چالاک سمجھا اور مجھ کی گمشدگی کی اطلاع



دیسے قاتلے پہنچ گئی تاکہ پولیس باہری باہر ڈھونڈتی رہے لیکن جیلانے صنفیہ اور مشتاق مہر کیس منوع پر پکڑ دیا۔ یوں جمہور کے کل کا معاہدہ مل ہو گیا۔ کہانی ابھی تھی۔ محترمہ اساقہ قادی کی فنکار میں چکر کمور پڑنے والی بات ہوئی۔ صادق احمد شاکر کو اگر مجھے کی کالی بیٹھ بھٹاتا تو وہ خود بھی محاشرے کی کالی بیٹھ ہی تھا۔ باقی دونوں فنکاروں کی فنکاریاں خوب رہیں۔ اگر ایسی ہی فنکاریاں وہ کہیں ثبت کاموں میں لگاتے تو اوروں کا نقصان کرنے کے بجائے ان کے کام ہی آتے۔ بہر حال عمدہ کہانی تھی۔ جواری جرم کا ہی کھلاڑی ہوتا ہے۔ برٹ اور جارج نے لوٹی ہوئی رقم سے جو اکیلے شروع کیا اور بے ایمانی سے بھگتے تک دوسرے بھگتے والے جوڑے ایسی اور ڈیوی کو مصیبت کے وقت کوئل گیا۔ وہ جان بچا کے بھاگ گئے۔ جارج اور برٹ پولیس کی تحویل میں پہنچے اور سمجھدار کو رہا کر دیا اور جارج نے بھی اپنی راہ لی۔ سارے قصبے میں بھی کواچھا سابق مل گیا اور کہانی ختم۔ دیکھو کے مارے ویزی نے پوری ٹرین کو تباہ کرنے کی ٹھان لی اور پھر فرض شناس سامعین نے اپنے خون سے ٹرین کو سرخ چمڑی دکھا کر بڑے حادثے سے بچالیا۔ آخر میں ویزی نے آکے سامعین کو قہم تو لیا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ وقت کی کہانی تو اس دفعہ پھر خاندان کے گرد ہی گھومتی رہی۔ البتہ مقبول یعنی کی گفتگو نے علی کو چوکلا جاویک۔ لیکن میں علی کی مارا ماری سے واقف نہ تھا۔ دوسرا اس پوری قسط میں علی اپنی ماں سے بھی بدل پایا جس کا انتظار تھا۔ اب اچانک اس کی ماں مل گئی تھی۔ اب پتا نہیں دی وی سلی ہوں گی یا کوئی اور..... جس کی سازش کام کر گئی وہ کچھ عرصے کے لیے معتبر ہو گیا اور جس کی کام ہوئی اس کا انجام بھی مہر تانک ہوا۔ کہتے ہیں جب بچھو کے چاروں طرف آگ لگ جائے تو وہ خود کو ڈنگ مار کے ہلاک کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہنوت مارے جب رانی جی کے قابو آیا..... اور کوئی پیش نہ چلی تو خود کو ہی خنجر سے ختم کر لیا۔ اعظم شادی ضد بھی کسی کام نہ آئی۔ اسے بھی بادشاہ کا حکم ماننا پڑا اور چندا بائی مکافات میں گمری پاگل ہوئی۔ شام شب ابھی رہی۔ محفل شہر و سخن میں زرین آفریدی، سعدیہ اسلم اور مہوش خان کے اشعار اچھے رہے۔

بدلنے
خدا
کرنے
بدلنے
کے
میں جی
کی جرم
ری س
انسان
ری مار
لیے کتنے
ت بن
ن وطن
جانب

زبان
ہیں۔
شیرو
ذرا
کے آنسو
بی نور
یہ اکی
ی میں
لئے تھے
نے بھی
مرے
یاز کے
ی کی
نفرش
نہ سا
کو دوس
سورہ
اطلا

محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے شریک محفل ہیں۔ "سپنس 2017ء اکتوبر کا شمار 17 ستمبر کو لا۔ سرورق کو انتظار کرتی ہوئی خوب صورت ماڈل سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم کی طرح کو بہت خوب صورت پیرا میں اے پیش کر رہے تھے۔ آپ کا ادارہ یہ پڑا اٹھا کھاکرم ہے عید اچھی گزری ہے، باقی سکرانوں کے کیا کہنے انہیں کسی سے کیا غرض۔ ان سب کے اپنے اپنے تلے ہی ختم نہیں ہوتے تو ان کو عوام کی کیا فکر۔ برما کی صورت حال بہت تشویش ناک ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے لجز ہو رہی ہے۔ دوستوں کی محفل میں آئے۔ بقیں خان صاحب بہت خوب صورت اعزاز میں محفل کی صدارت کر رہی تھیں، بہت مبارکاں جی۔ ریاض بیٹ کا تمبر بھی عمدہ رہا۔ اور اس احمد خان کی بھی عمدہ شریف آوری۔ باقی دوستوں میں زرین آفریدی، محمد قدرت اللہ نیازی، رانا شریا ز اشفاق شاہین کے تمبرے بیٹ رہے۔ کہانیوں کی شروعات طاہر عسکری کی باقی سے کی۔ آخر کا کو چودھری کامران نے کامیابی حاصل کی تو چودھری شمس علی بھی اپنے حصے کا کام کر گئے۔ کہانی کا اینڈ بھی اچھا رہا پھر وقت پڑی جو بہترین اعزاز میں آکے بڑھ رہی ہے اور علی تقریباً ماں کے پاس پہنچ چکے قبول یعنی کا اضافہ بھی کافی عمدہ ہے۔ ساتھ میں حفیظ کپور کے دوستوں کو بھی تحفہ کرایا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پڑھا۔ جو قید و بند کی صعوبتوں کے بعد مندر شاہی پر بر ارجان ہو گئے۔ بے شک مبرا کچھ ہمیشہ سے بیٹھا ہے۔ اب کتنے سال بعد بھائی بھی آکے دست بست ہو گئے۔ آخری صفحات کی بہترین تحریر بیکار عبدالرب بھٹی کے قلم سے بڑی عمدہ تحریر۔ میوزم سے شروع ہونے والی تحریر کا اختتام بھی میوزیم پر ہوا۔ سانول کی محبت انتہائی تھی۔ وہ مہر کے پیار میں پاگل تھا لیکن پھر مہر نے تو پیار کی ساری حدیں پار کیں، پھر خود کو کچھ اور منکوق تھا۔ سانول اور حیا کا ساتھ تو کھسا تھا اور مہر کو سانول کی جگہ پر بیٹھا تھا۔ ملک صفدر حیات کی دوستانہ پڑھی۔ صنفیہ تو ناٹک لکھی جس نے مشتاق کے ساتھ ملک کراچے سہاگ کو مار ڈالا اور آخر کار ملک صاحب نے ان کو جیلا کی مدد سے بے نقاب کر دیا۔ تو ریاض کی فیصلہ میں میڈیٹلین نے سام کے لیے بہت بہتر فیصلہ کیا۔ اساقہ قادی کی فنکار بھی عمدہ رہی۔ شمر عباس کی خوش قسمت بہت اچھی تحریر تھی۔ لائٹ کے بارے میں کہوں گا آسان سے گرا مجبور میں اٹکا۔ محفل شہر و سخن بھی عمدہ رہی۔ محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی بہت لا جواب تحریر رہی۔ باقی کتر میں خوب رہیں۔"

اشفاق شاہین، لاہور سے خط لکھ رہے ہیں۔ "عید پر یسی چمٹی کی تھی، چمٹیوں کے آخر میں ہی نیا سپنس آ پہنچا تو توقع نہیں تھی۔ اچھا، لے شہر جرمہ شاہ مقیم میں بروقت نیا شمارہ مل جائے گا۔ بہر حال حزدو بالا ہو گیا۔ سیدہ مبینہ محفل میں پہنچے جہاں دو بٹکیا کیٹی تھیں۔ تم کے ذکر نے خون کے آنسو لا دیا۔ جانے مسلم احمد کب تھم ہوگی۔ مسلم اتحادی اواناج کے مقاصد کیا ہیں؟ اور کب ہم خواب غفلت سے جاگیں گے۔ بس سوچ کر رہ گئے۔ بقیں خان سب سے پہلے کرسی صدارت پر بر ارجان تھیں خوب صورت خط کے ساتھ ریاض بیٹ پھر۔ انہیں آئے خوش آمدید۔ اور یس خان، اودا را بھی، زرین آفریدی، قدرت اللہ نیازی، صفدر معاویہ، انجم کمال کے سیر حاصل تمبرے محفل کا خاصہ تھے۔ کرن عمران خوش آمدید۔ خلیف ربانی، رانا بشیر، رمضان پاشا کی شرکت بھی بہت بھلی تھی اور اپنی بھی۔ "باقی" آخری شمارہ باجمرت اتنی جلد اختتام۔ بہر حال بہترین رہا۔ تین مہینے اپنی گرفت میں رکھا، باقی نے۔ کاش جو کامران کی سوچ ہے اگر کچھ



میں ایسے چند جوان پاکستان کو میسر آجائیں تو کالی بھیڑوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ وقت کی رفتار فی الحال سست ہی جاری ہے۔ ایک ہی سیشن میں پوری قسط نثر نگاری اور ادبی محکمی ایک ہی جی سے ملاقات کو لمبا ہی کیا جا رہا ہے۔ ہاں تصوف کا کٹھ اچھا رہا۔ مقبول یعنی کی انٹری شاعراری۔ یکنارا آخری صفحات کی کہانی کیا بات ہے۔ سارے کردار اپنی جگہ بہترین اور مہر و سب سے لازوال کردار۔ بلاشبہ یعنی صاحب نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ مختصر کہانیوں میں بہترین کہانی اساقہ داری کی فنکاری۔ سسٹمز بھی رہا، شائکہ کا کردار بھی خوب رہا۔ ملک مصفر حیات کی تحریر دوستانہ بہت اچھی رہی۔ کوٹا سسٹم پہلی بار پڑھا۔ جیلا اور صفیہ دونوں کردار خوب تھے صفیہ تھکر لگی اور لالی بھی۔ جلد بازی میں پکڑی بھی گئی اچھی لگی اور مختصر کہانی فرض شاس بھی بہت اچھی لگی۔ بالخصوص ایڈیٹ بہت عمدہ تھا۔ دیری گڈ ویٹم ان شرف، محفل شعر و سخن میں انتخاب بھی خوب رہا خصوصاً زین، سعدیہ اسلم اور احم کمال کا انتخاب لا جواب تھا۔“

✽ ریاض بٹ کا حسن ابدال سے تبصرہ۔ ”ماہ اکتوبر 2017ء کا شمارہ 19 ستمبر کو بے قرار رنگ ہوں کے سامنے آیا۔ سرور قی کی حینہ اس بار بھی سکر اپٹ لیے ہوئے تھی۔ خیر اس زمانے میں یہ بھی غنیمت اور قبول ہے۔ آگے بڑھے تو جون ایلیا منظر تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک جھپتی ہوئی تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ ویل ڈن۔ خطوط کی محفل میں پچھتے پچھتے پناخت دیکھ کر پھر سے جوان ہو گئے کیونکہ جوانی میں ہمارے خطوط تو اتارے شائع ہوتے تھے۔ بہت شکر ہے مان بڑھانے کا۔ کرسی صدارت پر بقیہ خان بہن ماسہرہ کی خوب صورت وادی سے براہمن تھیں۔ اللہ آپ کی والدہ ماجدہ کو رحمت کامل عطا فرمائے۔ آئیں غم اور خوشی تو انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ آپ کا تبصرہ بہترین ہے۔ جن بہن بھائیوں کو آپ نے آواز دی ہے کہ محفل میں حاضری لگوائیں، میں بھی ان سے آپ والی استدعا کروں گا۔ زین آفریدی آپ نے سسٹمز کی تحریروں پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ لگتا ہے کہ کرداروں پر آپ کی بڑی گہر نظر ہوتی ہے۔ رمضان پاشا پر پے کے پرانے اور بڑے اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ محمد قدرت اللہ غازی گورڈر تبصرہ طویل ہے لیکن اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہے میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ ملک مصفر حیات کی پرانی کہانیاں اگر وقتاً فوقتاً شائع کر دیں تو مومنوں ہوں گا۔ باقی تبصرے بھی پسند آئے۔ رانا بشیر احمد، اشفاق شاہین، محمد مصفر معاویہ، ظلیق ربانی انجم، احم کمال اور کرن عمران ویل ڈن۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ کے اوراق سے بڑی اچھی اور موثر کہانیاں لے کر آئے ہیں۔ جب تاریخ کے اوراق لفظوں کی صورت میں ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی تاریخی قلم دیکھ رہے ہیں۔ سبکی ڈاکٹر صاحب کا کمال اور ہر مندی ہے۔ بہت خوب خدا کرے زور قی اور زیاہ۔ ملک مصفر حیات صاحب کی تفتیش اس بار بھی زبردست تھی۔ صفیہ نے جو کچھ کیا اس کی سزا بھی بھگتی لی۔ ایسا دوستانہ بھی سبکی بلکہ اکثر خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے لیکن ایک بات میں بر ملا کہوں گا کہ جیلے نے بروقت اطلاع دے کر صفیہ اور مشتاق مہر کو گئے انھوں پکڑ دیا۔ باہر خیمہ چوتھا خانہ لے کر آئے۔ انہوں نے کوزے کو دور یا میں بند کر کے ایک اچھوتی اور جھپتی ہوئی تحریر ہمیں پڑھنے کے لیے دی۔ محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی ایک اچھی تحریر ہے۔ زہر محمد یا سراعوان کی ایک اچھی کہانی ہے۔ عبدالرب یعنی صاحب کی یکنارا کا ایک ایک لفظ سیدھا دل میں اتر گیا جو چوتھا خانہ بڑی دل نشین اور خوب صورت کہانی ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

✽ ایمان نے زہرہ شاہ کا خط اسلام آباد سے۔ ”سسٹمز کی کچھ عرصہ قبل سے خاموش قاری ہوں۔ ”باغی“ جیسی آڈٹ کلاس کہانی نے نیند سے جگایا ہے۔ کرپشن جیسا نا سونہر جانے کب ختم ہوگا۔ کامران تو اپنے مقصد میں کچھ کامیاب ہو گیا ورنہ اس کے پلانز کو تباہ کرنے کی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نہایت عمدہ پلاٹ و ڈائلاگز، جاندار کردار، شاعرانہ اختتام، ویلڈن طاہر عمیر۔ ”وقت“ سننے اور پوشیدہ موضوعات کا احاطہ کرتی تحریر ہے جس میں اب کچھ نوکٹ آنے کی وجہ سے کہانی کا ٹیڈیٹیز ہوا ہے۔ پچھلی قسط کا ایک سبک خرابی سے رہتی لگی۔ مقبول یعنی دلچسپ کردار لگا لیکن اسد علی کی سلسلی پیچھے سے اتنی جلدی ملاقات کی امید بر نظر نہیں آتی۔ ”فنکار“ میں چھوٹا فنکار بڑے فنکار پر بازی لے گیا۔ مزے دار تحریر تھی۔ فرض شاس میں سائنس کا فرض سیکڑوں لوگوں کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی جان دے دینا دل کو چھو گیا ہے۔ بے شک فرض سب پر بھاری ہے۔ ”انکشاف“ میں کسی راکٹ سائنس انکشاف کی توقع تھی۔ آخری صفحات پر یکنارے جیسے اشارت لیا، میں امید کر رہی تھی کوئی عشق کی لازوال داستان رقم ہونے جاری ہے مگر سڈانس سجاد کی محبت ریت کے دروں سے بھی ہلکی ثابت ہوئی۔ مہر و سجادری اور انجما کر دی آپ رہا انجما ہوئی اور سجادوں نے سر سے لائف اسٹائل ہی بدل دیا، یہ کیسا عشق تھا۔“

✽ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”بہترین کاوشوں سے مزین سسٹمز ڈائجسٹ موصول ہوا۔ سرور قی سے ابدائی۔ اندر کے صفحے پر انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ ناموں کی فہرست پر نظر پڑی تو سرفہرست بقیہ خان نظر آئیں۔ سو مبارک باد۔ سننے پرانے تبصرہ نگار اپنی اپنی منتخب آراء کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ سسٹمز کے سب دوستوں کو پر غلوس سلام۔ آگے بڑھے تو ڈاکٹر ساجد امجد کی شام شب پڑھی۔ تاریخ کے جھروکوں تک رسائی ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ سے متعارف کر رہے تھے۔ آگاہی کے دروا ہوئے۔ اس کے بعد تو ریاض کی کہانی مشکل فیصلہ پڑی بہتر تھی۔ اساقہ داری کی فنکار پڑھی، ثابت ہو گیا کہ فنکار کی فنکاری کے دعوے کو کھلے نہیں تھے جس کی وجہ سے اس کی بقا ممکن ہوئی۔ انھار نے تربیت یافتہ ایجنٹ شائکہ کو مات دے دی۔ باغی محمد



طاہر عمیر کی کہانی تیسری قسط میں مکمل ہوئی۔ کہانی بڑے اچھے انداز میں لکھی گئی تھی۔ دلچسپی کا عنصر آخری سطر تک برقرار رہا۔ چوتھا خانہ، محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اس کے بعد وقت پرچی۔ یہ قسط کچھ خاص تاثر نہ دے سکی اور آخر تک گھریلو معاملات کا ہی چرچا رہا۔ امید ہے اگلی قسط میں اس کی تلافی ہو جائے۔ فرض شناس اچھا تاثر دینے میں کامیاب رہی۔ جواری اور قدردان بھی بلاشبہ اچھی کہانیاں رہیں۔ رضوانہ ساجد کی داستان یوسف علیہ السلام اچھی جاری ہے جس میں بہت تفصیل کے ساتھ حیات یوسف علیہ السلام رقم کی گئی ہے۔ مذہب میں فقط ایک کتے کے پکڑے جانے پر مجرم کے جرم کا پوئلکھل مکمل کیا اور مجرم لاکھ چالاک دکھائی دینے کے باوجود پابند سلاسل ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی آخری صفحات پر لکھی گئی کہانی بہت پڑاؤ رکھتی رہی۔ محفل شعر و سخن کے بھی اچھے اور منتخب اشعار نے محفوظ کیا۔ کٹر نون نے بھی مزہ دیا۔ (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)۔“

امام عبداللہ، شاہ فیصل ناؤن کرچی سے شریک محفل ہیں۔ ”سب کو اسلامی سال 1439ھ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ عزوجل آپ سب کو دونوں جہاں کی بھلائیوں عطا فرمائے آمین۔ آپ کے ادارے کے تقریباً چاروں مطبوعات ہی زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ خاص طور پر جاسوسی اور سپنس، پائیزہ ما حال مل نہیں سکا ہے۔ سپنس بھی اب جا کے 25 ستمبر کو بڑی منتوں سے (ایک اسٹال والے سے) ملا ہے۔ اکتوبر 2017ء کا شمارہ بڑھ کر دل شاد ہو گیا۔ قدردان، جواری اور خوش قسمت دلچسپ کہانیاں تھیں۔ محمد فاروق انجم کے انکشاف نے چونکا دیا۔ یہی ”سپنس“ ”سپنس“ کا گرویدہ کر دیتا ہے۔ محمد یاسر احوان کی زہر بھی زبردست تھی۔ عبدالرب بھی کی یکساں شگفتگی و معاشرتی تمدن کو لیے ہوئے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ چوتھا خانہ معاشرے کا سلگنا موضوع ہے۔ باقی آپ کی محفل میں دوسری بار شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میری کہانی کی اشاعت کب تک متوقع ہے۔ (جی انشاء اللہ جلد ہی ہم آپ کو مطلع کر دیں گے)۔“

صادق معاویہ، خان پور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”کافی عرصے بعد شریک محفل ہو رہا ہوں۔ ہوئی تاخیر، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ بلا وجہ بے سبب جیل یا تار اور چکر رمضان کریم کی مقدس مساعرتوں میں نماز تراویح کے لیے جاتے ہوئے روڈ ایکسڈنٹ میں دونوں بازو اور پیلیوں سمیت، بہت ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ مسجد شکر بخسور خاقان کائنات کے جان سلامت رہی اور اب رو پڑھتے ہوں۔ ہاتھ قلم پکڑنے کے لائق ہوئے اور بندہ بزم دوستان میں حاضر ہے۔ کرسی صدارت پر جلوہ فگن نقیص خان مبارک کا جی، لائق تحریف و توصیف تمبرہ۔ پیاری ای سی سز صدیق آپ کے بغیر محفل اداس لگتی ہے۔ اسی محفل کی رونق بڑھا جائے۔ مفصل معاویہ بھائی ہمارا الیہ ہی یہی ہے کہ ہم روشنی چھوڑ کر اندیروں کے پیچھے پھنس چکے ہیں۔ اللہ کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔ بزم دوستان سے دوری تکلیف دیتی ہے لیکن ابھی تک ہاتھ لکھتے ہوئے درد کرتے ہیں۔ (بہت شکر یہ کہ آپ نے اتنی تکلیف کے باوجود سپنس سے اپنی محبت نبھائی۔ بہت افسوس ہوا آپ کی تکلیف جان کر۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عریض پریشانیوں سے بچائے اور صحت و سلامتی عطا کرے۔ آمین)۔“

ڈاکٹر نائلہ نصر ملک، پشاور سے محفل میں شریک ہیں۔ ”ایک دفعہ قلم اٹھانے کے بعد اب بار بار خواہش ہوتی ہے کہ دوستوں کی محفل میں شرکت کی جائے جہاں پر ارض پاکستان کے ہر علاقے، نسل، زبان اور مذہب کے لوگ اپنی پسندیدگی اور خیالات کا بارگاہ اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ سب کا شکریہ کہ میرے خط کو پسند کیا اور میری سوچ کی حمایت کی۔ اوشا راہی صاحبہ نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ میں شاید ڈاکٹر بننے کے مراحل میں ہوں۔ ارے ڈیزائننگم نہ کریں مجھ پر، میں صبح کراؤں کے پشاور کے ایک معروف اسپتال میں اسٹنٹ پروفیسر ہوں۔ گوکہ میری عمر اتنی زیادہ نہیں لیکن اللہ کے کرم اور میری محنت اور جذبے کی وجہ سے کم عمری میں ہی اپنی فیئذ کا عروج دیکھ لیا۔ ہم ڈاکٹر صاحبان کا بھی تو چیلنجیں پر حق ہوتا ہے ورنہ عوام الناس نے ہمیں انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے (چلیز ڈونٹ مائنڈ)۔ دوستوں کی محفل میں سرفہرست نقیص خان تھیں۔ تمبرہ بہت اچھا تھا اور اللہ آپ کی والدہ کو صحت دے۔ ریاض ہٹ اور قدرت اللہ نیازی کے تبصرے بھی خوب تھے۔ ڈائجسٹ میں پہلا ممبر باقی کو جاتا ہے۔ محمد طاہر عمیر کو میں نے پہلی مرتبہ پڑھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ بہت مبارک باد۔ انتہائی برقی رفتار اور پکڑ پکڑتی ہوئی تحریر تھی۔ چودھری کامران جب اپنے والد کی قبر پر آئو بہار ہے تھے تو اس وقت ہم بھی اپنے آنسوؤں میں جھپکنے لگے۔ باپ بیٹے کی محبت کی بہت خوب صورت داستان تھی جو کہ بظاہر ایک دوسرے کے لیے سر و جذبات رکھتے تھے مگر باپ کی محبت نے کامران کو دنیا آسان کر دی اور بیٹے کی محبت نے چودھری شمشد کی آخرت آسان کر دی۔ وقت بہت مختلف نوعیت پر لکھی گئی ہے اور حسام بٹ نے بہت بہترین کوشش کی ہے۔ رفتار تو بھی وقت کی طرح ہی تیز ہے اور کرچی آنے کے بعد کہانی بہت تجسس سے بھر گئی ہے۔ ویلڈن اس طرح کے موضوعات پر ضرور لکھنا چاہیے کیونکہ زندگی میں بھی ایسے حالات اور لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ خاص کر باہر کے ممالک میں بظاہر بے ضرر لوگ Zionists ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب کی یکساں رائے جاشور اور سندھ کی خوب سیر کرانی اور کہانی بھی بہترین تھی۔ کاش دونوں جہان ہوتے اور حزار پر بیٹھ کر اپنی زندگی گزارتے۔ سجاد کی شادی اور مہر کی برادری پر بہت دکھ ہوا۔ اکثر دوست و احباب کہتے ہیں کہ ڈراے اور کہانیاں جھوٹ ہوتی ہیں۔ میں ان کو کہتی ہوں کہ کہانیاں اور ڈراے حقیقی کرداروں سے متاثر ہو کر لکھے جاتے ہیں۔ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ سب ہو رہا ہوتا ہے ورنہ انسان کا خیال محدود ہے۔ فنکار بہت دلچسپ کہانی



تھی۔ پڑتے ہوئے مزہ آ گیا۔ محمد قاروق کی انکشاف اتنی مزاحیہ کہانی تھی کہ ہنس کر برا حال ہو گیا۔ سب مردوں سے درخواست ہے کہ نائی کی دکان میں ہوش سے کام لیا کریں ورنہ ہر گھنٹہ والا پرو فیسر نہیں ہوتا۔ ملک صاحب کی دوستانہ بھی خوب تھی۔ انسان اور شیطان کے بیچ فرق بہت معمولی سا ہوتا ہے اور وہ فرق ہٹ جائے تو پھر انسان ذلت کی گہرائیوں میں گر جاتا ہے جس سے شاید شیطان بھی پتا مانگے۔ صنفی اگر شوہر سے تنگ تھی تو طلاق کے لئے کمر بستہ تھی۔ اپنے سرخون کیوں لیا؟ بس کچھ باتیں سمجھ سے باہر ہوئی ہیں۔ انگریزی ادب کی کہانیاں بالکل بے تاثر تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے صفحات زیادہ ہونے چاہئیں۔ بہر حال اکتوبر کا نمبر ہیٹھ کی طرح شاندار رہا اور سسٹنس پڑھتے پڑھتے میرے اندر بھی جاسوسی اور سرراغ رسانی کی حسیں بیدار ہو گئی ہیں اور میرا دماغ بھی ہر طرف بہت تیزی سے گھومتا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر جس فیلڈ میں ہاتھ ڈالتے ہیں، بہت خطرناک بن جاتے ہیں اور تمام حجاب کرام کو مبارک باد۔ اللہ کرے کہ کراچی سے خیر تک ہم سب صرف پاکستانی ہو کر سوچیں اور اپنی اپنی فیلڈ میں ایمانداری سے اس زمین کا حق ادا کریں۔ اشفاق احمد کے بقول کہ اللہ ہم سب کو آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔“

✽ رمضان پاشا کا کھٹکشن اقبال کراچی سے۔ ”کافی عمر سے عمران افغانی محترم جناب معراج رسول صاحب کی کوئی اطلاع نہیں آ رہی ہے۔ یہ عاجز۔۔۔ صحت یابی اور درازی عمر کے لیے دعا گو ہے۔ (آمین)۔ لڑکے والے رشہ طے کرنے آئے ہیں اور لڑکی چمپ کر متوقع رہا کہ کون کھیر ہی ہے۔ یہ ہے سوری کی تعریف۔ تجسس اور سسٹنس سے بھرپور کہانی فنکار کے فن کا کام دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس قاری صاحب اس ناپ کی کہانی بھی لکھ گئی ہیں، خوب لطف آیا، بڑا مزہ آیا۔ باغی اے یہ کیا نیا نیا ہی قسط میں کہانی ختم، ابھی وقت دار لکھنا چاہیے تھیں کہانی کا انداز بیان بھی دل موہ لینے والا تھا۔ خوش قسمت بھی بہت پر لطف کہانی تھی۔ دوستانہ دفعہ ملک صاحب نے پچھڑا ہوا بھی سسٹنس بھر دیا۔ جو تھا خانہ کہانی پر اثر اور لائق تحسین تھی۔ کبھی کا محدود روکا بد محاش لکھا۔ انکشاف کہانی سادہ مگر اختتام میں جدت تھی۔ وقت پڑنے کے لیے کوشش کر کے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ کہانی اب صحیح صحیح پر پہنچ گئی ہے۔ اگلی بار سادہ مگر شادمانی اور مسرت کے اظہار کرنے والے ہیں۔ روسی کہانی فرض شناس کے اختتام پر بدل تڑپ تڑپ کر رہ گیا۔ جواری پسند نہیں آئی۔ قدر دان کہانیاں مختصر نہایت دلچسپ۔ زہر کسی مغربی کہانی کو شرف بہادری دیا گیا ہے، کہانی اچھی تھی۔ یکتا کہانی بہت ہی جاندار اور شاندار تھی، کافی عرصہ یاد رہے گی۔“

✽ زمرین آفریدی کی حیدر آباد سے آمد۔ ”زندگی کے گزرتے لمحات کا نہ تو شمار ممکن ہے اور نہ تھیں جس طرح پتا ہی نہیں چلا کہ یہ سال بھی اختتام کی طرف گامزن ہے۔ ماہنامہ سسٹنس ڈائجسٹ اکتوبر 2017ء میں اچھا نام پاس دے گیا۔ جب باغی کے آخری حصے پر نظر پڑی تو دل حیرت خراب ہو گیا۔ اس داستان میں یہ ستاروں اور کرپٹ لوگوں کو جو سزا مل رہی تھی اس سے کم از کم ہمیں دلی تسکین تو مل رہی تھی۔ ادارے سے مستفید ہوتے ہوئے محفل میں انٹری دی۔ بقیہ خان صدارت پر خیمہ مبارک ڈیزے۔ ریاض بیٹ بھی اچھے تمبرے کے ساتھ وزارت پر تھے۔ نوازش بیاری اور اشارہ تھی، اب بھی اب تمبرہ کرنے میں ایکسپرت ہوئی جاری ہو۔ رمضان پاشا اب آپ صرف تمبرہ کیا کریں، بھڑکنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ کافی دنوں بعد بے نیازی صاحب یعنی اللہ کی قدرت سسٹنس میں نظر آئے تمبرہ خیر اچھا تھا۔ رانا بشیر احمد صاحب تمبرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ تمبرہ تو آپ کا بھی بہتر رہا۔ اشفاق شاہن صاحب بھی سدا بہار تمبرے کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ تمبرہ پسند کرنے کے لیے نوازش۔ محمد مفدر معاویہ کے تمبرے کے بتا تو یہ محفل ادھوری لگتی ہے۔ تفکر تمبرے کی پسندیدگی پر۔ خلق ربانی، انعام کمال اور کون عمران کے تمبرے محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کہانیاں پڑھنے کی ابتداء عبدالرب بھٹی صاحب کی یکتا داس کی ہے۔ وجہ ہمارے شہر حیدر آباد کے تناظر میں کبھی مٹی داستان بھی جو کہ بے حد پسند آئی۔ ساتھ سندھیا لوی میوزیم جو کہ ہم کئی بار وزٹ کر چکے ہیں، سب نظروں میں محسوس کیا۔ مہر زادی اور سانول کی عجب داستان عشق، زندگی جب انسان کو اپنے گھیرے میں لیتی ہے تو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ مہر سانول کی جگہ تو سانول ڈارلنگ بن گیا۔ اس کا قاری ہی کی فنکار، واقعی فنکار اسٹوری تھی۔ صادق احمد یہ بات صادق آتی ہے کہ چوروں کو بڑے سورا۔ شاید عرف تھی بھی کبھی ڈاراما باڑھی۔ مزہ آ گیا اسٹوری پڑھ کر۔ دوستانہ دار ملک مفدر حیات، کبھی بھی مجرم ملک صاحب کو گھبرا کر رکھ دیتے ہیں جیسا کہ صنفی نے کیا یا لاخر مجبوراً پچھلی فروش کے قاتل صنفی اور مہر مشاق انجام کو پہنچے۔ ویلنٹ ملک صاحب، محمد قاروق انجم کی انکشاف بھی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ظہیر بھٹا کے کی شادی دوبارہ دادی کی وجہ سے اور پھر نڈ والی شامت۔ پرو فیسر ظلیل کی وگ کے حصول میں اس پر پرو فیسر کی اصلیت کا انکشاف ہوا اور اس کا رشہ بھی طے کیا۔ زہر بھی یاسر اعوان بھی ہمیں متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ سرراغ رساں دوحان نے سیاہ بلیوں کے مرنے کا اور ریحانہ اور فرزانہ کے غائب ہونے کا سراغ لگایا۔ زبردست اسٹوری میں کافی سسٹنس تھا۔ فرض شناس میں وسیم بن اشرف نے سائمن کے ارادے اور حالات کا کافی دلچسپ پیرائے میں پیش کیے۔ شاہ زین رضوان بھی اچھے رائٹرز کی لسٹ میں آتے جا رہے ہیں۔ جواری بھی ان کی قابل ستائش رہی۔ شام شب ڈاکٹر ساجد احمد صاحب غلوں کی زندگی کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا اور بہترین معلومات سے ہم قارئین کو روشناس کروایا۔ اور نگریب اور اس کے بیٹے اعظم شاہ اور شاہ عالم کی وفا اور فداوری کی داستان کبھی اور ساتھ ہی مہر رانی تارابی اور چندا بانی کے کارنامے سامنے لائے۔ ہنوت رائے بھی جان سے گیا۔ باغی محمد

طاہر عمیر صاحب ویلڈن۔ بس ایک شکایت ہے ادارہ سسٹمز ڈائجسٹ سے کہ جب کوئی داستان اپنے جوین پر ہوتی ہے ہم انجائے کر رہے ہوتے ہیں تو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں کرتے آپ۔ (اے کوئے آئندہ خیال تو کر لیں گے مگر..... جب کہانی اپنا اختتام خود ترتیب دے لے تو مجبور ہی ہے)۔ وقت حسام بٹ صاحب مستقل بنیادوں پر چم گئے۔ سسٹمز ڈائجسٹ میں داستان بھی اسے دن جاری ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات زندگی کے بارے میں رضوانہ ساجد صاحبہ کے شکر گزار ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے روح پرور حالات بہت تسکین بخش ہیں۔ تیسرا حصہ بھی بہترین رہا۔ جزاک اللہ خیر۔ مراسلے معلوماتی اور نسلی بخش ہیں۔ محفل شعر و سخن ہر بار شاندار و لا جواب اشعار پر مبنی ہوتی ہے۔ تینوں اعزازی اشعار واقعی زبردست رہے۔ (کمال ہے اہر کہانی آپ کی نظر میں پسندیدگی کی سند پاگئی پھر کیسے یہ شاہرہ بس ناظم پاس رہا؟ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ذرا وضاحت فرمائیں)۔

اوشا راٹھی، بمبئی سندھ سے شامل محفل ہیں۔ ”یہ ہماری سسٹمز ڈائجسٹ سے چاہت ہی ہے کہ براہ اس محفل میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ (مہربانی جناب کی)۔ اس ماہ کافی مصروفیات بھی ہیں۔ ابھی چند دن پہلے ہمارا درگشاہ بزم کا تہوار گزر رہا ہے۔ میں تین بھائیوں کی انکوائری بہن ہوں۔ تینوں بھائیوں کو راکھی بندھی اور کنٹ ڈسول کیے۔ (بہت خوب..... مبارک ہو بھئی)۔ اکتوبر کا سسٹمز 16 ستمبر کو مل گیا۔ ٹائٹل پر مبنی گاؤں کی دو شیڈز پر پردہ پکڑے خوش گمانی میں کھڑی ہے انشانہ اور ادارہ پر بھر پور ہے۔ محفل میں بتیس خانہ جی جاسوی ڈائجسٹ کے تمبر نگاروں کو یاد فرما کر کرسی صدارت پر تھیں۔ مبارک باد، ریاض بٹ جی آپ کے مشورے کا شکر ہے۔ کوشش رہے گی مستقل طور پر حاضری ہوتی رہے۔ ذرین جی، رانا بشیر جی اور محمد قدرت اللہ جی سب کا بے حد شکر ہے۔ میری حوصلہ افزائی کرنے کا۔ اشفاق شاہین جی محمد صفدر جی آداب و شکریہ۔ آپ کی وجہ سے محفل میں آنے کی بہت ہوئی اور حوصلہ بڑھا۔ ڈاکٹر ساجد کی شام شب بھی خوب رہی۔ مغلون اور مرہٹوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جی ان کا پلاڑی بھاری تو بھی ان کا، اور غریب اور ان کے بیٹے بھی تاریخ میں کافی کارنامہ انجام دے گئے۔ مرہٹوں کی چند بابائی بھی رعب دار مرہٹ حکمران تھے۔ باغی کا اتنا تاجلدی اختتام کر کے حیران کر دیا، کیوں، اس کہانی میں بہت کچھ تھا جو ابھی وضاحت طلب تھا۔ ملکی سیاست کی اصلیت بھی اجاگر ہو رہی تھی۔ کامی چوہدری کے ساتھ جی بہت کچھ ہوا جیسا کہ قریب کج کے راہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وقت اور حسام بٹ دونوں پر جا رہے ہیں۔ اب داستان بھی واقع ہو رہی ہے۔ اس میں ہماری توجہ اور دوپہلی کا سارا مواد موجود ہے۔ عہدار لب بھی جی بیکار کے ساتھ حاضر ہوئے۔ داستان بھی اسے دن اور لا جواب رہی اور آخری صفحات کا قلم بھی ادا ہوا۔ ہماری سندھ یونیورسٹی میں کافی ڈیروں کی بیٹیاں پڑھتی ہیں اور ہمارا گروپ سندھ یونیورسٹی میں جا رہا ہے۔ میں خود سندھ یونیورسٹی کے ہوٹل میں قیام پزیر ہوں۔ کسی کہانی میں اپنے شہر یا جگہ کا نام پڑھ کر بہت اچھا اور محب لگتا ہے۔ مہر زادی اور سجاد کی داستان عشق بھی زبردست تھی اور ڈیروں کے طرز عمل اور برتن بہن کی بھرپور دعا کی ہے۔ ملک صفدر حیات جی کی دوستانہ نے متاثر کیا۔ پچھلی فروش بھورا پچھرا سادہ دل انسان صفیہ اور مشتاق مہر کی چال بازیوں میں آگیا اور جان گنوا بیٹھا۔ ملک صاحب بھی تو بہترین و فرض شناس آفیسر ہیں۔ مجرم کو بے نقاب کر کے دم لیتے ہیں۔ اساقہ داری جی کی فنکار مہی بیٹھ اسٹوری تھی۔ تحمل اور سسٹمز سے لبریز۔ صادق احمد اور شعی نیلے پے دلا ثابت ہوئے۔ چوتھا خانہ پارہیم جی نے ایک بڑے معاشرتی پہلو کو اجاگر کیا۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام، صدر کشی صاحب نے جو کیا یہ مثال اس پر فٹ آتی ہے۔ شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے کالے کروت۔ انکشاف میں محمد فاروق انجم جی نے ہلکا پھلکا پرمزاح ٹاپک لیا۔ ظہیر کی شادی کے لالے پڑ گئے ادھر پروفیسر صاحب کچھ کم نہیں تھے۔ اپنی مرحوم بیوی کی آواز سے ظہیر کو حیران و پریشان کر دیا۔ شاہ زین رضوان کی جواری اور محمد الیاس کی قدردان بہترین اسٹوری تھیں۔ ویم بن اشرف کی فرض شناس نے بہت متاثر کیا۔ ویزنی کی فداوری اور سامن کی وفاداری خوب رہی۔ الغرض اکتوبر 2017ء کا سسٹمز بیٹھ رہا۔ محفل شعر و سخن میں رحمان خان، میموں علی، عمران شروانی، شاہین مہتاب، اسامہ جتیدی، اسامہ فیصل، بہترین انتخاب کے ساتھ سرفہرست رہے۔ کچھ نہیں بھی کمال تھیں۔ (آتی محبت اور اپنائیت کا بے حد شکر ہے)۔“

زہرا احمد، ناگن چوڑگی، کراچی سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ ”اکتوبر کا سسٹمز 17 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو شاہ کا رتو ڈاکر صاحب نے خوب بنایا ہے لیکن بیچنگ کا خیال نہیں رکھا۔ براؤن تھیں کے ساتھ بلیوڈ پنا اور ان کے ساتھ ریڈ ٹکری چوڑیاں کچھ بیچنگ بنتی نہیں۔ محترمہ چہرے سے جتنی دہلی میں ان کا ہاتھ چہرے کے مقابلے میں بہت ہی بھاری اور محنت مند لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو روہنگا اور برما کے مسلمانوں کا ذکر ہوگا کیونکہ ان پچھاروں کی حالت بہت پکی ہے۔ ظالم ظلموں کا فران کی لسل کشی کر رہے ہیں اور ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ بے شک وہاں پر بہت سے لوگ گئے۔ برما اور دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان ظالموں کا فروں کے ظلم کا شکار ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ظلم کے بدلے میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ظالموں اور کافروں کو نیست و نابود فرمائے۔ باقی انشانہ بہت ہی پرمغز ہے واقعی جون ایلیا صاحب اپنی تحریروں کی صورت میں ہم میں زندہ ہیں۔ محفل میں پہنچے تو بتیس صاحبہ کرسی صدارت پر موجود تھیں۔ بتیس صاحبہ اللہ آپ کی والدہ صاحبہ کو صحت و تندرستی دے (آمین)۔ اس مرتبہ میں سوچ رہا تھا کہ میں تمبرہ نہیں لکھوں گا لیکن



قدرت اللہ نیازی صاحب نے میرے بیٹے عبدالکبیر جو کہ عید الفطر سے دو دن پہلے وفات پا گیا تھا اس کی تعزیت کے سلسلے میں انہوں نے چہ جملے لکھے ہیں اور میں نے پڑھے تو دل بھرا آیا۔ قدرت اللہ صاحب اور آپ سب لوگ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میری اہلیہ اور دیگر اہل خانہ کو میر جلیل عطا فرمائے۔ (آمین)۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو بہت اور میر عطا فرمائے..... آپ کا غم بے شک بہت بڑا ہے لیکن..... بالآخر ہر انسان کو جانا تو اسی رب کے پاس ہی ہے نا)۔ واقعی باقی کی بنیاد کوئی چل نہ سکا۔ باقی آیا اور چھا گیا اور اسی طرح آج تک چلتا بنا۔ واقعی وہ چار باقی ایسے اور ہو جائیں تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ وقت میں بھی عظیم کے والد کو وقت پڑا ہوا ہے اور ہو سکتا ہے اسد ان کی کچھ مدد کر دے۔ وقت میں ایک نئی انٹری مقبول ہوئی صاحب کی ہوئی ہے جو کہ غیب کے اور ماضی کے واقعات بڑی روانی سے بتا رہے ہیں۔ کوئی بہت ہی پختگی ہوئی ہستی لگتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان جتنی بار بھی پڑ میں مزہ آتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ شام شب میں ساجد صاحب نے ہم سب کو تاریخی ادوار کی خوب سیر کروائی اور چھاپائی کے انجام پر بہت افسوس ہوا۔ دوستانہ میں مصفیہ اور..... مشتاق کی دوستی نے جمہور کے کی جان لے لی۔ وہ تو ملک صاحب نہ ہوئے تو جمہور سے بچا رہے کا پتا بھی نہیں چلتا، مصفیہ نے تو ملک صاحب کو بھی چکر دے دیا تھا۔ وہ تو جیل نے ان کو گائیڈ کیا تو دونوں پکڑے گئے۔ بے وقافتوں سے اللہ سب کو بچائے۔ مغربی معاشرے میں ماں باپ اپنے بچوں کا بہت ہی کم خیال رکھتے ہیں۔ لیکن لٹی نے مشکل فیصلہ لے ہی لیا۔ سام کو لہو رنگ اسکول میں داخل کرو کر اس کا مستقبل محفوظ کر دیا مغرب سے ایک اچھی تحریر ہے۔ خوش قسمتی بھی کہ ہی لوگوں کو ملتی ہے۔ لائم نے جیسے تیسے کر کر کا خوش قسمتی حاصل کر رہی لیکن اس خوش قسمتی میں حصہ دار بننے کے لیے میری بھی اس کے سر پر سوار ہوئی۔ فرض شناسی بھی کیا خوب ہے۔ لال چھٹی زندگی تو اپنے خون سے ہی سفید کر لال کر لیا۔ بہت خوب۔ کہانی نے بہت متاثر کیا جواری کا تو یہی ہے کہ جو اس کی کا نہ ہو مناسب ہی تھی۔ قدرتوان نہ جانے کس چیز کی قدرت اور کتنی چوری اور سینڈزوری ایک تو ڈاکوؤں نے۔ میجر صاحب کو کوٹان کی زندگی بھر کی محنت کی کمانی لوٹ لی اور پھر سینڈزوری کہ آپ نے ہمیں پوری دولت کے بارے میں کیوں نہیں بتایا ان ڈاکوؤں اور چوروں کو جو معصوم لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں ایسے دولت کے ٹریپ لگا کر بکڑا جائے اور موقع پر ہی گولیوں سے بھون دیا جائے۔ یکرا راجت میں گندمی ہوئی مہر اور سائلوں کی اس دور کی ماڈرن سکی اور بچوں کی کہانی ہے لیکن بھی صاحب نے آخر میں اس میں بہت ہی درہم دست معمول چھوڑ دیا شاید مجھے ایسا لگا۔ حادثے میں مہر و بل جاتی ہے لیکن زندگی بھی بچ جاتی ہے گاؤں بل کر مر گیا، اس کی لاش مل جاتی ہے۔ مہر و لاش نہیں ملتی اس کے گھر والے بغیر لاش ملے یہ کیسے یقین کر لیتے ہیں۔ کہانی اچھی تھی لیکن آخر میں جو گڑبڑ ہوئی وہ حلق سے نہیں اترتی۔ باقی اشعار بھی اچھے ہیں، دزیر صاحب کا شعر پسند آیا۔“

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم آباد خانہ ایل سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”سرورق پر منہ بسورتی حیدر اپنے محبوب کا انکار کرتے کرتے ماہیں نظر آئی، جون الیما اپنی ذات میں محسوس افراد پر نا امل نظر آئے۔ کیا خوب کہتے ہیں۔“ اپنے آپ میں محسوس رہنے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔“ ادارہ میں روہنگیا مسلمانوں کی حالت دار اور مسلم اندہ کی بحرمانہ خاموشی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ خبروں سے چلا چلا کہ پاکستان سے علیحدہ ہونے والے جنگ دیش نے بھی لاکھوں روہنگیا مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے جبکہ پاکستان ایمان میں قرار داد جمع کروانے آگے نہیں بڑھا۔ محفل میں پہنچے تو بقیہ خان کو صدارت سنبھال دیکھا۔ وہ پھر سوز انداز میں پرانے تبصرہ نگاروں کو پکارنے میں مصروف تھیں۔ ان کی پکار پر ہم نے تو شمولیت کر لی محفل میں باقی سب جواب دیں کہ کیوں غائب رہتے ہیں۔ پہلی بار محفل میں شریک ہونے والوں کو کرسی صدارت پر لا کر بیٹھائے تبصرہ نگاروں کی حوصرافزائی کے لیے اچھا قدم اور ادارے کی پالیسی ہے۔ ڈاکٹر نانک لہر کوہاری طرف سے بھی مبارک باد ملے۔ وہ رہا ماضی بٹ! آپ کی بات درست ہے کہ کٹر لو لائن پر بھارت فائرنگ کر کے نیچے شہریوں کو نشانہ بنارہا ہوتا ہے اور ہم سیمیا میں ہماری فلم دیکھ کر تبصرے کر رہے ہوتے ہیں۔ اشعار بھی کا تبصرہ مزے کا تھا کدیرہ کے جوابات شاید زیادہ ہی پسند آگئے ہیں کہ ان کا پتہ پوچھ رہے ہیں انہیں ان کے بارے میں اکثر قارئین کا یہی حال ہے اس لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ سب سے پہلے باقی پڑھی۔ اتنی جلدی آخری قسط کی۔ انہوں نے باقی کے ڈائلاگ نے بھی ہنسیا تو کبھی رلا یا۔ سچ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کام کرتے ہوئے ہمیں اس کی سنجیدگی کا احساس ہوتا اور جب احساس ہوتا ہے تو معافی و عطائی کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک جوشین ”باقی“ میں بھی آئی جس کو پڑھتے ہوئے انہیں یقین ہو گیا۔ باقی سے ایک اقتباس آپ احباب کی بساتوں کی نظر اور میں آسودے سے ترچر ہے پر ہاتھ رکھے ایک ہی منظر میں کھمبا ہوا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ تھانے سے باہر جا رہے تھے اور میں چادر ہاتھ رکھیں روک لوں لیکن میں انہیں روک نہ سکا کاش! میں انہیں آواز دے لیتا۔ جس طرح دیر سے دیر سے وہ بیڑھیاں چڑھ رہے تھے، شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ایک بار انہیں پکار لوں لیکن وقت نے اس لیے میں ہم دونوں ہار گئے۔ بلور چودھری حشمت علی یا کامران کے نہیں بلکہ اس دن ایک باپ اور بیٹا ایک دوسرے سے ہار گئے تھے۔ اس نے علاوہ آہنی اور جواہر موت بھی افسردہ کر گئی۔ مصنف کی پہلی کاوش بہتر ہے اس لیے معیار کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اس قدر کی ذکاوت پر مبنی کہانی کا دیکھی روٹن ہے۔ شرعاً اس کی خوش قسمت میں لائم کی خوش قسمتی اس وقت رخصت ہو گئی جب میری سکی کے ٹکڑے کا



راز جان گئی۔ یہ جانکاری میری کی خوش قسمتی اور لاکم کی بد قسمتی بن گئی۔ عبدالرب بھی اس بار ماروھاڑ اور ایکشن کے بجائے محبت کی رنگین و بگین وادیوں کی سرگرداں نظر آئے۔ یہ چند ہی اچھی لگی۔ سانول کے کردار کا بے نیازا نہ اعزاز اور دنیا سے بے رشتی مہر کو اسیر کر گئے تاہم وصل کی اور کا متدر ٹھہرا۔ وقت میں سارا وقت باتوں باتوں میں کا ناگیا۔ مقبول۔ بھی کا کردار بھی دلچسپ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کا مشتاق رہا ہے البتہ مذہبی اعتبار سے اس کردار کی حقولیت ممکن نہیں کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ریاضت کی کثر نہیں ہمیشہ کی طرح زبردست تھیں۔ محفل شعر و سخن میں اوشار اٹھی، بزرین آفریدی اور شہباز اکرم کا شعر کی انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا۔“

✽ فضا شاہ، ماڈل ٹاؤن سے تہرہ کر رہی ہیں۔ ”سرور قی پر موجود خاتون شرقی روایات کا پاس کرتی نظر آئی کہ اس بار دو پٹاسر پر موجود تھا۔ اس بار پہلا نمبر باغی کا لگا۔ بہت زبردست رہا کیونکہ بے جا طول نہیں دیا گیا اور کہانی حیرت ریزی سے بھاگتی رہی۔ آشتی کے مرنے کا دکھ ہوا۔ جو اد اپنے بے جا تصورات کی بیعت چڑھ گیا۔ چند کردار پہلو بھی نظر میں آئے لیکن مصنف کی پہلی کوشش کی داد و نوبت زیادتی ہو گئی۔ یکساں ترتیب مطالعہ میں دوسرے نمبر پر رہی۔ محبت کی ایک الم ناک داستان اور نجما کردی کردی میں آ رہے اور نجما ہوئی کی عملی تفسیر لگی۔ سانول کو تو پھر بھی چین آ گیا اس کے تصور کے مطابق مہر و اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن مہر کا انجام الٹا کر رہا۔ تاریخ کے جھروکوں سے شام شب اولین صفحات کی زینت بنی۔ اور تک زیب کے حالات پڑتے ہوئے ذہن اسی بات میں الجھا رہا کہ بادشاہ اور شہزادے سلطنت کے حوالے سے ایک دوسرے سے ڈرتے رہے۔ خوف اور اعدائوں نے بادشاہ سے بیٹوں کی فطری محبت جھین لی تو بیٹے باپ سے محبت کرنے سے قاصر نظر آئے۔ بھائی بھائی کے خوفزدہ و نالاں نظر آئے اور تقریباً تمام بادشاہوں کی یہی داستان رہی۔ ہونٹ رائے اور چندا بانی کا انجام بھی ناخوشگوار رہا۔ تارا بانی کا ایک جملہ بہت اچھا لگا جسے اس نے ہونٹ رائے سے کہا کہ مر ہو عورت جس سے پریم کا اقرار کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے خود کو برہنہ کر لیا۔ اب میں تجھے بے کہنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی کہ تو نے مجھے برہنہ دیکھا ہے۔ اس کا قوری کی فنکار میں پولیس کی انسپکٹر کراچی کے ملازمہ شرجہ پورا کرنے کے لیے جھینا جھینتی کرتی پھرتی تھی۔ فاروق انجم کی کہانی نے اچھا مزاج پیدا کیا۔ حجام کی ذرا سی غلطی نے مٹھی خطرے میں ڈال دی۔ پروفیسر کی وگ کا اور ان کی بیوی کی آواز کا قصہ خوب رہا۔ محفل خطوط میں بیٹیس خان کو صدارت سنبھالے دیکھا تو بے حد خوش ہوئی۔ باقی تہرہ بھی اچھے تھے۔“

✽ احتیاز احمد، پچالہ سے تہرہ کے شمارے پر تہرہ لے کر حاضر ہیں۔ ”تہرہ کا شمارہ خوب صورت سبز ہلالی پرچم سے مزین تھا اور تہرہ ہی کے حوالے سے خاتون کا اعزاز بھی ٹھہکا نہ تھا۔ پاکستان کے شیر جواں پتروں نے اپنے ہوسے اپنے وطن کی لاج رکھی اور دفاع پاکستان سے تہرہ کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنادیا۔ انتہائی بہت خوب رہا۔ ہم آس پاس بھی نظر دوڑائیں تو بیچا کی ضرور نظر آجائے، اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ساتھ کیا یاد آ رہا ہے۔ چٹائی اور پھول کی سانچہ نے برصغیر کے لوگوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ سر دو تو مر دعو میں بھی آگرہ یوں کے خلاف تحریک آزادی میں پیش پیش رہیں۔ ایسے ہی عزیزان بانی بھی تحریک آزادی کے شہداء میں شامل ہو کر امر ہو گئی۔ علی اختر کاظمی کا آئینہ سانچہ زبردست تھی اور ذرا بات میں بیچا لگی دیکھیے۔ شاہینہ کے رشتے داروں کو ذرا بات ہی لکھا گئی اور اس پچاری کو ایک دن کی سہاگن بن کر طلاق کا دکھ سہنا پڑا اور اپنی بیٹی کے لیے اپنی زندگی تیاگ دی۔ ناہید سلطانہ اختر کی نصیحتوں سے مہر پور کہانی عمدہ رہی۔ محمد الیاس کی اسٹوری بازار حسن بچپن کی یادوں کے ساتھ اچھی سی جہاں بڑے بزرگ بچوں پر مبنی نظر رکھتے تھے اور ان کی اصلاح بھی کرتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بھی مکافات میں بچپن کی شراتیں اور مصوم محبت کو موضوع بنایا مگر ایک دوست کی مہربانی سے اسے نیلوفر کی محبت سے تھک دھوئے پڑے اور سب ختم مکافات کا مکمل تو پھر تاریخ دہرا دیتا ہے۔ یوں اس کا دوست بھی نہ بن پایا۔ اسے بھی بڑے صدمے سے گزرا پڑا، عمدہ کہانی تھی۔ چوتھا درویش پڑھی تو ہے پر پہلی دفعہ سرے گزرنے والی بات ہوئی۔ اسوعلی اپنی ماں کی تلاش میں پاکستان پہنچ گیا اور اسے آتے ہی یہاں بہترین دوست مل گیا جو اسی کی طرح خطروں کا کھلاڑی لگتا ہے۔ عظیم نے سسلی کا نام لے کر ملی کوچ کا ڈاکا دیا ہے مگر دیکھو وقت ملی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ آسانی سے سسلی نامی ماں تک پہنچ پاتا ہے یا پھر اسے یہاں بھی شاہد زیب اور شہزی کی طرح پا پڑ بیٹے پڑیں گے۔ پس آگے وقت دیکھو۔ آصف ضیا احمد کی ہمدار میں شاید چند کو احساس نہ ہوتا اگر وہ پیش اور سر در شہزی کی کے درشن نہ کر لیتا۔ یوں ساری حقیقت اس پر عمل گئی اور چاندنی کی صورت اصل حق ہمدار کو مل گیا۔ تحریر بہت پسند آئی۔ جس نے بھی پیار سے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا اپنے ہوش بھلا بیٹھا۔ رضوانہ ساجد کی خوب صورت تحریر بہت اچھی لگی۔ کثر نہیں لاجواب رہیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

راجو دو، ننگران صاحب۔ محبوب مصور سوہراؤ لاڈکانہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ انجم کمال، حیدر آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ ظہیر احمد، کراچی۔ اسد شیر وانی، سکھر۔ آمنہ علی، میٹو، الہیاری۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

دربان

علی اختر

یوں تو عہد گزشتہ کے کچھ واقعات اور اوار قصے کہانیوں میں ڈھل کر لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن ان اوار کے پتھن کو شے پھر بھی مخفی رہ جاتے ہیں جیسے کہ... پرتھوی راج کی زندگی کے واقعات... جہاں تیزی سے بدلتے حالات نہ صرف اس کی سوجھ بوجھ اور ذہنی سطح بلکہ عسکری طاقت کی بھی آزمائش کرتے رہے اور وہ ان پر یوں انہی اثرات کو بامگر... جب دل کا معاملہ آیا تو نہ سوجھ بوجھ رہی اور نہ ہی عسکری طاقت کسی کام آئی کیونکہ... پیار سے دل کی دنیا تسخیر کرنے والی سنجگتانی بڑے مان سمان کے ساتھ اسے چاروں شانے چت کر ڈالا تھا... جس کے بعد جنگی محاذوں پر اس کی تمام تدبیریں دور کھڑی پرتھوی راج کا مذاق اڑاتی رہیں البتہ زندگی کے آخری لمحے میں دل پارے والی سنجگتانی خاموشی سے جان بھی ہار دی۔ کیونکہ جس اگن کے پھیروں میں اس نے پرتھوی راج کو باندھا تھا، اسی اگن میں وہ اسے تنہا کیسے جلنے دیتی۔





راج خوبصورت اور بہادر نوجوان تھا اور چوہان خاندان میں بااثر اور مقبول تھا۔ راجا انگ پال نے جب اس کو اپنا جتینی بنایا تو قنوج کے راجا جے چند واس کا بے حد رنج ہوا کیونکہ رشتے میں وہ بھی راجا انگ پال کا نواسہ ہی لگتا تھا۔ سب سے پہلی بات جو اس کے ذہن میں آئی، وہ یہی تھی کہ اگر کراسوں ہی میں سے توار راجے نے اپنا جتینی چنا تھا تو پرتھوی راج ہی کیوں..... اسے کیوں نہیں چنا گیا؟ جے چند کے ذہن میں توار راجا کی یہ پسند دشمنی کا روپ دھار گئی اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، یہ دشمنی گھسنے کے بجائے دوچند ہوتی چلی گئی۔

جب دہلی کا راجا مرا تو پرتھوی راج کی سلطنت خود بخود وسیع ہو گئی۔ اب پرتھوی راج دہلی اور اجیر دونوں گدیوں کا مالک ہو چکا تھا۔ جے چند اپنی حق تلفی کو بھی سمجھ نہیں بھول پایا تھا۔ اس بات کا آہستہ آہستہ پرتھوی راج کو بھی علم ہو گیا تھا۔ اب اس کے دل میں بھی جے چند کے لیے نفرت پروان چڑھ چکی تھی اور ہر دوکانہ صرف خاندانی معاملات بلکہ سیاسی طور پر بھی خصامت کا سلسلہ چل لگا تھا۔ دونوں خاندانوں میں ہوتی تھی کہ وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے کو نیچا دکھائیں۔ پرتھوی راج چونکہ زیادہ بہادر، خوب صورت اور چوہانوں کا سردار بھی تھا اس لیے وہ جے چند سے زیادہ طاقتور جاتا تھا اور ہر معاملے میں وہ جے چند مہاراجا قنوج کو نیچا دکھا جاتا تھا جس پر جے چند تملاکر رہ جاتا۔ چوہانوں اور توار خاندانوں کی حمایت بھی پرتھوی راج کو حاصل تھی مگر جے چند اندری اندر اس سے دشمنی میں بہت آگے بڑھ چکا تھا مگر اس کا کہیں بس نہ چلتا تھا جبکہ پرتھوی راج نے اب برملا یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ بہت جلد وہ قنوج کی راج دھانی بھی جے چند سے چھین کر اپنی راج دھانی میں شامل کر لے گا۔ قنوج کے راجا کو بھی اس کے مصائب میں یہ خبریں پہنچا رہے تھے۔ حد کے مارے جے چند بس پیش کھا کر رہ جاتا مگر پرتھوی راج کا کچھ بگاڑ نہ پاتا تھا۔

انجی دلوں ہوا یہ کہ غور خاندان کے محمد شہاب الدین نے جو محمد غوری کے نام سے مشہور تھا اور غور (افغانستان) کا بادشاہ تھا، اس کے ذہن میں یہ بات سمائی کہ شمالی ہند پر قبضہ کر کے اسے بھی اپنی سلطنت کا مستقل حصہ بنا لے۔ چنانچہ شہاب الدین نے 1191ء میں ہند پر حملہ کیا اور سید حامد کی طرف جا پہنچا۔ پرتھوی راج جو دہلی اور اجیر کا راجا تھا، اس نے بہت سے راجپوت راجاؤں اور اپنے حمایتیوں

معاہدہ جب ذاتی پسند اور ناپسند پر آ کر کرک جائے تو ترجیحات کے بدلنے سے انسانی دشمنیاں اور دوستیاں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ اس وقت پورے ہندوستان کے مختلف صوبوں، ریاستوں اور علاقوں میں یہی ترجیحات راج کر رہی تھیں۔ مختلف علاقوں، ریاستوں میں مختلف خاندانوں اور شخصیات کی اپنی اپنی راج دھانیاں قائم ہو چکی تھیں۔ جو طاقتور تھے، ان کے زیر نگین زیادہ علاقہ تھا۔ اس کے قرب و جوار میں قائم چھوٹی ریاستوں کے راجے مہاراجے اسے نذرانے اور خراج دیتے کہ ان کا وجود قائم رہے اور طاقتور ریاستوں کے راجے مہاراجے ہمیشہ اس بات کی ٹوہ میں رہتے کہ کہیں ان سے بھول چوک، کوتاہی یا غلطی ہو تو وہ ان پر چڑھ دوڑیں اور اسے بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیں۔ پورے ہندوستان میں اس وقت کوئی راجا، مہاراجا یا شہنشاہ ایسا نہ تھا جو یہ دعویٰ کر سکتا کہ وہ یا اس کا خاندان پورے ہندوستان کا ایک دہنیا مالک ہے۔ اوپر سے جو حملہ آور بھی آتے، وہ کچھ عرصہ لوٹ کھسوٹ کرتے اور واپس پلٹ جاتے۔

اس وقت شمالی ہند میں بھی راجپوتوں کی چار بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ توار راجپوتوں کی بڑی راج دھانی دہلی تھی۔ چوہان کی اجیر، رانھوروں کی قنوج اور بھیلیوں کی گجرات میں اپنی اپنی حکومتیں قائم تھیں چونکہ توار خاندان کی راج دھانی سب سے بڑی تھی اس لیے وہ ان تینوں ریاستوں کا بڑا سمجھا جاتا تھا۔ آپس میں رشتے داری کی وجہ سے بھی توار خاندان دوسروں سے بڑا تھا۔ اس کے تمام احکامات کو دوسری ریاستوں کے راجے تسلیم کرتے تھے۔ راجوں، مہاراجوں اور اس کے ساتھ ساتھ بادشاہوں، شہنشاہوں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ ریاست کو اپنی نجی جاگیر سمجھنے لگتے ہیں اور جو نجی کسی بڑے کی موت واقع ہوتی تو اس کے بیٹے ہی اس جاگیر اور ریاست کے وارث بنتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن راجاؤں کی اولاد زینہ نہ ہوتی، وہ شادی پر شادیاں کیے جاتے یا پھر اپنے کسی رشتے دار سے اس کا بچہ گود لے لیتے اور پھر وہی ان کی ریاست کا وارث بنتا۔ قدرت نے توار راجا انگ پال کو اولاد زینہ سے نہیں نوازا تھا جس کی وجہ سے دہلی جیسی بڑی ریاست پر وراثت کا معاملہ اس کے لیے بہت غور و فکر کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کے حل کے طور پر اس نے اپنے ایک نواسے... پرتھوی راج کو گود لے لیا۔ پرتھوی راج چوہانوں میں سے تھا۔ ان کی راج دھانی اجیر پہلے سے موجود تھی۔ پرتھوی

آپ کی اہمیت بڑھ جائے گی؟“

”مگر میں پیچھے ہٹنے والا بھی نہیں ہوں۔ میں ان کے پردہ گرام سے پہلے جشن منانا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے کوئی بہانہ ہونا ضروری ہے۔“ بے چارے نے بیٹی سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

”پتا چ! اراجاؤں اور بادشاہوں کا کیا ہے۔ وہ کسی بھی بہانے سے جشن مناسکتے ہیں اور کسی بہانے کے بغیر کا بازار بھی گرم کر سکتے ہیں۔“ سبکتا نے صلاح دی۔

”تو پھر ایسا کیوں نہ کریں، میں اپنے راجا دھیراج ہونے کا جشن مناؤں۔ میں ارد گرد کے تمام مہاراجوں اور سرداروں کو اس میں مدعو کروں گا اور ایسا جشن مناؤں گا کہ چھ ہالوں کو پتا چل جائے گا کہ کسی راجے نے یہ جشن منایا ہے۔“ بے چارے نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

”یہ بات درست ہے مگر اس جشن میں پرہموی راج کو بھی شامل ہونے کی دعوت دینا ضروری ہے کیونکہ اس طرح ایک تو اس پر دوا ہوگا کہ یہ جشن اس کی فتح کے سلسلے میں ہے اور ہم بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہیں۔۔۔۔۔ دوسرے اس کے ذہن میں آپ کے خلاف پلنے والی دشمنی بھی ہو سکتی ہے ختم ہو جائے۔“ سبکتا نے مشورہ دیا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ مگر اس دل کا کیا ہو جس میں پرہموی کا نام آتے ہی دشمنی کے شعلے بجھنے لگتے ہیں؟ بہر حال تمہاری بات اور سوچ دونوں اچھی ہیں۔ اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“

☆☆☆

پرہموی راج چوہان ایک حوصلہ مند، خوب صورت اور بہادر جنگجو جوان تھا۔ اجیر کے دار الحکومت میں اس کی بہادری اور جنگجوئی قیادت کی دعویں تو تھیں ہی مگر جب اس نے دہلی کی حکمرانی سنبھالی اور تھائیر کے مقام پر مسلمان حملہ آور شہاب الدین کو شکست دی تو اسے اپنی زندگی ہی میں لوگ داستانوں کے کردار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ شاہی ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں چہار دانگ اس کو اچھے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ سلطان محمود کے بعد کی دودھ دیوں کے دوران ان علاقوں کے سرداروں نے اپنے علاقے کے کسانوں اور دستکاروں سے اچھا خاصا لگان وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ زیادہ آمدنی ہوتی تو انہوں نے طاقتور افواج تیار کیں اور آپس کی خون ریز لڑائیوں میں فاضل پیداوار سے حاصل ہونے والی دولت کو خوب لٹایا مگر پرہموی راج نے جہاں دہلی اور اجیر کی حکومتوں کو اپنی

سمیت ہماری فوج لے کر دہلی سے اتنی میل دور تھائیر کے مقام پر شہاب الدین کو چالیا۔ دونوں کے درمیان خوب کھسکان کی لڑائی ہوئی۔ راجپوت بڑی بے جگری سے لڑے اور افغانوں کو شکست فاش دی۔ شہاب الدین خود بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔ راجپوتوں نے شہاب الدین کے بھاگتے ہوئے فوجیوں کا پانیس میل تک پیچھا کیا۔ جو افغان زندہ بچے، وہ سندھ پار بھاگ گئے۔ شہاب الدین کو شکست دینے کے بعد پرہموی راج کی بہادری کی اور بھی دعویں کی گئی جس کا بے چند کو بے حد رنج ہوا۔ ارد گرد کے دوسرے راجاؤں اور خود چوہان خاندان نے اس فتح کا جشن منانے کا پروگرام طے کرنے کا سوچا۔ بے چند کے ہاں بھی پرہموی راج کی اس بہادری کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا۔ پرہموی راج نے جہاں اپنے دشمن کو عبرتناک شکست دی تھی، وہاں اس نے اور بھی چھوٹے موٹے بہت سے کارنامے سر انجام دیے تھے جن کی وجہ سے ارد گرد کی چھوٹی ریاستیں اس سے دشمنی لگتی تھیں مگر بے چند خود کو ہمیشہ پرہموی راج کا مد مقابل سمجھتا تھا اور جب بھی اس کے سامنے پرہموی راج کا نام آتا تو وہ شعلے کے مانند بجھنے لگتا تھا۔ دشمنی کی آگ میں وہ جل بھن جاتا۔

بے چند کی پرہموی راج سے رشتے داری ہونے کے سبب اس کا اکثر ذکر اس کے اپنے گھر میں ہوتا رہتا تھا۔ بے چند کی اکلوتی بیٹی سبکتا بڑی خوب صورت اور حسین و جمیل تھی۔ قدرت نے جہاں اسے بے پناہ حسن سے نوازا تھا، وہیں اس میں سیاسی بصیرت اور سوچ بوجھ بھی بے تحاشا بھری ہوئی تھی۔ وہ کار حکومت میں اپنے باپ کا ساتھ دیتی اور بے چند کی اپنی بیٹی کے مشوروں پر ہمیشہ عمل کرتا تھا۔ شہاب الدین کے جانے کے بعد جب اس نے سنا کہ اس کے دشمن پرہموی راج کی فتح کے سلسلے میں کوئی جشن منانے کا پروگرام بنانے کا سوچ رہے ہیں تو اس نے سبکتا سے اس بارے میں مشورہ کیا۔

”یہ بات تو خاندان بلکہ پورے شاہی ہند کی خوشی کا باعث ہے کہ اس نے اتنی بڑی یلغار کا مقابلہ کر کے اسے شکست سے دو چار کیا ہے۔ ہمیں بھی اس کے جشن میں شریک ہونا چاہیے۔ ہم جنگ میں اس کے حلیف بھی تو تھے مگر بیٹی تم تو جانتی ہو، میں پرہموی راج سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی فتح میں منانے جانے والے جشن کا حصہ بنوں۔ میں یہ جشن الگ سے منانا چاہتا ہوں۔“ سبکتا نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ایسا کرنے سے

دانشندی سے چلایا، وہیں اپنی دونوں ریاستوں کو نواحی اور بیرونی حملہ آوروں سے بھی بچائے رکھا۔ اس لیے وہ عوام میں خاصا ہر لحاظ پر ہو چکا تھا۔ آدمی بہادر ہو خوب صورت بھی ہو تو وہ عورتوں میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کر ہی لیتا ہے اور خاص طور پر وہ حکومت کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے دلوں پر بھی راج کرنے لگتا ہے۔ لڑکیاں تو بسنت رت کی طرح ہوتی ہیں، جب وہ من ہی من میں کسی کو چاہنے لگتی ہیں تو اس وقت ان کے دلوں کی دھڑکن رنگ برنگی پنچلوں جیسی اونچے آسمانوں میں اڑنے لگتی ہیں۔

”لڑکی ایہ کیا بات کرتی ہو۔ جانتی ہو، تمہارا باپ اس سے کتنی نفرت کرتا ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں مگر میں بھی تو یہ چاہتی ہوں کہ ہمارے خاندان کے درمیان جو یہ فضول سی دھنسی ہے، اس کا خاتمہ ہو۔ پرتھوی راج اپنے خاندان ہی کا تو ہے۔ اس کے ساتھ میری شادی پر کوئی پابندی یا رکاوٹ بھی تو نہیں ہے۔“

”نہیں بھیا..... رام رام! میں تو یہ بات تمہارے باپ سے کرنے کا وعدہ نہیں کرتی۔ مجھے اس کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اس کی والدہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

”واہ ماں! ایک اتنی سی بات منوانے کی ہمت بھی نہیں رکھتی ہو۔ تم تو میری دوست ہو، ماں ہو۔ تم نے تو مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ اپنی بیٹی کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں؟ ماں! سچی بات یہ ہے کہ میں پرتھوی راج کو

بہت پسند کرتی ہوں۔ اگرچہ میں نے تمہاری قسم اسے آج تک نہیں دیکھا۔ ہمیشہ یہ سوچتی رہی ہوں کہ وہ کتنا خوب صورت، اونچا لمبا اور بہادر نوجوان ہے جس کے قصے لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ میں نہیں جانتی کیسے اس کی محبت نے میرے دل میں آن بسیر کیا۔ ماں! تو وعدہ کر کہ ابا جان سے اس بارے میں بات کرے گی۔“ سنجکتا نے کچھ اس انداز سے یہ باتیں کہیں کہ اس کی والدہ ہنسنے لگی اور بولی۔

”اچھا اچھا۔ کسی شہدہ موقع پر بات کر کے دیکھوں گی۔ ویسے مجھے امید کم ہی ہے!“

پھر دو ایک روز بعد وہ گھڑی بھی آئی مگنی۔ اس روز راجا بے چند گل میں آیا تو مہارانی نے ڈرتے ڈرتے بات شروع کی۔

”وہ اپنی سنجکتا ہے نا۔ اس کے بارے میں بات کرنی تھی۔“

”کیا بات کرنی تھی؟ بہت پیاری سمجھدار اور ذہین بچی ہے۔ میرے امور سلطنت میں اس کا ہمیشہ عمل دخل رہا ہے۔ راجا بے چند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”یہی کہ اب وہ اس عمر میں پہنچ چکی ہے۔“ اس سے پہلے کہ مہارانی اپنی بات مکمل کرتی رہے چند بول اٹھا۔

”ہاں ہاں، جانتا ہوں۔ میری آنکھیں اس کی طرف سے بند نہیں ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملا تو ہم یہ بوجھ بھی

نہ جانے اس وقت سنجکتا کی عمر کیا تھی۔ بہر حال یہ بات تو دل کو لگتی ہے کہ وہ درختوں کی عمر سے گزر چکی تھی۔ شاید حیرتوں کی عمر بھی جب اس نے گل میں اور ارد گرد ہونے والی سرگوشیوں میں پرتھوی راج کا نام سنا۔ اس کی بہادری کے قصے جہاں ہر کسی کی تعریفی زبان پر تھے، وہاں اس کی خوب صورتی کے چہرے بھی عام تھے۔ اگرچہ دھنسی کی بنا پر اس کے ہاتھ چند ہمیشہ اس سے نفرت کرتے تھے اور جب بھی اس کی بات ہوتی تو ان کا رویہ اور لہجہ ہمیشہ مخمسانہ ہوتا لیکن جتنی نفرت اس کے والد پرتھوی راج سے کرتے تھے، نہ چاہتے ہوئے بھی سنجکتا کے من میں اس کے لیے اتنی ہی جاہت کیوں پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے کان اس نام کو سننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اس کے من میں یہ نام سنتے ہی نہ جانے کیوں مدھر آواز میں بکھرنی لگتا تھا۔ وہ اپنے عمل میں اکیلی تو ہوتی تھی مگر اس کی نگاہیں اپنے ارد گرد پرتھوی راج کے ہونے کو کیوں دیکھنے لگی تھیں۔ جب بھی پرتھوی راج کا ذکر ہوتا تو سنجکتا کو یوں لگتا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ کر دھڑکنے لگا ہو۔

اس نے ابھی تک پرتھوی راج کو اپنے سامنے نہیں دیکھا تھا بس تصور میں وہ اس کے ہر وقت آس پاس رہتا تھا۔ ایک خاکہ تھا جو اس نے اپنے دل میں بسایا تھا اور دیرے دیرے وہ اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرنے لگی تھی۔ چونکہ پرتھوی راج چھ ماں اور اس کے والد بے چند کی آپس میں رشتے داری بھی تھی، اس لحاظ سے سنجکتا کو اپنی پسند کے سلسلے کی امید نے اس کے دل میں پرتھوی راج کی محبت کو اور بھی دو چند کر دیا تھا۔ سنجکتا اگرچہ والد کی حکومت میں اسے مشورے بھی دیتی تھی اور اس کے ہمراہ امور سلطنت بھی سرانجام دیتی تھی لیکن اس سلسلے میں اسے اپنے والد کے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بڑی

آسانی سے اتا دیں گے۔“

”رشتہ ہے میری نظر میں۔ گھر کا لڑکا ہے۔ اپنے خاندان سے۔“ جانے یہ کہتے کہتے مہارانی کا حلق کیوں خشک ہونے لگا تھا۔

”کون ہے..... کس کا بیٹا ہے؟“ راجے نے پوچھا۔
”پرتھوی راج..... اور سچکا بھی اسے پسند کرتی ہے۔“
یہ سنتے ہی راجا بے چند کا پارہ آسمانوں کو چھوئے لگا۔ وہ غصے میں دھاڑا۔

”آپ کو اس غیبت کا نام میری بیٹی کے ساتھ لینے کی ہمت کیسے ہوئی؟ اگر ایسا ہے جیسا آپ نے کہا تو بھگوان کی قسم میں سچکا کو انہی ہاتھوں سے ختم کروں گا لیکن اس کی شادی پرتھوی راج سے نہیں ہونے دوں گا۔“

”لیکن ہم نے اپنی سچکا کو ایک نہ ایک دن تو بیاہنا ہی ہے۔ رہے گی بات دشمنی کی تو یہ بات ہمارے بڑوں سے چلی آ رہی ہے کہ ہم ہمیشہ بیٹیاں دے کر، رشتے لے کر دشمنیاں ختم کرتے ہیں۔ اگر ہم بھی یہ کر لیں تو کوئی انہونی بات تو نہ ہوگی۔“ مہارانی نے ڈرتے ڈرتے دلیل پیش کی۔
”اگر آپ مہارانی نہ ہوتیں تو میں بتا دیتا کہ انہونی اور ہونی میں کیا فرق ہوتا ہے۔“ مہاراجا نے اپنا ہاتھ اپنی کمر سے بندھ کر اسے صریح دے پڑا کہ جواب دیا۔
”کوئی اور ایسی بات کرتا تو اس کا کٹنا ہوا سراپ تک میرے قدموں میں پڑا ہوتا۔“

”مم..... مم..... میں.....“ رانی شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

”بس۔ آپ عورتوں کو اگر دشمنیاں ختم کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو جابجائے پرتھوی سے اس کی بہن کا رشتہ لے آئیے۔ ہم بخوشی اسے اپنی حرم سرا کا حصہ بنائیں گے اور ایسے ہماری اس کے ساتھ دشمنی بھی ختم ہو جائے گی۔“ راجا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ پھر وہ غصے میں واپس پلٹا اور جاتے جاتے ایک بار بھر دھاڑا۔ ”اور ہاں، ایک بات اور کہتا ہوں۔ سمجھا لیتا اپنی لاڈلی کو اور بتانا کہ ہم اپنے دشمنوں کا نام مخلوں کی چار دیواری میں نہیں جنگ کے میدانوں میں لیا کرتے ہیں۔ پرتھوی ہمارا دشمن ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کا نام ہمارے محل کی دیواریں بھی سنیں۔ جب بھی اس سے آنا سامنا ہوگا، جنگ کے میدان میں ہوگا۔ شادی کے منہ پ میں نہیں۔“

مہارانی خوف اور حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ”اور یہ بھی سچکا کو بتانا.....“ وہ جاتے جاتے مڑا

اور اسی غصے میں بولا۔ ”اگر اس نے اپنے ذہن سے پرتھوی کا نام نہ نکالا تو ہم اس کی سوچوں پر پہرے بھی بٹھا سکتے ہیں۔ ہم اسے اپنے ہاتھوں سے مار کر ترک بھجوانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ وہی نہیں بھجوا سکیں گے۔“

مہارانی، راجا کے غصے سے واقف تھی۔ وہ جی جان سے اس بات کو سن کر لرز اٹھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجے مہاراجے ایسے مواقع پر کیا کرتے ہیں۔ قتل و غارت تو ان کے نزدیک ایک کھیل سے بھی کم ہوتا ہے۔ پھر حرم سرا میں ایک عورت کے کم ہونے سے کوئی قیامت گزر جاتی تھی۔
راجا بے چند غصے میں پھر پختا ہوا محل سے چلا گیا۔ اس کے جانے سے مہارانی کی جان میں جان آئی۔

☆☆☆

توج کی مہارانی کتنے ہی دن اپنے من ہی من میں بیچ و تاب کھاتی رہی۔ راجا بے چند غصے کا برا ضرور تھا مگر وہ اتنے غصے میں بھی نہیں آتا تھا۔ وہ خدا کا پکا تھا۔ اب مہارانی کو اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ آخراں نے ایسی بات کی ہی کیوں۔ نہ وہ سچکا کے کہنے پر لگی اور نہ اس کی اتنی تذلیل ہوتی۔ راجوں، مہاراجوں کا کیا ہے۔ ذرا سی ان کے من میں آنے والی باتوں سے پہلی عجزت پر دوسری لاناٹھاں۔ بے چند غصے میں کہہ گیا کہ وہ پرتھوی کی بہن کو، یاہ لائے گا۔ ہو سکتا ہے، وہ یہ بات کسی نہ کسی طرح سچ ہی کر دکھائے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ پرتھوی اس کے مقابلے میں زیادہ بہادر، زیادہ ذہین اور جری نوجوان ہے جبکہ بے چند اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا مگر پرتھوی راج کی طرح ذہین اور معاملہ فہم نہ تھا اور جلد غصے میں آ جاتا تھا۔ وہ ضدی بھی بہت تھا۔ یہی ضد سچکا کو بھی اپنے باپ کی طرف سے وراثت میں ملی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی وہی راجپوت خون دوڑ رہا تھا جو اس کے خاندان کے لیے باعث فخر تھا۔

اب مہارانی کو دہری مصیبت کا سامنا تھا۔ ایک طرف اس کا شوہر تھا اور دوسری طرف اس کی بیٹی اور طرفہ ستم یہ تھا کہ دونوں انتہا کے ضدی تھے۔ اگر اس کے ذہن میں یہ خیال آتا کہ اس کا شوہر اسی پر خاش کو بد نظر رکھتے ہوئے پرتھوی پر حملہ آور ہو سکتا ہے تو دوسری طرف اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ جب اس کی بیٹی کو اپنے والد کے انکار کا پتا چلے گا تو وہ بھی کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ دونوں طرح سے تباہی اسے نظر آرہی تھی۔ اسے اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی اور سچکا بھی تو

قائم ہو گئیں۔ بہنوں، بیٹیوں کے رشتے دے کر یا ان کو اپنے حرم میں شامل کر کے..... پھر یہ بھی تو سوچیں کہ پرتھوی دوسرے خاندان سے تو نہیں۔ اپنے ہی خاندان کا لڑکا ہے۔ میں نے اگر اسے نہیں بھی دیکھا تو یہ آپ کی نیک نامی اور بہتر پرورش کا نتیجہ ہے کہ میں نے اسے بنا دیکھے پسند کیا ہے اور چاہتی ہوں کہ بہتر انداز سے یہ نکل منڈھے چڑھ جائے۔“ سنجک نے آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

”بات تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ میرے من کو بھی گنتی ہے مگر تمہارے باپ کو کون سمجھائے۔“ مہارانی نے ایک آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”بات تو مکمل سنا نہیں۔ آخر کیا گفتگو ہوئی تھی آپ کے اور پتاجی کے درمیان تاکہ میں بھی اپنا کوئی لائحہ عمل بتا سکوں۔ زندگی تو میں نے ہی گزارنی ہے۔“ سنجک نے سنجیدگی اور باپوسی کے طے چلتے تاثرات سے کہا۔

”تو سنو..... میں نے تمہارے پتاجی سے بات کی تھی۔ انہیں مختلف دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہاں تو وہی ڈھاک کے تین بات والا معاملہ ہے۔ میری بات سن کر وہ جیسے سے اکڑ گئے بلکہ مجھے دھمکی دے ڈالی کہ اگر تم عورتوں کو یہ دشمنی ختم کرنے کا ہمتا، قدر شوق ہے تو مجھے پرتھوی کی بہن لا دو۔ یہ ضروری تو نہیں کہ بچے چند اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر ہی دشمنی ختم کرے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں تمہارا ارادہ بھی شامل عرس کون دیکھتا ہے۔ اگر اس میں تمہارا ارادہ بھی شامل ہے تو یہ جان لو، راجے کی نکو اور تمہارے سر کے درمیان دو ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ میں تم دونوں کو ختم کر دوں گا مگر اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا۔ پرتھوی میرا دشمن ہے اور دشمن ہی رہے گا۔ یہ میرا سختی فیصلہ ہے اور آئندہ میں اس بارے میں تمہاری زبان سے یہ بات سننا پسند نہیں کروں گا۔ بھگوان کی قسم اگر تم میری جتنی نہ ہوئیں تو ابھی تمہارا سر تمہارے جسم سے الگ ہو کر میرے قدموں میں لوٹ رہا ہوتا!“

مہارانی تمام باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ دلوں ماں بیٹی کے درمیان کچھ توقف کے لیے خاموشی یونہی تیری رہی پھر جیسے سنجک نے اپنے من ہی من میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بڑے خوفزدہ کرنے والے لہجے میں گویا ہوئی۔

”ماں! تو میرا فیصلہ بھی پتاجی کو سنا دینا۔ میری رگوں میں بھی وہی خون بہتا ہے جس پر انہیں فخر ہے اور جو اپنی ذاتی ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ اکڑ بھی ہے۔ اگر وہ اپنی دشمنی نہیں بھول سکتے تو میں بھی اپنی پسند نہیں بدل سکتی۔ میں نے

دوبارہ اس سے ٹٹی نہیں تھی۔ شاید اسے اس بات کا علم ہو گیا ہو یا پھر ہو سکتا ہے ریاست کے معاملات میں وہ اس قدر الجھی ہوئی ہو کہ اسے وقت ہی نہ ملا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات کر کے بھول ہی گئی ہو۔ طرح طرح کے خیالات تھے جو مہارانی کے من ہی من میں خود بخود دوسرا اشارہ ہے تھے کہ ایک روز سنجک سے دوبارہ اس کا سامنا ہو گیا۔ نئے ہی پہلا سوال جو سنجک نے کیا وہ یہی تھا۔

”ماں! وہ میں نے ایک کام آپ کے ذمے لگایا تھا؟“

”کیا؟“ مہارانی نے جتنے ہوئے پوچھا۔

”ریاست کی مہارانی باتیں کب سے بھولنے لگی ہے۔“ سنجک نے ہنستے ہوئے کہا تو مہارانی خود بخود شرمندہ ہو گئی۔ اس کی بیٹی یقیناً اتنی ذہین ہے کہ وہ ریاست کے معاملات کو بخوبی چلا سکتی ہے۔ اس نے سوچا اور فوراً بولی۔

”وہ..... ارے ہاں۔ مجھے یاد آیا۔“ مہارانی بات کو ادھر ادھر گھمانا چاہتی تھی۔

”لگا دیں کوئی بہانہ کہ پتاجی محل میں تشریف نہیں لائے۔ وہ آئے تو تھے مگر بات کرنا آپ کو یاد نہیں رہا یا پھر..... انہوں نے بات سننے ہی انکار کر ڈالا۔ ماں! جو بھی ہے، مجھے سچ بتا دیں، مجھ میں سب سننے کا حوصلہ ہے۔“ سنجک نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم یہ بھول کیوں نہیں جانتیں۔ خاندان میں پرتھوی سے زیادہ بہادر، خوب صورت اور ذہین و فطین نوجوان موجود ہیں پھر پرتھوی ہی کیوں؟ جبکہ تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ مہارانی نے رکتے رکتے بات مکمل کی۔

”ماں! یہ آپ کا خیال ہے یا آپ کے منہ میں پتاجی کی زبان بول رہی ہے۔“ سنجک نے دوبارہ پوچھا۔

”یونہی جان لو۔ یہ ہم دونوں کا خیال ہے۔“ مہارانی نے حوصلے سے کہا۔ سنجک..... میری بیٹی اتم نہیں جانتیں۔ جہاں دشمنی کا خود سر پہودا اپنا سر نکال چکا ہو، وہاں بہتر موسموں کی ہوا میں نہیں گزر کر تھیں۔ تمہارے ذہن میں بھی شاید نہ ہو کہ تمہارا باپ پرتھوی سے کس قدر نفرت کرتا ہے۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا۔ ایک دو بار ان دونوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ جھڑپیں جنگ کا روپ نہ دھار سکیں۔ ایسے میں یہ دشمنی اور یہ سوچ کہ منافقتیں ختم ہو جائیں، بھلا کیسے ممکن ہے!“ مہارانی نے دلیل سے سنجک کو قائل کرنا چاہا۔

”لیکن ماں! جی! بڑے بڑے خاندانوں کی دشمنیاں اسی طرح ختم ہوتی آتی ہیں کہ ان کے درمیان رشتے دار یاں

پر تقویٰ کو زندگی بھر نہیں دیکھا مگر اس کی خوبیوں اور اس کی بہادری کے چرچے تو سنی رہی ہوں۔ وہ میرے سن کے سنگھاسن پر ایک آسن بنائے جما بیٹھا ہے جسے لگانا میرے اپنے بس میں بھی نہیں رہا۔ میں اسے ہر حال میں حاصل کر کے رہوں گی۔ یہ میری جلد ہے۔“

وہ یہ کہہ کر پھر بچتی ہوئی چلی گئی اور مہارانی کو سوچوں کے بھونڈ میں ڈوبتا پھر جتا چھوڑ گئی۔

مہارانی اپنی چٹکتی آنکھیں لے کر سامنے رکھی بیگوان کی سواری کے قریب چلی گئی۔ اپنی پانی بھری آنکھوں کو بند کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کانپتے ہوئے لبوں سے الفاظ کا دھارا خود بخود بہنے لگا۔

”اے بیگوان! تو ہی میری اس زندگی کی لاج رکھنا اور اسے آنے والے دکھوں سے بچانا۔ یہ بہت معصوم اور سادہ سی لڑکی ہے۔ بیگوان تو ہی اس کی حفاظت کرنا!“ شاید یہ دعا تک کہ اس کے من کو سکون مل گیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ جلد ہی اپنے جڑے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر کر وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

سچلتا پھر بچتی ہوئی مہارانی سے لڑ چھڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور آتے ہی اپنے بستر پر گر پڑی تھی۔ غصے سے اس کی کن پٹیاں جل رہی تھیں، اب وہ کیا کرے؟ وہ اپنے والد راجا بے چند کے غصے اور اس کی زندگی سے واقف تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اس کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دے گا مگر اب پر تقویٰ جو بڑی دیر سے اس کی سوچوں کا محور بنا ہوا تھا، اس کے خیالوں پر قابض تھا، اب اس کی زندگی چکا تھا۔ وہ کیسا ہوگا؟ آیا وہ اس کی سوچوں اور اس کے خیالوں جیسا ہی ہوگا۔ اسے ایسا ہونا ہی چاہیے۔ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لے اور کیا اسے بھی اس بات کا علم ہے کہ ایک پاگل سی لڑکی اسے اپنی سوچوں کا محور بنائے ہوئے ہے؟ وہ دن رات اس کے خواب دیکھتی ہے مگر اسے یہ کیسے علم ہو سکتا ہے؟ وہ اس کے من میں چلنے والی بات کو کیسے جان سکتا ہے؟ وہ سوچتی رہی کہ سب سے پہلے اسے اس بات کا احساس دلوانا ہوگا کہ راجا بے چند جو اس کا جانی دشمن ہے، اس کی لڑکی سچلتا اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اتنی کہ وہ اس کے لیے کسی بھی امتحان سے گزرنے پر تیار بیٹھی ہے۔ ہو سکتا ہے جیسے خیالات اس کے من میں پیدا ہوئے ہیں، ایسے ہی خیالوں میں وہ بھی کھویا ہوا ہو۔ وہ بھی دل ہی

غور و فکر

☆ برائی کو خود میں اور اچھائی کو دوسروں میں تلاش کرو۔ یہ آپ کی سب سے بڑی اچھائی ہے۔

☆ جب مجھے پتا چلا کہ محل کے بستر اور زمین پر سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں تو مجھے اللہ کے انصاف پر یقین آ گیا۔

☆ شیطان کہلا میں کھڑا حسین علیہ السلام کا آخری سجدہ دیکھ رہا تھا کہ چاکل آسان کی طرف دیکھا اور کہا کہ اے اللہ! تیری خدائی کو غور سے تو آج دیکھا ہے۔ کہاں معلوم تھا کہ نور عالم ایسے ہوتے ہیں۔ اے خدا میں سجدے سے کبھی انکار نہ کرتا۔ اگر مجھ کو پتا ہوتا آسان ایسے بھی ہوتے ہیں۔

☆ خوشگوار زندگی اور چھوٹے سے بچنے کے دو اصول ہیں۔ جب آپ غلطی پر ہوں تو اسے تسلیم کر لیجیے مگر جب آپ درست ہوں تو خاموش رہیں۔

☆ محبت کس سے کی جائے؟ دنیا سے؟ مگر یہ تو رلائی ہے۔ پھولوں سے؟ مگر یہ تو مر جھاجاتے ہیں۔ پیسے سے؟ مگر یہ تو رشتے توڑتا ہے۔ بلندیوں سے؟ مگر یہ تو منہ کے بل گراتی ہیں۔ خوشی سے؟ مگر یہ تو فتنی ہوتی ہے۔ لوگوں سے؟ مگر یہ تو بے وفا ہوتے ہیں تو پھر آخر محبت کس سے کی جائے؟ عمر علیہ السلام جو اس دن بھی ساتھ نبھائیں گے جب ماں، باپ، بھائی، بہن سب اپنی اولاد اور فرشتوں کو بھول چکے ہوں گے۔ ☆ تین مشہور فلسفی (ایک فلسفی) قابلیت کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ (دوسرا فلسفی) تو ہیں سے زیادہ گہرا کوئی رخص نہیں ہوتا۔ (تیسرا فلسفی) ٹینشن (پریشانی) کا پیدا ہونا ذہانت کی موت ہے۔

سرسرلہ: خستہ شہ عارف..... جہلم

دل میں اس کی چاہت میں مبتلا ہو۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہو تو اس کا مزہ ہی دوگنا ہوتا ہے۔ ایک طرف طور پر محبت کی چنگاریاں سوچوں کو سلگاتی رہیں تو اس کا فائدہ..... پھر اچانک جیسے اس کی سوچوں میں کوئی بجلی سی اچانک چمکی جو جس سے وہ نہال ہو کر رہ گئی۔ اس درمیانی راستے کے بارے میں وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اپنے

سابق و سابق کے لحاظ سے یہ منصوبہ ہر حال میں جب مکمل ہو گیا تو اس نے اس بارے میں پختہ فیصلہ کر لیا۔ یہ درمیانی راستہ پر تقویٰ سے ہر حال میں راپٹے کا تھا۔ کرناٹکی اس کی ملازمہ جو اس کے ساتھ پیار بھی کرتی تھی اور اس کا... ہر حکم بجالانے کو اپنا ایمان جانتی تھی..... کیا وہ اس سلسلے میں اس کی مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا۔

مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ دوسرے ملازموں کی طرح وہ بھی دہرے معیار کی ثابت ہو اور انعام و اکرام کے لالچ میں آ کر اس کے والد کو سب بتا دے۔ دوسری سوچ نے سراٹھایا۔ آزمائشیں میں تو کوئی حرج نہیں پھر اگر وہ بے وفائی کرتی بھی ہے تو کیا۔ اس کا تو یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ ہر حال میں پر تقویٰ کو اپناتے گی اور اس کی راہ میں آنے والے کانٹوں کو اپنی پٹلوں سے چٹنے کی..... پھر اسے کس بات کا خوف یا کس بات کا ڈر ہے؟ اس کے دل نے فیصلہ صادر کر دیا تو اس نے کرناٹکی کو اپنا ہمراز بنانے کا بیج لگا دیا۔ اس روز کرناٹکی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سنجکتا بھی کاروبارِ سلطنت نشا کر فارغ تھی تو اس نے بات چلائی۔

”کرناٹکی! ایک بات پوچھوں..... بیج کچ بتانا۔“

”جی چھوٹی رانی! پہلے کچھ چھپایا ہے آپ سے۔ میں تو اپنے من کی ساری باتیں آپ کے سامنے کھول دیتی ہوں۔ وہ بھی جو آپ نہ بھی سننا پسند کریں۔“ کرناٹکی نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔

”مگر سوچ لو۔ اس بات کی ہینک بھی دوسرے کانوں تک پہنچی تو یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ سنجکتا اپنے سے بے وفائی کرنے والوں کو کبھی نہیں بخشتی۔“ اس نے کہا۔

”مجھے اس کا بھی احساس ہے!“ اس نے نظریں جھکا کر مختصر جواب دیا۔

”آٹھ شخصیں ملا کر مجھ سے وعدہ کرو۔“ سنجکتا نے حکم دیا۔

”جی آپ کہیں..... یہ میرا وعدہ ہے۔“ کرناٹکی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں جماتے ہوئے کہا۔

”تم نے کبھی پر تقویٰ کو دیکھا ہے؟ میرا مطلب ہے

کسی تقریب میں..... کسی جنگ میں..... یا یونہی اچانک؟“

سنجکتا نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

”چھوٹی مہارانی! بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ خاص کر میرے جیسی ملازمہ کے لیے جس نے کبھی محل کے باہر اڑتی خاک کو بھی نہیں دیکھا۔ میرے لیے تو یہ محل ہی پوری دنیا ہے۔ ہاں البتہ اس کی شہرت بہت سنی ہے۔ اس کے کارناموں کے چرچے بہت سنے ہیں۔ چھوٹی مہارانی! وہ تو آپ کے رشتے داروں میں سے ہے۔ آپ نے تو اسے دیکھا ہوگا۔ اس سے ملی بھی ہوں گی۔“ کرناٹکی نے اٹا اس سے سوال کر دیا تو سنجکتا ایک آہ بھر کر بولی۔

”کرناٹکی! یہی تو المیہ ہے، یہی تو دکھ ہے۔ ہم رشتے دار ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پائے۔ وہ اپنی ریاست کا راجا تھا پھر دہلی بھی اس کی دسترس میں آ گئی۔ پتائی کو اسی بات کا قلق تھا کہ ان کے بڑوں نے ان کے ساتھ دشمنی کی ہے۔ یہی بات ان کی دشمنی کا سبب بنی اور پھر پتائی کا..... میں تو اسے ان کا پاگل بن ہی کہوں گی۔ انہوں نے جانے بوجھے ہوئے دلی پر حملہ کر دیا کہ وہ اسے جیت کر اپنی سلطنت کا حصہ بنالیں گے حالانکہ انہیں علم نہیں تھا کہ پر تقویٰ ان سے زیادہ بہادر، جری اور ذہین حکمران ہے۔ اس نے پتائی کی ایک نہ چٹنے دی اور پتائی اپنی شکست سے جھٹکنا اٹھے۔ اس کے اور بھی بیڑی ہو گئے۔“

سنجکتا نے آہستہ آہستہ بتاتے ہوئے کہا۔

”تو اب.....؟“ کرناٹکی نے اگلا سوال کر ڈالا۔

”کرناٹکی! میں نہیں جانتی یہ کیونکر ہوا۔ ہر لڑکی کی طرح میری سوچوں پر بھی پر تقویٰ نے ایک روز اچانک قبضہ جمالیا اور میرے دل کی سلطنت کو جیت لیا۔ میں نہیں جانتی۔ میں جتنا بھی اب اپنے دل سے اس کا خیال نکالنے کی کوشش کرتی ہوں، اتنا ہی اس کے حصار میں جکڑی جاتی ہوں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ جب میرے پتائی کو اس بات کا علم ہوگا، وہ دن میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔ شاید وہ لمبے بھی میرے لیے آخری لمحے ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس بات کو سن کر وہ عملی طور پر کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں لیکن کیا کروں۔ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں کس قدر بد نصیب ہوں کہ یہ بھی نہیں جانتی کہ پر تقویٰ کو میری اس خاموش محبت کا علم کیسے ہوگا۔ یا اگر اسے علم ہو جائے تو اس کا کیا رد عمل ہوگا۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب اسے اپنی ضد بتا بیٹھی ہوں۔“ سنجکتا نے بتایا۔

”سمجھائیں چھوٹی رانی اپنے دل کو کہ وہ یہ پاگل پن

مصلحت آمیز جھوٹ

میں نے ایک بادشاہ کے بارے میں سنا کہ اس نے ایک قیدی کو قتل کر دینے کا حکم جاری کیا۔ بے چارے قیدی نے اس ناامیدی کی حالت میں بادشاہ کو گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں جب کسی انسان کی جان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو جو کچھ اس کے دل میں آتا ہے، کہہ دیتا ہے بادشاہ قیدی کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے وزیروں سے پوچھا یہ قیدی کیا کہہ رہا ہے تو ایک نیک خصلت وزیر نے بادشاہ سے عرض کی کہ اسے بادشاہ سلامت! قیدی کہہ رہا ہے وہ لوگ اچھے ہوتے ہیں جو غصہ پل جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

بادشاہ نے یہ سنا تو اسے قیدی پر رحم آ گیا اور اسے معاف کر دیا مگر دوسرا وزیر جو اس کے مخالف تھا فوراً بول اٹھا۔ بادشاہ سلامت! اس نے آپ کو گالیاں دی ہیں، آپ کی شان میں، نازیبا باتیں کی ہیں۔

بادشاہ نے جب اس وزیر کی باتیں سیں تو بہت ناراض ہوا اور بولا کہ وہ جھوٹ جو اس وزیر نے بولا ہے تمہارے سچ سے زیادہ مجھے پسند آیا ہے کیونکہ اس کا رخ نیکی کی طرف تھا جبکہ تیرے سچ کی بنیاد خیانت پر ہے۔ اسی لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ مصلحت آمیز جھوٹ قندہ بر پا کر دینے والے سچ سے بہتر ہے۔

(سچ سہی شیر اڑتی کی حکایات سے انتخاب)
(مرسلہ: دریا ضبٹ - حسن ابدال)

بجو

ایک نوجوان شاعر جب پہلی بار عینک لگا کر نظم پڑھنے آیا تو میزبان بوڑھے شاعر نے کہا! عینک لگا کر تم بالکل بھولتے ہو۔
نوجوان شاعر بولا۔
عینک اتار دو تو پھر آپ مجھ کو بھولیں گے۔
(مرسلہ: عید الجبارودی انصاری - قصور سٹی)

نہ کرے۔ اس کا بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ کی جان بھی جاسکتی ہے۔ دونوں ریاستوں میں ایک نہ رہنے والی جنگ کا بھی احتمال ہے۔ بہت تباہی ہوگی، اس چھوٹی سی ضد کو پورا کرتے ہوئے۔ میری باتیں تو اپنے دل کو سمجھائیں۔“ کرناٹکی نے کسی دانا عورت کی طرح اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں مانتا یہ کم بخت۔ کہاں مانتا ہے۔ بہت کوشش کی ہے اسے سمجھانے کی مگر یہ ہے کہ میری ایک نہیں سستا۔ اب چاہے قیامت آجائے، دنیا برباد ہو جائے مگر میں نے ہلکا ارادہ کر لیا ہے کہ میں برتھوئی کو اپنا آپ ہار کر بھی اپناؤں گی۔ بتاؤ اس سلسلے میں تم میرے لیے کیا کر سکتی؟“ سنجکتا نے آخری بات کی۔

”چھوٹی رانی! میں بہت دنوں سے آپ کی آنکھوں میں اداسی اور رت جگلوں کے ذورے لرزے کا پتہ دیکھ رہی تھی۔ اتنی تو سوجھ بوجھ میں بھی رکھتی ہوں مگر کبھی پوچھنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ ڈر لگتا تھا۔ یہ محبت، یہ عشق کم بخت جب دل کے تخت پر آ بیٹھتا ہے تو پھر اس کا قسوں اس کا جادو آہستہ آہستہ انسانی حیات پر قابض ہو کر اپنا آپ ظاہر کرنے لگتا ہے۔ پھر انسان چاہے کچھ نہ کہے مگر اس کا انگ انگ اس کے اندر کاراڑھ کھولنے لگتا ہے۔ مجھے حکم کریں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ کرناٹکی نے یہ کہا تو سنجکتا کو یوں لگا جیسے بھرے دریا میں اسے ڈوبنے سے بچانے کو ایک سہارا مل گیا ہو۔ جیسے اسے ایک رازدار کی سی ٹل مٹی ہو جس کے ساتھ اب وہ دھک دھک کر سکتی ہو۔

”تم پر تھوڑی سی ملوگی۔ جس طرح بھی ممکن ہو اور اس سے میرے من کی ساری باتیں کرو گی پھر اس کا رول دیکھ کر مجھے بتاؤ گی۔ اگر وہ بھی ہمارے بھگوان کی طرح پتھر کا لکھتا تو ساری عمر سر پھوڑنے سے بہتر ہے۔“ سنجکتا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”مگر چھوٹی رانی اگر اس بات کی بھینک بھی راجا کو پڑ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ کرناٹکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ایسی قیامت آنے سے پہلے میں اس کا رخ اپنی طرف موڑنے کی جرأت رکھتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ، میرا یہ کام کر سکتی؟ میں تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔“ سنجکتا نے دوبارہ کہا۔

”چھوٹی رانی! تم نے کرناٹکی کو دیکھا ہے مگر اس کے

دیوی دیوتاؤں کا حلق اٹھا کر اپنے سچ کا یقین دلاؤں؟“
 کرنا کئی سنجیدگی سے بولی۔
 ”نہیں، تم کہو۔ ہمیں چہرہ ہاری باتوں کا یقین ہے۔
 تمہارا انداز، بات کرنے کی پختلی ہی تمہارے سچ کے لیے
 کافی ہے۔“

☆☆☆

زندگی کی وہ شام سجتا کے لیے بہت بھاری تھی۔ کتنی
 دیر سے وہ اپنے کمرے میں بے چینی سے ادھر ادھر بھر رہی
 تھی اور اس کے من میں عجیب و غریب دوسوے جنم لے رہے
 تھے۔ کرنا کئی کو محل سے گئے دوسری شام ہو چکی تھی مگر ابھی
 تک اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

کیا وہ پر قہوی تک پہنچ بھی پائی ہوگی، کیا پر قہوی کو اس
 کی باتوں پر یقین آ گیا ہوگا یا کسی ظالم راجے مہاراجے کی
 طرح اس نے غصے میں آ کر کرنا کئی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا
 ہوگا؟ دشمن کے علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا، گویا
 جانتے بوجھے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف
 ہوتا ہے اور کرنا کئی تو پر قہوی کے دشمن راجا جے چند کے محل کی
 خاص ملازمہ تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے پاس
 جاسوسی یا کسی خاص مقصد کو لے کر پہنچی تھی یا پہنچانی گئی
 ہوگی۔ پر قہوی کو یہ خیال بھی آ سکتا ہے۔ سجتا کے سونچا۔
 دوسروں کی چمکا ڈریں اس کی سوچوں سے لٹکی
 پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا جاتا تھا اس کی
 پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا ذہن خود
 اپنے آپ پر علت اور پشیمار بھیجتا کہ اس نے ناقص ایک جیتی جانتی
 زندگی کو اپنے مفاد کی خاطر ترک (دورخ) میں دھکیل دیا۔

اسے اب تک وہاں پلٹ آنا چاہیے تھا۔ ایک سوچ
 آتی تو فوراً دوسری سوچ پہلی کا گلا گھونٹ دیتی۔ ان خیالوں
 نے سجتا کی سوچوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا
 دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا۔ امور مملکت میں اس کا دھیان
 نہیں لگ رہا تھا پھر جب سے راجا جے چند کو سجتا کی محبت کا
 پتا چلا تھا، اس کا رویہ بھی سرد مہری پر جا لگا تھا۔ جس طرح وہ
 پہلے سجتا کے باتیں کرتا، مشورے دیتا اور مشورے مانگتا تھا،
 اب سجتا کے محسوس کیا کہ اس کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی
 وہ بھی دوبار میں بس ایسے ہی جاتی۔ چند نے وہاں بیٹھتی
 اور پھر اٹھ کر محل میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ جاتی۔

دو مکمل راتیں بیت چکی تھیں اور تیسرے دن کا سورج
 نکل کر اپنی تمازتیں نکمیر نے لگا تھا۔ آج اس کا من نہیں چاہ
 رہا تھا کہ وہ دربار میں پہنچے مگر اس کا جانا اس لیے بھی ضروری

اندروں دھڑکنے دل کو نہیں دیکھا۔ یہ دل دولت کے لیے نہیں
 پیار کے لیے دھڑکتا ہے۔ اب اگر آپ نے ایک چھوٹی بہن
 سمجھ کر مجھ پر اعتماد کیا ہے تو کیا میں یہ کام چند سکوں کی خاطر
 کروں گی؟ اگر ایسا خیال بھی میرے من میں آئے تو علت
 ہے میری زندگی پر۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی جان پر
 کھیل کر بھی آپ کی ملاقات پر قہوی سے ضرور کرواؤں
 گی۔“ کرنا کئی نے عزم سے کہا تو سجتا نے پیار سے اس کا
 منہ چوم لیا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ سجتا نے ہنستے ہوئے کہا۔
 پھر ایک روز کرنا کئی ہمیں بدل کر محل سے نکلی اور
 پر قہوی تک کس طرح پہنچی، یہ ایک الگ کہانی ہے مگر وہ کسی
 نہ کسی طرح پر قہوی سے جا ملی۔ پر قہوی کے سپاہیوں کو اس
 کی مشکوک حرکات پر شک گزرا تو اسے گرفتار کر کے پر قہوی
 کے پاس لے جایا گیا۔ پر قہوی نے بڑے حکمانہ لہجے میں
 سوال کیا۔

”کون ہو تم اور محل کے ارد گرد کیوں چکر لگا رہی ہو؟“
 ”انسان ہوں اور دل کے ہاتھوں مجبور بھی۔“

کرنا کئی نے تر ت جواب دیا۔
 ”جانتی ہو مجھ کو ہوگی تو اس کی سزا کس قدر بے مانیک
 ہوگی؟“ پر قہوی نے دوسرا سوال کیا۔
 ”جانتی ہوں۔ سچ بھی بولوں گی تو کون اعتبار کرے
 گا۔“ کرنا کئی کا جواب تھا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں..... کس کے کہنے پر
 آئی ہو؟“ پر قہوی نے دوبارہ سوال کیا۔

”کچھ باتیں دل کی ہوتی ہیں اور دل کی باتیں سب
 کے سامنے اس لیے نہیں کی جاتیں کہ اس سے رسوائی کا خطرہ
 ہوتا ہے۔ اگر تجلیہ مل جائے تو یقین کریں سب کچھ سچ
 بتا دوں گی۔ اگر مجھوت کا شک گزرے تو یہ گردن حاضر
 ہے۔“ کرنا کئی نے اپنی گردن کو جھکاتے ہوئے کہا۔

”ہوں! خود پر اتنا یقین ہے۔ موت سے ڈر نہیں
 لگتا؟“ پر قہوی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے
 ہوئے پوچھا۔

”اگر ڈرتی تو اتنی ہمت کہاں سے لاتی۔“ یہ کہہ کر کرنا کئی
 نے ایک بار پھر اپنے ارد گرد گھڑے سپاہیوں کو دیکھا۔
 پر قہوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کیا
 تو وہ سارے انہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

”ہوں، اب کہو.....“ پر قہوی نے تجلیہ دیکھ کر پوچھا۔
 ”آپ یقین کریں گے یا میں جھگوان کی قسم اٹھا کر یا

میں اپنے آنے کا مقصد تو پر قہوی کو ہی بتاؤں گی۔“
”پھر وہ مجھے پر قہوی کے پاس لے گیا۔ میں نے بھی اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ چند لمحوں تک تو میں بت بنی اس کے سامنے کھڑی رہی پھر اس نے حکیمانہ انداز میں یہاں آنے کا مقصد اور میرے بارے میں پوچھا۔“

”تم نے سب کے سامنے کہہ دیا ہوگا۔۔۔۔۔ سب کچھ۔
ہائے رام! کروادی ہوگی بدنامی۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ۔۔۔۔۔ سب کچھ! نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا جس میں احساس شرمندگی بھی شامل تھا۔

”چھوٹی رانی! کیا تم کرنا کئی کو اس قدر بے وقوف سمجھتی ہو۔ اتنی عقل تو ہے تمہاری اس باندی کو۔ جس گھر کا بھوجن (کھانا) کھاتی ہوں، اس کی بدنامی اور سبکی ہونے دوں گی؟“ کرنا کئی نے بیٹے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ آگے کہو! سب کچھ! نے جلدی سے پوچھا۔
”میں نے جب بتایا کہ میں توج کے را جا ہے چند کے محل کی شہزادی کی ملازمت خاص ہوں تو وہ مارے غصے کے تقریباً اچھل ہی پڑا تھا۔ میں نے اس کے ارد گرد کے مردوں سے تجلیہ چاہا تو اس نے سب کو بھیج دیا۔ پھر میں نے آپ کے من کی ساری باتیں اس پر کھول دیں۔“
”پھر۔۔۔۔۔؟“ سب کچھ! نے لہجے میں سب جلدی سننے کی آرزو محسوس رہی تھی۔

”میری بات سن کر د۔ بہنہ لگا کر ہنسا اور کچھ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ دشمن کے آئین میں محبت اور جاہت کا پھول اک آ یا ہے۔ کیا را جا ہے چند کو اس کا علم ہے اور اس میں اس کی مرضی بھی شامل ہے؟ کہیں لڑکی یہ سازش تو نہیں اور اگر جھوٹ ہو تو؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”مہاراجا! کرنا کئی آپ کی دسترس سے دور تو نہیں۔ کسی وقت بھی دیوچ کر اس کی گردن مار سکتے ہیں۔ رہی بات را جا کی تو را جا تو ایک طرف، محل کے درو دیوار کو بھی اس بات کا علم نہیں۔ ماسوائے اس ناچیز اور شہزادی عالیہ کے۔“ میں نے یقین دہانی کروائی۔

کچھ دیر تک وہ سوچتے رہے پھر فرمانے لگے۔
”میرا اپنی شہزادی کو اس کی جرات اظہار پر سلام کہنا اور بتانا کہ ہم نے اسے سوکار (قبول) کیا۔ ہمیں اس کا انداز پسند آیا۔ ہم یہ وجہ (دعہ) دیتے ہیں کہ ہم ایسی بہادر لڑکی کو اپنے حرم کی زینت بنانا پسند کریں گے۔“
”ایک اور بات!“ میں نے پھر جرات کی۔

ہو گیا تھا کہ آج اس کے ارد گرد کی چھوٹی ریاستوں کے وفود را جا کے پاس تاوان اور تحفے تحائف لے کر آنے والے تھے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ جتنا تھا کہ وہ را جا ہے چند کی برتری کو ماننے ہوئے طے شدہ تاوان ادا کر رہے ہیں۔ وہ سلطنتی سے آئی اور دربار میں آگئی حالانکہ اس کا آنے کو من نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ ان امور کی نگرانی کرتی رہی۔ جب تھک کر آئی تو اپنے کمرے میں آگئی۔ ابھی وہ ذرا کمر سیدھی نہ کر پائی تھی کہ کرنا کئی مسکراتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کہاں مگر کئی تھی۔۔۔۔۔ کہاں وہ کئی تھی؟ پتا ہے، میری جان سولی پر لگی ہوئی تھی۔“ سب کچھ! نے جلدی سے اٹھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

”دمرجن چھوٹی رانی! بتاتی ہوں۔۔۔۔۔ سب بتاتی ہوں۔“ کرنا کئی نے سکون سے کہا۔ تو سب کچھ! نے اس کو چھوڑ دیا اور آرام سے اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ کچھ دیر وہ کئی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

”ہوں!“ تب تک کرنا کئی بھی سانس لے چکی تھی۔
”چھوٹی رانی! پر قہوی آپ کی سوچوں سے بھی زیادہ شہسب، بہادر اور خوب صورت ہے۔ یہ اونچا لقا، آدھوں میں چمکتی ہوئی ذہانت کی روشنی۔۔۔۔۔ میں یوں سمجھ لیں کہ اس کے متعلق جتنے بھی لوگ باتیں کرتے ہیں، وہ ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔“ کرنا کئی مزے لے لے کر بتا رہی تھی جبکہ سب کچھ! چاہتی تھی کہ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دے۔ وہ اکتا کر بولی۔

”آگے بتاؤ۔ کیا ہوا تہارے ساتھ؟“

”چھوٹی رانی! ہوتا کیا تھا، میں دل میں ہزاروں دوسرے، خوف اور ڈر لے کر ان کی حدود میں پہنچی۔ گرتے پڑتے محل تک پہنچی تو ایک سپاہی نے مجھے روک کر پوچھا۔
”اے لڑکی! کیوں گھوم رہی ہے محل کے ارد گرد؟“
”ملنا چاہتی ہوں پر قہوی مہاراج سے۔“ میں نے نوٹے سے جواب دیا۔

”کیوں ملنا چاہتی ہو؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔
”تم مجھے وہاں تک پہنچا سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بہرا راستہ چھوڑو اور اور مجھے جانے دو!“ میں نے اسی انداز میں کہا۔

”جب تک تم بتاؤ گی نہیں، میں جانے نہیں دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے تم خود وہاں تک لے جاؤ۔“

نے اب پیغام لانے والی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنے حرم کی زینت بنا کے رہے گا تو اب راجا کے وعدے کو ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ اسے ہر حال میں اپنی بات کا پالن (پورا) کرنا ہوتا۔ وہ جب جب اس بات کو سوچتا، اس کے سیاسی خدشات خود بخود دمرتے چلے گئے اور ان پر سبکتا کی محبت قبضہ جاتی چلی گئی۔

کرناٹکی، سبکتا کے پیغام لے کر پرتھوی کے پاس آتی جاتی رہی اور دونوں کی محبت پر دان چڑھتی گئی۔ ان ہی دنوں پرتھوی اور کرناٹکی کی ملاقاتوں کی افواہیں بھی اڑنے لگیں۔

”دشن ریاست کے راجا نے اس راج دھانی پر قبضہ کرنے کو یہ ایک نیا اور دلفریب منصوبہ بنایا ہے..... تم کوئی نہ کہنا۔“ لڑکی تو اس قدر خوب صورت نہیں، اس سے ہزار درجہ بہتر لڑکیاں راجا کے حرم میں داخل ہو سکتی ہیں پھر یہی لڑکی کیوں؟ دوسرے نے جواب دیا۔

باتیں تھیں جو آہستہ آہستہ جوان ہو رہی تھیں۔ پھر اس کی سن کن پرتھوی کو بھی ہو گئی تو اسے اپنے رویتے پر بے حد شرمندگی ہوئی لیکن سبکتا سے محبت اتنی دیر میں اس کی سوچوں پر پوری طرح قابض ہو چکی تھی۔ اس رات وہ بڑی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے اس کا حل بھی نکال ہی لیا۔ وہ ایک بار سبکتا سے ضرور ملے گا تاکہ اسے اس کی محبت کا نہ صرف اندازہ ہو جائے بلکہ وہ آنے والے دنوں کے لیے کوئی ناجائز عمل بھی اختیار کر سکیں۔ اس روز کرناٹکی سبکتا کا پیغام لے کر پرتھوی کے مہمان خانے میں بیٹھی تھی۔ پرتھوی اٹھی کل میں ہی تھا۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد وہ مہمان خانے میں آیا تو کرناٹکی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”دشن بھاگ۔“ کرناٹکی سلام کرتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کھوں کورت چکے دینے والی تمہاری شہزادی کیسے ہیں؟“ پرتھوی نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”بھگوان کی کرپا ہے۔“ کرناٹکی نے مودبانہ انداز

میں جواب دیا۔ ”آج پھر وہی خواہش اور وہی تمنا ہے کہ میں حاضر ہوئی ہوں۔ شہزادی سبکتا آپ کے درشن کی تمنا کی ہے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری کر دیں تو ان کا کہنا ہے کہ وہ بھی خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی جانے لگیں گی۔“
 ”دیکھ کرناٹکی! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر

فضول کاموں میں اسے ضائع کرتے پھریں۔ یہ محبت اور ہر عشق وغیرہ کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ وہ تو ان کی چاہت

”کہو.....!“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”شہزادی درشن کی خواہش بھی رکھتی ہیں۔“ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

”ہوں..... ان کی یہ خواہش بھی جلد پوری کر دیں مگر تھوڑا وقت لگے گا۔ تم آتی جانی رہنا اور اپنی شہزادی کے من کی کٹھا کھولتی رہنا۔ بہت جلد ہم تمہیں اگلا عندیہ بھی دے دیں گے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے نہ صرف مجھے اجازت دے دی بلکہ آپ کی محبت کو بھی سید قبولیت عطا کر دی۔“

”کرناٹکی..... کرناٹکی.....“ سبکتا نے کرناٹکی کو دونوں کان دھوں سے پکڑ کر جذبات میں آتے ہوئے گھما نا شروع کر دیا اور پھر گلے سے لگا لیا۔

”کرناٹکی! آج میں خوشی سے نہال ہوئی جا رہی ہوں۔ اب کم از کم مجھے یہ گھڑ تو نہ رہے گا کہ میری محبت، میری چاہت یک طرفہ تھی۔ ایک شخص اور ایک پیاس کی طرح تھی جو صرف میرے ہی ہونٹوں کی سکری بنی ہوئی تھی۔ اب اگر چاہت کی چنگاریاں میری سوچوں کو جلا لیں گی تو پرتھوی بھی اس آگ میں جلے گا۔ اب میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ اپنی محبت کو حتی طور پر عملی جامہ پہنا سکوں۔“

☆☆☆

کتنا عجیب لگتا ہے کہ ایک راجا محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس سے ملنے کے لیے جائے۔ وہ دور ریاستوں کا یکہ و تنہا مالک تھا۔ دہلی اور اجیر دونوں ریاستیں اس وقت شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاستیں تصور ہوتی تھیں جن پر قابض ہونے کے لیے ہر راجا اور حملہ آور جتن کر رہا تھا۔ اس کا راجا ایک لڑکی کے حصول کے لیے مارا مارا پھرے۔ جب سے کرناٹکی اسے مل کر اور اسے سبکتا کے دل کا حال بتا کر گئی تھی، وہ انہی سوچوں میں جھلتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ صرف اور صرف قہوج کے راجا جے چند کی کوئی سیاسی چال ہو۔ دوسری سوچ نے سراٹھایا۔ یہ ممکن ہے کیونکہ جے چند اس کا دشمن ہے اور دشمن ان ہولی بات کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس نے اس پہانے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا پروگرام بنایا ہو۔ ورنہ ایک لڑکی اور وہ بھی قہوج کی شہزادی میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی کہ وہ بلا خوف و خطر اس سے محبت کرنے کا اعتراف کرے جس کو اس نے بھی دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جب وہ سبکتا کی جرأت اظہار اور بے باکی کو دیکھتا تو اسے اپنی اس سوچ پر شرمندگی ہوتی۔ بہر حال اس

سے ان خبروں کو سن رہا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ بھیم دیو نے دوبارہ صل کے لیے اپنے آدمیوں کو دلی روانہ کر دیا ہے تو بڑے غصے سے اس کے منہ سے نکلا۔

”بزدل کہیں کا..... ایک چھوٹے سے چھوڑ کرے کا سامنا کرنے سے ڈرتا ہے۔ ویسے بہت بہادر بنا پھرتا ہے۔“

سجھتا بھی اپنے باپ کے برابر بیٹھی اس کی بات سن کر ہنس دی تھی۔

”بتا جی! آپ کو اس کی فکر کیوں لگ رہی ہے۔“ اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔

”بہادروں کو ہر جگہ بہادری دکھانا چاہیے۔ اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو تخت و راج کسی بہتر کے لیے چھوڑ کر خود اگل ہو جانا چاہیے۔“ بے چند نے غصے سے جواب دیا۔

”میں نے بھی کوشش کی تھی کہ اس ڈرپوک اور بزدل آدمی سے کجرات کی فرماں روا کی جہین لوں مگر پرتھوی کے آڑے آنے سے میں نے اپنا ارادہ ترک کر ڈالا مگر نہ آج یہ بھی ہماری سلطنت کا حصہ ہوتا۔“

ایسی خبریں سن کر سچھتا کا سن اندر ہی اندر سے ڈوبنے لگا تھا۔ تو کیا اب پرتھوی کجرات کی طرف جانے کے لیے نہیں آئے گا؟ اگر ایسا ہو گیا تو ان کی ملاقات کا کیا ہوگا؟ بڑی مشکلوں سے پرتھوی اس ملاقات پر رضامند ہوا تھا۔ یہ خبر اس کے لیے جی بن کر گری تھی۔ وہ فوراً دربار سے اٹھ کر اپنے محل میں آئی اور آتے ہی ایک بار پھر کرناٹکی کو بلا لیا۔ ”کچھ سنا تم نے..... کجرات کے راجانے ڈر کے مارے اپنے چند آدمی زور و جواہرات سے آراستہ کر کے دلی بھجوا دیے ہیں۔“

”کیوں؟“ کرناٹکی نے جراتی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ کہیں پرتھوی کجرات پر چڑھائی نہ کر دے۔ اپنی پیش بندی کے طور پر اپنا وفد دلی بھجوا دیا ہے۔ کرناٹکی! اب ہماری ملاقات کا کیا ہوگا؟“ سچھتا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہ تو بہت بری خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ کجرات جاتے ہوئے ملاقات کریں گے۔“ کرناٹکی نے جواب دیا۔

”تم اس طرح کرو، ایک بار پھر دلی جا کر ان سے ملو اور کوئی نیا طریق کار وضع کر کے آؤ۔ میرا جی بہت پریشان ہو رہا ہے۔“ سچھتا نے جلدی سے کہا۔

”مگر شہزادی صاحبہ! میرا روز روز محل سے یوں

دیکھتے ہوئے ہم نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ ہمیں تو ریاست کے حقدوں سے چھکارا نہیں ملتا۔“

”مگر شہزادہ عالم! آپ نے اس ناچیز سے وعدہ فرمایا تھا۔“ کرناٹکی نے پرتھوی کی بات کاٹی۔

”ہاں، ہمیں یاد ہے اور ہم اس پر قائم بھی ہیں۔“ پرتھوی نے جواب دیا۔

”مگر صرف ایک بار ہماری التجا کو قبول کرتے ہوئے شہزادی کو اپنے درشن کروا دیں تو ان کی زندگی آسان ہو جائے گی۔ یقین کریں، ان کا ترہنا ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔“

”اچھا کرناٹکی! تم مجبور کرتی ہو تو کوشش کر کے دیکھیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم کجرات جانے والے ہیں۔ وہاں کے راجا بھیم دیو کے متعلق پتا چلا ہے کہ وہ دوبارہ سے سر

افغانے کی کوششوں میں ہے۔ راستے میں رک کر آپ کی شہزادی سے ملاقات کر لیں گے۔ بتا دینا انہیں۔“ پرتھوی نے سکون سے کہا۔

”مگر یہ کب ہوگا؟“ کرناٹکی نے سوال کیا۔

”جب ارادہ ہوگا تو اور گرد کی تمام ریاستوں کو خود بخود مل ہو جائے گا۔ جنگ اور محبت چھپانے نہیں چھپتی۔“

پرتھوی نے غصے سے جواب دیا۔

”خواہش کو اجازت دینے کا شکریہ۔ میں جا کے شہزادی کو یہ خوشخبری دیتی ہوں۔“

”مجھے اور میری سپاہ کو آج بھی خدشہ ہے کہ کہیں یہ مہم جہارا راجا بے چند کا منصوبہ نہ ہو..... ہمیں بچانے کا۔“

”لیونکہ ہم اس کی خصلت سے واقف ہیں۔“ پرتھوی نے اپنے خدشے کا ایک بار پھر اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں شہزادہ عالم۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ راجا کو ہماری ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ صرف میرے اور لہزادی صاحبہ کے درمیان کی باتیں ہیں جن سے محل کا کوئی اور واقف نہیں۔“

”مجھے اجازت دیں۔ ہم آپ کے بڑی لذت سے منتظر رہیں گے۔“

آہستہ آہستہ چاروں طرف یہ خبریں گردش کرنے لگیں کہ کجرات کے راجا بھیم دیو نے دلی کو لگانا دینے کا ارادہ کر دیا ہے اور عقیب پرتھوی اس پر یورش کرنے

آہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ خبر بڑی تیزی سے اٹھی کہ ہم دیو نے اپنے کچھ آدمی دلی میں تجدید وفا کے لیے

اجواہرات دے کر بیٹھے ہیں۔ اس روز قوتج کے راجا ہند کے دربار میں بھی یہ خبر پہنچی۔ درباری اس بارے

چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ راجا اپنی مسند پر بیٹھا چینی

اچانک غائب ہونا کہیں کوئی نئی قیامت نہ ڈھا دے۔“
کرنا بھی نے جواب دیا۔

”یہ میں سنجال لوں گی۔ بس تم جلدی سے جانے کی تیاری کرو اور فوراً واپس آنے کی کوشش کرنا۔ مجھ سے یہ لمحات کاٹ نہیں سکتے۔“

”ہے بھگوان! اگر تم نے یہ ملاقات کرانی تھی تو پھر راستے کی یہ رکاوٹیں بھی دور کر دیتا۔ تو اسے میری بے مبری جان یا بے چینی..... میں بچتی کرتی ہوں تو اس مشکل کو دور کر دے۔“ اس نے بھگوان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا کرتے ہوئے کہا اور پھر بے چینی سے کمرے میں گھومنے لگی۔

☆☆☆

پورے چاند رات کی رات تھی وہ، جب کرنا بھی اور سنجکتا بیسیں بدل کر محل سے باہر نکلیں اور دلی سے توج آنے والے راستے کی طرف گھوڑوں پر سوار جانے لگی تھیں۔
”تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے آج ہی کے دن آنے کو کہا تھا؟“ سنجکتا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ہاں ہاں چھوٹی رانی بالکل آج ہی کے دن کا کہا تھا۔“
چٹیل اور سامیں سامیں کرتا میدان پورے چاند کی چاندنی میں اور بھی عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ گھر سے گھر دور دور کھڑے درختوں کے سائے زمین پر کسی ماورائی مخلوق کی طرح چھوٹے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر سنجکتا نے ذرا خوفزدہ لہجے میں کرنا بھی سے پوچھا۔

”جہیں کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا؟ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔“

”ارے نہیں شہزادی صاحبہ! یہ صرف آپ کا وہم ہے۔ ہم اکیلے ہیں، اس وقت ہمارے ساتھ اور کون ہو سکتا ہے۔“ کرنا بھی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ذرا غور سے سنو۔ بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں کہیں دور سے سنائی دے رہی ہیں۔“ سنجکتا اسی خوف سے بولی۔

”ہاں شہزادی صاحبہ! ہوا کے دوش پر اڑتی دور سے آتی ٹاپوں کی آوازیں بھی مدھم مدھم اور کبھی تیز اب مجھے بھی سنائی دینے لگی ہیں۔“ کرنا بھی کی آواز میں بھی اب خوف کا عنصر ظاہر ہونے لگا تھا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پرتھوی کے گھوڑوں کی آوازیں ہوں۔“ تھوڑے توقف کے بعد کرنا بھی نے کہا۔
”یہ دل کمینہ بھی بہت ہی نڈر ہو جاتا ہے محبت میں۔“

اب اگر اس کے علاوہ کوئی مجھے اپنی پوری ریاست بھی دے دے تو میں اس وقت بھی گل سے نہ نکلوں مگر آج دیکھ لو۔ ہم کتنے نڈر ہو کر باہر نکل آئے ہیں۔ ہمیں نہ تو اپنے بڑوں کا خوف لاحق ہے اور نہ ہی تنہائی میں کوئی اور خوف۔“ سنجکتا نے دھیرے دھیرے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں شہزادی عالیہ۔“

”سنو۔ ذرا غور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اب نزدیک سے آنے لگی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں ادھر ادھر ہو جانا چاہیے۔ راستہ چھوڑ کر..... کہیں اترائی میں..... یا درختوں کے پیچھے ہو جانا چاہیے۔ اگر پرتھوی نہ بھی ہوئے تو ہمیں خطرہ نہ ہوگا اور اگر پرتھوی ہوئے تو ہم نکل کر ان کے سامنے آ جا سکیں گے۔“ سنجکتا نے تجویز پیش کی۔

”آپ کی تجویز درست ہے۔ اب تو اس تنہائی میں مجھے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ ادھر دو تین درخت اکٹھے ہیں اور ان کے تہے بھی کچھ چوڑے محسوس ہوئے ہیں۔ ان کے پیچھے خود کو چھپایا جا سکتا ہے۔ آئیے ادھر چلے ہیں۔“ کرنا بھی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر دونوں جلدی سے اپنے گھوڑوں کو لے کر ان درختوں کا اوٹ میں جا کھڑی ہوئیں۔

آنے والے گھوڑے بھی تعداد میں دو تھے اور ان کے چہرے ڈھانٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے سائے آ کر انہوں نے گھوڑوں کی باکیں بچھنے لگیں۔ گھوڑے د ٹکالنے کو ڈار کے تودہ دونوں ادھر ادھر میدان میں جا روا طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔ کچھ د ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے چہرے سے ڈھانٹا اتار کر کرنا بھی کی جیسے جی ہی نکل گئی ہو۔

”پرتھوی..... وہ پرتھوی ہے چھوٹی رانی۔“ اس۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور فوراً اپنے گھوڑے ان کی طرف گھما دیا۔ اس کو دیکھ کر سنجکتا نے بھی اب گھوڑے کو اس کے پیچھے لگا دیا۔

کرنا بھی پرتھوی کے پاس پہلے جا پہنچی تھی۔ اس۔ بھی اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا تو پرتھوی نے اطمینان سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”تو آپ کتنی ہی ہیں؟“

”ہم تو کتنی ہی ہیں۔“ اس کے انتظار میں تھے۔
رہی شہزادی سنجکتا۔ ”کرنا بھی نے آگے بڑھ کر اس۔ چہرے کا نقاب بھی شوشی سے اتار دیا۔

اسے اپنی ضد نہایت ہوئے جتنا مرضی نقصان اٹھانا پڑے وہ نقصان کر لیتا ہے مگر ضد نہیں چھوڑتا۔

”کئی بار میرے من میں بھی آئی تھی کہ میں ضد کی اس دیوار کو کسی صورت گردوں مگر میری کوشش بیکار رہی۔ بہر حال یہ الگ بات ہے۔ آپ کا ہاتھ ایک راجپوت کے ہاتھ میں ہے اور آپ کو بھی علم ہے کہ راجپوت ہاتھ پکڑ کر بھی چھوڑا نہیں کرتے پھر یہ تو میری محبت کا ہاتھ ہے۔ تم یقین رکھو۔ میں ہر حال میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا اور کسی بھی صورت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے اجیر تو کیا دی کی راج دھانی بھی قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔ میں اپنا قول ضرور نبھاؤں گا اور تم پر کسی قسم کی آج نہ آنے دوں گا۔“ پرتھوی نے جذبات میں آ کر کہا۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔ گلنا ہے، میرے خوابوں کو آج اس کی تعبیر مل گئی ہے اور یہ کہ میرا چننا غلط نہ تھا۔ آج تک صرف اندازوں پر زندگی گزار رہی تھی لیکن آج اس میں آپ کے یقین نے وہ ترم رنگ بھر دیے جن کی میں نے خواہش کی تھی۔“ سنجنا نے اتنا کہہ کر اپنا سر پرتھوی کی چھاتی سے لگا دیا۔

پرتھوی نے آہستہ آہستہ اس کے لیے اور گھنے بالوں میں اگلیاں پھیرتے ہوئے اسے ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ بھی اس کے ساتھ اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی وہ اس کے ساتھ کرتی ہے پھر ٹکے سے انداز میں اس نے سنجنا کا سر اپنی چھاتی سے الگ کرتے ہوئے دوسروں کو آواز دی۔ جب وہ دونوں ان کے نزدیک آگئے تو پرتھوی نے کرناٹکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو کرناٹکی! آج کے بعد تم بھی میرے پاس سنجنا کا پیغام لے کر نہیں آؤ گی۔ تمہارے آنے سے میری سیاہ میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میری محبت کے دامن پر رسوائیوں کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ یہ جاننا بداری ہے۔“ اس نے اپنے ساتھ آنے والے لوجوان کو کندھے سے پکڑ کر سامنے کر کے کہا۔ ”یہ میرا دوست، میرے دربار کا شاعر اور گویا ہے اور اس سلسلے میں میرا ہم راہ بھی ہے۔ یہ کسی نہ کسی طرح تمہارے دربار میں آئے گا اور اسے دربار تک رسائی دلانا تمہارا کام ہے بلکہ ہو سکے تو اسے کل تک جتنی ممکن ہو، رسائی دلوانے کی کوشش کرنا کہ یہ مجھ تک باتیں پہنچا تا رہے۔ اس پر اعتبار کرنا کہ یہ پرتھوی کا خاص آدمی ہے۔ باقی کام یہ خود کر لے گا۔ یہ کسی بھی

وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے اور دونوں ہی مبہوت کھڑے تھے، بت بنے ہوئے۔ ٹھنکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھنے جا رہے تھے۔ چند ثانیے وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پرتھوی کے ساتھ آنے والا دوسرا سوار بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے جھٹکا کو ہوش آ گیا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے پرتھوی کو سلام کیا اور ڈرے ڈرے انداز میں اٹکتے ہوئے بولی۔

”آج ایک عرصے بعد زندگی کی آس پوری ہوئی ہے۔ گلنا تو یہ تھا، شاید اس ادھوری زندگی کی دوسو سو میں گھری ڈوبتی کشتی کو کہیں کنارہ نہ مل سکے گا۔ یونہی ٹھنکی کی حالت میں مرجاؤں گی مگر آج لگ رہا ہے، پوری کائنات اپنی ساری خوب صورتیوں سمیت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہو۔“

”مجھے نہیں علم تھا کہ ظاہری خوب صورتی کے ساتھ ساتھ آپ کی زبان سے اترنے لفظ بھی اسی قدر خوب صورت ہوں گے۔“ پرتھوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان دونوں کو جو گفتگو پا کر کرناٹکی اور دوسرا سوار ایک طرف ڈرامٹ کر دور جا کھڑے ہوئے۔ ”مجھے آپ کے جذبات کا اندازہ کرناٹکی کی باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ کیا واقعی یہ سب آپ کے دل کی باتیں ہوتی ہیں جو کرناٹکی مجھ تک پہنچاتی رہتی ہے؟ کیا آپ میرے بارے میں اس طرح سوچتی ہیں؟“ پرتھوی نے سنجنا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”اس سے کہیں زیادہ۔ یقین کریں، میرے شعور پر جو پہلا حرف جا گا تھا، وہ صرف آپ کے نام کا تھا۔ میرے گھر میں آپ کے جس نام سے نفرت کی جاتی ہے، یہ اتنا ہی چمک دمک کے ساتھ میرے من میں روشن ہے۔ یہ تو آپ کو بھی علم ہے کہ میرے والد راجا جے چند آپ سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ نام تک متنا پسند نہیں کرتے مگر پتا نہیں میرے اندر یہ ضد کہاں سے تبادور ہوئی گئی کہ میں اگر زندگی گزاروں گی تو اسی کے سنگ جو میرے والدین کا جانی دشمن ہے اور یہی ضد آج تک میرے من میں گھر کرتی چلی گئی۔ میں نے اپنے طور پر بڑی کوشش کی کہ دشمنی کی یہ دیوار مگر جانے مگر میرے پتا حتی.....“ وہ بات کرتے کرتے ذرا رک کر پرتھوی بول اٹھا۔

”میں تو کیا، سارے لوگ، ساری ریاستوں کے راجوں کو علم ہے کہ جے سنگھ اپنی ہٹ کاکس قدر پکا ہے۔

طرح تمہارے دربار تک پہنچ جائے گا۔ باقی سنبھلتا! تم کسی قسم کا خیال دل میں مت لانا۔ اب پرتھوی کا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔ اپنی محبت کو میرے لیے زندہ رکھنا۔ اب ہم جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر دونوں نے چلا گئیں لگائیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر انہیں لہڑھ لگا دی۔ کرناٹکی اور سنبھلتا انہیں جاتے بڑی دیر تک دیکھتی رہیں پھر وہ بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس محل میں آ گئیں۔

☆☆☆

اب سنبھلتا کے لیے اور بھی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ چاند باردی نے بھی اپنے مالک کا خوب حق ادا کیا۔ وہ قوتج پہنچا اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کے سبب بہت جلد بے چند کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور الفاظ کی جادوگری کے ساتھ ساتھ سنبھلتا کی خفیہ امداد کے ذریعے راجا بے چند کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ رنگ محل میں بھی اس کی آزادانہ آمد و رفت ہونے لگی تھی جس سے سنبھلتا کو پہلے سے زیادہ آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چاند باردی کے ذریعے پرتھوی راج تک پیغام پہنچانے لگی تھی۔ اگرچہ اس پہلی ملاقات کے بعد اسے دوبارہ ملاقات کا موقع نہ ملا تھا لیکن پھر بھی رنگ محل میں اب ایک خفیہ کنونین بن چکی تھی جس کے تین کوٹے چاند باردی، سنبھلتا اور کرناٹکی تھے۔ ان کی ہی وجہ سے پرتھوی کو اب رنگ محل کی پل پل کی خبریں ملنے لگی تھیں۔

چاند باردی اپنا ہمیش بدل کر جب چاہتا رنگ محل سے غائب ہو جاتا اور پرتھوی کو خبریں پہنچا کر سنبھلتا کے لیے پیغام محبت لے کر واپس آ جاتا اور اس بات کی کسی کو کالوں کا خبر نہ ہوتی۔ چاند باردی خود شاعر تھا۔ وہ ہمرے دربار میں لطائف اور اپنی شاعری سے ماحول کو گرم کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس لیے جلد ہی وہ بے چند کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ امور سلطنت میں بھی چھوٹے موٹے مشورے دینے لگا تھا۔ سنبھلتا خوش تھی کہ اب اس کی محبت اور اس کی چاہت بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی تھی۔

اس دوران بے چند نے اپنے ارد گرد کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر لڑائیوں کے ذریعے یازدو جبر کے ساتھ قبضہ کر لیا تھا۔ کئی ایک نے اپنی راج دھانی بچانے کی خاطر تادان دے کر اپنی ریاست کو بچا لیا تھا اور آئندہ بھی اس کے باج گز ار رہنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ راجا بے چند بہت زیادہ خوش تھا کہ اس کی سلطنت کی حدود اب خاصی پھیل چکی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا کہ پرتھوی پر بھی کسی طرح دباؤ

ڈال کر یا حملہ کر کے اسے شکست سے دوچار کر دے اور اجیر کے ساتھ ساتھ دلی بھی اس کی دسترس میں آ جائے مگر اس کے ساتھیوں اور سپاہ نے اسے اس بات سے روک رکھا تھا۔ دشمنی کی چنگاریاں اس کے من کو دھیرے دھیرے سلگا تو رہی تھیں لیکن وہ اپنے اندر ہمت نہ پارہا تھا۔ پھر بھی وہ پرتھوی کو بچاؤ کھانے کے کسی حربے کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اپنی بے پناہ کامیابیوں کے اظہار کا اب قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس روز اس نے ہمرے دربار میں اپنے مصاحبین اور ساتھیوں کے آگے ایک تجویز رکھی۔ اس وقت سنبھلتا بھی دربار میں موجود تھی۔ بے چند نے موقع غنیمت جانا۔ اس نے ہمرے دربار میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ اعلان کیا۔

”بھگوان کی کرپا سے اب قوتج کی راجدھانی اس قدر طاقت ور ہو چکی ہے کہ کسی دشمن کو اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ اپنے ارد گرد کی تمام ریاستیں یا تو قوتج کی باج گز ار ہو گئی ہیں یا ان پر قبضہ کر کے ہم نے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان کامیابیوں کی دھاک دشمنوں کے دلوں میں بٹھانے کی خاطر ایک شاندار جشن منایا جائے۔ اس جشن کا نام راج سوچ ہوگا۔ آپ لوگوں کو اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

یہ کہہ کر راجا بے چند خاموش ہو گیا تو مصاحبین اور رفقائے خاص میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اس دوران بے چند خوشی سے تھمتاتے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے ان کی گفتگو کو سنتا اور ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

”لیکن پتا ہی! آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے خزانے میں یہ جشن منانے کے لیے اتنی چاندی موجود ہے؟“ سنبھلتا نے سوال کیا۔

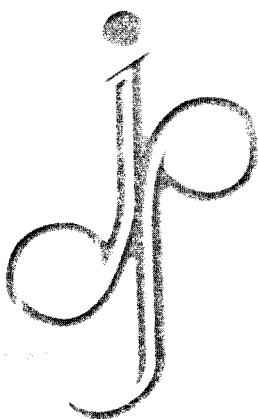
”اس کے متعلق تم بھی جانتی ہو۔ کیا تم امور سلطنت اور دربار کے مسائل سے واقف نہیں ہو؟“ راجا بے چند نے الٹا سنبھلتا سے سوال کر ڈالا۔

”اس بے جا مصارف سے خزانہ کمزور ہو جائے گا۔“ سنبھلتا نے اطمینان سے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ ہم تو عام پرگائے ٹیکسوں اور لگان میں اضافہ کر دیں گے اور پھر جب ہم اس جشن میں اپنی باج گز ار ریاستوں کو مدعو کریں گے تو وہ بھی تو ہمارے لیے نئے تحائف، نقدی یا زرد جواہر کی شکل میں لائیں گے۔ بڑے مصارف تو اس طرح پورے ہو جائیں گے۔“ راجا بے چند

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات



جاسوسی ڈائجسٹ سب سے زیادہ گھمبیر اور سراسر گزشتہ

ماہ کی ایک نئی جگہ ہے جس میں ہر ماہ کی ایک نئی جگہ ہے جس میں ہر ماہ کی ایک نئی جگہ ہے

جس میں ہر ماہ کی ایک نئی جگہ ہے جس میں ہر ماہ کی ایک نئی جگہ ہے



جہاں جہاں اللہ کی رحمت ہے وہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے

63-فیروز ایکسپریس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

تلفون: 35804200 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

نے آہستگی کے ساتھ سنجکتا کو پھینٹے ہوئے بتایا تو سنجکتا خاموش ہو گئی۔ اسے پتا تھا کہ باپ کے ساتھ زیادہ بحث سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔ صرف ان کی ضد پختہ ہوگی، اس لیے وہ بھی خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر اور اسی طرح گزر گئی پھر راجا بے چہرے نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”میرے مصاحبین اور رفقاءے کار کو شاید میری یہ تجویز اچھی نہیں لگی۔ سچی تو فیصلے میں تاخیر ہو رہی ہے۔“

”تجویز بہت اچھی ہے مگر کہیں یہ اس بات کی دلیل تو نہ بن جائے گی کہ ہم اپنے دشمنوں کو بھڑکار رہے ہیں۔ انہیں غصہ دلا رہے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ طاقتور ہیں اور جب چاہیں ان پر بھی حملہ آور ہو سکیں گے۔“ ان میں سے ایک بولا تو بے چند تہقہ مار کر فحش پڑا۔

”خوب..... بہت خوب! ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ ہماری دھاک ہر طرف بیٹھ جائے۔ پھر یہ صرف ہماری سلطنت کا فیصلہ ہے۔ ہر ریاست اپنے معاملات میں آزاد ہے۔ وہ جو چاہے اپنی ریاست میں کرے، کسی کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ بے چہرے نے دلیل پیش کی تو کہنے والا اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔

”کیا اس جشن میں دوسری ریاستوں اور اپنے دوستوں کو بھی مدعو کیا جائے گا؟“ ایک دوسرا اٹھ کر بولا۔

”بالکل..... جشن تو ہوتا ہی دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ ہم اپنے ارد گرد کی ریاستوں کے فرماں رواؤں کو بھی اس جشن میں باقاعدہ دعوت نامے بھجوائیں گے۔“ بے چہرے نے وضاحت کی۔

”پھر یہی راج کو بھی بلائیں گے؟“ کسی اور نے سوال کیا تو پہلی بار سنجکتا نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”بالکل..... جب ہمارے جشن منانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کریں تو پھر کیا دوست کیا دشمن..... ہر کسی کو دعوت نامے بھجوائے جائیں گے۔ اس میں شمولیت کا اختیار ان کے پاس ہے۔ وہ چاہیں تو جشن میں شریک ہوں یا نہ ہوں، ان پر ہمارا اختیار تو نہیں۔ ہمارا کام تو دعوت نامے دے کر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے اور ہر کسی کے ساتھ دوستی کرنے کے خواہش مند ہیں۔“ سنجکتا نے بات ختم کی تو بے چہرے کی آنکھوں میں کچھ اور سوچ کر چمک پیدا ہوئی جو ایک ہی لمحے بعد معدوم ہو گئی اور وہ بولا۔

”ہماری بے تری کی ذہانت کی داد دیں۔ اس نے ایک

اور بھاری دلیل سے مجھے بھی اس بات کا قائل کر لیا کہ ہم اس کی دی ہوئی تجویز کے تحت اس جشن میں شمولیت کی ہر کسی کو دعوت دیں گے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس جشن میں دعوت نامے صرف دوست ریاستوں کے راجاؤں کو بھیجے جائیں گے مگر اب میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ دعوت نامے دور و نزدیک ہر ریاست کے فرماں رواؤں اور شہزادگان کو بھجوائے جائیں گے۔ اس میں شامل ہونا یا نہ ہونے کا اختیار ان کا اپنا ہے۔“ راجا بے چہرے کے اس فیصلے سے سارے مصاحبین خوش ہوئے۔ ”تو پھر آج سے جشن راج سو بج کی تیاریاں ریاست کے طول و عرض میں شروع کر دی جائیں۔ جو نیکی یہ تیاریاں مکمل ہو جائیں تو اس کی اطلاع مابعد دولت کو دی جائے تاکہ جشن کی تاریخ کا باقاعدہ اعلان کیا جاسکے اور دعوت نامے جاری کیے جاسکیں۔“

یہ کہہ کر راجا بے چہرے اپنی مسند سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی سنجکتا بھی اٹھی اور دونوں رنگ محل میں آ گئے۔ ”مجھے یہ کمال کی تجویز دینی۔ بھلا تمہارے ذہن میں کیسے آئی راجا بے چہرے نے چند بہت دنوں کے بعد خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس نے چلتے چلتے سنجکتا سے پوچھا۔

”آخر بیٹی کس باپ کی ہوں۔“ سنجکتا نے مزید حمایت حاصل کرنے کو کہا۔

”یہ تو ہے۔“ راجا بے چہرے نے فس کر کہا۔ ”جب ہم نے اپنی شان و شوکت ہی دکھانی ہے“ پھر کیا دوست، کیا دشمن! اب دیکھنا تو یہ ہے کہ میری اگر تجویز پر کس قدر عملدرآمد ہوتا ہے۔“ سنجکتا نے آخر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

”کیوں نہ ہوگا۔ تم اس ریاست کی شہزادی ہو اور میری چھٹی بیٹی ہو۔ اگر تمہاری خواہش پر عملدرآمد نہ ہوگا اور کس کی بات یہ بوڑھا مانے گا۔ ویسے اس جشن کے حوالے سے ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آئی ہے لیکن ابجہ نہیں۔ یہ بات تمہیں جشن والے دن ہی بتاؤں گا۔ یہ صرف تمہارے بلکہ سب کے لیے حیرانی اور خوشی کی ہوگی یقیناً یہ دیکھ کر تمہاری خوشیاں بھی دوچند ہو جائیں گی۔“

”وہ کیا خوشی ہوگی، ابھی سے نہیں بتائیں گے؟“ سنجکتا نے اپنے والد کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اچک لی۔ ”نہیں۔ وہ اچانک اور حیران کر دینے والی ہوگی ابھی بتاؤں گا تو اس کا مزہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔“ راجا بے چہرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی لیکن ایک بار پھر کہوں گی میر۔“

در بار میں میری کئی ہوئی بات کی لاج ضرور رکھیے گا!“
سجکتا نے کہا اور رنگ گل میں اپنے کمرے کی جانب
چلی گئی۔

☆☆☆

سجکتا اور بے چہ کے دل کا چور الگ الگ تھا مگر
دونوں کا محور صرف ایک ہی ذات تھی اور وہ ذات پر تقویٰ کی
تھی۔ پر تقویٰ راج چوہان والی اجیر اور دی۔

سجکتا کے دل میں یہ بات تھی کہ ایک عرصے کے بعد
وہ دونوں ایک بار پھر مل پائیں گے۔ راز و نیاز کی باتیں
ہوں گی۔ دل کے مجید ایک دوسرے پر آشکار کریں گے۔
محبت دل کے پالنے میں پڑے بچے کی طرح ہوتی ہے جو
اپنی من مانی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے اور ریں
رہیں کرتی رہتی ہے، جب تک اس کے من کو تسلی نہیں
ہو جاتی۔ ایک عرصے تک سجکتا اکیلی ہی محبت کی اس آگ
میں جلتی رہی۔ اس وقت وہ ہمیشہ گوگو کی حالت میں رہی تھی
کہ پتا نہیں اس کی محبت اور جاہت کی یہ آتش پر تقویٰ کے
من میں بھی سلتی ہے یا نہیں مگر اب ان کی ملاقات کے بعد
سے یہ آتش دو چند ہو چکی تھی۔ دونوں اطراف کے دل ایک
دوسرے کے نام پر دھڑکنے لگے تھے۔ ایسے میں ہراس
لے کے بھر پور طریقے سے استقبال کرنے کی آرزو جلتی رہتی
تھی جس میں ملاقات کا کوئی لمحہ ہی بھرا جائے۔

سجکتا نے دھڑکنے والے دل کے ساتھ اس روز بھرے
در بار میں یہ تجویز تو پیش کر دی تھی کہ جشن میں شرکت کا
دعوت نامہ پر تقویٰ کو بھی بھجوایا جائے۔ اس کے چہرے نظر
جہاں پر تقویٰ سے ملاقات ہونے کا امکان تھا، وہاں وہ یہ بھی
چاہتی تھی کہ شاید اس طرح کرنے سے دشمنی ختم ہو جائے۔
گو کہ اس کا امکان بہت کم تھا پھر بھی ایک کوشش تو تھی..... کر
گزرنے میں کیا قیامت تھی۔

بڑی دیر تک وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اس نے تجویز تو
دے ڈالی، اب اگر اس پر عملدرآمد نہ ہوا تو..... کیونکہ اسے
اپنے والد کی طبیعت کا علم تھا۔ وہ کسی وقت بھی اپنا ارادہ
تبدیل کر سکتا تھا لیکن پر تقویٰ کی عادت سے بھی وہ واقف
ہو چکی تھی۔ اگر اس نے آنے سے انکار کر ڈالا تو کیا اس کی
امیدیں اور کوششیں بیکار تو نہیں چلی جائیں گی؟ اب اس نئی
سوچ نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

دوسری طرف بے چہ اپنے من ہی من میں خوش
ہو رہا تھا کہ اس بھانے وہ پر تقویٰ پر اپنا رعب داب بجانے
میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے کم از کم اس بات کا احساس

تو ہو جائے گا کہ بے چہ بھی اب اس کی فکر کا حکمران بن
چکا ہے۔ وہ اگر اجیر اور دی جتنی بڑی ریاستوں پر حکمرانی
نہیں کرتا تو قوت و فہم اپنی فہم و فراست اور جنگی حکمت عملی
سے اس قدر وسعت تو دے چکا ہے۔ وہ اب ہر طرح سے
اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس نے سجکتا کی تجویز کو بھی صرف
اسی لیے قبول کیا تھا کہ اس بھانے وہ پر تقویٰ کو نچا دکھانے
میں کامیاب ہو جائے گا لیکن ایک بات رہ رہ کر اس کے
ذہن میں آ رہی تھی۔ اگر پر تقویٰ نے آنے سے انکار کر دیا
تو اس طرح اس کی بسکی ہو جائے گی پھر اچانک اس کے
ذہن میں ایک ترکیب آئی جسے سوچ کر وہ بے حد خوش
ہو گیا۔ وہ کتنے دنوں تک اپنی اس ترکیب کو من ہی من میں
عملی جامہ پہنا تا رہا۔

ریاست کے طول و عرض میں جشن راج سو بک کی
تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ دعویٰ کارڈ بھی بن چکے
تھے اور جشن کی مقررہ تاریخ کا اعلان بھی کیا جا چکا تھا لیکن
ابھی تک دعوت ناموں کو سجکتا نے نہیں دیکھا تھا جس میں یہ
 واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ جشن کے آخری روز قوت و فہم
شہزادی سجکتا کا سونہر ہوگا۔ ارد گرد کے ریاستی شہزادگان
خاص طور پر اس تقریب کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔

سونہر میں شہزادی اپنے ہاتھوں میں مہکتے اور کھلے
پھولوں کی خوب صورت مالا لے کر تمام قطار میں کھڑے
شہزادگان اور امیدواروں کے آگے سے گزرتی تھی۔ وہ
جس کو چاہتی یا جسے پسند کرتی پھولوں کی یہ مالا اس کے گلے
میں ڈال دیتی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کو شہزادی
نے پسند کر لیا ہے اور آئندہ وہی اس کا شوہر ہوگا۔ ہندوؤں
میں یہ روایت کب سے چلی آ رہی تھی۔ اس روایت کو معتبر
اور تبرک سمجھ کر نبھایا جاتا تھا۔

سجکتا تو دعوت نامے کے مندرجات کے بارے میں
کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ جب یہ دعوت نامے بھجوائے جا رہے
تھے تو کرناٹکی بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ اس کی
سائنس اس طرح پھولی ہوئی تھی کہ گویا وہ بہت دور سے بھاگتے
ہوئے آ رہی ہو۔

”خیریت ہے کرناٹکی جو یوں بدحواس ہو رہی ہو۔“
سجکتا نے پوچھا۔

”ہاں شہزادی صاحبہ! میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ خوش
خبری کسی اور ویلے سے آپ تک پہنچے اور انعام و اکرام کی
حق دار وہی بن جائے۔“ کرناٹکی نے سائنس بحال ہونے
پر کہا۔

اختتام پر سوئمبر چایا جانے کا تو اسے اپنے وعدے کے مطابق جشن میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ بہر حال اسے اپنے طور پر ایک بار پھر اسے مطلع کرنا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے کرناٹکی کو مشورے کے لیے بلوایا۔

”تمہاری بات ٹھیک نکلے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پرتھوی کو کس طرح رضامند کیا جائے کہ وہ اس جشن میں اپنی شرکت کو یقینی بنائے؟ ورنہ یہ سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ پرتھوی کے بغیر تمہاری یہ سیکلی، تمہاری شہزادی مرجائے گی کرناٹکی..... مرجائے گی۔“ سنجکتا اس کے سامنے پھوٹ پڑی۔

”بھگوان نہ کرے۔ آپ فکر مت کریں۔ میں ابھی چاند بارودی کو بلواتی ہوں اور آپ کی درخواست ایک بار پھر پرتھوی کو بھجواتی ہوں بلکہ میں اسے لاتی ہوں۔ آپ خود اس سے کہیں کہ وہ جا کر پرتھوی کو آپ کی خواہش کے بارے میں بتا کر اس کے یہاں آنے کو یقینی بنائے۔“ کرناٹکی نے کہا اور محل سے چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد چاند بارودی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم فوراً پرتھوی کے پاس جاؤ اور اسے اپنی زبانی سارے حالات کی خبر دو۔ اسے بتاؤ جشن راج سوہج کے آخری روز سنجکتا کو سوئمبر چایا جائے گا۔ اس لیے اس موقع پر اس کا دربار میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو یہ میرا آخری دن ہوگا اور میرا جنازہ اٹھے گا سوئمبر نہیں ہوگا۔ فوراً جا کر اس کی تصدیق کر کے آؤ کہ اس کا کیا ارادہ ہے اور اس کے جواب سے مجھے مطلع کرو۔“ سنجکتا نے سمجھاتے ہوئے اسے روانہ ہونے کا کہا۔

”جیسا آپ کا حکم شہزادی صاحبہ۔ میں ابھی جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر چاند بارودی رنگ محل سے نکل گیا اور سنجکتا ایک بار پھر بڑی دیر کے بعد انہی دوسووں میں گھر گئی کہ اگر پرتھوی نے آنے سے انکار کر دیا تو پھر اس کا کیا لائحہ عمل ہوگا۔ کیا وہ اپنا وعدہ نبھائے گا؟

☆☆☆

دربار مصاحبین، حقائق سپاہیوں اور ساتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پرتھوی راج اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا اور سلطنت کے اہم امور پر گفتگو ہو رہی تھی جب ایک درباری نے اٹھ کر پرتھوی کی توجہ مبذول کروائی۔

”شہزادہ عالم! توجہ کی ریاست کے راجا بچہ چندا ایک ہرکارہ دربار میں حاضری کی تمنا لیے آیا بیٹھا ہے۔“

”اسے دربار میں حاضری کی اجازت ہے۔“

”کوئی خوشخبری۔ کیا پرتھوی نے جشن کی تقریبات میں آنے کی ہائی بھری ہے؟“ سنجکتا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”نہیں چھوٹی رانی۔ ریاستوں کے راجاؤں اور شہزادگان کو جو دعوت نامے بھجوائے جا رہے ہیں، اس میں یہ بات بڑی وضاحت سے لکھی گئی ہے کہ جشن کے اختتام پر آپ کے ہاتھوں سوئمبر چایا جائے گا۔“ کرناٹکی نے بتایا۔

”کیا..... کیا کیا کام ہے؟ کس نے بتایا ہے تمہیں؟“ سنجکتا نے بولائے ہوئے کچھ میں پوچھا۔

”تو، یہ تو دعوت نامے میں درج ایک خاص تقریب ہے۔“

”اچھا۔ ابھی پوچھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر سنجکتا غصے میں پیر پٹتی ہوئی رنگ محل کے کمرائے خاص میں اپنی والدہ کے پاس چلی گئی۔

”یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ کس نے میری زندگی کا فیصلہ میرے پوچھے بغیر کرنے کا اختیار دیا ہے۔“ وہ غصے میں پھر کر بولی۔

”کیا بات ہے..... کونسا فیصلہ؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔“ مہارانی نے دلار سے پوچھا۔

”جشن منانا بجا..... جنگ کرنا آپ کی عادت۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سنجکتا سے پوچھے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا جائے۔ میرا سوئمبر چانے کا فیصلہ کس کا ہے؟“ سنجکتا اسی غصے میں بولی۔

”یہ پرتھویوں سے ہوتا آیا ہے۔ لڑکیاں جب بیاہ کی عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو ان کی شادیوں کا فیصلہ ان کے والدین ہی کرتے ہیں اور ریاستوں کی شہزادیوں کا اسی طرح سوئمبر چایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ شہزادی اپنی پسند کے دلہا کا خود سے فیصلہ کر لے۔ اگر یہ ہو رہا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ مہارانی نے بڑے اطمینان سے سمجھا یا۔

”مگر اس کے لیے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اگر عین موقع پر آ کر میں سوئمبر چانے سے انکار کر دوں تو۔“ سنجکتا نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”کیوں اپنے والد کی پیاسی تلوار کو دعوت دیتی ہو۔ تمہارا انکار تمہاری موت کی صورت میں ہوگا۔ اپنے باپ کی ضد جانتی ہو۔“ مہارانی بولی۔

اپنی والدہ کی بات سن کر سنجکتا غصے سے ہمراہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اسی غصے میں ہمراہی کمرے میں ادھر ادھر گھومتی سوچتی رہی۔ آخر یہ دعوت نامہ پرتھوی کو بھی تو مل گیا ہوگا۔ اسے بھی پتا چل گیا ہوگا کہ سنجکتا کا اس جشن کے

مہاراج کو شرکت نہیں کرنا چاہیے۔“
ان کی باتوں میں کافی وزن تھا جنہیں سن کر پرتھوی نے جذبات میں آ کر فیصلہ کر لیا کہ وہ قنوج میں ہونے والے جشن میں شریک نہ ہوگا۔ دربار پر خواست کر دیا گیا۔ پرتھوی بھی اٹھ کر اپنے گل میں آ گیا مگر اب وہ ایک اور جیسے میں پھنس چکا تھا۔

ادھر سنجکا کا پیغام لے کر چاند بارودی بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے پرتھوی کو تمام صورت حال سے باخبر کیا اور ساتھ ہی شہزادی کے اصرار کے بارے میں بتایا کہ پرتھوی کو ہر حال میں جشن کی تقریبات میں حصہ لینا ہوگا۔ اگر وہ ان تقریبات میں حصہ نہیں بھی لیتا تو کم از کم اسے اس وقت وہاں ضرور حاضر ہونا چاہیے جب سوئیکر کی رسم ادا ہو رہی ہو۔

اس کے لیے دونوں فیصلے اہم تھے مگر ان میں سے صرف ایک پر ہی عملدرآمد ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی مسئلہ اپنے دوست اور ہمزاد چاند بارودی کے سامنے رکھا تو وہ بھی اس کی طرح سوچوں میں پڑ گیا۔

”لیکن مہاراج شاید آپ بھول گئے ہیں۔ آپ نے شہزادی کو دھوکا نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ آپ نے ان کا ساتھ ہر حال میں دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے اور یہ راجدھانی خون و مکمل دونوں کے متصادم ہے۔ اس لیے آپ جشن میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر شہزادی سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ میرا آپ کو یہی مشورہ ہے۔“

”ہوں..... وقت آنے دو، کچھ سوچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر پرتھوی نے جان تو چھڑا لی مگر اس کی نگاہوں میں بار بار سنجکا کا مصوم اور پیار بھرا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ شہزادی کے ساتھ کیے گئے قول و قرار اسے کبھی کل چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

دوسری طرف قنوج کے راجا جے چند کو جب پرتھوی کا اہانت آمیز جواب ملا تو وہ بھڑک گیا۔ اس نے فوراً اپنے درباریوں اور مصاحبین کو بلایا اور نئی صورت حال سے مطلع کیا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ پرتھوی بڑی آسانی سے جشن میں شمولیت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کی اب تک پرتھوی سے کوئی براہ راست جنگ نہ ہوئی تھی مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ پرتھوی کو نچا دکھائے۔ راج سوچ کا جشن ایک بہترین موقع تھا کیونکہ اس جشن میں پرتھوی کی شرکت کا مطلب تھا کہ گویا اس نے جے چند کی برتری کو بغیر جنگ کے تسلیم کر لیا۔ جے چند کے اقتدار کو مان کر وہ جنگست خوردہ قرار پاتا لیکن اس کے اہانت آمیز رویے اور یکسر انکار نے معاملہ ہی الٹ

دہ درباری اٹھا اور اس نے ایک دوسرے خدمت گار کو اشارہ کیا۔ وہ دربار سے باہر گیا اور چند لمحوں بعد ایک شخص کو ساتھ لے کر دربار میں آ گیا۔ آنے والے نے سلام کرنے کے بعد قنوج کے راجا کا خط پرتھوی کو پیش کر دیا۔ پرتھوی نے خط کے مندرجات پڑھنے کی اجازت دی جس میں درج تھا۔

”میں قنوج کا راجا اپنی راج دھانی میں منائے جانے والے جشن راج سوچک میں آپ کو شرکت کی دعوت دیتا ہوں جو میری رعایا کی پرزور خواہش پر مانیا جا رہا ہے اور اس جشن کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی آخری تقریب میں شہزادی سنجکا کا سوئیکر بھی رچایا جائے گا۔ آپ سے شمولیت کی درخواست ہے!“

”ہوں.....“ دعوت نامے کے مندرجات سن کر پرتھوی نے ایک لمبی سی ہچکچاہٹ بھری۔

”تو اس بڑھے کو جا کر کہو کہ ابھی تکوار اپنی میمان میں ہی رکھے۔ اس طرح کے فریب میں پرتھوی آنے سے رہا۔ بہر حال تم جاؤ اور میرا یہ پیغام اسے پہنچا دو۔ پھر بھی ہم مشورہ کریں گے۔ اپنے مصاحبوں سے، اپنی سپاہ سے کہ ان کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے۔ یہ بات بہر حال طے ہے کہ دشمنوں کے دوستی کے لیے بڑھائے جانے والے ہاتھ میں بھی کوئی نہ کوئی فریب ہوتا ہے۔ لہذا ہمارے پہلے فیصلے ہی کو آخری جانا جائے۔“ یہ کہہ کر پرتھوی نے دربار پر خواست کر دیا اور پیغام لانے والے کو رخصت کر دیا گیا۔

اس سے اگلے روز اس بات پر سوچنے کے لیے دوبارہ دربار سجایا گیا۔ قنوج کے راجا کا پیغام سب کے سامنے تھا جس پر سب اپنے اپنے انداز میں تنقید کر رہے تھے۔

”اتنی دشمنی کے بعد قنوج کے راجا کا جشن میں شمولیت کا دعوت نامہ کسی فریب اور دھوکے کا پیش خیمہ نہ ہوگا۔ ایک درباری نے بات شروع کی۔

”ہمارے راجا کا مرتبہ جے چند سے زیادہ بلند ہے۔ لہذا اگر مہاراج، راج سوچک میں شرکت کے لیے جاتے ہیں تو اس کا مطلب راجا جے چند کی بالادستی، حکمرانی اور برتری کو تسلیم کرنا ہوگا جبکہ مہاراج، قنوج کے راجا سے نہیں بلند مرتبہ اور اعلیٰ منصب راجدھت ہیں۔ اس لیے جے چند کو چاہیے کہ بجائے آپ کو بلا بھیجے، وہ خود آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہو۔“ دوسرے درباری نے مشورہ دیا۔

”یہ سراسر مہاراج کو نچا دکھانے کے لیے ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ لہذا ہم سب کا منتظر فیصلہ ہے کہ اس جشن میں

کر رکھ دیا۔ وہ پرتھوی کا جواب سن کر غصے میں تھلا اٹھا۔
طیش میں آ کر اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا تاکہ
دلی پر حملہ کر کے پرتھوی کو عبرتناک شکست دے بلکہ زبردستی
اسے جشن میں شرکت پر مجبور کرے۔

ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی اتالیکی تسکین ہو جاتی
بلکہ وہ اپنی بیٹی سنجنا کو بھی یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا
کہ جس شخص کی محبت کا وہ دم بھرتی ہے، وہ اس کے باپ
کے قدموں پر سرنگوں ہے اور وہ اس قاتل نہیں ہے کہ قنوج
کی اگلوٹی راج کماری کو اس کے حرم سرا کی زینت بنا دیا
جائے۔ یہ ہے چند کا اپنا جذباتی فیصلہ تھا۔ ممکن تھا وہ اس پر
عملدرآمد بھی کر بیٹھتا مگر جب اس نے دلی پر فوج کشی کی
تجویز درباریوں کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے قبول
کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ اب جبکہ
جشن بالکل قریب ہے، ایسے میں راجا کا اپنی ریاست میں
نہ ہونا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ چند دنوں تک
دور و نزدیک کے مہمانوں کی آمد بھی شروع ہونے والی تھی
اور ایسے میں ان کے استقبال کے لیے موجود نہ ہونا آداب
میزبانی کے مطابق نہ تھا۔ یہ سوچ راجے کے ارادے کو
تبدیل تو کر گئی مگر اس کے من میں اٹھنے والے نفرت کے
گرداب کو کم نہ کر سکی۔ راجا بے چند شروع سے ہی سازشی
ذہن کا مالک تھا۔ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ اچھا ہوا، پرتھوی نے
جشن میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس میں
شریک ہوتا اور سوئمر کی رسم کے موقع پر شہزادی سنجنا پھولوں
کی مالا اس کے گلے میں ڈال دیتی جس کا قومی امکان تھا تو
ہندو دھرم اور پرما (روایت) کے مطابق سنجنا کو اس کے
حوالے کرنا پڑتا جو کہ اسے کسی طور پر بھی گوارا نہ تھا مگر اس کا
نہ آنا بھی نقصان دہ تھا کیونکہ وہ سنجنا کی ضد کو بھی جانتا تھا۔
بہر حال وہ خوش تھا اور اس دوسرے امکان کا عمل بھی اس
نے سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

آخری عشرہ تھا 1191ء کا..... جب ریاست قنوج
کے طول و عرض میں راج سو جگ کا جشن منایا جا رہا تھا۔
ملک کے ہر قریب میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔
رنگ محل کا ہر چھوٹا بڑا ملازم بھاگ بھاگ کر اپنی ذمے
داریاں نبھا رہا تھا۔ ارد گرد کی ریاستوں کے راجے،
مہاراجے، ولی عہد اور شہزادے آنے شروع ہو گئے تھے
جن کا استقبال راجا بے چند کر رہا تھا اور انہیں ان کی حیثیت
کے مطابق مہمان خانے میں کمرؤں تک لے جانے کے لیے

ایک درباری تعینات تھا جو انہیں لے جاتا اور ان کے کمرؤں
تک پہنچا کر وہاں پہنچاتا۔

رنگ محل کے داخلی دروازے پر مہمانوں کے
استقبال کے لیے ایک الوکھا طریقہ نکالا گیا تھا۔ بعض کہتے
ہیں کہ یہ راجا بے چند کے درباریوں کی تجویز تھی اور کچھ کا
کہنا ہے کہ یہ خالصتاً راجا بے چند کے اپنے ذہن کی اختراع
تھی۔ اس نے پرتھوی راج کا ایک طلائی بت بنوایا اور بطور
دربان جشن داخلی دروازے پر نصب کر دیا۔ جشن کی
تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ ملک بھر سے آئے ہوئے
مہمان خاص طور پر ولی عہد اور شہزادے دروازے پر
نصب اس بت پر قہقہے لگاتے، ہنستے اور طنز و تضحیک کے کھیلے
جملے کہتے ہوئے پنڈال میں داخل ہوتے۔ ایک ولی عہد نے
تو ازراہ مذاق بت سے ہاتھ ملا کر ہیلو ہائے بھی کیا جس کی
حرکت دیکھ کر دوسرے زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

راجا بے چند ان باتوں کو دیکھ کر اور سن کر خوش
ہو رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ اس نے پرتھوی سے
خوب انتقام لیا ہے۔ اچھے خاصے حکمران کو دربان بنا ڈالا۔
سنجنا تو پہلے ہی پریشان تھی۔ اس کی نظریں بار بار
آنے والے دروازے پر پرتھوی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر ہر
بار نا کام ہو کر رہ جاتیں۔ جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، اس
کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار کرناٹکی
سے پوچھا بھی جو ہمہ وقت اس کے آس پاس رہتی تھی لیکن
وہ بھی مایوسی سے انکار میں سر ہلا دیتی۔ ادھر چاند بارودی
کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کو زینت کھائی ہے یا
آسان نکل گیا ہے۔

”دیکھ لو کرناٹکی پرتھوی نے ہمارے ساتھ کیا سلوک
کیا ہے۔“ سنجنا نے کرناٹکی سے بظاہر گلہ کرتے ہوئے کہا۔
”تو مہاراجا نے کونسا اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا
ہے۔ اس کا طلائی بت بنوا کر دربان کی جگہ رکھ دیا تاکہ آتے
جاتے مہمان اس کا مذاق اڑا سکیں اور اس کی تذلیل کر سکیں
جو کہ ہو رہی ہے۔ اب اگر پرتھوی کو اس کی ہینک پڑ جائے تو
ایک قیامت ہی تو آ جائے گی۔“ کرناٹکی نے آگے سے
جواب دیا۔

”پتاچی کو کون سمجھائے۔ ان کی ہر بات نرالی ہوتی
ہے۔ بہر حال پرتھوی کو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا
چاہیے تھا۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ پیار ہی تو کیا تھا، کچھ
مالگنا تو نہ تھا۔ پیار کے بدلے پیار کی گستاخی تھی۔“ سنجنا نے
مایوسی کے ساتھ کہا۔

شہزادی سنجکتا مایوسی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی راج کماروں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ہر راج کمار اور شہزادہ پر امید تھا کہ سوئجر کی مالا اسی کے گلے میں پڑے گی۔ سب دم بخود اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسرے شہزادے کے سامنے سے گزرتی۔ چند لمحے رک کر اس کے چہرے پر مسکراتے ہوئے نظر ڈالتی اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ دھڑکے دلوں کو اپنے قدموں تلے روندتی وہ بڑے غرور کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ آخری راج کمار کے سامنے نہیں پہنچ گئی۔ اس راج کمار کو بھی یہی یقین تھا کہ مالا اسی کے گلے میں پڑے گی۔ سنجکتا کچھ دیر کے لیے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ چند ثانیے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی ہاتھ میں مالا لیے آگے بڑھ گئی۔ راج کمار ختم ہو چکے تھے لیکن مالا بدستور سنجکتا کے ہاتھ میں تھی۔

یہ دیکھ کر بے چند کا دل دھڑک اٹھا۔ ہزاروں دوسرے ایک ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھے کہ نجانے اس کی بیٹی اب کیا حرکت کرنے والی ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سنجکتا اچانک بڑی تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی راہ میں مداخلت کرتا، اس نے ہاتھ میں پکڑی مالا پر تقویٰ راج کے طلائی جیسے کے گلے میں ڈال دی۔

بے چند اضطراری حالت میں فوراً اپنی منہ سے اٹھا اور سنجکتا کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک جانب سے گھوڑے پر سوار ایک وجیہہ لوجوان بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ سنجکتا کو دیوچ کر گھوڑے پر بٹھایا اور ہوا کی طرح اڑا کر لے گیا۔ جشن میں شریک ہر شخص بے چند سمیت حیران رہ گیا۔ کوئی بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ خود سنجکتا کو خبر نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ لوجوان پر تقویٰ راج تھا جس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا اور اپنی عبت کو بیت کر لیا تھا۔

اس کی اس جرأت پر ہر طرف ایک ہنگامہ مچ گیا۔ افراتفری مچ گئی۔ سوئجر کے لیے لگا ہو امیدان اجڑ کر رہ گیا اور جشن کی تمام تقاریب ختم ہو کر رہ گئیں۔

دلی پہنچ کر پر تقویٰ راج نے سب سے پہلے سنجکتا کے ساتھ سات پھیرے لیے اور اسے باضابطہ اپنی رانی بتایا۔ سنجکتا پر تقویٰ کے اس عمل سے بہت خوش تھی۔ آج اس کے من کی مراد پوری ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں برسوں سے

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب اسے سوئجر رچانا تھا۔ سنجکتا کو خوب سچایا سنوارا گیا۔ منادی کرنے والے نے رنگ محل اور مہمان خانوں میں اعلان کر دیا کہ کچھ ہی دیر بعد سوئجر کی رسم ادا کی جائے گی۔ مختلف راج دھانیوں اور ریاستوں کے شہزادے اور ولی عہد بن سنور کر ایک قطار میں کھڑے ہو چکے تھے۔ سنجکتا کو پھولوں کی مالا لے کر ان کے سامنے سے گزرتا تھا۔ جو راج کمار یا شہزادہ اسے پسند آ جاتا، وہ اس کے گلے میں پھولوں کی مالا پہنا دیتی۔ وہی اس کے جسم و جاں کا مالک بن جاتا۔ سنجکتا جب بن سنور کر اس جگہ پہنچی جہاں اس کے تمام امیدوار کھڑے تھے تو وہ اس کا سنن دیکھ کر بخود مر گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت پھولوں سے گندھی ہوئی بڑی کی مالا پکڑا دی گئی۔ راجا بے چند ان سب سے دور مسند پر بیٹھا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب پھولوں کی مالا اپنے ہاتھوں میں تھامے سنجکتا قدم بہ قدم راج کماروں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ادھر سنجکتا بڑے نیچے دل سے آگے بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف پر تقویٰ کو بھی اڑتے اڑتے اپنی ٹھیک کا علم ہو چکا تھا۔ بتانے والوں نے اسے بتایا تھا کہ داخلی دروازے پر جو طلائی بت کھڑا کیا گیا اور جسے دربان کا خطاب دیا گیا ہے، اس کی شکل ہو بہو پر تقویٰ سے ملتی جلتی ہے۔ اکثر راجے اور مہاراجے اسے پہچانتے تھے۔ چنانچہ وہ جشن میں داخل ہوتے وقت پر تقویٰ راج کو اس شکل میں دیکھ کر ہنستے تھے۔

پر تقویٰ سے بھلا اپنی تذلیل کہاں برداشت ہوتی۔ وہ غصے میں لال پٹلا ہو گیا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بے چند کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے یا اپنے نیزے میں پرو ڈالے۔ اس کے اندر کا بہادر سورا اسے بے چمن کیے ہوئے تھا۔ اس نے سب کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود باجی سوسواروں کا ایک دستہ لیا اور آندھی طوفان کی طرح توج کی طرف بڑھا۔ خلاصہ التو ارج کے مطابق وہ عین اس وقت وہاں پہنچا جب جشن اپنے عروج پر تھا۔ بے چند کو اس بات کا احساس تھا کہ جیسے ہی پر تقویٰ کو اپنی تذلیل کا علم ہوگا، وہ اس پر ضرور حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس نے پہلے سے اس طلائی بت ”در بان“ کی حفاظت کے لیے کچھ پاسبان بھی وہاں رکھ چھوڑے تھے۔ اسے پر تقویٰ راج کی آمد کا گمان تو نہ تھا۔ ہاں البتہ یہ امر خارج از امکان نہ تھا کہ اس کے پیچھے ہونے ہر کارے کی قسم کی شرارت یا در اندازی نہ کریں۔

پلنے والی خواہش شرمندہ تعبیر ہو چکی تھی۔

”دیکھ لو، ایک دربان نے اپنی حفاظتی ڈسے داری کو پورا کر ہی ڈالا۔“ پرتھوی نے ہنسنے ہوئے سنجکتا سے کہا تو اس نے بڑے پیار کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پیار سے بولی۔

”ہم نے اپنے ماضی کو جشن راج سو جگ کے پنڈال ہی میں دفن کر دیا ہے۔ اسے چھپڑنے سے زندگی بد مزہ ہوگی پھر اسے حرز جاں کیوں بتائیں۔ اپنے حال کو خوشگوار بناتے ہیں۔“

سنجکتا کی صورت میں پرتھوی کو ایک ذہین اور با وفا عورت مل گئی تھی جسے پاکر پرتھوی راج عیش و عشرت میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ سلطنت کے امور اور لشکر کی ترتیب و تکمیل تک سے غافل ہو گیا۔ وہ سنجکتا کو لے کر خواب گاہ میں کئی کئی روز بند رہتا۔ اب اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ پہلے وہ دشمنوں کے سر قلم کر کے اور انہیں میدان جنگ میں شکست دے کر خوشی محسوس کرتا تھا لیکن اب وہ ہر وقت سنجکتا کی دل جوئی میں مصروف رہتا۔ وہ دن رات عیش و عشرت کی محافل جمانا۔ رقص و سرود اور لہو و لعب میں وقت گزارنے لگا تھا جو لمحے ان مشاغل سے بچنے کے لیے سنجکتا کی ہمراہی میں گزار جاتے۔ سنجکتا بھی ان خوشیوں کو ہر طرح سے سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈالنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ وہ پرتھوی راج کو پاکر دنیا کو بھلا بیٹھی تھی۔ ریاستی امور پرتھوی کی عدم توجہی کے باعث بگڑنے لگے تھے مگر پرتھوی کو اب اس کی کیا پروا تھی۔

☆☆☆

راج سو جگ کے جشن میں جس طرح سے توجہ کے راجا بے چند کی جگہ ہنسی ہوئی تھی، وہ اسے نہیں بھولا تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر پرتھوی راج سے بدلہ لینا چاہتا تھا مگر اس کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ پرتھوی سنجکتا کو پاکر ریاستی امور سے ہاتھ صاف بیٹھا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے حمایتی اور باج گزار ریاستوں نے بھی لگان دینے سے انکار کر ڈالا تھا۔ امیر اور دلی کی ریاستوں کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جا رہی تھی۔

کتنے دنوں کے بعد اس کے مصاحبین اور درباریوں کے مجبور کرنے پر اس نے دربار لگا یا تو ایک درباری نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! اس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس سورما نے بغیر کسی ہتھیار کے شیر کو مار ڈالا ہو جس نے محض 13 سال

کی عمر میں سحرات کے مفروطات توڑے ہیں دیکھو کتنے نیکے پر مجبور کر ڈالا ہو، آج اس قدر بے بس اور تھک کیسے گیا؟ اس کی ہمت کیسے جواب دے گئی کہ محض ایک عورت کی خاطر وہ سب تیاگ بیٹھا ہے اور اسے اپنے ارد گرد کی بھی خبر نہیں رہی۔“

”کیا کوئی بری خبر ہے؟“ پرتھوی نے عام سے لہجہ میں پوچھا۔

”بڑی ایسی بری۔ آپ کو پتا ہے کہ جشن راج سو جگ میں رچائے جانے والے سوکبر سے آپ نے جو نامردی دکھاتے ہوئے توجہ کے راجا کی بیٹی کو اٹھالیا اور اپنے محل کی زینت بنالیا ہے۔ راجا بے چند اسی روز سے یولا یا پھرتا ہے اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہے جب وہ اس کا بدلہ لے سکے گا اور آپ کے اس ٹھکے ٹھکے انداز کو دیکھتے ہوئے ہماری باج گزار ریاستوں نے بھی لیت و صل سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ لگان اور محصولات میں کمی کی وجہ سے ریاستی امور چلانا بھی دن بدن مشکل ہوتے جا رہے ہیں۔“

”او تو اور اڑنی اڑنی خبریں یہ بھی ہیں کہ شہاب الدین نے ایک بار پھر ان ریاستوں کے راجاؤں اور مہاراجوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں اپنے ساتھ ملالیا ہے۔ جس کی شے پر وہ بھی شیر ہونے لگے ہیں۔ توجہ کے راجا اور آپ کے ازلی دشمن بے چند نے بھی شہاب الدین سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔“ بتانے والے نے پوری تفصیل کے ساتھ پرتھوی راج کو بتایا۔

”ہوں.....“ پرتھوی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تو پھر آپ لوگ بھی تیاری کریں۔ واقعی مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ بہر حال.....“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ادھر راجا بے چند اسی وقت سے شہاب الدین کی ٹوہ میں تھا جب سے وہ شکست خوردہ ہو کر واپس پلٹ گیا تھا۔ جب راج سو جگ جشن اپنے پورے عروج پر تھا تو اس وقت راجا بے چند کو شہاب الدین کا پیغام ملا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر دہلی پر حملہ آور ہونے کی تیاری کرے۔ راجا بے چند تو خود ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اپنے تمام پرانے بدلے اٹارتا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی میں ایک بار وہ پرتھوی کو شکست دے کر اس کی راجدھانی کو اپنی ریاست میں شامل کر لے۔

توجہ میں بے چند کے خلاف فوج کو سنجکتا اور پرتھوی نے زندگی کا سب سے بڑا۔ اور آخری معرکہ کچھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ان کے نزدیک اب شاید بے چند پوری

تھی مگر اس حالت میں چاند باردی کا محل میں آنا اور اس سے ملاقات کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی افتاد آ پڑی ہو۔ یہ سوچ کر وہ جلدی سے چاند باردی سے ملنے کے لیے آگئی۔

”مہارانی! حالات مملکت کے مصاحبین اور سپاہ کے ہاتھوں سے نکلنے جا رہے ہیں۔ شہاب الدین کی افواج دلی کو فتح کرنے کے لیے دھڑی چلی آ رہی ہے۔ آپ کے والد محترم قنوج کے راجا جے چند بھی شہاب الدین کی حمایت میں لڑنے پر تے بیٹھے ہیں اور شہاب الدین کی سپاہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ دھر پرموی آپ کے حسن کا اس قدر اسیر ہو چکا ہے کہ وہ کسی کی بات نہیں سن سکتا۔ مملکت کی سپاہ کی نظریں پرموی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ان کے لیے اب آپ ہی کا سہارا ہے۔ انہیں کیا جواب دوں؟“ چاند باردی نے اس انداز سے اپنی درخواست پیش کی کہ سچتا بھی پریشان ہوگئی۔

”تم فکر نہ کرو۔ پرموی ابھی آ کر اپنی سپاہ کے ساتھ شامل ہوں گے۔ ہم بھی یہ برداشت نہ کریں گے کہ بغیر مہاتو کے ہاتھی نکلے۔“

سچتا نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پرموی راج کو چنگا یا اور شہاب الدین کی برستی ہوئی افواج کے بارے میں آگاہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی پریشان ہوا مگر پھر نرم نہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سپاہ کے ساتھ ملنے کی تیاری کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑا رہا تھا کہ اس بزدل میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔ کیا وہ اپنی پہلی شکستوں کو بھول گیا۔

”مہاراج! اس میں غلطی ہماری بھی ہے۔ آپ نے امور مملکت سے نظریں چرائی شروع کر دیں تو بھیمبر میں بھی شیر ہو گئیں اور اس سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ آپ کی عدم توجہی کے سبب ارد گرد کی ان ریاستوں نے جو بھی آپ کی باج گزار تھیں سلطان کا ساتھ دیا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور تو اور میرے پتا جی جو سلطان کے ساتھ پچھلی جنگ میں طوعاً و کرہاً آپ کے ساتھ تھے اب کھل کر سلطان کے ساتھ شامل ہیں۔ انہیں ابھی تک میرا آپ کے ساتھ شادی کرنا برداشت نہیں ہوا۔ وہ اسے اپنی تدبیر جان کر آپ کی دشمنی میں کھل کر آچکے ہیں مگر آپ نے تو کراہت کو ایک بوجھ جان کر اپنی گردن سے اتار پھینکا تھا۔ اس لیے وہ لوگ نئے جوش اور دلولے سے سلطان کی شہ پر اس کے ساتھ مل چکے ہیں۔“

سچتا نے تفصیل سے بتایا۔

”ہوں..... شاید انہیں علم نہیں کہ شیر اور بگیتے ہوئے بھی

زندگی ان کی طرف نہ دیکھے لیکن انہیں اس بات کی توقع ہی نہ تھی کہ آنے والے دنوں میں کسی قسم کی مصیبت ان پر اتر سکتی ہے۔ جے چند اپنی بیٹی کے معاملے میں پرموی راج سے اٹھانے والی ذلت کو بھولا نہ تھا۔ ایسے میں شہاب الدین کی طرف سے کیا جانے والا رابطہ اس کے لیے بھگوان کی دین تھی۔ اس نے فوراً اس دعوت کو قبول کیا اور اس کے ساتھ مل کر 1192ء میں ایک بار پھر دلی پر حملہ آور ہوا۔ سلطنت دلی کا محافظ اپنی بری عادات میں پڑنے کے سبب کمزور ہو چکا تھا اور اپنے ناشی و حال سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

ایسے میں شہاب الدین کا لشکر منزلیں مارتا ہوا دلی کی جانب بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

دھر پرموی نے جب سے سچتا کو پایا تھا تو وہ اس کے حسن گرہ گیر کا اس قدر اسیر ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے محل کے تمام ملازموں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی اس کی اور سچتا کی خلوت میں دخل انداز نہ ہو اور کسی قسم کی ناخوشگوار خبر اس کی چہیتی رانی کے گوش گزار نہ کی جائے۔

شہاب الدین کے پہلے پر بھی پرموی کے اس حکم کی پابندی کی جاتی رہی اور مصاحبین و سپاہ مملکت کا دفاع کرتے رہے مگر شہاب الدین کی افواج کو روکنا ان سے جب ممکن نہ رہا اور دلی سرنگون ہوتا دکھائی دینے لگا تو انہیں مملکت بچانے کی فکر ہوئی۔ انہوں نے خاصی سوچ بچار کے بعد چاند باردی سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح پرموی کو خواب خرگوش سے جگا کر حالات سے آگاہ کرے۔

چاند باردی اس خبر کو سن کر خود سوچ میں پڑ گیا۔ وہ پرموی کا منہ چڑھا اور ہم راز تو تھا لیکن راجوں مہاراجوں کے موڈ سے بھی واقف تھا کہ انہیں بدلے میں دیر ہی کہاں لگتی ہے اسے بھی اپنی جان پیاری تھی۔ وہ معمولی سی غلطی کر کے اسے گنوا نے کے حق میں نہ تھا۔ بہر حال کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے پرموی کو آگاہی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

محل کی سات راہداریاں عبور کر کے وہ اس وقت محل میں پہنچا جب پرموی آرام کر رہا تھا۔ اس نے ملازمہ خاص سے سچتا سے ملنے کی خواہش کی۔ کتنی دیر تک تو خادمہ انکار کرتی رہی اور اسے مہاراج کی معصی طبعیت کا حوالہ دے دے کر ڈراتی رہی۔ بالآخر وہ شہزادی کو پیغام دینے پر رضامند ہوگئی۔ چاند باردی کو سچتا جاتی تھی اور اپنی محبت کے معاملے میں اس کی طرف داری کرنے پر اس کی شکر گزار بھی

شیر ہی رہتا ہے۔ تم ادھر کے معاملات دیکھو، میں نکلتا ہوں۔“
 پر تقویٰ نے اپنے اسلحے کو ترتیب کے ساتھ اپنی وردی پر
 سجایا۔

”نہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ سنجکتا نے
 عزم سے کہا۔

”جنگ میں.....“ پر تقویٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔ جنگ میں آپ کے کاندھے کے ساتھ دوسرا
 کاندھا آپ کی اس محبت کا ہوگا جس نے ہمت دی اور مجھے
 جینے کا حوصلہ دیا۔ آپ کے بغیر تو یہ ادھوری ہے۔“ سنجکتا نے
 حوصلے اور جرأت سے کہا۔

”نہیں سنجکتا! پر تقویٰ اپنی فتح عورتوں کے ماتھے پر نہیں
 سجانا چاہتا۔“ پر تقویٰ نے جواب دیا۔

”یہ اعلان ایک عورت کا نہیں، ایک محبت اور ایک عشق
 کا ہے۔ میں دنیا کو بتا دیتا چاہتی ہوں کہ سنجکتا اور پر تقویٰ کے
 جسم دو ہیں لیکن اس میں دھڑکنے والا دل ایک ہے۔ جان ایک
 ہے پھر یہ بھی کہ میرے والدین کو پتا چل جائے کہ سنجکتا کا
 عشق صادق تھا..... ہے اور رہے گا۔ میں جانتی ہوں، دوسری
 جانب میرے والد جنگ کرتے ہوں گے۔ اسی لیے تو چاہتی
 ہوں کہ ان کی تلوار سے ان کی بیٹی کا سر اس حالت میں کٹے کہ
 انہیں احساس ہو جائے کہ ان کی بیٹی اپنی محبت میں ثابت قدم
 رہی ہے۔“ سنجکتا نے جواب دیا۔

”سنجکتا! ایک تو تمہاری دلیلوں کے آگے میں نے
 ہمیشہ ہار اپنی ہے۔ پتا نہیں، اتنا ذہن بھگووان نے تمہارے سر
 کے اندر کیوں رکھ دیا ہے۔“ پر تقویٰ نے ہنستے ہوئے سنجکتا کے
 سر کو اپنی انگلی سے ہچا کر کہا۔

وہ دونوں محل سے باہر آ کر سپاہ سے ملے تو سپاہ کی
 سانسیں بحال ہوئیں۔ اس نے بڑی جلدی سے سپاہ کو ترتیب
 دیا اور ترانے کے میدان میں سلطان کے مقابل آ گیا۔

راجا جے چند پہلے ہر جنگ میں پر تقویٰ راج کا
 حلیف ہوا کرتا تھا جس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اس کی وجہ
 تو یہ تھی کہ دونوں کے باپ دادا ایک تھے۔ اگرچہ بعد میں
 ان کی دور دراز کی رشتے داریوں کی وجہ سے اعلیٰ اور ادنیٰ
 کے درجات پیدا ہو گئے تھے لیکن راجا جے چند ابھی تک
 اس رشتے داری کی لاج بھار تھا مگر اس کی اپنی دشمنی الگ
 سے اس کے دل میں پختی رہی جو اسے پر تقویٰ سے نفرت پر
 مجبور کرتی رہی پھر راج سو جنگ جشن میں ہونے والے
 سانچے نے پر تقویٰ کے خلاف اس کی دشمنی کو اور بھی ہوا
 دے ڈالی تھی۔ سنجکتا کو اس طرح بھرے پنڈال سے

اٹھالے جانا راجا جے چند کی توہین کے مترادف تھا۔ اس
 لیے وہ شہاب الدین کے ساتھ مل کر اپنی ازلی دشمنی کی
 بھڑاس نکالنا چاہتا تھا اور وہ سلطان کی صفوں میں پر تقویٰ کا
 دشمن بن کر کھڑا تھا۔ اسے قطعاً علم نہ تھا کہ پر تقویٰ کی جس
 فوج سے وہ لڑنے جا رہا ہے، اس میں ہمیں بدل کر خود اس
 کی بیٹی سنجکتا اس کی حریف بنی لڑ رہی ہے۔

1191ء میں تو سلطان شہاب الدین کو پر تقویٰ راج
 نے شکست دے دی تھی مگر اب سلطان مایوس نہیں ہوا تھا بلکہ
 پھر سے 1192ء میں دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس
 کے ساتھ اس مرتبہ ایک لاکھ بیس ہزار گھڑ سوار تھے۔ اس بار
 بھی اس نے ترانے کے میدان ہی کو چننا تھا کہ اپنی پچھلی شکست
 کا بدلہ چکا سکے۔ پر تقویٰ راج چوہان نے بھی بڑے پیانے پر
 فوجی تیاریاں کیں۔

شہاب الدین نے اس بار اپنی جنگی حکمت عملی تبدیل
 کر لی تھی۔ اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور حکم
 دیا کہ ایک وقت میں فوج کا صرف ایک حصہ دشمن کے ساتھ
 برسرِ پیکار ہوگا جبکہ باقی آرام کرے۔ جونہی پہلا دستہ کمزور
 پڑنے لگے تو دوسرا اس کی جگہ لے لے۔

پر تقویٰ راج کی سپاہ پہلے کی طرح بے جگری سے لڑی
 لیکن انہیں شہاب الدین کی نئی حکمت عملی اور نئی تکنیک کی کچھ
 سمجھ نہ آ سکی۔ انہیں یہ سمجھ نہ آ سکی کہ شہاب الدین کی تازہ دم
 فوج کہاں سے آئی ہے۔ چنانچہ سلطان کے یکے بعد
 دیگرے ”تازہ دم“ حملوں نے اس کے تمام منصوبوں کو
 خاک میں ملا دیا۔ اب شکست اسے صاف نظر آنے لگی تھی۔
 پر تقویٰ راج نے میدانِ جنگ سے فرار ہونے کی پوری
 کوشش کی مگر پھل نہ آیا!

تاریخی حوالوں میں جگہ جگہ آیا ہے کہ سلطان اور پر تقویٰ
 کے درمیان ٹھسنا کا معرکہ ہوا۔ اس کی زبان میں ”وہ
 کھانڈے (تلواریں) بچے کہ دلاوروں کے خون سے زمین
 سرخ ہو گئی!“

خوب جنگ ہوئی جس میں کشتوں کے پٹے لگ گئے
 لیکن اس بار قسمت نے چوہانوں کی یادری نہ کی۔ دلی کی سپاہ
 کے بے شمار جوان کام آئے۔ سنجکتا کو تو بچا لیا گیا مگر پر تقویٰ کو
 شکست کے ساتھ اسیری کا صدمہ بھی سہتا پڑا۔ پر تقویٰ اور اس
 کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش
 کیا گیا تو اس نے اسے جیل میں ڈالنے ہوئے کہا۔

”ڈال دو اس سورا کو جیل میں۔ ذرا دشمنوں سے
 مٹ لوں تو بعد میں ان کے بارے میں سوچوں گا۔“

سلطان مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔“ پرتھوی راج نے مایوس اور ادا اس لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے انسوں ہو رہا ہے نہ ایک بہادر شخص اس قدر مایوسی کی باتیں کر رہا ہے۔ کہانی یہیں ختم تو نہیں ہوتی۔ آپ کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ جنگیں جیتی بھی جاتی ہیں اور ہاری بھی جاتی ہیں مگر یوں ہمت ہارنا بڑی کی علامت ہے جو کم از کم پرتھوی راج کو زیب نہیں دیتی۔“ چاند بارودی نے اس کی ہمت بندھا دی تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

”کہو، میں اندھا کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے دوبارہ سے پوچھا۔

”آپ مجھے میرے منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت دے دیں۔ باقی کام میرا ہے!“ چاند بارودی بولا۔

پھر اس نے دیرے دیرے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو پرتھوی راج نے نہ صرف اس کے منصوبے کی تعریف کی بلکہ اس کے ساتھ مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا۔ دونوں نے مل کر اس پر عملدرآمد کرنے کا نہ صرف فیصلہ کر لیا بلکہ چاند بارودی نے اس سے کہا۔

”تمہارا راج! میں آج سے اس منصوبے پر عمل کر رہا ہوں۔ بہت جلد میں اس کے دن اور وقت کا تعین کر کے آپ کو بتا دوں گا۔“

”میں بڑی شدت کے ساتھ تمہاری کامیابی کی دعا کروں گا۔“ پرتھوی راج نے جواب دیا۔

پھر چاند بارودی نے ایک روز سلطان شہاب الدین پر ایک نیا انکشاف کیا۔

”جہاں پناہ! کیا آپ کو علم ہے کہ کوئی آپ کی آواز سن کر آپ کو نشانہ بنا سکتا ہے۔“

سلطان کے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ اس نے چاند بارودی کی بات سن کر حیرت سے کہا۔

”نہ تو میں نے آج تک کسی ایسے نشانہ باز کے متعلق نہ سنا ہے اور نہ ہی اسے دیکھا ہے۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص آپ کی آواز سن کر آپ کو نشانہ بنا سکے؟“

”ایسا ممکن ہے جہاں پناہ! بالکل ممکن ہے بلکہ میں ایسے شخص سے آپ کی ملاقات بھی کر داسکتا ہوں اور آپ اس کے ہنر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔“ چاند بارودی نے جواب دیا۔

”کون ہے وہ ایسا تیرا انداز؟“ سلطان نے تجسس سے پوچھا۔

چنانچہ سلطان شہاب الدین چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو زیر کرتا ہوا دلی کو بھی فتح کر کے لوٹا اور اپنے ساتھ ان قیدیوں کو بھی لے گیا۔

ایسی مصیبت میں بھی پرتھوی راج کے قابل اعتماد ملازم اور ہم راز دوست چاند بارودی نے پرتھوی کے ساتھ اپنی وفاداری کا بھرپور ثبوت دیا۔ اس نے ہمیں بدلا اور دلی سے غزنی پہنچا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ سلطان کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بنیادی طور پر وہ چونکہ فنکار اور گویا تھا اس لیے جلد ہی سلطان کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ کسی طرح اپنے دوست پرتھوی کو سلطان کی اسیری سے رہائی دلانے۔ اسی حکمت عملی کے تحت اس نے دربار میں اتنا عمل وغل بڑھالیا کہ اس کی آمد و رفت زندان تک بھی شروع ہو گئی۔

سلطان شہاب الدین جنگ فتح کر کے واپس غزنی آ چکا تھا اور دلی کے ساتھ ساتھ اجیر پر قطب الدین کو حکمران بنا چکا تھا۔ واپس آ کر اس نے اس جنگ کے قیدیوں پر دھیان دیا۔ پرتھوی راج کو قید سے نکال کر اس کی آنکھوں میں سرخ ہوئی گرم سلاخیں پھروادی گئیں اور اسے ہمیشہ کے لیے اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح کے ظالمانہ سلوک دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی روا رکھے گئے۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین نے پرتھوی راج کی حسن پرست آنکھوں میں سلاخیوں پھروا کر اندھا کر دیا۔ اس کا دوست اور ہم راز چاند بارودی اس تک پہنچا۔ جب پہلے روز چاند بارودی اس سے ملا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا۔ اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حال میں پرتھوی راج کو سلطان کی قید سے نکال کر لے جائے گا۔ وہ اکثر قید خانے جاتا اور مونچ پا کر پرتھوی راج سے مختلف منصوبوں پر تبادلہ خیال کرتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے پرتھوی راج سے کہا۔

”تمہارا راج! میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں کہ آپ کو اس قید سے چھڑا لے جاؤں۔“

”کیا کروں گا میرے دوست۔ آنکھوں کے دیے مجھ کے ہیں۔ اب زندگی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا فائدہ ہوگا۔ کیسا بے چراغ چہرہ لے کر سبکتا کے پاس جاؤں گا۔ یہ تو بھلا ہوا کہ وہ سلطان کی قید میں نہیں آئی۔ ورنہ اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہ سوچ سوچ کر خوف آتا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ

مخصوص نشست پر آ بیٹھا۔ چاند باری اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ اس سے دور سلطان کے سامنے اور مصاحبین بیٹھے اور کھڑے تھے۔ سیاہ کا ایک اسلحہ بند دستہ بھی قریب کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر تیار کھڑا تھا۔ جب سارے انتظامات ہو چکے تو پرتھوی راج کو جیل سے نکال لانے کا حکم سلطان نے ایک درباری کو دیا۔

درباری فوراً گیا اور جیل سے پرتھوی راج کو نکال کر لے آیا۔ درباری اور مصاحبین اس انوکھے قماشے کو دیکھنے کے منتظر تھے اور آپس میں اونچی آواز سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ پرتھوی راج کو لا کر ایک فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا پھر سلطان کے کہنے پر ان سب نے اپنی گفتگو بند کر دی۔ اس کے دوسرے اشارے پر اس درباری نے تیر کمان پر پرتھوی راج کو پکڑا دی۔ اب صرف ایک بار چاند باری نے سلطان کو مخاطب کر کے گفتگو کا آغاز کیا۔

سلطان نے اس کی بات کا جواب دیا لیکن اس کی نظر اس پر پرتھوی راج پر لگی ہوئی تھیں۔ سلطان نے جونہی چاند باری کی بات کا جواب دیا، ایک سنسناتا ہوا تیر کمان سے نکلا اور اڑتا ہوا سلطان کی جانب آیا۔ سلطان کی نظریں اگر پرتھوی راج پر نہ ہوتیں تو ممکن تھا، یہ تیر اس کے جسم میں ہیوست ہو جاتا اور سلطان وہیں موت کے منہ میں چلا جاتا۔ جیسا کہ بعض تواریخ میں درج ہے کہ تیر سلطان کے سینے میں لگا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ سلطان کے گرتے ہی محافظوں نے پرتھوی راج اور چاند باری کو مار دیا۔ جب پرتھوی راج غزنی کی قید میں مارا گیا اور اس کی لاش جلانے کے لیے شیشاں گھاٹ لے جانی گئی تو اس کی ارمی کے پیچھے پیچھے ایک عورت سفید لباس پہنے، پورے سنگار اور بناؤ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ننگے قدموں کے ساتھ چلی جا رہی تھی پھر جب اس کی لاش کو آگ دکھائی گئی اور آتش پوری طرح بھڑکنے لگی تو اس خوبصورت عورت نے فریادیں جہیزات میں انتہائی خاموشی لیکن تیزی کے ساتھ اس آگ میں چھلانگ لگا دی اور لاش کے ساتھ ہی جاتی ہو گئی۔ یہ جوان عورت جھکا جاتی جو اپنے دربار کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”وہ شخص آپ کی قید میں ہے اور اس کا نام پرتھوی راج ہے۔“ چاند باری نے مزید تجسس کو ابھارتے ہوئے بتایا۔

”کیا واقعی ایسا ہے؟ پھر تو ہم کسی روز اس کا یہ ہنر بھی دیکھیں گے۔“ دیکھتے ہیں وہ اندھا ہو کر کھس آواز پر کیسے کسی کو نشانہ بناتا ہے۔“

”جی ضرور! آپ دن اور وقت کا تعین فرمائیں۔ مجھے اجازت دیں تو میں اس سے بھی بات کر لوں۔“

”ہوں..... ضرور کرنا لیکن میں ابھی تک اس بات سے حیران ہوں کہ وہ آواز کی سمت کا تعین کر کے کیسے کسی کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ کیا وہ میری آواز پر میرا بھی نشانہ لے سکتا ہے؟“

سلطان نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ خود اس روز اس کا اندازہ کر لیں۔ مجھے اس کے اس ہنر کا غم تھا تو میں نے ضروری جانا کہ آپ کو بھی اس کی تیر اندازی کا یہ ہنر دکھاؤں۔“ چاند باری نے کہا اور پھر سلطان سے اجازت لے کر پرتھوی راج کے زندان میں آ پہنچا۔

”بیچے مہاراج! اب آپ کے ہنر کو آزمانے کا موقع آ گیا ہے۔ میں نے سلطان کے تجسس کو اس قدر بھڑکا دیا ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھنے کو نہ صرف تیار ہو گیا بلکہ آپ کا یہ ہنر خود اپنے آپ پر آزمانے کی اس نے اجازت بھی دے دی ہے۔ میں سلطان کے ساتھ دور کھڑا ہوتا ہوں کروں گا۔ آپ میری آواز تو پہچانتے ہیں۔ آپ سلطان کی آواز سن کر اس پر نشانہ آزما لیں گے۔ اگر سلطان آپ کے تیر سے مر گیا تو پھر آپ کو اس قید سے نکالنا بہت آسان ہوگا۔ بس بھگوان کرے اس روز آپ کا نشانہ کہیں خطانہ جائے۔“ چاند باری نے پرتھوی راج کو بھجایا۔

”آج تک زندگی میں آنکھیں بند کر کے میں نے جو بھی نشانہ بنایا وہ کبھی خطا نہیں ہوا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ پرتھوی راج نے بے بسی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

پھر مقررہ دن اور تاریخ کو سلطان شہاب الدین اپنے مصاحبین اور درباریوں کے ساتھ ایک میدان میں اپنی

ماخذات

1. تاریخ ہند۔ ای ماریٹن (اردو ترجمہ)۔ 2. خلاصۃ التواریخ۔ سیمان رائے بشالوی۔ 3. تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)۔ 4. پنجاب کی ذاتیں۔ سر ڈینیئل ایڈنسن (اردو ترجمہ)۔ 5. چہار باغ پنجاب۔ منشی گنیش داس وڈیا



اعلیٰ ظرف

منظر امام

اعلیٰ ظرفی ہر ایک کا چلن نہیں ہو سکتی... لیکن جس کے اخلاق میں شامل ہو جائے اسے انسانیت کی معراج پر پہنچا دیتی ہے۔ جو اس کے درپردل کی مراد بر لانے کے لیے پہنچتا تھا... اپنی اعلیٰ ظرفی کے ہاتھوں اسے خالی دامن لوٹنا پڑا لیکن دل میں ڈھیروں اطمینان بھی اتر آیا کہ یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

محبت کی تشنگی اور دست برداری کی انوکھی مثال

رات کا وقت تھا۔ دبیر کی سردرات تھی۔ ہوائیں بولائے بولائے پھر رہی تھیں۔ کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوائیں دیواروں سے سرایت کرتی ہوئی کمرے میں چلی آ رہی ہوں۔

اس بڑے سے کمرے میں الیکٹریک ہیٹر جل رہا تھا جس سے کچھ فاصلے پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب ان ہی کرسیوں پر بیٹھے شدید سردی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ملازم ابھی ابھی کافی بنا کر دے گیا تھا۔

کمل مل گیا تھا جیسے وہ اسی خاندان کا فرد ہو اور برسوں سے
ساتھ رہتا چلا آیا ہو۔

اسی دوران احتشام بھی کچھ دنوں کے لیے وہاں چلا
آیا تھا۔ اسے بھی ارشد پسند آگیا تھا لیکن اس کے چہرے
کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ اسے ارشد اور جویریہ کا یہ
رشتہ اچھا نہیں لگے گا۔ لیکن اس نے اس کا اکتھار نہیں کیا تھا۔
اس رات وہ سب سردی کا لطف اٹھانے کے لیے
بڑے کمرے میں میٹر کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت
مختتم نے اپنی زندگی کے قصے سنانے شروع کر دیے تھے۔
یہ اس زمانے کے قصے تھے جب وہ ملازمت پر تھا۔ وہ بتا رہا
تھا کہ کیسے کیسے لوگ اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ کیسے
کیسے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

سب اس کی باتیں دلچسپی سے سن کر ہنستے رہے تھے۔
اس کا انداز بیان بھی بہت اچھا تھا۔
”ارشدمیاں۔“ زریہ نے اس کی طرف دیکھا۔
”یہ جگہ تمہیں کیسی لگی؟“

”بہت خوبصورت اور بہت مختلف۔“ اس نے کہا۔
”یہاں فطرت اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔
یہاں جو کچھ ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہاں آکر
روح میں ایک تازگی سی آگئی ہے۔ اس کے علاوہ.....“ وہ
کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”رک کیوں گئے؟ اس کے علاوہ کیا؟“
”اٹکل۔“ اس نے جویریہ کی طرف دیکھا۔ ”اس کے
علاوہ یہاں میرے بیٹے بھی پورے ہونے والے ہیں۔“
مختتم اور زریہ دونوں مسکرا دیے تھے۔ ارشد کا
اشارہ جویریہ کی طرف تھا۔

”اچھا کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔“ مختتم نے
کہا۔ ”ہم نے ابھی تک صرف تمہیں دیکھا ہے اور تم ہی کو
دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ جویریہ کا انتخاب بہت بہتر ہے لیکن
ابھی تک ہمیں تمہارے گھر والوں اور بیک گراؤنڈ کے
بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”مجھے اسی لمحے کا خوف تھا اٹکل۔“ اس نے کہا۔
”کہ مجھ سے میرا بیک گراؤنڈ پوچھا جائے گا جو ابھی تک
جویریہ کو بھی نہیں معلوم۔“

جویریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مختتم بھی
کچھ الجھا ہوا دکھائی دیتے لگا۔ ”کیا تمہارا بیک گراؤنڈ اتنا
بھیاں تک ہے کہ تم اس کو بتاتے ہوئے پریشان ہو رہے ہو؟“
اس نے پوچھا۔

وہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ تھے۔ ان میں
سے ایک اس گھر کا مالک تھا مختتم ادراس کی بیوی زریہ۔ یہ
دونوں اوجیز عمری کے دور سے گزر رہے تھے۔ ایک ان کی
بیٹی تھی جویریہ، جو شہر سے چھٹیاں گزارنے ماں باپ کے
پاس آئی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک دوسرا آدمی احتشام
بھی تھا جو مختتم کا چھوٹا بھائی تھا لیکن وہ بھی چالیس کے لگ
بھگ ہو چکا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کے برعکس اس کے
چہرے کے نقوش بہت سخت تھے۔ ایک عجیب قسم کی کڑنگی
تھی۔ ایک اور لوجوان تھا ارشد۔ وہ اور جویریہ شہر میں ایک
ساتھ پڑھتے تھے۔ جویریہ اس کو پسند کرتی تھی۔ ارشد ایک
ایسے خاندان کا معقول لوجوان تھا۔

جویریہ نے اپنے باپ کو لکھا تھا۔ ”ڈیڈ! میں یہ چاہتی
ہوں کہ ایک نظر ارشد کو دیکھ لیں اس سے مل لیں۔ اگر وہ
آپ کی سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ میں وہی کروں گی
جو آپ لوگوں کی خواہش ہوگی۔ ارشد مجی ہمارے علاقے کو
دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو وہ میرے ساتھ
آجائے۔“

مختتم نے زریہ سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی یہی کہا
کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لڑکے کو تو دیکھنا ہی ہوگا۔ بلا
لیا جائے۔ ویسے بھی یہ لوگ کھلے دل و دماغ کے لوگ تھے۔
مختتم ایک سرکاری آفیسر ہو چکا تھا۔ ایک بڑا میوور کرینٹ۔
اپنی سروس کے دنوں میں اس کی ایمانداری اور اصول
پسندی پورے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھی۔

یہ بنگلہ اور اس کے آس پاس کی زمینیں اس کے باپ
کی وراثت میں اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کا باپ ایک
بڑا زمیندار تھا۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو ایک جیسے
مواقعے دیے تھے۔ ایک جیسا حصہ..... لیکن احتشام نے
ساری دولت ادھر ادھر اڑادی تھی۔ جبکہ مختتم نے اپنی حکمت
عملی سے اس میں اضافہ ہی کیا تھا۔

اس کے باوجود بھی احتشام کے پاس شہر میں کچھ
دکانیں اور فلیش تھے جن کے کرائے آجایا کرتے اور اس
کی بھی زندگی بس ٹھیک ہی گزر رہی تھی۔

جویریہ جب ارشد کے ساتھ پہنچی تو یہ لوجوان پہلی نگاہ
میں دونوں کو پسند آگیا تھا۔ وہ ایک مہذب انسان تھا۔
کلچرڈ۔ مختتم کی تجربہ کار نگاہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ
لوجوان آگے جا کر ایک بڑا آفیسر بن سکتا ہے۔ اس کا تھیلی
ریکارڈ بھی بہت شاندار تھا۔

دو چار دنوں میں ہی ارشد ان لوگوں کے ساتھ اتنا

”چلو میاں ختم کرو۔“ ختمش نے کہا۔ ”مجھے تمہارے ماضی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں ذرا دوسرے مزاج کا انسان ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے اس وقت جو بیٹھا ہے، وہ آج کیسا ہے۔“

”بس تم اسی بات سے گھبراہے تھے؟“ جویر نے پوچھا۔ ”نہیں جویر یہ، ایک اور بات بھی ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس بات کو بھی ظاہر نہیں کروں اور کسی کو پتا بھی نہیں چل سکتا لیکن یہ میرا مزاج نہیں ہے۔ اکل اور آغنی اتنے اچھے ہیں کہ انہیں اندھیرے میں رکھ کر تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ اکل!۔“ اس نے ختمش کی طرف دیکھا۔ ”میری پرورش خیرات کے پیسوں سے ہوئی ہے۔“

سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ احتشام کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ جویر یہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب تک سب ٹھیک تھا۔ ارشد کا معمولی کام کرنا۔ گھر میں قانون کا ہونا۔ گھروالوں کی پریشانی۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن یہ

”نہیں اکل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میرے ابا خالدا ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے لیکن ان کو کسی وجہ سے نوکری چھوڑنی پڑی تھی۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں اس وقت کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہمارے پاس زندگی گزارنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ صرف ابا کی آمدنی تھی۔ وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ گھر بھی کرائے کا تھا۔ ایسی صورت میں اندازہ لگائیں کہ ہم پر کیا گزری ہوگی۔“

”ہاں مجھے احساس ہے لیکن کیا یہ ایسی بات ہے جس کے لیے تم اپنے ماضی کو اندھروں میں رکھو؟“

”نہیں اکل! بات کچھ اور بھی ہے۔“ اس نے جویر یہ کی طرف دیکھا۔ ”معاف کرنا جویر یہ۔ میں نے پہلے یہ سب تمہیں نہیں بتایا تھا کیونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس وقت بتانا پڑ رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جویر یہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ ”اکل! بات یہ ہے کہ میں والد صاحب کی نوکری ختم ہو جانے کے بعد بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ گھر میں بہن بھائیوں اور والدین کا ساتھ تھا اور اکل کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو ایسے کاموں میں جھونک دیا جو عام حالات میں بھی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میں نے ایک معمولی سے ہوٹل میں بیرے کا کام شروع کر دیا۔ گاؤں کے سامنے کھانا رکھنا۔ ان کی انٹی سیڈی بائیں سننا۔ ان کے جموٹے برتن اٹھا کر لے جانا۔ لیکن میں یہ کام شام کے وقت کرتا تھا پارٹ ٹائم کے طور پر۔ جبکہ دن میں اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔“

”تم یہ کہانی سن کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“ احتشام نے درمیان میں ہی پوچھ لیا۔ ”اگر تمہارا ایک گراؤنڈ اچھا ہوتا تو خاندان والے کبھی تمہیں ایسا کام نہیں کرنے دیتے۔“

”اکل میں نے بھی خاندان والوں سے مدد نہیں مانگی۔ میں حلال روزی کما رہا تھا۔ میرے لیے کبھی بہت تھا۔“

”بھائی۔“ ختمش نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”اس نے اپنے بارے میں سچائی کے ساتھ جو کچھ بھی بتایا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس کی بڑائی ہے کہ اس نے ایسے حالات میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور آج ایک اچھے مقام پر ہے۔ اسی قسم کے نوجوان اپنے اندر اس پارک رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ بن کر دکھا دیتے ہیں۔“

احتشام کا منہ بن گیا۔ شاید اسے ارشد کی ایسی طرف داری اچھی نہیں لگی تھی۔

اکل

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر تشوہیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

توقارین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

”ہوسکتا ہے احتشام ہو سکتا ہے اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔“ محتشم نے کہا۔
 ”آپ کس طرح جانتے ہیں؟“
 ”اس لیے کہ ان کے والد جس جگہ میں کام کرتے تھے، اس کا سربراہ میں ہی تھا۔“ محتشم نے بتایا۔
 ”کیا؟“ ارشد نے حیران ہو کر محتشم کی طرف دیکھا۔
 ”یعنی میرے والد صاحب کی بربادی میں آپ کا تھا تھا۔“
 ”ہاں بیٹے ایسا ہی سمجھ لو لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں پیروں پر کھڑا کرنے کا فرض بھی میں نے ہی انجام دیا تھا۔“
 محتشم نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ گناہ محض جو تمہاری اور تمہارے خاندان کی مدد کرتا رہا تھا وہ میں ہی تھا۔“
 اب ایک سنا تھا۔ بے نام سنا تھا۔
 ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اب کیا کہوں۔“
 ارشد نے کہا۔
 ”پیشام نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں کہاں اسٹیڈ کر رہا ہوں۔ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں اس شخص سے انتقام لوں گا جس نے میرے باپ کو تباہ کیا تھا لیکن اب میں بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ آپ ایک طرف میرے دشمن بھی ہیں اور دوسری طرف میرے دشمن بھی ہیں۔“

”اب ایک بات اور سن لو۔“ محتشم نے کہا۔ ”تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ تم میں ایک اسپارک ہے جو بہت کم نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ ایمانداری کا اسپارک۔ سچائی کا اسپارک لیکن پینا ز مٹی حقائق کچھ اور ہی ہوتے ہیں اور وہ حقائق یہ ہیں کہ انسانی نفسیات بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس کی یادداشت ایسے موقع پر ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔“

”اگر جویریہ سے تمہاری شادی بھی ہو گئی تو اس کے باوجود یہ خلش تمہارے یا جویریہ کے دل میں رہے گی۔ تم کو اس بات کا دکھ ہوگا کہ جویریہ کے باپ نے تمہارے باپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور جویریہ کو اس بات کا احساس رہے گا کہ اس کے باپ نے تمہاری پرورش کی تھی۔ اسی لیے یہ شادی کا سبب نہیں ہوگی۔ تم دونوں ساری زندگی اچھے رہو گے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کہانی کو یہیں ختم کر دیا جائے۔“

ارشد نے اپنی گردن جھکا لی۔ باہر سردی اچانک بڑھ گئی تھی اور کمرے میں جلتا ہوا آتش دان بھڑکنے لگا تھا۔

خیرات کے پیروں سے پرورش اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جبکہ خود اس کے والدین ایک شاندار بیک گراؤنڈ رکھتے تھے۔ اس کے خاندان کے زیادہ تر لوگ اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں۔ دو سفیر تھے۔ ایک تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ سچ تو نہ جانے کتنے تھے اور اس بیک گراؤنڈ رکھنے والی کا امیدوار یہ بتا رہا تھا کہ اس کی پرورش خیرات کے پیروں سے ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو بھی تھا اس کا ماضی تھا۔ اس نے بہت بُرے حالات میں خیرات کو قبول کیا ہوگا۔ اس کے باوجود یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر غور کیا جاسکے۔

”اور یہ خیرات کس ادارے سے آئی تھی؟“ احتشام نے پوچھا۔

”کسی ادارے سے نہیں بلکہ کوئی اللہ کے نیک بندے تھے جنہوں نے خود کو میرے والد کا دوست ظاہر کیا تھا۔ وہ ہر ماہ ہمیں ایک معقول رقم بھیج دیا کرتے اور اس سے ہمارا گزارہ ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ان کا پتا چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا نام تک نہیں معلوم ہو سکا۔ انہوں نے فون پر کہا تھا کہ وہ میرے والد کے دوست ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ماہانہ پیچھا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک میں کسی پوزیشن پر نہ پہنچ گیا۔“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ احتشام نے کہا۔ اس نے محتشم کی طرف دیکھا۔ ”بھائی اس دور میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اب کوئی کسی کی اس طرح مدد نہیں کرتا۔ وہ بھی بغیر کسی سبب کے۔ بغیر کسی فائدے کے اور مدد بھی اس طرح کہ گناہ رہا جائے۔ سامنے نہ آیا جائے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“
 ”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس نے جو گناہ فرشتے کی کہانی سنائی ہے، وہ جھوٹی ہے۔ اصل بات یہ ہوگی کہ اس کی مدد کی خیراتی ادارے نے کی ہوگی اور یہ کسی گناہ فرشتے کا نام لے رہا ہے۔“

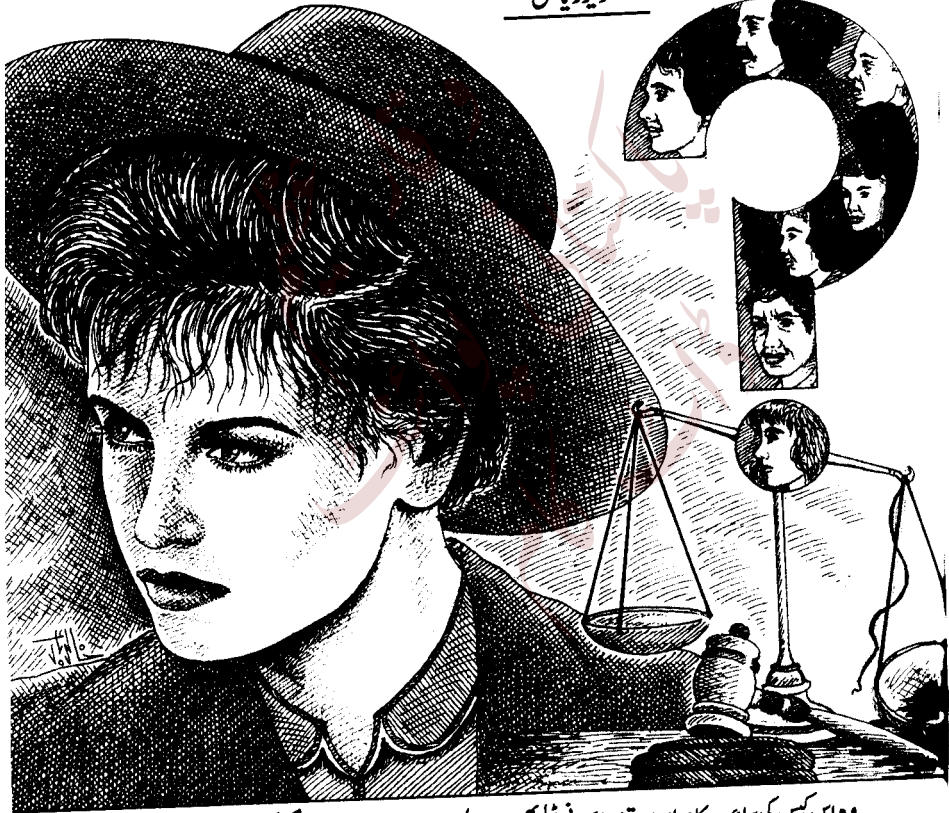
”محترم!“ ارشد نے اس کو مخاطب کیا۔ ”ایک بات بتائیں۔ اگر میں یہ بات نہیں بتاتا تو کیا آپ کو یہ معلوم ہو سکتا تھا؟ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ کیا مجھے اپنے پیروں پر کھڑی مارنے کا شوق ہے جو میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہا ہوں؟“
 ”میں یہ تو نہیں جانتا کہ تمہیں شوق ہے یا نہیں لیکن تم جو کچھ بتا رہے ہو، وہ وہ نہیں سکتا۔“

رفتہ رفتہ تیشے زہر سے شکار کرنے والی ایک حیثیت کی چالاکی

انتقام ایک ایسا جذبہ... جو دھیرے دھیرے پہلے انسان کے اندر جال
گھتا ہے پھر اس کی لپیٹ میں وہ اپنے ہدف کو لینے کی کوشش کرتا
ہے۔ اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا... جس نے بچپن میں اسے
احساس محرومی کے جنگل میں دھکیلا رفتہ رفتہ اس نے رسوائی کا
طوق اسی کی گردن میں ڈال دیا اور بالآخر وہ اپنی سازشوں میں
کامیاب ہو گئی۔

سازش

تویر ریاض



دلچسپ مشغلہ تھا تاکہ زندگی کی یکسانیت میں کچھ تبدیلی
آ سکے۔ وہ کمرالک پوری عمارت اس کی توقع کے مطابق
نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے کی اونچی دیواروں پر
دارش کی ہوئی کٹری کے تختے لگے ہوں گے۔ اونچی چھت

وہ اس کس کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ ایسوی نیلر بھی
دوسرے اراکین جیوری کے ساتھ ہی کمرے میں داخل
ہوئی۔ ان کی تعداد کل بارہ تھی اور ان میں سے بیشتر بزرگ
شہری تھے جن کے لیے اس جیوری میں شامل ہونا ایک

ایم ایروں پر پڑھو پہاڑیوں کی تصاویر آویزاں ہوں گی
 باجم ادم انصاف کی دیوی کا مجسمہ ضرور نصب ہوگا جو
 اس کا ترازو پکڑے وہاں آنے والوں کو منصفانہ ساعت
 ۵۰ البین دلار ہی ہوگی۔ جیسا کہ ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا
 اس کے برعکس اس نے دیکھا کہ کمرے کی چھت
 انتہائی پتلی اور پسیدہ تھی۔ دیواروں پر لگے ہوئے تختے دیکھ
 لاشری دہائی کے کسی سٹ کام کے سیٹ کا گمان ہوتا تھا اور
 لاشری گرد آلود تھیں۔

جب ہیلف انہیں ہدایات دینے کے بعد چلا گیا تو
 اس نمبر والے شخص نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں سب
 پہلے اپنے ترجمان کا انتخاب کر لینا چاہیے جو اس جیوری
 لی فارروائی کو آگے بڑھائے۔“

سب لوگوں نے اپنی کرسیاں میز کے نزدیک
 کر لیں۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے سب لوگ اپنا تعارف
 کرادیں۔“ سات نمبر نے کہا۔ اس نے خود ہی ترجمان
 کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کسی نے اس پر اعتراض نہیں
 کیا۔ اس کے بائیں جانب سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ سب
 لوگوں نے باری باری اپنے نام، ملازمت یا کاروبار، شادی
 شدہ زندگی اور تعلقات کے بارے میں مختصر تعارف پیش کیا،
 ماسوائے نمبر ایک کے جس نے صرف یہ بتانے میں چارمنٹ
 لگا دیے کہ اس کے پاس سات بلایاں ہیں۔ وہ کیوں اور کیسے
 یہاں آئی۔ اس کا پہلا شوہر، دوسرا شوہر..... مجبوراً نمبر سات
 کو اسے ٹوکنا پڑا، جب وہ خاموش ہوئی۔

ایمونی کو ان کے نام، پیسے اور ذاتی زندگی سے کوئی
 دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انہیں ان کے نمبر سے جانتی تھی اور یہی اس
 کے لیے کافی تھا۔ وہ اس کے دوست نہیں تھے اور نہ ہی وہ
 انہیں دوست بنانا چاہتی تھی۔ وہ اس جیوری میں شامل ہونے
 کو اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک
 مقصد کے تحت یہاں آئی ہے۔ جج نے انہیں ہدایت کی تھی
 کہ وہ بحث مباحثہ کرنے سے پہلے کوئی رائے قائم نہ کریں
 لیکن وہ پہلے ہی اپنا ذہن بنا چکی تھی۔

”نمبر آٹھ.....“ نمبر سات نے اس کی طرف دیکھتے
 ہوئے کہا۔

”میرا نام ایمونی ٹیلر ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں
 اور ایک انٹرنیٹ کمپنی میں سافٹ ویئر ڈیولپر کے طور پر
 کام کرتی ہوں۔“

جب وہ اپنا تعارف کر دیا پچھتے تو سات نمبر نے کہا کہ
 سب ایک کاغذ پر اپنا ابتدائی فیصلہ لکھیں اور اسے تہ کر کے

اس کے حوالے کر دیں گوکہ کوئی رسمی انتخاب نہیں ہوا لیکن وہ
 حقیقت میں ترجمان لگ رہا تھا۔ ساری پرچیاں جمع ہونے
 کے بعد اس نے دوٹوں کی نکتی کی۔ آٹھ لوگوں نے ملزم کو
 بے قصور ٹھہرایا تھا۔ تین کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے جبکہ ایک
 رکن کی نظر میں ملزم قصور وار تھی اور اس رکن کے بارے
 میں صرف ایمونی ہی جانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جن
 لوگوں نے اسے بے قصور سمجھا ہے، ان پر اسے کافی کام کرنا
 ہوگا۔ لہذا اسے پہلے ان لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جنہیں
 اس بارے میں پورا یقین نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں قائل کرنے
 میں کامیاب ہوئی تو اس کے ساتھ اور آدازیں بھی شامل
 ہو جائیں گی۔

پہلے روز انہیں زیادہ بحث کرنے کا موقع نہیں ملا
 کیونکہ تعارف اور رسمی کارروائی میں کافی وقت لگ گیا تھا۔
 جب ہیلف نے کہا کہ جیوری کے اراکین جا سکتے ہیں تو وہ
 ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

ایمونی جانتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اسے
 پورے عزم کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ
 جیوری کے دوسرے اراکین کو اپنا ہم خیال بنا سکے گی یا نہیں
 لیکن اسے ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ مگر پہنچ کر اس نے
 حوصلہ کیا اور ڈر نہ کرنے کے بعد سوئی۔

دوسرے دن وہ عدالت پہنچی تھی کہ ایک آواز
 نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ نمبر دو تھا۔ ”تم نمبر
 آٹھ ہونا؟“

وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ لاٹ سے
 عدالت کی عمارت تک آئے۔ ایمونی نے اسے غور سے
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ بولو کیا بات ہے؟“

”ہم دونوں ایک ہی جیوری میں ہیں۔ سیرینا ہیوٹ
 کس کے سلسلے میں۔“

ایمونی پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے
 کہا۔ ”ہاں نمبر آٹھ اور تم.....؟“

”میں نمبر دو ہوں۔ ہیریس کو سلوسکی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ وہ نمبر دو ہے۔ اگر اس
 کا نام یاد نہ رہا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اب اسے یہ معلوم
 کرنا تھا کہ ملزم کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔

”کیا یہ تمہارا پہلا مقدمہ ہے؟“ اسے یہ سوال کچھ
 احمقانہ لگا جیسے وہ پہلی بار ڈیٹ پر آئی ہو اور پوچھ رہی ہو
 کہ تمہارا ستارہ کون سا ہے اور تم کس قسم کی موسیقی پسند
 کرتے ہو؟

ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آج ہم واقعی اس مسئلے پر مزید غور کر سکیں گے۔“
کسی نے کچھ نہیں کہا۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا کسی نے گزشتہ شب اپنا ذہن تبدیل کیا؟“ نمبر سات نے کہا لیکن کسی نے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا۔
”پہلے ہمیں تحریری ریکارڈ دیکھنا چاہیے۔“ نمبر پانچ نے کھڑے ہو کر کہا۔ وہ ایک درمیانے قد اور چسامت کی ہسپانوی عورت تھی اور ایک بینک میں کام کرتی تھی۔ شاید اسی لیے یہ بات کر رہی تھی۔

”ہمیں اس بارے میں بحث کرنی چاہیے۔“ نمبر نو نے کہا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، سفید بالوں والا شخص تھا جو پوسٹ آفس سے ریٹائر ہوا تھا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ ہمیں سب لوگوں کی رائے کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔“

”ایک رکن نے اسے قصور وار اور تین نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا، اگر وہ تینوں اسے بے قصور قرار دیتے ہیں تو ہم اطمینان سے گھر جا کر سو جائیں گے۔“ نمبر گیارہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ جب وہ بول رہا تھا تو اس کی نظریں ایسوی نے پر تھیں۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس نے طرہ قصور وار قرار دیا ہے..... لیکن کیسے؟ اس نے اسے پہلی ہی نظر میں ناپسند کر دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے دیکھ کر کوئی ایسا شخص یاد آ گیا جس کا اس کے باطنی سے تعلق تھا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی مناسب طریقہ ہے۔“ نمبر بارہ نے کہا۔ یوں لگا جیسے اسے نمبر گیارہ کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے اس نے حال ہی میں فوجی وردی اتار کر شہری زندگی میں قدم رکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک دیسی ہی تھمتھی۔

”ہمیں صرف باتیں نہیں بلکہ اس کیس پر بحث کرنی چاہیے۔“
”کیا یہ بحث نہیں ہو رہی؟“ نمبر گیارہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”تم جانتے ہو، میرا کیا مطلب ہے۔“ نمبر بارہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اگلے بیٹھے یہاں نہیں آنا چاہتا۔ ہمیں کوئی فیصلہ کر کے اس کیس کو ختم کر دینا چاہیے۔“ نمبر گیارہ نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

دن کا بقیہ حصہ اسی طرح گزر گیا۔ نمبر گیارہ اور نمبر بارہ آٹھ سائے بیٹھے ایک دوسرے سے الجھتے رہے اور نمبر سات بیچ بچاؤ کرتا رہا۔ جیوری کے دیگر اراکین بھی موقع

”نہیں۔ میں اس سے پہلے بھی تین مرتبہ جیوری کے رکن کے طور پر کام کر چکا ہوں۔“
”یعنی تم پیش درجیور ہو۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا اندازہ تھا کہ تم یہی کہو گی۔ اس کیس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“
”ہمیں اس پر قیاس آرائی نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ بھولپن سے بولی تاکہ اسے پہل کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ بھی اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔

”کوئی بھی اس جانب توجہ نہیں دے رہا۔“ وہ آواز نیچی کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ استغاثہ نے الزام ثابت کر دیا ہے اور دوسری جانب وکیل صفائی بھی کوئی معقول وجہ نہیں پیش کر سکا۔“

”گویا تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ وہ بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پولیس نے میرنا، سوٹ کو جانے وقوع سے چند بلاک کے فاصلے پر کیوں رد کیا؟ اور اس کے پاس اس علاقے میں موجود ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔“

”ایسا لگتا تو نہیں؟ تم کیا سمجھتی ہو؟“ کوسلو کی نے کہا۔
”میں نہیں جانتی البتہ میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ قصور وار نہیں تو اسے مجرم قرار دینا نہیں چاہتی لیکن اگر وہ مجرم ہے تو اسے معاف بھی نہیں کیا جاسکتا اور وہ بہت تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہی تھی۔ کیا یہ مجرم ہونے کی نشانی نہیں؟“

”اس علاقے میں سب لوگ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

ایسوی نے اپنی رائے محفوظ رکھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”دوسرے اراکین بھی آرہے ہیں۔ ہمیں اندر چلنا چاہیے۔“
”کیا تم میرے ساتھ چل کر دو؟“

”یقیناً۔“ اس نے کہا۔ وہ اس کے باجیوری کے کسی بھی رکن کے ساتھ چل نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ کبھی سکتی تھی، اگر اس کا کوئی فائدہ ہوتا۔ کیا وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا؟ اسے اب بھی یہ بڑا عجیب لگتا کہ کوئی مرد اس کی جانب متوجہ ہونے لگا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور اسے بولی بریٹ یاد آنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مشابہت بہت خفیف سی تھی۔

وہ جیوری کے کمرے میں پہنچے تمام اراکین جیوری وہاں موجود تھے۔ نمبر سات نے میٹنگ کا آغاز کرتے

گڑبڑ اس وقت ہوئی جب گھر کے مالک نے اس کے دو ساتھیوں پر کوئی چلائی اور جب پولیس نے اسے پکڑا تو وہ بہت جلدی میں تھی۔

”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس پر یقین کر سکتا ہوں۔“
”اس کے علاوہ وہاں ایک عینی شاہد بھی تھا جس نے اسے شاخت کر لیا۔“

”یعنی شاہد کٹر غلط بیانی بھی کرتے ہیں۔“
”جیوری کے لوگ اپنے تجربے کی بنیاد پر اسے پرکھ سکتے ہیں۔“

اس نے قہقہہ لگایا تو وہ بولی۔ ”یعنی شاہد نے جو حلیہ بتایا، وہ اس سے ملتا ہے، اس کے علاوہ اس کا سیل فون بھی ایک قریبی ٹاور سے سکتل لے رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہاں موجود تھی۔“

”یقیناً لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس علاقے سے گزر رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف اس کا فون ہی وہاں ہو۔“

”اس کے بغیر۔“ ایبونی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
”میں سو فٹ ویٹر پروگرامروں اور باتسکی ہوں کہ سو فٹ ویٹر کے ذریعے فون رکھنے والے کی لوکیشن کا سو فیصد درست یقین کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا تمہاری رائے میں وہ مجرم ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے یہ بات چھپانا مناسب نہ سمجھی۔ ”میری خواہش تھی کہ صرف میں ہی تھا یہ بات نہ کہہ رہی ہوں۔“
انہوں نے کھانے کے دوران مقدمے کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی باتیں کیں۔ وہ اتنا برا نہیں تھا۔ البتہ اس کا دماغ دوسری طرف لگا ہوا تھا۔

نمبر دو اور ایبونی ایک ساتھ جیوری روم میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دو اور اراکین بھی آئے۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور ان کے درمیان بحث شروع ہو گئی تو اس کے اختتام پر ایک بار ہارڈ ورنگ ہوئی۔ اس مرتبہ سیرینا کو قصور وار قرار دینے والوں میں ایک کا اضافہ ہو گیا۔

نمبر گیارہ غصے سے بولا۔ ”ہم کبھی یہاں سے نہیں جاسکیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے کن اگلیوں سے ایبونی کی طرف دیکھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ وہ نمبر دو کے ساتھ لچ پر مبنی تھی اور اس کا ذہن تھیل کر دیا؟ کیا اس نے صرف ایبونی کو ہی دیکھا یا دوسرے لوگوں کو بھی اسی طرح دیکھ رہا تھا جس پر

ملنے پر بولتے رہے۔ بالآخر سات نمبر نے لچ کے وقفے کا اعلان کر دیا۔

”ہمیں یہاں سے باہر نکلنا چاہیے۔“ نمبر دو نے ایبونی سے کہا۔ وہ بھی اس وقفے سے خوش تھی اور اس کے ساتھ کھانا نہیں بلکہ باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ انہیں دو بلاک کے فاصلے پر ایک چینی ریسٹوران مل گیا۔

”جیسے وہاں تھوڑی سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔“ ایبونی نے سوپ کا چمچہ منہ میں لیتے ہوئے کہا۔
”ہاں۔ ایسا ہوتا ہے، کوئی بھی عدالت میں آنا نہیں چاہتا۔“

”مگر تم تو آ گئے ہو۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”یہ تمہارا چوتھا مقدمہ ہے۔“
”ہاں۔ میں اسے ایک طرح سے کام سے چھٹی سمجھتا ہوں۔“
”تم کیا کام کرتے ہو؟“
”میں استاد ہوں۔“

”استاد ہو کر تم نے یہ ٹیوٹو پایا ہے؟“ اس نے آستین سے جھانکتے ہوئے سانپ کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج کل کوئی ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے باوجود میں کلاس میں پوری آستین کی قمیض پہن کر جاتا ہوں۔“

وہ اس بے معنی گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ مطلب کی بات کی جائے۔ ویٹر کھانے کر آیا تو گفتگو کا سلسلہ وقتی طور پر منقطع ہو گیا۔ اس نے چکن کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی تک کسی نتیجے پر کیوں نہیں پہنچے؟“

”ویکل اسٹاف کا کہنا ہے کہ مس ہیویٹ جانے وقوع سے فرار ہو رہی تھی۔“

”اسی سے اس کے جرم کا اظہار ہوتا ہے۔“
”لیکن ویکل مغانی کا کہنا ہے کہ غالباً وہ وہاں نہیں تھی۔“ کوسلو سکی نے کہا۔ ”بہر حال وہاں اس کی اگلیوں کے نشانات نہیں ملے اور نہ اس کی کار میں لوٹ کا مال تھا۔“

”وہ ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہی تھی۔“ گولیوں کی آواز سننے ہی اس نے کار چلا دی اور اس کے ساتھیوں کو یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ لوٹ کا مال کا رنگ پہنچا تو چونکہ وہ ڈرائیور تھی اس لیے اندر نہیں گئی اور وہاں اس کی اگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔ ساری

ایمونی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بہر حال اس کا ساتھ دینے والوں میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دس ابھی باقی تھے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

تیسرے دن بحث کا آغاز ہوا۔ نمبر گیارہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اکثریت کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور نہ ہم یہ کیس ختم کر کے گھر جا چکے ہوئے۔ اب تم نے نمبر دو کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔“

”مجھے وہی کرنا ہے جو میں مناسب سمجھتی ہوں۔“

”گویا تم اپنے آپ کو صحیح سمجھتی ہو اور ہم دس اراکین غلط ہیں۔“ اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”بعض اوقات اکثریت بھی غلط ہو سکتی ہے۔“ ایمونی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ہاں لیکن اس کیس میں نہیں۔ سیرینا ہیوٹ بے قصور ہے۔“

”ممکن ہے۔“ ایمونی نے کہا۔ ”لیکن جہاں تک میں سمجھتی ہوں، استغاثہ اسے مجرم ثابت کر چکا ہے اور وکیل صفائی نے بھی کوئی مقبول دلائل پیش نہیں کیے۔“

وقفہ ہوا تو وہ ریست روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔ وہاں جیوری کی رکن نمبر پانچ آئیٹے میں اپنا ایک اپ درست کر رہی تھی۔

”اعزیز قوڑی سی گرما کر رہی ہو گی تھی۔“ ایمونی نے کہا۔ ”کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ میں ایک اور جیوری میں بھی رہ چکی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ مجھے لڑاکا معلوم ہوتا ہے۔“

”مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے۔“

”مجھے بھی۔“ نمبر پانچ نے اپنا ہاتھ معامے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”رینا نورس۔“

ایمونی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ایمونی ٹیلر۔“

”خوب صورت نام ہے۔“ رینا بولی۔

”دراصل یہ میرا بیچ کا نام ہے۔ پہلا نام لیزا مجھے پسند نہیں تھا۔ لہذا میں نے اسے ترک کر کے قانونی طور پر ایمونی رکھ لیا۔“

اس نے اکیس سال کی عمر میں ہی اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس انوکھے نام سے اس کی شخصیت میں تبدیلی آ سکے گی اور اس طرح لوگوں سے بات کرنے اور انہیں دوست بنانے میں مدد ملے گی۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ نمبر پانچ کیس کے بارے میں

کوئی بات کرے پھر خود ہی بولی۔

”ایک عورت کو اور کیا چاہیے کہ وہ گھر پر اپنے والدین کے ساتھ رہے۔ اسے مکان کا کرایہ دینا ہو اور نہ ہی لائڈری کے اخراجات برداشت کرنا پڑیں پھر سیرینا نے ڈاکوؤں کا ساتھ کیوں دیا؟“

”اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ کیا تم واقعی اسے مجرم سمجھتی ہو؟“

”ہاں۔“ ایمونی نے پورے وثوق سے کہا۔ ”حاشی ہو، میں اس نتیجے پر کیوں پہنچی؟ وہ اپنی زندگی سے اسکا بچہ تھی اور اسے سی ایڈوچر کی تلاش تھی، جیسا کہ استغاثہ نے کہا کہ وہ ملازمت تلاش کرنے کے بجائے رات گئے پارٹیوں میں شریک ہوتی اور دیر سے گھر آتی۔“

”مجھے یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔“ نمبر پانچ نے کہا۔

ایمونی کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ واقعی استغاثہ نے یہ بات کہی تھی۔ البتہ اسے یاد آ گیا کہ نمبر پانچ نے جرح کے دوران وکیل صفائی سے پوچھا کہ کیا وہ محسوس کرتی ہے کہ بے روزگار لوگ ست ہو جاتے ہیں جس کا اس نے نفی میں جواب دیا لیکن ایمونی نے رینا کا فیس بک پیج دیکھا تو اس نے اپنی ایک پوسٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ زیادہ تر لوگ جنہیں کوئی کام نہیں ملتا، وہ ست ہو جاتے ہیں اور کوئی کام کرنے کے بجائے بے روزگاری الاؤنس پر انحصار کرتے ہیں۔

رینا کی آنکھوں میں حیرت جھلک رہی تھی۔ ایمونی کو لگا کہ وہ کامیاب ہوئی ہے اور جب دن کے اختتام پر دو ٹنگ ہوئی تو تین اراکین نے طرہ کو مجرم قرار دیا۔ ایک نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور باقی آٹھ اسے بے قصور سمجھ رہے تھے۔

شام کو گھر پہنچ کر اس نے حسب معمول غسل کیا اور ڈنر کے بعد اپنی پسندیدہ موسیقی سننے بیٹھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دو اراکین کو اپنے ساتھ ملا چکی تھی جبکہ نو ابھی باقی تھے۔ اگر وہ روزانہ ایک رکن کو اپنی طرف کرے تو نو دنوں میں اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ کیا سیرینا واقعی مجرم تھی؟ ایمونی کو یہ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس کی پروا تھی۔

چوتھے روز ایمونی نے نو نمبر کو کرید۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فیصلہ کرنے میں ڈانواں ڈول ہو رہا ہے لیکن اس نے کہا کہ سیرینا ایک اچھی لڑکی لگتی ہے۔

”کیا تم اسے محض اس لیے بے گناہ سمجھتے ہو کہ وہ

پچاس کی دہائی کے کپڑے پہنتی ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ اسے اس کے دیکھوں نے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ اپنے لباس، بالوں اور ہلکے میک اپ کی وجہ سے فرشتوں جیسی معصوم نظر آئے۔“

اسے اس بات سے شدید نفرت تھی کہ کسی کو اس کی ظاہری وضع قطع کے لحاظ سے پرکھا جائے۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتی تھی کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسے یاد تھا کہ اسکول میں اس کی سب سے بہترین دوست ہی اس کا مذاق اڑاتی تھی۔ ”اسے دیکھو یہ اپنی ماں کی جینز پہن کر آگئی ہے۔“ ایبونی کی ماں نے اسے ڈھیلی ڈھالی جینز بنا کر دی جبکہ دوسری لڑکیاں ڈیزائنرز جینز پہن کر آتی تھیں۔ وہ اس کے جھٹھے، جسمانی خطوط اور پتلی ناگوں کا مذاق اڑاتیں۔ ایبونی گھر جا کر روزانہ رات کو روتی۔ یہاں تک کہ اس نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا لیکن اس کے دادا نے سلی دیتے ہوئے کہا کہ اسکول کے بعد بھی بہت زندگی باقی ہے جس میں وہ تخلیقی بن کر اڑے گی۔ کسی حد تک یہ بات درست ثابت ہوئی تاہم اس کے ذہن پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔

چوتھے روز اس کے ہم نواؤں میں کسی کا اضافہ نہیں ہوا۔ ایبونی جانتی تھی کہ وہ مزید چند لوگوں کو اپنی طرف کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے اسے تدریس کا کام لینا ہوگا اور وہ اس معاملے کو مزید طول دینے کے لیے تیاریں کر رہی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ حسب معمول نہانے کے لیے ہاتھ میں بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں ایک فلم چل رہی تھی اور جیوری کے اراکین کے چہرے ایک ایک کر کے پرانے زمانے کی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی طرح اس کے سامنے آتے رہے جن میں فلم کے آخر میں ہر کرکٹر کا کلو ز اپ اس کے اصل نام کے ساتھ پردے پر آتا تھا۔ رکن نمبر ایک ایوراموس، رکن نمبر دو ہیرس گوسلو کی اور آخری چہرہ نمبر گیارہ ڈین شلٹر کا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی بھی اس کا ذہن تبدیل نہیں کر سکے گی۔

پانچواں اور چھٹا دن بھی غیر اہم رہا البتہ اگلے دو دنوں میں کچھ تبدیلیاں نظر آئیں اور ایبونی اپنے دوستاؤں نمبر دو اور نمبر پانچ کی مدد سے نمبر ایک اور چھ کی رائے تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن نمبر گیارہ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور وہ بھٹ پڑا۔

”آخر تم کیوں اس عورت کو مجرم قرار دینے پر تلی ہوئی ہو؟“ ایبونی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ”میرا خیال

ہے کہ ہمیں جج کو بتادینا چاہیے کہ یہ ایک معلق جیوری ہے لہذا ہمیں یہ معاملہ کسی احمق جیوری کے سپرد کر دینا چاہیے۔“ ”نمبر ہم معلق نہیں بلکہ صرف بحث کر رہے ہیں۔“ نمبر چھ نے کہا۔ میرٹلین نامی اس عورت کی گروڈا پنگ سینٹر میں ایک چھوٹی سی مگر اچھی چلنے والی دکان تھی۔ ”کیا تم ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہو؟“ نمبر گیارہ نے بتائی سے کہا۔

”میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔“ ”مجھے سب سے والا نمبر دے دو دیکھ کر ایبونی کو اپنے دادا کی یاد آ جاتی تھی، اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں قائل کرو۔“

وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور میز کے گرد بیٹھے گیارہ افراد کو دیکھا۔ اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی اور اسے یقین نہیں تھا کہ وہ انہیں قائل کر سکے گی لیکن اب اس کے لیے موقع تھا کہ وہ فوراً ہی ان پر حملہ کر دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی نمبر دو بیچ میں کود پڑا۔ ”مجھے ہینڈل کرنے دو۔“ ہمیں شروع سے اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔“

ایبونی اس مدد کے ملنے پر خوش تھی۔ اب وہ جہاں نہیں رہی بلکہ اس کے کامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ”میں مختصر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ہیرس نے کہا۔ ”سیرینا ہیویٹ پر قتل کا الزام ہے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جو ناٹمن لینڈو کے مکان میں داخل ہوئی۔ انہوں نے لوٹ مار کی اور مسٹر لینڈو پر بے پناہ تشدد کیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے لیکن مرنے سے پہلے انہوں نے ڈاکوؤں پر گولی چلا دی۔ سیرینا بیچ ٹپکنے میں کامیاب ہو گئی اور پولیس نے اسے جائے وقوعہ سے چند بلاک کے فاصلے پر پکڑ لیا۔ اس کے فرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجرم تھی ورنہ وہ کیوں بھاگتی۔“

ایبونی دل ہی دل میں مسکادی۔ وہ اسی کی زبان بول رہا تھا۔

”یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔“ سات نمبر بروک شیلڈ نے کہا۔

”وکیل صفائی کا کہنا ہے کہ اس کی شناخت میں غلطی ہوئی۔“ نمبر دو نے کہا۔

”جبکہ استغاثہ کا کہنا ہے کہ سیرینا ہی وہ عورت ہے جو وہاں سے بیچ نکلی لیکن ایک عینی شاہد مورینا کا کہنا ہے کہ سیرینا ہی وہ عورت ہے جسے اس نے مجرموں کی کار میں بیٹھے دیکھا۔“

”کار کے شیشے آدھے کھلے ہوئے تھے۔ اس کی محض جھلک ہی نظر آئی ہوگی۔“ نمبر گیارہ نے اعتراض کیا۔
 ”ممکن ہے لیکن میں نے کس مورچہ کی گواہی کو قابل اعتبار پایا۔“ نمبر دو نے نمبر گیارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”مکان میں اس کی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں پائے گئے۔“ نمبر گیارہ نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”ممکن ہے کہ وہ وہاں دوا بھی خریدنے کے لیے رک گئی ہو یا کسی دوست سے ملنے گئی ہو۔ اس نے اسی لیے غلط بیانی کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس ہنگامے سے الگ رکھنا چاہتی تھی۔“ نمبر گیارہ نے کہا۔

”میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں کیا کرتی اگر یہ حملہ میرے دادا پر ہوا ہوتا۔ کیا ہم اپنے گھروں میں محفوظ ہیں؟“ ایبونی نے کہا۔

بحث کے خاتمے پر دو ٹنگ ہوئی۔ اس بار نمبر نے بھی ملزم کو مجرم قرار دے دیا۔ ایبونی اس کا میا پی پر مسکرا دی۔ اس کی منزل قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔

آخوئیں دن کوئی بھی وہاں مزید رکنے کا خواہش مند نہیں تھا اور سب گھر جانا چاہ رہے تھے۔ ”مجھے اپنے کام پر واپس جانا ہے۔“ نمبر چار نے بحث کے دوران نمبر ایک سے کہا۔

”اگر وہ کار میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی تو ممکن ہے کہ وہ گھر میں نہ گئی ہو لیکن اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دو ساتھی مکان میں گئے اور انہوں نے مسٹر لینڈ پر تشدد کیا پھر اس کا سیل فون بھی قریبی ٹاور سے سنل وصول کر رہا تھا۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کا انتظار نہیں کر رہی تھی تو اس کی اس علاقے میں موجودگی کا کیا جواز ہے؟“ نمبر دو نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہمیں نہیں معلوم کہ وہ وہاں موجود تھی۔“ نمبر گیارہ نے کہا۔

ایبونی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”موجودہ ٹیکنالوجی کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس کا سیل فون کہاں تھا؟“

اس نے اس امید پر جھوٹ بولا کہ لوگ ہر اس بات پر یقین کر لیتے ہیں جو کہ کسی نامہاد ماہر کی طرف سے کہی جائے۔

”یہ سچ ہے۔ میں نے کرائم سین الوبیٹی کیشن شو میں دیکھا تھا۔“ نمبر دو نے کہا۔

”اور استغاثہ نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ وہاں موجود تھی۔“ نمبر دو بولا۔ ”کیونکہ گواہوں کے بیانات اور مسٹر لینڈ کے گھر کے باہر لگے ہوئے سیکوریٹی کمرے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔“

”نیر ٹھیک ہے۔“ ایبونی نے کہا۔ ”استغاثہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ملزم کم از کم ایک ڈاکو کو پہلے سے جانتی تھی۔“

”بسکول کے زمانے سے۔“ نمبر گیارہ نے طنزاً کہا۔
 ”ممکن ہے کہ وہ پہلے سے رابطے میں ہوں۔“

رینا بولی۔
 نمبر نو ایبونی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”وہ پہلے ہی اس بارے میں جھوٹ بول چکی ہے کہ وہ شہر کے اس علاقے میں کیا کر رہی تھی۔ اس نے جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کے بارے میں بھی غلط بیانی کی۔ اگر وہ قصور وار نہیں تو اس نے ایسا کیوں کیا؟“

ایبونی جانتی تھی کہ وہ اسناک بروکر ہے اور چوری میں آنے سے اسے مالی نقصان ہو رہا تھا لیکن اس کی کمپنی چاہتی تھی کہ وہ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں پوری کرے۔ اسے اس خدمت کا بہت معمولی معاوضہ مل رہا تھا۔

دوپہر کے وقفے میں باہر نکلتے ہوئے وہ جان بوجھ کر نمبر چار سے ٹکرائی۔ ”معاف کرنا۔“ میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ دراصل یہاں آنے کی وجہ سے مجھے کمپنی سے تنخواہ نہیں مل رہی۔“ اس نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

”مجھے بھی۔“ نمبر چار نے کہا۔ ”مجھے کمیشن نہیں مل رہا۔“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اسے جلدی ختم کر کے گھروں کو لوٹ جائیں؟“

دن کے اختتام پر دو ٹنگ ہوئی تو نمبر چار نے بھی ملزم کو قصور وار قرار دے دیا۔ یہ محض اس سرگوشی کا نتیجہ نہیں تھا جو ایبونی نے وقفے کے دوران اس سے کی تھی بلکہ وہ گزشتہ شب ہی اپنے آئی پیڈ پر نمبر چار سے متعلق وہ معلومات حاصل کر چکی تھی جو اس کا ذہن تبدیل کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

نواں دن سب سے اچھا رہا۔ اس روز ایبونی کے ہم نواؤں میں تین اراکین کا اضافہ ہوا۔ یہ تین تین سات اور دس تھے۔ ان کے نام شریڈر، ریسکی اور لیو تھے۔ وہ تینوں پہلے یا دوسرے دن سے ہی آپس میں مکمل مل گئے تھے اور کھانا کھانے بھی ایک ساتھ ہی جاتے۔ ایبونی جانتی تھی کہ

کے علاوہ ہر ایک کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ اب اسے کچھ اور سوچنا تھا۔ اس شام ٹب میں نہاتے ہوئے اسے ایک ترکیب سوچھیں گئی۔

گیارہویں روز بج نے اراکین جیوری کو کرائے عدالت میں طلب کیا۔ وہاں صرف طرہ و کیوں، عدالتی عملہ، بلیف اور جیوری کے علاوہ کوئی غیر متعلقہ شخص موجود نہیں تھا۔ ”مجھے آج صبح ایک دلچسپ خط ملا ہے۔“ اس کی آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔ ”فی الحال میں یہ نہیں بتا رہی کہ اس میں کیا لکھا ہے لیکن یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ کیا کوئی رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرے گا؟“

سب خاموش رہے۔ بج اپنے کمرے میں واپس چلی گئی اور اس نے فردا فردا جیوری کے ہر رکن کا انٹرویو کیا۔ بظاہر کسی نے بھی نوٹ بھیجے کا اعتراف نہیں کیا لیکن نمبر گیارہ کو شکریہ کے ساتھ واپس جانے کے لیے کہا گیا۔

”میں نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔“ وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا، جاتے ہوئے اس نے ایبونی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ آئندہ کبھی تم لوگوں سے ملاقات نہیں ہوگی۔ خاص کر تم سے۔“

اس رات غسل کرتے ہوئے ایبونی کو جھرجھری آگئی۔ اس کا پورا جسم مل رہا تھا۔ حالانکہ نمبر گیارہ سے نجات مل چکی تھی۔ ایبونی نے گزشتہ شب اس کا کمپیوٹر ہیک کر کے معلوم کر لیا تھا کہ اس کا بیٹا جیل میں ہے۔ اسے یاد تھا کہ وکیل استخاضے سے پہلے ہی دن تمام اراکین جیوری سے پوچھا تھا کہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار کسی جرم میں ملوث تو نہیں تو نمبر گیارہ خاموش رہا۔ شاید وہ اسی لیے طرہ کو بے قصور قرار دینے کے موقف پر سختی سے قائم تھا۔ اسے اس نظام انصاف سے نفرت تھی۔ وہ بھی طرہ کو مجرم قرار نہ دیتا اور وہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے پوری جیوری کو قسم کرنا چاہ رہا تھا۔ ایبونی نے گناہ بن کر یہ تمام معلومات بج کو بھیج دیں اور اس طرح نمبر گیارہ کو جیوری سے الگ کر دیا گیا۔

بارہویں روز کی کارروائی میں نمبر گیارہ کا متبادل رکن بھی شریک ہوا۔ جوش لینگروں ایک پلیر تھا اور اپنے کام پر واپس جانا چاہتا تھا۔ ایبونی جانتی تھی کہ وہ آسانی سے قابو میں آ جائے گا۔ اس نے اس کی زندگی میں جھانک کر اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ کھانے کے وقفے

اگر اس نے شریڈر کو اپنی طرف کر لیا تو باقی دونوں بھی اس کا ساتھ دیں گے چنانچہ اس نے شریڈر پر اپنا داؤد آزما دیا۔

”میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی لیکن میرا خیال ہے کہ سیکیورٹی کیمرے کی مدد سے اس کے چہرے کی شناخت ہو رہی ہے۔“

”لیکن کیرا مسٹر لینڈو کے دروازے پر لگا ہوا تھا اور طرہ وہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ سیرینا یا مگی البتہ تصویر میں وہ توہڑی اس جیسی لگ رہی ہے۔“

”لیکن ماہرین.....“ ایبونی نے کہا۔

”وہ غلط بھی ہو سکتے ہیں اور یہ تصویر اتنی صاف بھی نہیں ہے بلکہ دھندلی لگ رہی ہے۔“ ریمسی نے کہا۔

ایبونی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں کافی معلومات ہیں۔ وہ حساب کتاب کے ذریعے دھندلی تصویر کا موازنہ چہرے کے نقوش سے کر سکتے ہیں اور اس میں نانوے فیصد کامیابی کے امکانات ہیں۔ اگر تمہا نیوں سے بھرے ہوئے فٹ بال اسٹینڈیم میں کسی دہشت گرد کی شناخت ہو سکتی ہے تو میں جیوٹ کی کیوں نہیں؟“

وہ دیکھ رہی تھی کہ شریڈر کا داغ تیزی سے کام کر رہا ہے۔ اس نے ریمسی اور لیو کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح طرہ کو قصور وار سمجھنے والوں میں تین اراکین کا اضافہ اور ہو گیا۔

جب وہ چھوٹی تھی تو اسے بتایا گیا تھا کہ عدالتوں سے انصاف ملتا ہے لیکن اب وہ جان گئی تھی کہ ایک مقدمہ چھوٹی لڑائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس میں زنجیروں اور ہتھیاروں کی جگہ سوٹ اور ٹائیوں نے لے لی تھی۔

دسویں دن صرف نمبر گیارہ اور نمبر بارہ ہی اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کسی بھی وقت جھڑپ ہو سکتی تھی۔ نمبر سات خطرہ محسوس کرتے ہوئے درمیان میں آ گیا اور بولا۔ ”پڑسکون ہواؤ۔“

ایبونی نے بارہ نمبر سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ تو آج کا دن تمہارے نام ہو جائے گا۔“

شاید وہ طرہ کو بے قصور سمجھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود ایبونی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طرح طرہ کو مجرم سمجھنے والے اراکین کی تعداد گیارہ ہو گئی جو کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بہت زیادہ تھی۔ وہ نمبر گیارہ

تک وہ بھی ایسوی کا ہم نوا بن چکا تھا۔ اس طرح جیوری ایک حلقہ فیصلے پر پہنچ گئی۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو جیوری کے ترجمان خبر سات نے تحریری موقف بیلٹ کے حوالے کیا جس میں متفقہ طور پر طرہ کو مجرم قرار دیا گیا تھا۔ وکیل صفائی کے مطالبے پر سبھی اراکین نے اپنی رائے کو تسلیم کیا اور جج نے ان کا شکر یہ ادا کر کے عدالت برخاست کر دی۔

سیرینا کے علاوہ سب لوگ مقدمہ ختم ہونے پر خوش تھے۔ وہ ایک طویل عرصے کے لیے جیل جا رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے بازو میں زہر کا انجکشن لگایا جاتا لیکن کیلی فورنیا میں موت کی سزا ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے ساری زندگی جیل میں گزارنا تھی۔

اسے سیرینا پر تھوڑا سا انفسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں مڈل اسکول تک بہترین سہیلیاں تھیں لیکن ہائی اسکول میں سیرینا نے سنجیدہ لڑکوں سے دوستی کر لی جبکہ ایسوی ان حق لڑکوں سے ملتی رہی۔ جس پر سیرینا اسے طعنے دیتی اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اس طرح دوستی دشمنی میں بدل گئی۔

تاہم وہ اسے اب بھی دوست سمجھتی تھی۔ لہذا اس نے سیرینا کو رازدار بناتے ہوئے یو بی بریٹ کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ یو بی اسکول کا سب سے معقول لڑکا تھا۔ سیرینا نے اسے اذیت دینے کے لیے کہا۔ ”تم یو بی بریٹ سے محبت کرتی ہو۔ کیا تمہیں بچے پیدا کرنے ہیں؟“

سیرینا کے الفاظ میں صرف طنزی نہیں چھپا ہوا تھا بلکہ وہ سریمیا ایسوی کی بے عزتی کر رہی تھی۔ اگلے دن پورے اسکول کو یہ بات معلوم ہو گئی اور ایسوی سمیت سب لوگوں کو پتا چل گیا کہ ان کی رفاقت ختم ہو گئی ہے لہذا لوگوں نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا اور وہ ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بن گئی۔ سیرینا اور اس کے دوست اسے بے رحمی سے چھیڑتے اور پوچھتے کہ کیا وہ یو بی کے ساتھ فلم دیکھنے یا گھومنے پھرنے جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اسکول کے آخری دن تک کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہا۔

لہذا جب اسے جیوری کا رکن بنایا گیا اور اس نے اپنی پرانی دوست کو وہاں دیکھا تو وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ سیرینا شاید اسے پہچان لے۔ گو کہ اس نے کافی حد تک اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تھا لیکن پھر بھی اس کا امکان موجود تھا۔ سیرینا اسے لیوا پاؤل کے نام سے جانتی تھی لیکن اس کی ماں کو طلاق ہوئی تھی تو اس کے سوتیلے باپ

نے اسے قبول کر لیا۔ اب اس کا نام ایسوی ٹیلر تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی شکل صورت میں بھی تبدیلی کی۔ بالوں کو ڈائی کر کے ترشوا لیا۔ لیور آئی سرجری کے بعد اسے چشمہ لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کی شخصیت بالکل بدل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی اندر سے لیور ای تھی لیکن دیکھنے میں کافی مختلف نظر آتی تھی۔ نام کی تبدیلی کی وجہ سے سیرینا بھی اسے نہ پہچان سکی۔ ویسے مقدمے کی سماعت کے دوران میں بیشتر وقت اس نے اپنی نظریں نیچی رکھیں اور جیوری کے لوگوں کو بالکل نہیں دیکھا۔

سیرینا پلڈر گھر میں گھر کر ڈکیتی کے دوران ایک بوڑھے شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا جس پر اسے موت کی سزا ہو سکتی تھی لیکن ایسوی کے دماغ میں اس کے خلاف شک کرنے، اسے دھم کرنے اور اس کی زندگی برباد کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ کیا یہ سزا ان جرائم کے لیے موزوں تھی؟ کیا ان جرائم کو دیکھتے ہوئے سزائے موت کچھ زیادہ نہیں؟ شاید ہاں یا شاید نہیں۔

ایسوی جانتی تھی کہ اس سزا پر کبھی عمل نہیں ہوگا۔ وہ چالیس سال کی عمر میں بیس برس بعد قید سے رہا ہو جائے گی۔ اس کے بعد بھی اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کافی وقت ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایٹل کرنے پر وہ جلد رہا ہو جائے۔ بہر حال وہ بے قصور تھی اور ممکن ہے کہ ایک اچھا وکیل ایٹل کی سماعت کے دوران اسے بے گناہ ثابت کر دے۔ اس دوران اسے چند ماہ جیل میں رہ کر پتا چل جائے گا کہ سماجی قیدی اسے کس طرح شک کرتے ہیں اور وہ ان کا مقابلہ کیسے کرتی ہے۔

وہ کسی کے ساتھ اپنی جیت کی خوشی منانا چاہتی تھی لیکن اس کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا کوئی آخری دوست نہیں تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتی چنانچہ اس نے اس خوشی کو بھی اپنے تنگ ہی محدود رکھا اور اپنے معمولات سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ شب میں لیٹی اپنی من پسند غزلیں اور موسیقی کے مزے لے رہی تھی اور حیران تھی کہ بعض اوقات زندگی اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں جمہا کا ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس نے شخص ڈانی اٹا اور دشمنی کی خاطر سازش کر کے ایک بے گناہ عورت کو ایسے جرم میں سزا دلوا دی جو اس نے نہیں کیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب استراج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان





دراز قامت تھا۔ ہنری نے اسے اپنی یونیورسٹی کا این اوسی اور تاج برطانیہ کا وہ خط لکھا دیا تھا جو وہ لندن سے روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا۔
 ”تمہیں ان کاغذات کی بھلا کیا ضرورت تھی..... مائی ڈیرسٹ فرینڈ!“ مائیکل کا بیان جاری تھا۔ وہ چست فوجی لباس میں لبوس تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔

”بعض راہداریوں کو پار کرنے کے لیے ایسے پروانے لازمی ہوتے ہیں، تاکہ ہم جیسے کسی پر دیسی کو قاتلونی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ حکیم طبع اور اپنی قوم سے یکسر مختلف سوچ کے حامل پروفیسر ہنری برنارڈ نے بھی دوستانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”ہا ہا..... قاتلون..... راہداری..... پروانہ.....“
 لیفٹیننٹ جنرل شانے اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سابقہ خارج کیا۔ ”یہاں صرف گریٹ برٹن کا قاتلون چلتا ہے اور ہمیں یہاں داخلے کے لیے کسی بھی قسم کے پروانوں کی ضرورت نہیں۔“

پروفیسر ہنری کو اس نقلی موضوع سے کوفت ہونے لگی۔ وہ اپنی جس ریسرچ کے سلسلے میں آیا تھا وہ کام نمٹا کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کسی بحث میں پڑے بغیر مسکرا کر کہا۔
 ”اچھی بات ہے لیکن..... میری کوو شالیہ کی طرف روانگی کا جلد بندوبست کرو دو تو بہتر ہوگا۔“

”ارے..... ابھی تمہیں آئے چند ہی روز تو ہوئے ہیں مائی ڈیرسٹ فرینڈ! کیا اتنی جلدی تم نے ٹیم بھی بنائی؟“ مائیکل کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس نے اپنی گلاہی ختم کی اور باس ایک اونچی کٹھولی پر رکھے ٹوٹی والے بڑے سے عین کے جگ کی طرف بڑھ گیا اور اپنی گلاہی اسی مشروب سے بھر لیا۔ ساتھ ہی اس نے ہنری کو بھی اشارہ کیا تھا مگر اس نے اپنی خالی گلاہی قریب دھری ایک تپائی پر رکھ کر انکار میں سر کو جنبش دی۔

”میں اپنی ٹیم بنانے کا نصف کام پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہاں کچھ ایسے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی، وہ بھی تمہاری مدد سے میں ہائر کر چکا ہوں۔ اب بس مجھے روانہ ہونا ہے۔“

”ویل.....! کچھ دن اور مجھے دے دو، ابھی حالات بہتر نہیں ہیں۔ بٹ..... ڈونٹ دری! جلد ہی بہتر ہو جائیں گے..... کلیئر ٹرس ملتے ہی تمہیں آگاہ کر دوں گا۔“

یہ ریاست ناگرہ..... کے مضائقہ علاقے میں ایک خوبصورت پہاڑی وادی کا منظر تھا جس کے دائیں جانب ہر دوڑ کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی دم کو بھادوں میں برسنے والی نمی۔ وہ مختصر قافلہ جس کا سالار ایک برطانوی باشندہ تھا جو نہ فوجی تھا، نہ اس کا تعلق انگریزوں کی کسی ایسی کمپنی سے تھا جو بچے کھچے باغیوں کے سرفروش گروپ سے نہرو آزما بھی بلکہ اس کا نام سیاسی ریشہ دوانیوں سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ اس کا نام پروفیسر ہنری برنارڈ تھا۔ وہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت، ماہر لسانیات اور پروفیسر تھا۔ اپنی ایک علمی ریسرچ کے سلسلے میں وہ لندن سے ہندوستان آیا تھا اور دلی میں ایک انگریز لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کے ہاں مقیم تھا۔ اس کے مختصر قافلے میں ہرٹل قومیت کے لوگ شامل تھے، جن کی حیثیت ملازموں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ ماسوائے اس کے خاندان کے ایک فرد کے..... اور وہ فرد اس کی جواں سال اور کل رعنائی ریتا تھی۔ وہ مندر کے لندن سے باپ کے ساتھ آئی تھی۔ وہ فخرنا ایڈ وینچر پسند تھی۔ باقی دیگر ملازمین کی تعداد پانچ تھی۔ دو تو انگریز فوجی تھے، جنہیں ساتھ لینے پر پروفیسر ہنری برنارڈ مجتہز ہوا تھا، مگر مائیکل شانے احتیاطاً انہیں اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک نوجوان فرنگی جوڑا بھی تھا۔ دو بوڑھے میاں بیوی ملازم تھے۔ یہ ہندو تھے اور پانچواں شخص ایک خوب رو اور مسلمان نوجوان شوکت حسین تھا۔ یہ مائیکل شا کے گھوڑوں کے سائیکس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا تھا۔

ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی کی تو بات تھی جب پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی جواں سال خوبصورت بیٹی ریتا کے ہمراہ لندن سے دلی پہنچا تھا۔

”ویل مسٹر ہنری! ہم آپ کو یہاں تاج برطانیہ کی حکومت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔“

دلی کی ایک قلعہ بند، قابض حویلی میں لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا، جو ایک سرخ فوجی وردی میں لبوس تھا، نے پروفیسر ہنری برنارڈ اور اس کے مختصر خاندان کا پرچاک استقبال کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے غاصبانہ نتج کی بو آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشے کی چھوٹی سی ”گلاہی“ تھی ہوئی تھی جس میں انگوری مشروب تھا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ایک ایسی ہی گلاہی اس نے ہنری کو بھی تمہار تھی۔

جنرل مائیکل شا، ہنری برنارڈ کا ہم عمر اور اسی کی طرح

مشرّب انڈیل کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور ایک طرف موذبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔
 ”لگتا ہے تم دونوں کوئی خاص خبر لائے ہو۔۔۔۔۔؟“
 مائیکل شانے ان کے سامنے دھری گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل سرکار!۔۔۔۔۔! خبر کیا ہے بس ایک نیا کھراگ سمجھ لو۔۔۔۔۔“ چندی چندی مکار آغموں اور لبوترے چہرے والے لال چندنے فکر مند لہجے میں کہا۔
 ”کیسا کھراگ؟“ مائیکل نے اپنی آنکھیں کھیر کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سرکار!۔۔۔۔۔! جنگ آزادی تو اپنے آخری دم پر ہے مگر ان مسلوں کے دلوں میں ایک نئی تپسی پروان چڑھنے لگی ہے۔۔۔۔۔“
 ”ذرا مکمل کر بات کرو مسٹر چندا کر ہم کچھ سمجھ سکیں۔“
 تب ہی لال چندنے اپنے ساتھ بیٹھے ساتھی کرکھ کی طرف دیکھا تھا جو اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر جزل مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔

”سرکار!۔۔۔۔۔! مسلمانوں کے دلوں میں ودوئی نظریے کی بنیاد پڑنے لگی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک دہلا پتلا پارسی لوجوان ہے جو طلبہ عظیم کالیدزمی ہے، وہی دھیرے دھیرے یہ بیج بوتا ہے۔ آگے چل کر وہ ان مسلمانوں کا راہنما (قائد اعظم محمد علی جناح) بھی بن سکتا ہے اور سرکار کے لیے تو سب سے بڑا خطرہ بننے والا ہے وہ مسلمان۔۔۔۔۔ وہ وکالت پڑھ رہا ہے۔ بہت قابل طالب علم ہے اور قانونی جنگ کرنا جانتا ہے۔“ کرکھ نکلنے اپنی بات ختم کی تو جزل مائیکل کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولا۔

”مسلمانوں میں اب کوئی دم ختم نہیں رہا ہے۔ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو ہم کالے پانی کی سزا پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ بجھتے چراغ کی وہ آخری روشنی ہے جو ٹھمنے کے بعد سرد ہو جاتی ہے۔ تم لوگ اس کی فکر نہ کرو۔۔۔۔۔“

”لیکن سرکار!۔۔۔۔۔! ہمارے لوگ چاہتے ہیں کہ اس تحریک کو ابھرنے سے پہلے ہی اس کی پہلوئی میں ہی ٹھٹھ کر دو۔۔۔۔۔ یہ آگے چل کر آپ کے لیے بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔“ اس بار لال چندنے کہا تو مائیکل چندا نے کچھ سوچتے کے بعد اپنی جیب سے ایک سگار کیس نکال کر بولا۔

”تو ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔۔ برصغیر کے ہندو مسلم جواہتی آزادی کی جنگ میں مصروف ہیں، انہیں مسلمانوں کے دلوں کے میل سے آگاہ کر دو۔۔۔۔۔ پھر آزادی کی یہ طاقت

اس کی بات پر ہنری کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار آئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر یہ بات آتے آتے رہ گئی کہ۔۔۔۔۔“ کمال ہے مشرٹا! یہاں آپ نے کیسی حکومت بنا رکھی ہے، جہاں قلعہ بند رہنے کو محفوظ اور باہر نکلنے کو خطرہ سمجھا جاتا ہے؟“ مگر وہ خاموش رہا۔

اسی وقت ایک وردی پوش سپاہی اندر داخل ہوا اور جبکہ کر موذبانہ انداز میں جزل مائیکل سے بولا۔ ”سر! لال چندا اور کرکھ نکلنے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ہمارے وفادار آگئے۔ ضرور کوئی خاص خبر لائے ہوں گے فوراً سمجھو انہیں۔۔۔۔۔“ جزل مائیکل شانے کہا۔ سپاہی اگلے ہی دلوں لوٹ گیا۔ ہنری ایک گہری سانس لے کر وہاں سے جانے کی غرض سے بولا۔

”تم اپنے وفاداروں کے ساتھ میننگ کرو، میں ذرا۔۔۔۔۔“
 ”نہیں۔۔۔۔۔“ مائیکل نے اس کی بات کاٹ دی اور معنی نیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ذرا تم بھی اس میننگ کا حال آنکھوں سے دیکھ لو۔۔۔۔۔ اور دیکھو کہ ہماری چالوں نے کس طرح یہاں لوگوں کو ہمارا مطیع اور فرماں بردار بنا رکھا ہے۔“

”دماغی چالوں سے یا زور و طاقت۔۔۔۔۔“ ہنری نے زہرباب کہا تھا جسے مائیکل شانے نہ سکا تھا کیونکہ اسی وقت دو افراد ویدوانہ انداز میں ہاتھ جوڑے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے سفید مٹل کی دھوئی اور اوپر لبا کرتہ پہن رکھا تھا۔ چہروں پر چالو سانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ رنگ سانولے تھے۔ ان میں سے ایک ویدوانہ مہرکا اور دوسرا پتہ العرق تھا۔ یہ دونوں ہندو پیٹے ان لوگوں سے تعلق رکھتے تھے جو انگریز حکمران کے مراعات یافتہ اور راتب خور تھے۔ یہی نہیں، بلکہ انگلیہ آری میں ان دونوں کو ایک خاص عہدہ بھی انگریز سرکار نے تفویض کر رکھا تھا۔

”بیجی کی جے ہو۔۔۔۔۔ بیجی زندہ آباد۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ دونوں ”ٹوڈی مین“ اندر داخل ہوئے اور نہایت موذبانہ انداز میں انہوں نے مائیکل سمیت ہنری کو بھی کورٹس کیا۔

”بیٹھو۔۔۔۔۔ بیٹھو مائی ڈیر فرینڈز!“ جزل مائیکل شانے نے ان دونوں سے کہا۔ لال چندا اور کرکھ نکلنے سامنے والے ایک صوفے پر دھنس کر بیٹھ گئے جبکہ جزل مائیکل پہلے ہی اپنے صوفے پر برابر اجماع ہو گیا تھا اور ہنری کو بھی اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

انہیں لانے والے ملازم کو مائیکل نے اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے ایک خوبصورت شیلٹ پر رکھی دو گلاسوں میں

منقسم ہو کر خود ہی ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔“

”ارے واہ..... سرکار! کیا کجب کی ترکیب سوچی ہے، ہم آج ہی سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور مسلوں کی اس سازش سے انہوں کو آگاہ کرتے ہیں۔“ لال چند نے خوش ہو کر کہا اور پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

”دیکھنا تم نے بائی ڈیزیزسٹ فرینڈ! کس طرح ہم لڑاؤ اور حکومت کو دلی پالیسی پر چلتے ہیں۔“

”مجھے اب اجازت دو تو بہتر ہوگا.....“ پروفیسر ہنری برنارڈ نے خاصی بیزاری سے کہا اور اٹھ کر اوپری منزل کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اپنے عقب سے مائیکل کے بدست قمیض کی گونج سنائی دی تھی۔ جو عنقریب پورے برصغیر میں فسادات اور کشت و خون کی ایک نئی قیامت لانے کا پہل بجا رہی تھی۔

☆☆☆

کوہ شمالیہ..... کی وہ رات کسی لاش کی طرح سرزاد اور خاموش تھی..... مہبوت احمدیادوں میں سنگلاخ پہاڑیوں کے بیوئے خوابیدہ عفریت کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے دامن میں کل پانچ نفر کا بڑا ڈاکو تھا۔ وہ پانچوں جوان الماد کے گرد جمع تھے اور دشمنی ہوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

الاد پر ایک چوٹی چٹینی میں جنگلی خرگوش کے دوسالہ پٹھور..... پک کر یونی کی طرح سرخ ہو گئے تھے اور وہ باتوں کے دوران اس پر سے گوشت لٹو لٹو کر کھا رہے تھے۔ چوٹی چٹنیوں کی لکڑی کو کنڈہ باوری کے درخت کے بیروڑے سے ترک کیا گیا تھا اسی لیے وہ آگ میں جلنے سے قدرے بچی ہوئی تھیں۔ یہ مخصوص لکڑی اور بیروڑا مل کر ایک ایسا تیل نما مواد بھی خارج کر رہی تھی جو خرگوش کے گوشت کو لذیذ بناتے ہوئے تھی۔

ان کے سروں پہ کھانا تاریک آسمان تھا، وہاں بھی کہرے اور دھند کے بادل سے ٹھہرے ہوئے نظر آتے تھے۔ قہر و جوار کی سنگلاخ گھاٹیوں اور دروہی میں سرد ہوا میں سرسراتی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ بھی دو سر کی آوارہ جانور کی آواز ابھرنی تھی اور پھر وہی دم بہ خود سا سکوت طاری ہو جاتا۔

”میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“ ان میں سے ایک نے ہولے سے کہا۔ اس نے کھد کا پیرانا مگر گرم لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور بھھرے ہوئے تھے۔ اس نے بوسیدہ سی شال اوڑھ رکھی تھی۔ چہرہ قدرے

دبلا، جڑے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں مگر جسم کسرتی تھا۔ آنکھیں ایک عزم میم کی چمک سے روشن محسوس ہوتی تھیں۔ نشانے چوڑے تھے۔

”اتنی جلدی کیا ہے، شاہ زمان! ہم خطرے سے باہر اور منزل کے قریب ہیں۔ ٹھوڑا اور سستا لینا چاہیے ہمیں۔ سہ پہر سے ہم مسلسل سفر میں ہیں۔ انگریز کمپنیوں کے چھاپوں کے ڈر سے ہم کہیں بھی نہیں ٹھہر سکتے۔“

اس کے دائیں جانب بیٹھے ایک دوسرے نوجوان نے کہا۔ یہ علی رحمان تھا۔ فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل غیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ وراز قامت مگر چھپرے جسم کا مالک جس کے جسم کی حرکات و سکنات سے ایک خاص قسم کا جنگجوانہ انداز نکلتا تھا۔ جنرل غیر خان کے گروپ میں اسے ”بارودی ماہر“ کہا جاتا تھا۔

”یہ تو شکر ہوا کہ راستے میں انڈین ٹائفرک مل گیا، ورنہ تو تھک کر چڑھ رہی ہو جاتے۔“

پہلے والے نے کہا۔ اس کا نام احسان جامو تھا۔ یہ کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی اور ایک پورے گروپ کا انجارج تھا جبکہ ان کا تیسرا ساتھی شاہ زمان بذات خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا گروہ ”کاروان مجاہد“ کہلاتا تھا۔ باقی دو بھی اسی کے ساتھی تھے۔ جو اپنے لیڈر کے ہمراہ آئے تھے۔ ان میں ایک شرجیل شگری اور دوسرا قیصر شاہ تھا۔ ان میں گروپ لیڈر علی رحمان تھا۔

ان پانچوں کو ایک خطرناک اور اہم مشن سونپا گیا تھا جو مکمل طور پر گوریلا آپریشن تھا۔ ان کے پاس اسلحے کے نام پر دو توڑے دار بندوقیں، ایک کیلی بارڈاٹفل اور برطانوی گن مارک تھی۔ علاوہ ازیں تین عدد بارودی تیبلے، تین سنگینیں بھی تھیں۔ ان کی منزل قریبی ریاست ناگرہ تھی۔

یہاں کا مہاراجا چندر گپتا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز لیفٹیننٹ کمپنی کمانڈر رائل شا کو دوسلم ریاستوں کے خلاف مکمل سپورٹ کر رہا تھا۔ اگرچہ مذکورہ دور ریاستوں میں سے ایک ریاست تریپال میں مسلمان نواب شہباز خان کی حکومت تھی جبکہ اس سے ملحقہ ریاست پالن پور بھی جس کا مہاراجا مہندر سنگھ نواب شہباز خان کا حلیف تھا۔ اگرچہ اس ”دوٹی“ میں بھی اس کا اپنا مفاد کارفرما تھا تاہم وہ نواب شہباز خان کی دوٹی کا دم بھرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز سامراج نے چندر گپتا کو شہ دے رکھی تھی کہ وہ ان دونوں ریاستوں پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو جائے، اس کی مکمل سپورٹ کی جائے گی۔ اس کے لیے وہ اپنے نائب

کئی افسر جان پال کوروانہ کرنے والا تھا اور عنقریب اسی سلسلے میں وہاں کے مہاراجا چندر گپتا کی محل نما حویلی میں فرنگی کمانڈر جان پال کی اپنے خاص ساتھیوں کی معیت میں مہاراجا کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں مہاراجا چندر گپتا کے سینا پتی (سپہ سالار) موج سنگھ نے اس فرنگی افسر نائب کو ضروری بریفنگ دینا تھی، تاکہ وہ تریپال اور پالن پور پر چڑھائی کرنے کے لیے اپنی رجمنٹ اور عسکری نفری بھیجے کا بندوبست کر سکے۔ اسی ”خصوصی نشست“ کو سبوتاژ کرنے کے لیے ان پانچوں مجاہدوں کو گوریلہ مشین پر روانہ کیا گیا تھا تاکہ ایک طرف مہاراجا چندر گپتا فرنگیوں کے ساتھ اس غاصبانہ گٹھ جوڑے باز آجائے اور اسے دھمکی بھی مل جائے کہ اس طرح کی حرکت اسے دھمکی پرکتی ہے اور باقی مجاہدین کارخانہ کی ریاست کی طرف ہونے سے ان کا اپنا امن تہاہ ہو جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان مذکورہ پانچوں مجاہدین نے وہاں بشیر کی جانی نقصان کے بدامنی پھیلانے کے لیے کچھ کارروائیاں بھی انجام دینا تھیں اور جاسوسی کے لیے انہیں وہیں کچھ عرصے کے لیے ڈیرا بھی ڈالنا تھا۔ اس ”خصوصی نشست“ کی خبر شہباز خان کے ہی ایک جاسوس شائل نے انہیں دی تھی جو وہیں خفیہ طور پر منتقل تھا اور انہوں نے ناگرہ پہنچ کر سب سے پہلے اسی سے رابطہ کرنا تھا۔

کوہ شالیہ کی ان تینوں قریبی ریاستوں نے دیگر ریاستوں کی طرح اسی وقت آزادی اور خود مختاری حاصل کر لی تھی جب انگریزوں کی سیاسی ریشہ وادہوں نے مغلیہ کوئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کر کے رکھ دیا تھا۔

ملک کے ایک بڑے حصے پر انگریز قابض تھے اور مغلیہ کے آخری تاجدار ظفر شاہ کو بھی اپنے راستے سے ہٹا کر پورے ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نگہ نظری، تعصب اور ناردوا حکمت عملی سے پورے ملک میں اشتعال پھیل گیا تھا اور محب وطن عناصر نے جگہ جگہ توڑی بہت قوت جمیع کر کے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ جسے انگریزوں نے ”غدر“ کا نام دے رکھا تھا۔ باغیوں میں زیادہ تعداد مسلمان مجاہدین کی تھی۔ کچھ ہندو بھی تھے، مگر وہ زیادہ تر غدار اور مسلمانوں کے ساتھ حق تعالیٰ نہ روئے کے باعث انگریزوں کی پس پردہ پشت پناہی کر رہے تھے جس کے باعث انہیں بڑی بڑی مراعات حتیٰ کہ ریاستیں تک ملی

کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہر کیف..... پانچوں مزید کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ روانہ ہو گئے۔ ایک درے سے گزرنے کے بعد وہ ریاست ناگرہ کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں انہوں کی سنگلاخ بلند یوں سے پیدا ہو کر لکیر لکیر اُبھرنے لگی تھی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ غماز ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دشمن علاقے کی سرحد کے قریب تھے اور کسی وقت بھی چوب دار یا مہاراجا کے مسلح چوکیداروں کی نظروں میں آسکتے تھے۔ ان کے خیر نے ریاست میں داخلے کے لیے ایک خانہ بدوش کی بستی کا پتا بتایا تھا جو کتھ کے تہوار پر قافلے کی صورت میں ریاست ناگرہ میں بغیر تلاش اور رکاوٹ کے داخل ہونے کی اجازت رکھتے تھے۔ اس قبیلے میں شامل ہونے کے لیے راہ پہلے ہی ہوار کی جاچکی تھی۔ اس شخص کا نام تارا تھا۔ وہ ایک لالچی شخص تھا اور پیسے لے کر حریت پسندوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس نے ان سے ترمائی کی ایک گھاٹی کے پاس، پو پھوئے ہی ملاقات کا وعدہ

مالاکیں بکھری پڑی تھیں۔

”اب تہرت کام نہ لالو..... دیری ہو رہی ہے۔ آگے بھی جانا ہے ہمار کو.....“ گھما کے دہانے کے پاس گھڑے محتاط انداز میں باہر جھانکتے ہوئے تارائے ان سے کہا۔

وہ پانچوں حرکت میں آگئے اور ذرا ہی دیر بعد وہ سب بھی تارائیسے نظر آنے لگے۔ البتہ اپنا اسلحہ انہوں نے ان لٹکے جھولتے چولوں کے نیچے جیسوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

”ہاں..... یہ بات ہوئی نا.....“ تارایک دم چپک کر بولا۔ ”کھلو باہر اور جیسا سمجھایا ہے ویسا ہی کرنا.....“ یہ کہہ کر سب سے پہلے وہی گھما سے باہر نکلا کیونکہ دہانے کے قریب وہی گھڑا تھا پھر جیسے ہی وہ پانچوں بھی اس کے عقب میں گھما سے باہر نکلے، ایکایک ایک کرج دار آواز نے ان کے قدموں کو نمود کر ڈالا.....

”ہالٹ..... اینڈ ڈونٹ بی موو..... تم سب کے سب ہمارے نشانے پر ہو.....“

پانچوں کو یکبخت سانپ سونگھ گیا۔ تار او وہیں سینہ تھامے زمین پر لیٹ گیا۔ وقت کی سگینی صرف چند ثانیے کے لیے بھاری سِل کی طرح ان کے سروں پر مسلط رہی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے اس اہم مشن کو سبوتاژ ہونے سے بچانے کے لیے ”کاروانِ مجاہد“ کے شاہِ زمان نے سردھڑکی بازی لگا دینے کا اٹل ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں شرجیل اور قیصر کو آٹھ کا مخصوص اشارہ کیا اور اسی وقت دونوں جوانوں نے اپنے لیڈر (کاروانِ مجاہد) کے اشارے کو بوجھتے ہی خود کو اس مشن پر ورتانہ وار قربان کر دینے کی ٹھان لی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے۔

لحاتی توقف اور کسی ساتھی کی جاں فروشانہ حرکت کا انتظار یہ ان گوریلوں کی تربیت کا حصہ تھا۔ ایسے کسی بھی خطرناک موقع پر وہی باتیں ان کی منتظر ہوتی تھیں۔ یا تو ہتھیار ڈال دیا پھر سردھڑکی بازی لگا دو..... اور شاہِ زمان نے اپنے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو اسی بات کا اشارہ کیا تھا۔

ان کی عقابانی نظروں کے احاطے میں سردست پانچ سے چھ گن برادر تھے، انہی دھڑکتے ہوئے لمحات میں شرجیل اور قیصر نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے اپنے باقی تینوں ساتھیوں کو اپنے جیسوں کی ڈھال پہنا دی۔ اسی وقت گولیوں..... کی بمیانک تڑتڑاہٹ

کر رہا تھا۔ یہ پانچوں ذرا ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہیں وہاں ایک دبلا چٹلا سا خستہ رنگت کا شخص دکھائی دیا۔ اس نے جھٹکا سا چوڑا ٹائپ لباس پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے تھوڑا ہی نیچے جمول رہا تھا۔ شکل اس کی لمبوتری تھی۔ گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ ہاتھ میں کوئی ڈنڈا سا پکڑ رکھا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے درمیان ہی لگتی تھی۔ یہ تارایک تھا۔

”آگت ہو تم.....“ اس نے ان تینوں کو پچانتے ہی نیچی آواز میں کہا۔

”کیا یہ محفوظ جگہ ہے؟ میرا مطلب ہے ہم یہاں کچھ دیر گھڑے ہو کر بات کر سکتے ہیں؟“ علی ریحان نے اس سے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

”اس طرف آ جاؤ.....“ تارائے ادھر ادھر گردن گھما کر کہا اور ایک دائیں جانب کی چٹان میں بنی گھما کی طرف بڑھا۔ یہ تینوں بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

وہ گھما سامنے سے تنگ مگر اندر سے کشادہ تھی، البتہ اس کی چھت کافی نیچے تھی اور وہاں چابجا سنگلاخ رخنے نظر آ رہے تھے جن میں سے جھاڑ جھکاڑ، عمر سیدہ درختوں کی جٹاؤں جیسی سوگی شاخوں کے مانند جمول نظر آ رہا تھا۔ اسی وقت دور سنگلاخ ویرانوں میں کوئی جنگلی جالور چیخا۔ اس کے بعد وہی دلوں میں ہیبت طاری کر دینے والا سنا تا تھا۔

پو پھنے کی روشنی، کسی حد تک اندر پڑ رہی تھی۔ تارایک تارایک سے کونے میں جا کر دوبارہ نمودار ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک میلی چپکٹ سی پتلی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس نے ان تینوں کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

”اس میں وہ تو ہمارے ملیل کا سب سامان موجود ہے۔ جلدی سے پہن لو، میں تب تک باہر کھڑا ہوتا ہوں۔“ تارایہ کہہ کر گھما سے باہر جانے لگا تو شاہِ زمان نے اسے روک دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، تم ادھر ہی روک کہیں باہر گھڑے ہو کر دیکھ لے لے جاؤ.....“

تار او وہیں ٹھہر گیا۔ احسان جامو نے شاہِ زمان کی طرف دیکھ کر مسکرا کے کہا۔

”پسند آئی دوست! تمہاری یہ احتیاط پسندی.....“

اس کے بعد شاہِ زمان نے اپنے دونوں قریبی ساتھیوں شرجیل شمری اور قیصر شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں حرکت میں آئے اور پتلی کھول ڈالی۔ اس کے اندر اسی طرح کے گندے سندے چولے نما کپڑے، ٹوئیاں اور رنگین

ابھری۔ شرجیل اور قیصر رقص اجل کے نرے میں آچکے تھے مگر یہ ان کا جذبہ حریت تھا کہ انہوں جس خاص مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا چاہا تھا اس کے لیے وہ دونوں گولیوں سے چھلنی ہونے تک تنے کھڑے رہے تھے، جب تک کہ ان کے باقی ساتھیوں کو دشمن کے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہ مل گیا۔ وہ دونوں جیسے ہی جام شہادت نوش کرتے ہوئے زمین پر گرے، اسلحہ پوش دشمن کا یہ کشتی گردوپ ایک لمحے کو دنگ رہ گیا۔ کیونکہ باقی تینوں حریت پسند غائب تھے۔ ایک لمحے کو تو انہیں اس چالاکی کا پتا ہی نہ چل سکا مگر دوسرے ہی لمحے گھما کی سنگلاخ دیواروں کی آڑ لیتے ہی علی ریحان، احسان جامو اور شاہ زمان اپنی گنیں نکال چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنے دوسرا تھیوں کی قربانیوں کو ضائع نہ جانے دینے کی جیسے قسم کھالی تھی اور دشمن کو اسی لحاظی حیرت میں مبتلا کرتے ہی ان پر گولیاں برسا دیں۔ وہ سب حلق سے ہمایاںک چٹخیں اگلنے ہوئے گرے۔ کچھ نے پیچھے کو ہٹ کر گرتے ہوئے کسی چٹائی آڑ میں جانے کی بھی کوشش چاہی تھی مگر بے سود..... مجاہدین کی گولیوں نے انہیں جاٹ ڈالا تھا۔

اس مختصری مٹن گرج کے تھمتے ہی کوہ شالیہ کی ان سنگلاخ فضاؤں میں ایک ایسی سناٹا طاری ہو گیا۔ تارا ہنوز اوندھے منہ پتھر لی زمین پر پڑا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ گدی پر تھے۔ علی ریحان نے اسے ٹھوکر لگائی۔

”تارا.....! کھڑے ہو جاؤ..... وقت نہیں ہے

ہمارے پاس.....“

اس کی آواز سن کر تارا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پٹنی پٹنی آنکھوں سے ان تینوں کی طرف اور زمین پر خون کی چھتری میں پڑی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد انہیں اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف ہولیا۔ تینوں بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ انہیں اپنے دونوں ساتھیوں کی موت کا از حد دکھ تھا اور اسی دکھ نے ان کے کوہ شکن حوصلوں اور عزمِ مصمم کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے مٹن میں ہر قیمت پر کامیاب ہوں گے.....

☆☆☆

دلی کے وسط میں واقع ”سرداراں والا محلہ“ کے ایک تنگ و تاریک مکان میں کریم بخش اپنے مختصر کنبے کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یہاں زیادہ تر مزدور ٹائپ اور غرباء کا طبقہ رہتا تھا۔ کریم بخش کا ایک ہی بیٹا تھا شوکت حسین۔ وہ جوان تھا۔ عمر انیس سال تھی۔ قد کاٹھ کا اچھا تھا اور صحت بھی اچھی

تھی۔ شکل و صورت کا بھی خوب تھا۔ رنگ گورا اور اس کے سر کے بال گھنے اور بھورے تھے۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ پاں کی کافی تھا۔ اس کی ماں ایک خوب صورت خاتون تھیں۔ شوکت ابتدائی میٹرک پاس تھا۔ (اس زمانے میں میٹرک کے بعد بھی ایک سال اور پڑھنا پڑھنا تھا، جو ابتدائی میٹرک کہلاتا تھا۔ وہ پاس کرنے کے بعد ہی آگے کالج، فرسٹ ایئر یا انٹر میں داخلہ ملتا تھا۔) اس کے بعد اس کا آگے پڑھنے کو بھی نہ چاہا تھا۔ باپ نے اسے اپنے ساتھ کالج پر لگایا۔ خود کریم بخش ایک انگریز فوجی افسر کا سائیکس تھا۔ وہ اس کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور اب اپنے بیٹے شوکت کو بھی کام پر لگایا تھا۔ وہ بھی باپ کے کام میں دلچسپی لینے لگا لیکن ”کام“ میں دلچسپی کی وجہ کچھ اور تھی جسے اس نے ابھی خود تک محدود کر رکھا تھا۔

ایک فرنگی کے ہاں نوکری کرنے پر اس مختصر سے کنبے کو کچھ ”اپنوں“ کی مخالفت کا سامنا بھی تھا مگر انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ کریم بخش کا کہنا تھا کہ وہ غریب اور حق حلال کی روزی کمانے والے لوگ تھے جبکہ اس کا اصل پیشہ بھی یہی تھا، مگر ایک عرصے سے اس کے پاس مطلب کی کوئی نوکری نہ تھی۔ چھوٹی موٹی مزدوری بھی مل جاتی تھی بھی نہیں۔ اکثر اس گھرانے پر فاقوں کی نوبت بھی آتی تھی اور فاقہ کشی کے ساتھ بیمار یاں بھی لازم و ملزوم ہوتی ہیں، اس کی بیوی سخت بیمار ہو گئی تھی۔ سکینہ بے چاری مرتے مرتے پٹی تھی۔ تب ہی ایک ہندو دوست کی معرفت اسے ایک اس انگریز افسر کے بیٹکے میں نوکری مل گئی اور وہ بھی اس کے مطلب کی، یعنی گھوڑوں کی دیکھ بھال۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بس، وہ دن تھا اور آج کا دن اس کے معاشی مسائل زیادہ نہیں تو کافی حد تک حل ہو چکے تھے اور اب تو اس نے اپنے بیٹے شوکت کو بھی اس کام میں لگا دیا تھا۔

لیکن ساتھ ہی کریم بخش ایک اور فکر میں بھی تھا۔ وہ ایک پختہ العمر اور جہاندیدہ وزانہ چشیدہ شخص تھا۔ اس نے ملک کے دن بہ دن بگڑتے ہوئے سیاسی حالات اور فسادات کا اندازہ لگایا تھا اور اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح اس فرنگی آفیسر کے سرورٹ کو انٹرٹیک رسائی حاصل کر لے۔ جہاں وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ محفوظ اور مامون زندگی بسر کر سکتا تھا۔

اس نے اپنی درخواست دے رکھی تھی۔

”ابا.....! ہم اس بیٹکے کے کوارٹر میں کب تک چلے جائیں گے؟“

”سر“ کرنے کے فرائض بھی انجام دے لیا کرتا تھا۔

لیکن..... شوکت نے جب سے ریتا کو دیکھا تھا، وہ باپ کی نصیحت فراموش کرنے لگا تھا۔ ریتا سے دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ پہلے پہل وہ اسے مغرور حسد سے سمجھتا تھا مگر رفتہ رفتہ اسے احساس ہونے لگا کہ ایسی بات نہیں تھی۔ ریتا اس سے گھڑسواری سیکھتی تھی اور اس کے رموز سے آگاہی حاصل ہونے کی حد تک ہی اس سے گفتگو کرتی تھی۔ شوکت نے آج تک اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی نہ ہی اس کے گالوں پر کسی جذبے کی چمکتی تپش کا شائبہ تک دیکھا تھا۔ بارہا اس کے جی میں تو آئی کہ وہ بھی گھڑسواری سکھانے کے دوران اس سے اس کی اسی آرزو آرزو سی خاموشی کا راز پوچھ لے لیکن وہ اس کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔

تاہم ایک بات پر اسے بے حد افسوس ہوتا تھا۔ وہ اس انگریز آفیسر کے خاندان کی لڑکی نہیں تھی بلکہ وہ یہاں مہمان بن کر آئی تھی اور شوکت کو اس کی حقیقت کا بے خوبی اندازہ تھا کہ مہمان پر دیکھی ہوتا ہے اور اسے ایک دن جانا ہوتا ہے۔

”میں اسے جانے نہیں دوں گا..... ہرگز نہیں.....“

ناشتا کرتے کرتے اس کے دل میں ایک جوش تلے ابھرنے والے الفاظ زبان پر بھی آ گئے۔ اس وقت تک سکینہ بھی ایک ڈلیا میں اپنے لیے کمی میں تلی ہوئی روٹی اور چائے کا پیالہ لیے چارپائی پر آگئی تھی۔

اسے یوں اپنے آپ بولا دیکھ کر کریم بخش اور سکینہ دونوں ہی بے اختیار چمک گئے تھے۔

”کیا ہوا بیٹا؟! کسے نہیں جانے دو گے.....؟“ سکینہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

شوکت زیرک دماغ تھا۔ سمجھ گیا کہ اس کے منہ سے کیسے الفاظ نکل گئے ہیں۔ یک دم بات بناتے ہوئے اور بغیر گھڑائے بولا۔

”مارگریٹ کو..... وہ مجھ سے بن کے نہیں دیتی..... بابا کہتے ہیں اسے جانے دو، میرے حوالے کر دو..... مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے، اسے سدھا کر ہی چھوڑ دوں گا۔“

”آخر بیٹا کس کا ہے۔“ کریم بخش اپنے گہرے دھڑکنے کی بات کا مطلب سمجھ کر فخر سے اپنی گردن اونچی کر کے بولا۔ ”شاباش بیٹے ابھی حوصلہ اور عزم رکھنا، جانور سے بھی شکست مت کھانا.....“

”یہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ کون جانور؟ اور..... اور یہ

یہ اسی روز کا ذکر تھا۔ دونوں باپ بیٹے مختصر سے صحن میں بھی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھے رات کی بچی ہوئی روٹی چائے سے کھا رہے تھے۔ سکینہ نے روٹیوں پر تیل لگا کر انہیں گرم کیا تھا۔ جو انہیں بہت پسند تھیں۔ شوکت نے لوالہ منہ میں ڈال کر چائے کا کھنٹ بھرتے ہوئے باپ سے پوچھا تھا۔

”دیکھو، بیٹا! آج جواب مل جائے گا۔“ کریم بخش نے جواب دیا۔

”کیا ہماری درخواست وہ انگریز آفیسر قبول کر لے گا؟“

”کرنا تو چاہیے، آخر کو ہمارے کام سے بہت خوش ہے۔“ کریم بخش نے امید دلائی اور شوکت ریتا کے خیالوں میں گھوم گیا۔

ریتا ایک سترہ اٹھارہ سالہ فرنگن دوشیزہ تھی جس پر شوکت کا دل آ گیا تھا۔ بچکلے میں اگرچہ اور بھی خواتین اور لڑکیاں تھیں مگر شوکت کے دل کو ریتا بھاگتی تھی۔ اس کی مخمور کردینے والی نئی آنکھیں، سبب جیسے پرکشش بھرے بھرے گورے گال اور سنہرے گھٹنے لگی بالوں والی یہ معصوم صورت گڑیا سی دوشیزہ اسے بھاگتی تھی۔ وہ اسے گھڑسواری سکھاتا تھا۔ وہ جب اس کے سامنے گھڑسواری کے چست لباس میں آتی تو اس کے سہم تن و جود کی حشر سامانیاں شوکت کے لیے ایک امتحان سی بن جاتی تھیں۔ لائیک بوٹ، شارٹ کوٹ اور کارڈائن کی چست پتلون میں ملفوف وہ فرنگن دوشیزہ اس کے حواسوں پر بجلیاں سی گرانے لگتی۔ گھٹنے لگی بالوں پر اس نے خاصے اسٹائل سے کیپ پہن رکھی ہوتی تھی۔ شوکت جب تک اس کے ساتھ رہتا، اپنے ساتھ اپنے دل کو بھی اسے سنبھالے رکھنا پڑتا تھا۔

اسے ایک بات پر اکثر اچھن ہوتی تھی۔ ریتا اس کے خلاف توقع ایک خاموش طبع لڑکی تھی۔ حالانکہ شوکت کے خیال کے مطابق اس عمر کی لڑکیاں خاصی تیز طرار اور شوخ و چٹیل ہوتی ہیں۔ جیسی جوبلی کی اور انگش دوشیزا بھی تھیں، بلکہ اس نے تو یہاں بیشتر انگریز خواتین کو بھی بھدے انداز میں چٹیلیں اور ہنستے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ شوکت کی شخصیت خوب رو اور پینڈم ہونے کے سبب بعض خواتین اور لڑکیاں اس کے ساتھ بھی مفری ہونے کی کوشش کرتی تھیں یا پھر یہ کہ ان کا چلن ہی ایسا تھا۔ تاہم شوکت اپنی ”اوقات“ سے واقف تھا اس لیے وہ اپنے کام سے کام ہی رکھتا تھا۔ جانتا تھا کہ ذرا ہی بھی خوش بھی اس کے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔ یہ باتیں اس کے جامعہ عیدہ باپ کریم بخش نے بھی اشاریوں کنایوں میں اسے سمجھا رکھی تھیں۔ اکثر یہاں تقاریب ہوا کرتی تھیں اور وہ مہمانوں کو

شوکی کس فرنگن عورت کی بات کر رہا ہے؟“ سکینہ نے اچھے ہوئے انداز میں کہا تو شوکت ہنسنے لگا۔ کریم بخش بیوی سے بولا۔

”مارگریٹ سرکار کی سب سے زیادہ پسندیدہ گھوڑی ہے۔ دونوں ہی ہوئے ہیں، پانی والے جہاز سے انگلستان سے لائی گئی ہے۔ مگر بیٹی ایسی ہے کہ پٹھے پر ذرا ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔“

”گھوڑی جو ہوئی.....“ سکینہ منہ دبا کر ہنس دی۔

بات آئی گئی ہو گئی اور شوکت نے بھی تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ محتاط رہے گا۔

تاشا کرنے کے بعد وہ دونوں باہر نکلے اور کچے میں سوار ہو گئے۔ دونوں باپ بیٹوں کے کام پر نکلنے کا چونکہ یہی وقت یعنی علی الصباح کا ہوتا تھا اسی لیے عموماً انہیں چاچا عثمان کا ہی یکے ملتا تھا۔ چاچا عثمان ”کیے والا“ سے ہی معروف تھا۔ لہذا وہ دونوں باپ بیٹوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ شوکت نے دیکھا تھا کہ چاچا عثمان اکثر اس کے باپ سے کہا کرتا تھا۔

”دیکھ رے کریم! فرنگی کی چاکری اپنی جگہ پر ضمیر کا سودا بھی مت کر یو..... یاد رکھنا! ان فرنگیوں کے ہاتھ ہمارے مجاہدوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔“

کریم بخش جواب میں کبھی کبھ بول لیتا، کبھی خاموش رہتا۔ تاہم اس کا جواب بھی ایک ہی ہوتا۔

”مجھے پتا ہے عثمان بھائی! میں صرف اپنی روزی روٹی پر ہی نگاہ رکھتا ہوں اور بس..... تو، تو جانتا ہے کہ میرے حالات کتنے خراب تھے۔“

اور چاچا عثمان جواب میں گھوڑے کو ہولے سے چابک رسید گردیا کرتا تھا۔ گویا وہ اپنا فرض پورا کر کے مطمئن ہو جایا کرتا تھا۔

”ابا! کیا یہ انگریز بڑے ہوتے ہیں..... مگر کیوں؟“

شوکت نے ایک دن باپ سے پوچھ ہی لیا تھا اور کریم بخش جواب میں کہا کرتا۔

”نہیں بیٹا! انسان بُرا نہیں ہوتا۔ اس کی سوچ اسے بُرا بنادیتی ہے۔“

”ہم جس انگریز فوجی افسر کی نوکری کرتے ہیں، تو کیا وہ بھی بری سوچ رکھنے والا انگریز ہے؟“ شوکت پوچھتا۔

”میرا خیال ہے اس کی سوچ کے پیچھے بھی کوئی بری سوچ ہے۔“ کریم بخش کہتا۔ ”تم بیٹا! بس، اپنے کام سے کام رکھو، ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔“

کیے والے نے انہیں ایک میدانی علاقے کے وسیع و عریض حویلی نمائش کے بڑے گیٹ کے سامنے پہنچا دیا اور لوٹ گیا۔ وہ وہاں ٹھہرنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔

گیٹ پر لمبے دستوں والی بندو قیس تھاے اور سرخ اور گولڈن کلڈوالی وردی میں ملبوس فرنگی سپاہیوں نے دونوں باپ بیٹوں کو پہچان کر گیٹ کا نقلی دروازہ وا کر دیا۔

اندرونی وسیع و عریض گھاس کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف اصطل نظر آ رہا تھا۔ دائیں جانب حویلی نمائش کے بڑی سی چار منزل عمارت تھی۔ ایک جانب سونٹنگ پول تھا۔ شوکت یہاں جب بھی آتا تو اسے غی دنیا سمجھنے لگتا تھا۔ ہر طرف ہر پالی، باغات، خوش رنگ پھول اور دیدہ زیب پودے مگر انہیں طویلے کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں بھی پہرے دار مرگشت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اسی وقت ایک گھڑسوار پہرے دار ان کی طرف بڑھا اور انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

”نئے حکم نامے کے مطابق تم آج کے بعد اس عمارت سے باہر نہیں جاؤ گے۔“

یہ سن کر کریم بخش خوش بھی ہوا اور تھوڑا سا پریشان بھی بولا۔

”میں نے تو خود سرکار کو یہ عرضی دے رکھی تھی کہ میں یہاں کوارٹر میں اپنے کنبے سمیت رہنے کے لیے آجاؤں۔“

”عرضی کو چھوڑو..... حالات کے پیش نظر اور جاسوسوں کے خطرے کے باعث یہ حکم نامہ جاری کیا گیا ہے۔ جنہیں یہ حکم نامہ منظور نہیں ہے، وہ نوکری چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔“

دونوں نے فوراً سرکوشاںات میں ہلا کر اپنے اقرار کا اظہار کر دیا۔

اچانک ایک چیخ کی آواز ابھری۔ دونوں چونک پڑے۔ آواز کی سمت دیکھا تو ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے۔

دوسرے ہی لمحے شوکت نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی، اس نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور فرنگی پہرے دار پر اچھل کر جا پڑا۔ پہرے دار اس اچانک اور غیر متوقع ٹکڑے سے سنبھل نہ پایا اور گھوڑے کی پشت سے نیچے زمین پر گر پڑا۔ ایک نوکری اس حرکت نے اس کا دماغ

تھما دیا اور اس نے فوراً اپنی توڑے دار بندوق سیدھی کر لی اور چاہتا تھا کہ شوکت کو اپنی دھواں دھار گولی کا نشانہ بنائے

اور چاہتا تھا کہ شوکت کو اپنی دھواں دھار گولی کا نشانہ بنائے

اور چاہتا تھا کہ شوکت کو اپنی دھواں دھار گولی کا نشانہ بنائے

تھامے ایک سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ ہی رہا تھا مگر اب وہاں میدان میں دیگر کچن بھی آن موجود ہوئے تھے اور گویا سانس روکے تک بیک نظریں گاڑے کھڑے تھے۔

مارگریٹ پورے میدان کا قوس کی صورت میں چکر لگا رہی تھی اور کوئی اس سرکش گھوڑی کے آگے آنے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا، چہ جائیکہ اسے گولی مادی جاتی اور یہ کام لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کرنے کے لیے پر تو لے ہوئے تھا کیونکہ اپنی پسندیدہ گھوڑی کے مقابلے میں اس کے مہمان دوست پروفیسر ہنری برنارڈ کی لاڈلی بیٹی رینا زیادہ عزیز اور پیاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی ہندو ”پھتیا“ دی تھی لیکن یہی وہ وقت تھا جب عقب سے اسی پہرے دار نے، جس کا گھوڑا شوکت لے کر بھاگا تھا، جنرل شا کے عقب سے نمودار ہو کر ہولے سے نمودار ہوا انداز میں اس کے کانڈھے کو تھپتھا دیا تھا۔

ادھر رینا کا پاؤں رکاب سے آزاد ہوا، ادھر شوکت خطرے میں گھرا تھا کہ شاید اس کے بوڑھے باپ کی وعائیں کام آئیں۔ اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے اپنا سر بچا لیا تھا مگر کم کی ایک جاں کش شوکر اس کے پہلو پر ضرور لگی تھی اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پیٹ کھل گیا ہو۔

رینا اور شوکت دونوں زمین پر لڑھکتے مچھتے ہوئے قریب بھوسے کے ایک ڈھیر پر جا پڑے۔ اس طرح کہ دونوں کے وجود بھوسے اور آپس میں رل مل کر ایک جگہ جا پڑے۔

رینا کے نرم و گلداز اور شاخ گل سے جسم کالس اس نے جب اپنے مضروب مگر مضبوط وجود میں محسوس کیا تو جیسے سارے درد اور تکلیف کو پی گیا۔ رینا کے ریشمی سنہری بال اس کے خراش زدہ چہرے کا نرم بن گئے۔ دور یاں جیسے وصل کا امرت بن کر نیم و جان کی نزدیکیاں بن گئیں اور وصل شب جیسی خوار آلود ساعتیں اس پہل کو پہل کے پہل امر کر گئیں۔

دونوں یک جان دو قالب میں ڈھلے، بھوسے میں خلط ملط پڑے رہے۔ ان کی سانس دھونکی کی طرح تیز تیز چل رہی تھیں۔ دونوں ہی نیم بے ہوشی میں تھے یا قریب توں کے نشے میں تھے کہ بے اختیار ان ”اپنے بے“ الحاحات کو مال قیمت جان کر شوکت نے رینا کے گلاب رنگ چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ اسی وقت جب شور بلند ہوا..... اور لوگ باگ انہیں تلاشتے ہوئے وہاں پہنچنے لگے تو

مگر دوسرے ہی لمحے ہندو کی لیلی پر اس کی انگلی ساکت ہو کر رہ گئی اور اب وہ بہ غور شوکت کو اپنے گھوڑے پر اس طرف دوڑتے ہوئے جاتا دیکھنے لگا جدھر مارگریٹ نامی گھوڑی طوفانی رفتار سے میدان کے ایک جانب دوڑی جا رہی تھی اور اس کے پائے رکاب پر رینا کی ایک ٹانگ پھنسی ہوئی تھی۔ شوکت جانتا تھا کہ مارگریٹ (گھوڑی) ان کے مالک فرنگی آفسر لیفٹیننٹ مائیکل شا کو کس قدر پسند تھی، مگر شوکت کے صلح نگاہ رینا کی جان بچاتا تھا۔ وہ بری طرح زمین پر گھسٹتے ہوئے جا رہی تھی اور اب شاید خوف و دہشت کے مارے بے ہوش ہو چکی تھی۔

شوکت پہرے دار سے پچھتا ہوا گھوڑا دوڑاتا ہوا آن کی آن میں مارگریٹ کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے مارگریٹ کے ہوا میں لہراتے ہوئے ورازا پال دوپٹے کی کوشش کی تو اس طرح وہ خود بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گرے کرتے بچا کیونکہ پال ہاتھ میں آتے ہی پھسل گئے تھے۔ رینا کا نرم و نازک جسم مارگریٹ کے پچھلے دونوں پیروں کے بالکل قریب ہی زمین پر ٹھسٹا جا رہا تھا اور شوکت جانتا تھا کہ کسی وقت بھی اگر مارگریٹ کا قفل لگاسم رینا کے سر سے گرا گیا تو وہ پاش پاش ہو کر مغز سمیت میدان میں بکھر جائے گا۔ لہذا اس نے پہل کے پہل ایک اور فیصلہ کیا..... ایک خطرناک فیصلہ..... جو اس کی جان بھی لے سکتا تھا مگر اس کے دل و دماغ میں بھرکنے والی رینا کی محبت کی شمع نے اسے ہر خوف سے عاری کر رکھا تھا۔

اب اس کا گھوڑا مارگریٹ کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس نے مارگریٹ کو اپنے گھوڑے سے تھوڑا آگے جانے دیا اور جیسے ہی وہ رکاب کے قریب متوازی ہوا، اس نے روانہ دار اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے چھلانگ لگا دی۔ ایک ہاتھ رکاب میں دے دیا اور خود بھی خطرے کی زوئیں آگیا۔ اس کے جسم کو دوڑتی ہوئی مارگریٹ نے ایک طوفانی جھکادیا تھا مگر وہ سنبھلا رہا اور اس نے اپنے پچھلے وجود کو بھلا کر، جو زمین پر بری طرح مچھٹنے لگا تھا، رکاب سے رینا کا نرم و نازک پاؤں چھڑا دیا۔ وہ ایک ماہر اور تربیت یافتہ سائیکس کا بیٹا تھا، جانتا تھا کہ اس کوشش کی کامیابی کے بعد..... رینا تو خطرے سے نکل جائے گی مگر وہ طوفانی رفتار سے دوڑتی ہوئی مارگریٹ کے قفل زدہ سموں تلے آجائے گا۔

یہ خطرناک کھیل شوکت کا بوڑھا باپ کریم بخش تو اپنا کلیجا

شوکت بھی دنیا دافیا ہے بے نیاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کوہ شمالیہ کی پہاڑیوں میں شام جھکنے لگی تھی۔ تارائے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی اور مہارت سے منایا تھا۔ وہ ان تینوں کو اپنی بستی میں لے آیا تھا اور طعیا مکر جیت سے ملوانے اور اسے ان کے بارے میں یہ جھوٹ بتا کر کہ یہ لوگ بھی انہی کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں سے انہیں اپنے جھوپڑے میں لے آیا تھا۔ وہاں یہ تینوں ان بخاریوں میں رل مل گئے۔ وہاں جوان اور عرسیدہ بخاریں بھی تھیں، کئی جوان اور پرکشش بخاریوں نے ان تینوں کا دل بھانے کی کوشش کی اور ان کے زریب پھیں مگر وہ تینوں کمال ہوشیاری کے ساتھ انہیں طرح دے گئے تھے کہ وہ ناراض بھی نہ ہوں اور انہیں سبکی بھی محسوس نہ ہو۔

انہیں قافلے کے کوچ کرنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ یہ تارائی کی ہدایت پر ایسے وقت میں یہاں پہنچے تھے کہ آج کل میں یہ ناگرہ ریاست کی طرف اپنے سالانہ گرنتھ تہوار پر روانہ ہونے ہی والے تھے۔ معلوم ہوا کہ دوروز بعد ریاست کے چوب دار اعلیٰ سے اجازت نامہ یاہ الفاظ دیگر پروانہ راہداری ملتے ہی انہوں نے کوچ کر جانا تھا۔

یہ سفر زیادہ طویل نہ تھا۔ بہ مشکل آدھے دن کا تھا۔ سفری صعوبتوں اور دشوار گزار پہاڑی راستوں کو پانے کے لیے ان کے پاس خجروں کی کمی نہ تھی مگر وہ اتنی تعداد میں نہ تھے کہ سبھی ان پر سوار ہوتے۔ یہ خچر بوڑھے، بچوں اور عورتوں کے لیے تھے۔ گویا یہ پیدل سفر تھا۔ اگلے دن صبح کھیا مکر جیت کے قاصد نے ریاست ناگرہ کے دروازے سے واپس آ کر جو اطلاع دی اس نے نہ صرف لوگوں کو چونکا دیا بلکہ پریشان بھی کر ڈالا تھا۔ کیونکہ آج تک ایسا نہ ہوا تھا کہ انہیں مہاراجا چندر گپتا نے اجازت نامہ دینے سے انکار کیا ہو۔

یہ لوگ پچھلے کئی برسوں سے اپنے سالانہ گرنتھ تہوار پر ناگرہ کی جنوبی سمت میں واقع کالی کے مندر میں جاتے، پوجا پاٹ کرتے شادیوں اور سونہر کی رسمیں کرتے، وہاں ایک قدرتی تالے جو ”پون آشا“ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، اشان کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے مردوں کو بھی وہیں بھلانے کے بعد قریب واقع ایک شیشان گھاٹ میں جلانے کی رسم بھی ادا کیا کرتے تھے بشرطیکہ اس دوران سفر میں یا ہجرت سے ایک آدھ روز پہلے کسی کی موت واقع ہو جاتی۔ ایسے

دنوں میں مرنے والوں کو ”خوش نصیب“ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے مُردے کو پون آشا میں بھلایا جاتا اور پھر چتا جڑھا دی جاتی۔

بہر طور..... کھیا مکر جیت کو پہلے تو اپنے قاصد توڑی رام کی بات پر یقین ہی نہ آیا تو توڑی رام نے ایک لپتر (کھال کا ٹکڑا) اپنی ڈب سے نکال کر تھمایا۔ اس میں چوب دار اعلیٰ نے مہاراجا چندر گپتا کا چند سطر پیغام دیا تھا کہ اجازت ضرور ملے گی مگر اس سے پہلے حویلی سے ایک وفد کھیا مکر جیت سے آ کر ملنا چاہتا ہے۔ جو کل صبح تڑکے تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے پہنچ جائے گا۔

اس..... پیغام کے ساتھ ہی بخاریوں کی اس بستی میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی رائے دریافت کرنے لگا کہ آخر کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟ کھیا مکر جیت نے فوراً بستی کے چند معتبروں کی نشست بلوائی۔ مگر چہ ان میں دیگر لوگ بھی موجود تھے۔

”یہ فریکوں کی شرارت ہے۔“ ایک نے کہا۔
”لیکن پتا تو چلے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ اجازت کیوں نہیں ملی؟“

”پہلے کبھی تو ایسا نہیں ہوا۔“
”وفد آجائے دو..... تب ہی بات کھلی گی۔“
نشست، اس آخری بات پر اتفاق رائے سے برخاست ہو گئی۔

اس بستی میں مقیم صرف چار افراد ہی پروانہ راہداری نہ ملنے کی وجہ سے واقف تھے اور اس وقت اسی سلسلے میں سر جوڑے ایک جھوپڑی میں بیٹھے تھے۔

”معاملہ گمبیر ہو گیا ہے۔“ تارائے سرکشی میں ان تینوں سے کہا۔ وہ بھی سن کر ان کے لباس پہنچا تھا۔ اس نے ان سے یہ کہتے ہوئے ساری بات گوش گزار کر دی۔ وہ خاصا پریشان اور تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔

”ریاست ناگرہ سے جو وفد آ رہا ہے وہ درحقیقت کھیا مکر جیت سے ملنے نہیں..... بلکہ بستی کے لوگوں کو کھٹانے کے لیے آ رہا ہے..... جس کا مطلب ہوگا تم تینوں کے ساتھ میں بھی گیا.....“

تارائی مگر مندی اور تشویش اپنی جگہ مگر تینوں مجاہدین کو اپنے مشن کی فکر ستانے لگی، جو پہلے ہی سرطے میں بری طرح ناکامی سے دوچار ہونے لگا تھا۔

”تم تینوں جلدی سے اور اسی وقت کوئی فیصلہ کرلو۔“ وہ ان تینوں کو گمبیر اور پڑسوج خاموشی کے

”کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی باپ کیا ہے تو نے؟ کسی کی جتھیا کی یہ ادھر مٹ گیا ہے۔“

”رام..... رام.....! ایسا کچھ نہیں کیا ہے میں نے کھیا جی!..... پر.....“ تارا اسی طرح ہاتھ جوڑے بولا۔

”پھر کسی بات کی چنات کر باقی گناہ معاف ہیں۔ اب بول ایسی کھیا غلطی ہوئی ہے تیرے سے؟.....“

”مجھے کشمی کی طرح نے مار دیا.....“ تارا روتے ہوئے بولا اور تینوں مسلم مجاہدوں کے ساتھ گھ جوڑی رو داد بیان

کردی اور رات ہونے والے حلقے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ سب سن کر کھیا کو یکنخت سانپ سو گھ گیا۔

”اب بدھی مان میں سانی کہ ماجر کیا تھا۔ کیوں ہمیں اجازت نامہ نہیں دیا گیا تھا؟ اور نہ تو آج تک ایسا بھی نہیں ہوا۔ ہوں.....“ خود کلامیہ انداز میں یہ الفاظ بڑبڑاتے ہوئے

بولا اور کچھ لمحے کے لیے سوچ میں رہا پھر بولا۔

”کتنے گا کہ کمرے کیے تو نے ان سے؟.....“

”ایک ہزار.....“

”ایک ہزار.....“ کھیا کے لہجے میں حیرت تھی۔ یہ معمولی رقم نہیں تھی۔

کھیا کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ وہاں موجود نہ کوہ تینوں افراد کی آنکھوں میں بھی ایک خاص سی چمک

ابھری تھی، اب ہی ان میں سے ایک نے کھیا کمرجیت کے قریب آکر کان میں کچھ کھسرپسری اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کے بعد تارا سے کہا۔

”وہ رقم کدھر ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“

”ترت جا کر ادھر لے آؤ.....“

تارا اپنی کٹی جان کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور جب تک وہ لوٹا، اس سے تک کھیا اپنے قرابت داروں سے صلح

مشورہ کر چکا تھا۔

تارا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی میلی چیکٹ گھسی تھی۔ وہ اس نے کھیا کمرجیت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کھیا جی! اس میں سے دو روپے بارہ آنے میں خرچ کر چکا ہوں، باقی یہ حاضر ہیں۔“

کھیا نے گھسی اس کے ہاتھ سے لی اور اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کی گھسی میں کئی چھوٹے بڑے چاندی اور نکل کے سستے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں کاغذی روپے بھی تھے، اس سے پہلے ”گولڈ اسٹینڈرڈ“ کے تحت سونے کے سکے اور اشرفیاں ہندوستان کی کرنسی کہلاتی

ہمزمیں مسترق پا کر دوبارہ بولا۔ ”لیکن..... بات تو سری پھرو ہی میری گردن پر ہی آئی ہے تم تینوں

اگر یہاں سے چلے بھی جاتے ہو تو..... ضرور انہیں ان تین لوہار افراد کی بھینک پڑ جائے گی اور پوچھا جائے گا کہ وہ

کون تھے اور انہیں یہاں لایا کیوں تھا؟ سب کی انگلیاں میری جانب اٹھ جائیں گی۔ ہائے رام.....! لا لاج نے مجھے

مار دیا۔ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔“ تارا نے رو دادھوٹا ڈال دیا۔

”ابے چپ ہو جا..... کیوں وقت سے پہلے ہم پروت ڈال رہا ہے.....“ علی رحمان نے اسے ہولے سے

جھڑکا۔ ”ہم کہیں نہیں جا رہے..... ادھر ہی رہیں گے۔ کیا خبر معاملہ کچھ اور ہو.....“

”کچھ اور معاملہ ہو ہی نہیں سکتا.....“ شاہ زمان بولا۔ ”ان کی آدمی پلٹن ہمارے ہاتھوں ماری گئی

ہے، ضرور ان کے ساتھی ان کی تلاش میں وہاں گھما تک پہنچے ہوں گے اور انہیں خفیہ گوریل ٹرائی اور ہماری ورا اندازی کا ادراک ہو چکا ہوگا۔“

احسان جامو نے اس کی بات کی تائید میں کہا۔

”تمہاری بات مقول ہے، ہمیں کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ اس کے بعد اس نے کچھ سوچا۔ علی

رحمان نے کچھ کہنا چاہا تو احسان جامو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرایا اور پھر تاراک کی طرف دیکھ کر گہری

متانت سے بولا۔

”تارا.....! تم تھوڑی دیر کے لیے ہمیں کچھ سوچنے دو، پھر تمہیں بلا کر ہم اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیے

ہیں۔ فکر نہ کرو، ہم تمہیں بھی بچانے کی کوشش کریں گے۔“

تارا خاموشی سے باہر آگیا۔ وہ شاطر دماغ تھا۔ ان تینوں کے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ

چکا تھا اور اس سے پہلے کہ بہت سا وقت گزر جا تا وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے دوڑ پڑا تو کھیا کمرجیت کے پاس

آکر ہی دم لیا اور مکاری سے روتے ہوئے اس کے قدموں میں جا کر۔

”مم..... مجھے بچالو..... کھیا جی.....! انجانے میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی.....“

کھیا کمرجیت کی کھیا نما جھونپڑی میں دو تین اور افراد بھی تھے۔ کھیا ایک ساٹھاٹھا آدمی تھا۔ سر کا گنجا، رنگ کا کالا اور ناک موٹی تھی۔ آنکھیں کسی تیل کی طرح ابھردوان۔ وہ انہی آنکھوں سے تارا کو گھورتے ہوئے بولا۔

تھی، مگر انگریزوں نے برصغیر کی دولت لوٹنے کی غرض سے یہاں ”معیار نقرہ“ (سلور اسٹینڈرڈ) کا قانون رائج کر دیا تھا۔

کھیا مکر جیت نے کھٹلی ایک طرف سنبھال کر رکھ دی اور تار اسے بولا۔

”اب وہ تینوں کدھر ہیں؟“

”وہ جمپو پڑی میں ہیں اور اس تازہ صورت حال پر سرجوڑے بیٹھے ہیں۔“

”ان سے جا کر کہو کہ تم تینوں اگر کھتی چاہتے ہو اور اپنا کام بھی تو فرار ہونے کے بجائے ترنت یہاں چلے آؤ..... ہم ان کی پوری پوری مدد کریں گے۔“

”ہیں..... کھیا جی.....؟“ تارا ششدر آنکھوں سے کھیا مکر جیت کا چہرہ دیکھنے لگا جس کے بدہیت ہونوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”نور جاؤ..... جو کہا گیا ہے..... جلدی کرو..... پرٹھرو..... میں دو آدمی تمہارے ساتھ کیے دیتا ہوں۔“ کھیا نے تحسنا نہ کہا۔

ادھر علی ریحان، شاہ زمان اور احسان جامو آپس میں سرجوڑے بیٹھے اس مشکل صورت حال کا حل تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ ان کی جمپو پڑی میں تین افراد دوندنا تے ہوئے گھسے چلے آئے۔ یہ تینوں بری طرح ٹھنک گئے اور پھر تار کے ساتھ جب دو افراد کو بھی دیکھا تو انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ ان کی بندوقیں ذرا فاصلے پر تھیں۔

”کسی چننا کی ضرورت نہیں ہے۔“ تارا نے ان کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ”تم تینوں بہت خوش نصیب ہو کہ بیٹھے بٹھائے تمہارا کام ہو گیا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ علی ریحان نے اس کی طرف گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ علی ریحان کو یہی نہیں بلکہ اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی تارا کی بدینتی پر یقین کی حد تک شبہ چلا تھا۔

تارا نے جب ساری بات ان سے سچ سچ گوش گزار کر دی تو تینوں کو یہ سب سن کر ایک جھٹکا سا لگا اور وہ چند لمبے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔

”کہانا..... کسی چننا کی ضرورت نہیں ہے۔ کھیا جی سے مل لو، اس میں تمہارا بلکہ ہم سب کا فائدہ ہے۔“ تارا کے ساتھ آئے ہوئے دو میں سے ایک نے انہیں مزہ دپا کر کہا۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں..... ہی آنکھوں میں پیغام رسانی کا ادراک کی عمل گزرا تو علی

ریحان نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ یہ لوگ اسی وقت کھیا مکر جیت کے پاس پہنچ گئے۔

”ایک ہزار اور دینے کی بات کرو تو رازداری کے ساتھ تم تینوں کو نہ صرف اس مسئلے سے بہ آسانی نکال دیا جائے گا، بلکہ جہاں کہو گے وہاں بہ خیریت پہنچا بھی دیے جاؤ گے۔“

مکار اور لالچی کھیا مکر جیت نے کھڑے کھڑے ان سے دونوں لہجے میں بات کر ڈالی۔ شاہ زمان نے جواب دیا۔ ”رقم کا دوبارہ بندوبست کرنا اتنی جلدی آسان نہیں ہوگا اور نہ ہی ہم اتنی بڑی رقم ادا کر سکتے ہیں۔ پانچ سو کیے جا سکتے ہیں، مگر اس میں بھی وقت لگ سکتا ہے۔“

”ہمیں قبول ہے۔“ مکر جیت فوراً چلا گیا بولا۔ ”رقم کی ترسیل کے لیے تم لوگ کیا اقدام کرو گے؟ تاکہ ہم بھی اس سلسلے میں شامت نہ رہیں۔“

”اپنے مشن کے دوران ہم تم سے رابطے میں رہیں گے۔ ابھی تو تمہارا قافلہ کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں کافی دن ڈیرا ڈالے رہے گا..... جب تک رقم بھی منگوا لیں گے۔“ علی ریحان نے جواب دیا۔

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ کھیا نے تسلی سے جواب دیا تو احسان جامو اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”مگر..... اب تم یہ بتاؤ کہ اس تازہ صورت حال کے سلسلے میں کیا اقدامات کرنے والے ہو؟“

”ہم مہاراجا چندر گپتا کے وفد کی آمد کے منتظر ہیں۔“ مکر جیت بولا۔ ”ہم انہیں یہ سب بتائیں گے کہ ان کے دشمن جاسوس ہمارے پیچ رہل ل گئے ہیں۔ اصل بات تو ہماری ہی آخری ہوگی تا پر بھو!“

علی ریحان نے تعجبی انداز میں اپنے سر کو ہلایا تھا۔ اس کے بعد وہ تینوں واپس اپنے ٹھکانے پر پلٹ آئے۔

”اس بد ذات تارا نے سارا کھیل بگاڑ دیا ہمارا.....“ احسان جامو جھلا کر بولا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس ”ڈیل“ سے مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی ریحان بولا۔

”میرا خیال ہے تارا نے ایسی حرکت خود کو اور ہم سب کو آنے والے ایسے خطرے سے بچانے کے لیے کی ہوگی۔“ ”ہرگز نہیں، میں تمہاری اس بات سے اختلاف کروں گا دوست!“ شاہ زمان بولا۔

”تارا اگر ایسی کوئی حرکت کرتا تو وہ سب سے پہلے

اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے خود کو نسبتاً آرام وہ حالت میں پایا۔ بستر تو عام سا ہی تھا، جس پر وہ پڑا تھا جگہ بھی، پس ایسی ہی تھی، جیسی کسی سرورٹ کوارٹر کی ہونی چاہیے تھی۔ یہ جگہ جگہ جگہ والا چھوٹا سا کرا، جہاں یہ مشکل ایک چار پائی اور ایک پرانی سی کرسی سادی گئی تھی۔ پاس ایک دیوار سے سلیب لگی ہوئی تھی جس پر صراحی اور تختل کا گلاس دھرا پڑا تھا۔ چھت پر دو پنکھ مناسب رفتار سے گھوم رہا تھا۔ کھڑکی اس کے بستر کے دائیں جانب تھی، جس کی دیوار سے اس کی چار پائی لگی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے مضرب جسم کو حرکت دینا چاہی تو جیسے سارا دکھتا ہوا بدن میں بن گیا، اسی باعث اس کے منہ سے بے اختیار سسکاری نکل گئی مگر اس نے ذرا سستا کر دو بارہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک گیا۔ کوئی دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ اس کا باپ کریم بخش تھا۔ بیٹے کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ فوراً اس کی جانب بڑھا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے میرے بچے!“ بوڑھا باپ اپنے گرو جوان بیٹے کو ایسی ہیئت کنڈائی میں دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔

”میں..... اب ٹھ..... ٹھیک ہوں..... باب.....“

بابا.....! آہ..... آہ.....“
یہ کہتے ہوئے شوکت بری طرح کراہ گیا۔
”میرے بچے! تو ٹھیک نہیں ہے۔“ بوڑھا کریم بخش اپنے کڑیل بیٹے کو سسکتے پا کر بریشان ہو گیا اور لائے قدموں پلٹ گیا۔ بستر پر صاحب فراش شوکت کو اپنے کانوں میں باپ کی داد و فریاد کرنی آواز سنائی دینے لگی جو اس کی دیواری کھڑکی سے آ رہی تھی۔

”کوئی ہے؟ میرے بیٹے کو ہوش آ گیا ہے، مگر وہ سخت تکلیف میں ہے۔“

اس کے بعد شوکت نے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ دو افراد اس کے باپ کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو دردی پوش فرنگی تھا، دوسرا کوئی ڈاکٹر ناپ آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے سفید کوٹ (ایپرن) پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا باکس تھا..... باکس اس نے ایک طرف تپائی پر رکھا اور شوکت کا غور معائنہ کرنے لگا۔

اس کے زخموں کی مرہم پٹی پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ اس نے ایک انجکشن لگا دیا۔ کچھ دوا میں دیں۔ اسی

ہمیں اعتماد میں لیتا پھر یہ سب کرتا، مگر وہ تو سیدھا سبھاؤ ناک کی سیدھ میں قبیلے کے کھیا کے پاس چلا گیا۔ جس سے صاف لگتا ہے کہ وہ وہاں معافی مانگنے اور ہمارا راز فاش کرنے کی نیت سے ہی گیا تھا مگر ان کا کھیا بھی پکا لاہمی اور حریص بننا ثابت ہوا۔“

”مجھے بھی تارا کا چہرہ اترا اترا اور مایوس لگ رہا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا۔“ احسان بولا تو علی ریحان نے کہا۔
”چلو مان لیا کہ ہمارے یہ قیاسات غلط نہیں، مگر اب دوستو! تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا کھیا مکر جیت پر بھروسہ کر لیا جائے یا پھر فرار کا راستہ اپنا جائے؟“

”اب ہمارے پاس فرار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔“ شاہ زمان گہری متانت سے بولا۔

”یہ کام تارا کے بھانڈا پھوڑنے سے قبل کر لیا جاتا تو اور بات تھی، لیکن اب ہمارے راز میں ایک قبیلے کا کھیا بھی شامل ہو چکا ہے۔ جس کی بات ناگرہ ریاست کے ایوانوں میں اثر رکھتی ہے۔ اس کے ایک اشارے پر ناگرہ کی وادی ہمارے لیے تنگ کر دی جائے گی۔ معاملہ ایک آدمی کا ہوتا، مثلاً تارا کی حد تک محدود رہتا تو اسے ہلک جھپٹتے ہی موت کی نیند سلا دیا جاتا۔“ شاہ زمان نے ایک ذرا متوقف ہونے کے بعد دوبارہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے مزید کہا۔

”ہمیں اب مجبوراً مکر جیت کی بات ماننا پڑے گی۔ لیکن کلی طور پر اس پر بھروسہ کرنا بھی بے وقوفی ہوگی۔ کم از کم وہ ذرا آنے تک ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔“

وہ تینوں دھیمے دھیمے لہجے میں آئندہ کی حکمت عملی مرتب کرنے لگے۔

☆☆☆

شوکت کو ہوش آیا تو اسے اب بھی اپنے کہیں آس پاس رینا کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی، حالانکہ ہوش میں آنے تک انسان کے اپنے حواس ذرا مٹانے کو مختل رہتے ہیں لیکن یہاں ایسا کچھ نہ ہوا۔ شوکت کو اپنا ہوش کب تھا، وہ تو اب تک رینا کے تصور میں مدھوش تھا۔ اسے اپنے وجود میں کسی کے نرم و گداز جسم کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ کسی کی ریشمی گھٹی زلفوں کی مہک اور شبنمی سی چھایا ہونو زینا پ بادکر رہی تھی۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی وہ اپنے ہونٹوں تک میں اس پر ہی جمال رینا کے گل بدن کے ان حصوں کی حلاوت ثبت محسوس کر رہا تھا جہاں جہاں اس نے بے خودی دے اختیار میں ہوئے دیے تھے۔

جب ”اپنا“ یار ابوا تو اس نے کسمسا کر گردن گھمائی

کیا اہمیت ہوتی تھی۔ یہ فرنگیوں کے مراعات یافتہ اور خصوصی ملازمین کو ملا کرتے تھے۔ جن پر یہ فرنگی آفیسر فخر کرتے تھے کہ یہاں رہتے ہوئے ہم نے اپنے جانثار اور وفادار لوگوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔

پروفیسر ہنری غور سے اس کڑیل لوجوان کو بکے جا رہا تھا۔ وہ اپنی دشوار گزار اہم کے لیے اس کا انتخاب کرنے کے بارے میں غیجیگی سے سوچنے میں جھومتا۔

ان سب کے جانے کے بعد شوکت کے دل میں ایک امید سی جاگتی تھی کہ رینا بھی شاید اس کے پاس ”شکریہ“ کہنے آئے۔ اسے یوں تو نہ وصلے کی پروا تھی نہ ہی سائنس کی غمزدہ تو رینا کو ایک نظر بھر کے دیکھ لیتا چاہتا تھا۔ اس دوران اس کا باپ اس کے بستر کے قریب دھری کرسی پر بیٹھا، بیٹے سے خوشی کے اظہار میں نجانے کیا کیا کہتا رہا تھا مگر شوکت تو کسی اور ہی تصور میں کھویا ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچتا تھا کہ کیا وہ رینا سے واقعی محبت کرنے لگا ہے؟ یا پھر یہ شخص ایک صنف مخالف کے لیے صنف نازک کی روایتی سی انسیت ہے؟ جلد ہی اس کے دل نے پتہ چکر گواہی دی۔

”نہیں شوکی! یہی محبت ہے، اس میں روایت کا کیا دخل؟ آخر کو حیلے میں اور بھی تو خواتین اور لڑکیاں موجود ہیں؟ پھر آئے روز فرنگیوں کی پارٹیاں، مہمانوں کا آنا جانا..... خواتین اور جوان لڑکیوں سے تو شوکی کی بھی اکثر بات ہو جایا کرتی تھی۔ پر رینا کے سلسلے میں معاملہ دل..... واقعی کچھ اور ہونے لگا تھا..... وہ پہلے انسیت، پھر چاہت کے مدار سے نکل کر محبت جیسے اٹل جذبے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

☆☆☆

کریم بخش اس قلعہ نما حیلے کے کچھ ملازمین کے ساتھ ایک بڑی سی مجلس میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ سکنین سے خوشی سارا حال کہہ سنایا، وہ بھی خوش ہوئی مگر جب اسے اپنے بیٹے شوکت کے بارے میں حادثے کا علم ہوا تو وہ ایک دم تشویش زدہ اور پریشان ہو گئی، تاہم کریم بخش نے اسے بیٹے کی خیریت اور صحت یابی سے متعلق تسلی دے دی کہ وہ اب بالکل بھلا چکا ہے۔

کریم بخش ادھر اپنی ”شفقت“ میں مصروف تھا ادھر شوکت کے دل کو قورا نہیں مل رہا تھا۔ اسے جزل شایا اس کے معزز مہمان پروفیسر کے متاثر ہونے اور ان کے ٹکریہ کہنے کی غلطی کوئی پروا نہ تھی وہ تو بے چینی سے

وقت باہر سے کسی کے فوجی انداز میں خبرداری دینے کی آواز بلند ہوئی اور ذرا سی دیر بعد کمرے میں دورعب داب والے افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو فوجی وردی میں ملبوس لیفٹیننٹ جزل مائیکل شا تھا اور دوسرا اس کا سہمان پروفیسر ہنری برنارڈ تھا، جس کی لاڈلی اور خوبصورت بیٹی کو شوکت نے مارگریٹ نامی منہ زور گھوڑی کی سرکشی سے بچایا تھا۔

”ویل یگ مین! کسی طبیعت ہے تمہاری؟“ جزل شانے اس سے پوچھا۔

”میں کافی بہتر ہوں جناب!“ شوکت نے ہولے سے جواب دیا پھر ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ”لگ..... کیا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں؟“ ”مم..... میرا مطلب ہے.....“ ”بے بی اب بالکل ٹھیک ہے، مسٹر شوکی! میں تمہارا بہت مشکور ہوں، ہم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری بیٹی رینا کی جان بچائی۔“ اس بار رینا کے باپ پروفیسر ہنری نے اس سے مخاطب ہو کر مسکرا کے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شوکت کے لیے بڑے سائنسی جذبات بلکھوے لے رہے تھے۔

”ویل! ہم بھی تمہاری اس بہادری کی قدر کرتے ہیں یگ مین! تم ایک دلیر انسان ہی نہیں بلکہ ہمارے سچے وفادار ملازم بھی ثابت ہوئے۔ تمہیں یہاں آج سے ہر قسم کی مراعات حاصل ہوں گی۔“ جزل شا بارعب مگر متاثر کن لہجے میں بولا۔

”بہت بہت شکریہ سرکار! ہم گریب لوگ ہیں، بڑی مہربانی ہوتی اگر ہمیں ادھر ہی کسی کوارٹر میں.....“ بوڑھے کریم بخش کی بات کاٹ دی گئی کیونکہ اسی وقت جزل شا گونج دار آواز میں بولا تھا۔

”شیور..... شیور.....“ وائی ناٹ! مسٹر کریم! تم آج ہی سے اپنی فیملی کے ساتھ ڈی سینٹ کوارٹر میں شفٹ ہو سکتے ہو اور حیلے کے ملازم تمہارے ساتھ ہیلیکاپٹر میں بیٹھیں ہوں گے۔“

شوکت کے لیے اس اعزاز میں کوئی خاص کوشش نہ تھی کہ انہیں یہاں رہنے کے لیے ایک ”ڈی سینٹ“ کوارٹر مل رہا تھا مگر اس کی خوشی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ وہ اب یہاں مستقل رہتے ہوئے، رینا کا دیدار کرتا رہے گا۔ وہ اس کے قریب ہوگا۔ اس سے ملنے رہنے کے مواقع ملیں گے..... لیکن بوڑھے کریم بخش کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عام کوارٹر کے مقابلے میں ڈی سینٹ کوارٹر کی

ختر تھا، رہنا کا.....!

”کیا وہ محض ایک شکرے کا بول تک کہنے کے لیے بھی نہیں آسکتی؟“ وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ وہ رہنا کے لیے کسی احسان تلے یہ نہیں سوچ رہا تھا، اس کی مرضی تھی کہ کسی بہانے ہی سہی وہ آئے تو سہی..... جب ہی وہ اپنے بے قرار خیال پر خود ہی ہنس دیا۔ وہ بھی تو اس حادثے میں زخمی ہوئی تھی۔ چپ وہ خود بستر سے لگا ہوا تھا تو بھلا وہ بے چاری کیسے اٹھ سکتی تھی یا چل پھر سکتی تھی۔ تب اسے کچھ سکون ملا اور اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ رات کو اسے سوپ ابلے ہوئے انڈے دیے گئے۔ اسی رات تک وہ کوارٹر میں شفٹ کیا جا چکا تھا اور اب اس کی ماں سکینہ ہی اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔

شوکت کو ایک ہی جگہ اور بستر پر بڑے رہنے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی طویلے کی راہ لے گا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ اگلے دن صبح سویرے وہ جاگ اٹھا۔ ایک نئے کپلے اور آزاد ماحول میں رات گزارنے کا یہ تجربہ اس کے لیے خاصا خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ محلہ سرداراں والا کی تنگ گلیاں، گھٹے گھٹے اور تنگ و تاریک کوشریوں والے گھروں سے اسے سخت نفرت تھی۔ یہاں اس ڈی سینٹ کو ایئر کاکٹن ہی اس قدر کشادہ تھا کہ میدانی ہواؤں سے پورا گھر تازہ دم سا رہتا تھا۔ اس میں تین بڑے کمرے تھے۔ چھت تھی۔ سب سے بڑھ کر بنیادی ضروریات کی ساری سہولیات مینسر تھیں یہاں۔

سکینہ اور کریم بخش بھی بہت خوش تھے یہاں..... ناشتے کے بعد جب شوکت نے بھی باپ کے ساتھ طویلے جانے کی تیاری باندھی تو دونوں میاں بیوی فکر مند ہو گئے۔ ”شوکی بیٹے! یہ تو کدھر چلا.....؟“ بالآخر باپ نے پوچھا۔ ”کام پر جا رہا ہوں.....“ شوکت نے جواب دیا۔ ”پر بیٹا! تیری طبیعت تو.....“

”میں اب ٹھیک ہوں ابا!“

”کدھر سے ٹھیک ہے تو میرے لعل!“ سکینہ نے مستابھری فکر مندی سے کہا۔ ”کل تیرے ساتھ اتنا خطرناک حادثہ پیش آیا ہے اور آج تو کام پر جانے کی تیاری پکڑ رہا ہے۔ تجھے کچھ روز آرام کرنا چاہیے بیٹے!“

”اماں! میں ایسے بہت پوریت محسوس کر رہا ہوں، میں کوئی سخت کام نہیں کروں گا..... میں یوں سمجھ ڈرا چھل قدمی کرنے جا رہا ہوں اور ڈاکٹر نے بھی تو مجھے

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسٹی ملٹی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کس

یہی مشورہ دیا ہے۔“ شوکت نے مسکرا کر کہا۔
شوکت یوں ماں باپ کو بہلا کے کام پر نکل آیا۔

اس نے بھلا کہاں جانا تھا۔ کوارٹر سے نکلا اور سیدھا طویلے کا رخ کیا جو قریب ہی تھا۔ باقی عام کوارٹر طویلے کے پچھوڑے بنے ہوئے تھے، ڈی سینٹ کوارٹر چند ہی تھے اور وہ طویلے سے ہٹ کر نسبتاً کشادہ اور کھلی جگہ پر تھے۔ یہاں سے جو بھی قریب تھی۔ شوکت کے پہلو کا زخم اگرچہ کافی حد تک بھر گیا تھا مگر پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ابھی گھڑ سواری سے منع کر رکھا تھا۔

وہ کچھ سوچتا ہوا طویلے میں داخل ہوا اور کھر کھا سنبالے ایک گھوڑے کی کمر پر بے دلی سے پھیرنے لگا۔ اس کا سارا دھیان کھر کھا پھیرنے کے بجائے پری جمال رینا کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب اسے ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا تھا تو بھلا رینا کو کہاں اتنی جلدی بستر چھوڑنے کا کہا جائے گا؟ وہ خود تو محذور تھا اور رینا شہزادی مثل..... اسے تو طویل بیڈریسٹ کا کہا گیا ہوگا۔

تاہم ایک امید تو تھی کہ ہو سکتا ہے رینا بھی اس کی طرح بیڈریڈ پڑے پڑے آکتا جائے اور گھڑ سواری کا لباس پہنے طویلے میں چلی آئے..... اور یہی وہ وقت تھا جب دل بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ قبولیت کی اس گھڑی میں وہ خدا سے کچھ اور مانگ لیتا، کیونکہ اگلے ہی لمحے اسے طویلے کے گیٹ پر وہ کھڑی دکھائی دے گئی۔ سرد وقت، مناسب جنم اور گھڑ سواری کے مخصوص ڈارک براؤن کمر کے چست لباس میں ملفوف، سر پر ٹوپی اور اس سے جھانکتے ہوئے اس کے سنہری بال، تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں حسب سابق بید کی اسٹک تھی جس سے وہ بڑے عجیب سے انداز میں ہولے ہولے اپنی دائیں ٹانگ کی پنڈلی پر ضرب لگا رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی گھری سوچ میں غلطیوں ہو۔

گھوڑے کی پشت پر کھر کھا اٹھتا ہوا اس کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ اس کی دلی مراد برآئی تھی اور وہ آگئی تھی۔ ہاتھ رکنے پر گھوڑا ہنپنا یا تھا اور اپنی ایال بھری گردن کو گھما کے شوکت کی طرف دیکھا تھا۔ شوکت نے رینا کو دیکھتے ہی مسکرا کر اپنا ایک ہاتھ ہلادیا۔ جواب میں رینا بھی اپنا ہاتھ ہلادیا کرتی تھی مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی اور شوکت کو یوں لگا جیسے رینا کا ہر اٹھتا ہوا قدم اس کے دل

پر پڑ رہا ہو..... رینا کے استقبالیہ انداز میں ہاتھ نہ ہلانے پر وہ اندر سے تھوڑا کھٹکا تھا۔

”ہیلو..... مس رینا! آپ کو صحت یاب دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ وہ جب اس کے بالکل قریب آ کر کھڑی ہو گئی تو شوکت نے اسے اوپر سے سلام کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”آئم اوکے..... تم کیسے ہو؟“ رینا کا مترنم لہجہ سپاٹ اور سرد تھا اور اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں ایک خاموش سی چھین کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اندر سے ہونے لگا، کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی؟ اور تب ہی اسے اپنی ”غلطی“ کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت جب وہ رینا کو نیم بے ہوشی کی حالت میں اس سرکش گھوڑی مارگریٹ سے بچاتا ہوا خود سے لپٹائے بھوسے کے ڈھیر پر جا پڑا تھا تو خود پر قابو نہ پاسکا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر رینا کے ساتھ تھوڑی سی ”گستاخی“ کر ڈالی تھی۔

”تو کیا اسے احساس ہو گیا تھا؟“ اس نے سوچا۔ اسے اپنے باپ کی نصیحت بھی یاد آنے لگی۔

”بیٹا! ان فریکٹوں سے محتاط رہنا، ان کے موڈ بدلنے میں دیر نہیں لگا کرتی۔ ہل میں تولہ ہل میں ماشہ ہوتی ہیں یہ..... شکایت ہو گئی تو مجبوروزی بھی گئی اور جان بھی.....“

وہ تھرا گیا۔ ہل کے بل اس نے یہ سب سوچا اور جلدی سے جواب میں قدرے تم ہو کے بولا۔

”تھینک یوس رینا! میں بالکل ٹھیک ہوں..... بس تھوڑا سا زخم گہرا ہے۔“ اس نے آخر میں جتا بھی دیا کہ اگر ایسی کوئی ”بات“ تھی بھی تو اس پر وہ طرح دار میں پھٹی رہ جائے۔ شوکت کے جسم پر بھی جھلکے سبز رنگ کی وردی تھی جو اس کے کسرتی جنم پر خوب بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس میں خاصا خوب رو دکھائی دے رہا تھا۔ دراز قدر پر فڈنرٹ اور ٹائٹ پینٹ، پیروں میں لاناگ بوٹ..... اس کی شخصیت کو بھی پُر وجہ بنائے ہوئے تھے۔

”تمہارا شکریہ! تم نے میری جان بچائی لیکن..... تم نے میری خاطر اپنی جان کیوں اس قدر خطرے میں ڈال دی تھی.....؟“ رینا یہ کہتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اسی گھوڑے کی پشت پر پھیرنے لگی، جس پر شوکت کھر کھا پھیر رہا تھا۔ شوکت کو رینا کا یہ پوچھنا اچھا تو لگا مگر اسے یہ بھی احساس ہوا کہ استفسار کا یہ انداز سرسری اور واجبی سا ہے، جیسے خانہ پُری کی جارہی ہو۔

”مس! میں آپ کا لازم ہوں اور میچسٹی کانمک خوار..... میرے باپ نے مجھے یہی تعلیم دی ہے کہ اپنے

اسٹیبیل باکس کے چوٹی بانس پر اپنے دونوں بازو دکھا کر شوکت سے کہا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ رینا کے اس طرح چمکیلی کمر کاخم نکال کر چوٹی بانس کے ساتھ تک کر کھڑے ہونے کی قیامت خیز انداز نے شوکت کا دل ایک لمحے کو ڈمک کر رکھ دیا تھا تاہم وہ جلدی سے جوابا بولا۔

”مس رینا! کیا آپ اب بھی اس پر سواری کرنا چاہتی ہیں؟“

”ہاں!“

”اس حادثے کے بعد بھی؟“ شوکت کے لہجے میں حیرت کے ساتھ توشیح کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

”تمہارا کیا مطلب ہے مسٹر شوکی! کیا ایک گھڑسوار کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایک جانور سے ہار مان لے؟ یہ تمہارا ہی مجھے بتانا ہوا تو ہے۔“

رینا نے اسی طرح کمر کاخم نکالے، دونوں بازو ہنوز بانس پر لٹکائے ہوئے محض اپنی گردن ڈراموز کر اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ایسے میں شوکت کو رینا کی آنکھیں چمکی ہوئی اور ہونٹ تھرتھکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا شارٹ جیکٹ نما کوٹ کمر سے کچھ اور اونچا ہو گیا تھا اور اس کی نیس پر ہنٹ مکر کی دودھیا گوری اور شفاف جلد کچھ اور واضح ہو گئی تھی۔ شوکت نے فوراً کہا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ آگے بھی کہنا چاہتا تھا کہ رینا ایک دم پٹنی اور اس کے بالکل قریب اور سامنے ہو کر مسکت اور تھکمانہ لہجے میں بولی۔

”مارگریٹ کو باہر نکالو۔۔۔۔۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ حکم صادر کر کے وہ گیٹ کی طرف چل دی۔ شوکت اسے جاتا نہ سہا۔ وہ بھی اسے مارگریٹ کی طرح کوئی مزہ زور گھوڑی ہی کی صورت نظر آرہی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شوکت اسٹیبیل کے دیوہیکل چوٹی دروازے سے مارگریٹ کی باگیں تھامے برآمد ہوا۔۔۔۔۔

مارگریٹ اس وقت پرسکون نظر آرہی تھی۔ شوکت اس کی گردن پر دیرے دیرے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تازہ ہوا میں اس کے ایال لہر رہے تھے۔ شوکت نے ماہرانہ نظروں سے مارگریٹ کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کو دیکھا۔ ان میں بے چینی نہیں تھی۔ تاہم وہ فکر مند تھا۔ اسی وقت قریب کھڑی رینا نے اس کے کاندھے پر اپنا سر مریں ہاتھ رکھا۔ شوکت نے اپنے دل کی بے طرح دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس کی شارخ گل جھبی نکر کے گرد اپنا ایک بازو حائل کر کے سہارا دیا تو رینا، جو اپنا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا چکی تھی، اچھل کر مارگریٹ کی پشت پر سوار ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے

مالکوں سے وفادار رہوں اور وقت پڑنے پر جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔!“ رینا کے گلابی لبوں سے گویا عجب انداز کا اختصار یہ برآمد ہوا۔ اس کے گداز ہونٹوں کا ایک کونا تھوڑا سا لبوں سے کھینچا تھا جس سے ہلکے طنز کا سماں ہوتا تھا۔ اس طرح کونا کھینچنے سے اس کے سر میں گال میں ایک ڈھیل سا بنا تھا، یہ محسوس کرنے کے باوصف کہ اس میں طنز کا شائبہ تھا، شوکت کو یہ گڑھا پھر بھی بھلا لگا تھا۔ وہ خود کو اس میں گرا ڈالنے کے لیے تیار تھا۔۔۔۔۔ جو شاید اس کا اپنا ہی کھودا ہوا تھا۔

فرنگیوں کی نوکری کرتے ہوئے اور کچھ اپنے باپ سے سیکھے ہوئے ادب و آداب سے شوکت بھی واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ رینا کے ساتھ اسی انداز و نیز سے باتیں کیا کرتا تھا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا مگر آپ۔۔۔۔۔“

اس نے بات کا رخ کھانے کی کوشش کی۔

”بہت کر لیا آرام۔۔۔۔۔“ رینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مارگریٹ نظر نہیں آرہی۔۔۔۔۔؟“ یہ کہتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”وہ اسٹیبیل نمبر تیرہ میں ہے۔“ شوکت نے اس کے چہرے پر اپنی پُرشوق سی نظریں جمائے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”شیوہ۔۔۔۔۔“ شوکت نے کہا اور پھر دونوں رواں سائل کے اسٹیبیل سے ہٹ کر باکس اسٹیبیل کی طرف آگئے۔ یہاں دو اور ملازم بھی کام میں مصروف تھے۔ یہ دونوں گھوڑوں کی کندگی صاف کرتے تھے اور فیڈر بھی تھے۔ یہ ہندو تھے۔ دونوں ہی پختہ العمر تھے۔

”مندو! مارگریٹ کے اسٹیبیل کا فرش بہت چمکا ہو رہا ہے۔“ شوکت نے تیرہ نمبر کے اسٹیبیل کے قریب آکر رکھتے ہوئے قریب کھڑے ایک فیڈر سے کہا۔

”تم جانتے ہو، یہ گھوڑی صاحب کی کس قدر پسندیدہ ہے۔ پھل کئی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو صاحب کو اسے گولی مارنے میں کس قدر روکھ ہوگا۔“

”غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔ ابھی دیکھ لیتا ہوں۔“ مندو نامی وہ پختہ العمر فیڈر جلدی سے اس طرف کو بڑھا اور اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

”آج میں اسی پر سواری کرنا چاہوں گی۔“ رینا نے

لینے کی کوشش کرنا اور جب تک کسی خطرے کی بومت سونگھ لو وہاں سے مت ہٹنا..... تاہم اگر ایسی بات محسوس نہ کر دو تو آکر ہمیں مطلع کر دینا۔“

شاہزماں اسی وقت جھونپڑے سے نکل آیا۔

دور سفر تک چوٹیوں پر دھوپ سنہری ہونے لگی تھی۔ ہواؤں میں ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ شاہ زمان نے کھدڑ کی موٹی شال اوڑھ رکھی تھی۔ تارائے جس جمبو پڑی میں ان کی عارضی رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا، وہ نسبتاً آگ تھلک اور پرے واقع تھی۔ یہ بھی ان کے لیے درست نہ تھا، جسے ان پر شک نہ بھی ہوتا، وہ جتلائے تشکیک ہو جاتا۔ شاہ زمان نے اس طرف قدم بڑھا دیے جدھر کھیا کرجیت کی کٹیا تھی۔ اس کے لیے اسے بستی کے وسط سے گزرتا پڑا۔ کئی جمبو پڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بچوں کے رونے کی آوازوں میں عورتوں کے بیزار کن انداز میں چلانے کی بھی آواز ابھرتی تو ماحول کریہہ سا ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ ادھر ادھر الاؤدھ کھائے، اس کے گرد بیٹھے پہاڑی جانوروں کے سالم پتھر بچونے اور ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ شاہ زمان یہ ظاہر لاپاہلی انداز میں چلا جا رہا تھا۔

نکھیا کی کنٹیا قریب آتے ہی اس نے یقیناً اپنا راستہ بدل دیا۔ راستہ اس نے کنٹیا کے باہر بندھے چار گھوڑوں کو کچھ کر بلا لٹا۔ جن پر مخصوص شاہی زین کی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ مہاراجا چندر گپتا کے بیٹے ہوئے آدمی پہنچ چکے تھے۔ شاہ زمان پہلے ہی محتاط تھا۔ ایک نظر اور اپنے گرد و پیش میں ڈال کر کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کی تسلی کر ڈالی اور کنٹیا کے عقبی حصے کی طرف بڑھ چلا۔

یہاں اطراف میں سناٹا طاری تھا۔ کسی پہرہ دار یا محافظ کا جھلایا ہوا کیمکڑا تصور ہوتا۔ وہ بھر جی احتیاط کا دامن تھامے ہوئے آگے بڑھا اور کنٹینر کے عقبی حصے کے قریب آ کر رک گیا۔ لمحہ بھر کو گرد و پیش کی سن گن لی اور ایک درپچہ نما اور قدرے کشادہ روزن کے پاس سرک آیا۔ یہاں ٹاٹ جمول رہا تھا۔ اندر سے کسی کے بارعب انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے وہ ذرا سا سر کا کر اندر جھانکا۔ تین سرخ اور ایک نیلی وردی میں لمبوس افراد اتنے کھڑے تھے۔ سرخ وردی پوش افراد کی پشت سے راکٹیں جمولتی نظر آرہی تھیں، جبکہ نیلی وردی والے کے بائیں پہلو سے نکوار بندھی ہوئی تھی۔ وہ خاصہ دراز قامت اور رب داب والی شخصیت نظر آتا تھا۔ وہ سامنے مڑو بانہ سے انداز میں کھڑے کھیا کر جیت سے

ہائیں مضبوطی سے تمام لیں۔ شوکت مارگریٹ کی چٹک پر پیارے ہاتھ پھیرنے لگا اور ساتھ ہی ریتا سے بولا۔
 ”اس کی گردن اور ایال کو پیارے سہلائیے، ابھی فوراً اڑنے لگنے کی کوشش کیجیگا۔“

”تم میرے ساتھ، پیچھے بیٹھ جاؤ.....“ اُجھانک
ریتا نے نیا حکم صادر کر دیا۔ شوکت کا دل مزید اُتھل چھل
کا شکار ہوئے لگا۔ تاہم اس نے بھی یہی ضروری سمجھا اور خود
بھی اچک کر ریتا کے پیچھے کھڑے پر سوار ہو گیا۔ مارگریٹ
زور سے جھپٹائی اور خاموش ہو گئی۔ ریتا ٹھوڑا آگے کوچک
کر اس کی گردن اور ایال سہلانے لگی، ایسی صورت میں اس
کی پشت شوکت کو چھونے لگی۔ اس کے حلق میں کانٹے اُگنے
لگے۔ اس نے ریتا سے لگام کو حرکت دینے کی سرکوشی کی اور
ریتا نے سیدھی ہو کر ایسا ہی کیا۔ مارگریٹ فوراً ہی دِگی چال
پُر آگئی۔ دونوں ایک ساتھ گھڑسواری کرنے لگے۔ اس کے
بعد ریتا نے مارگریٹ کو ایڑ لگا دی۔ مارگریٹ زور سے
جھپٹائی اور اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ شوکت ریتا کی
پشت سے چپک گیا تھا۔ ریتا کا بھی سارا زور عقب میں
تھا اور شوکت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آیا وہ مارگریٹ
کو سنبھالے یا ریتا کو..... مگر ایسی ”خطرناک“ صورت حال
میں اسے دونوں کو ہی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ دونوں نے مل
کر میدان کا ایک چکر لگا یا اور ابھی دوسرا چکر پورا ہونے ہی
والا تھا کہ فضا میں گولی جلنے کی آواز ابھری..... ریتا نے
فوراً لگ میں پہنچ دیں۔ مارگریٹ اضطراری انداز میں
جھپٹا کر رکتی گئی۔

☆☆☆

سرحدی بنجاروں کی بستی میں رہتے ہوئے انہیں آج دوسرا دن تھا اور آج ہی ناگرہ سے وفد کے آنے کا امکان تھا۔
 ”تارا ہمیں بھی نہیں بتائے گا کہ وفد آیا ہے یا نہیں۔“
 شاہ زمان نے کہا۔ ”اسی لیے میرا خیال ہے مجھ کو باہر جا کر معلوم کر لینا چاہیے۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ احسان جامو بولا۔ ”وفد آئے گا تو اب کیا کر جیت ہی انہیں سنبھالے گا۔“

”میرا خیال ہے شاہ زمان کا کہنا غلط نہیں ہے۔“

گروپ لیڈر علی رحمان نے شاہ زمان کی بات کی تائید میں کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔ ”جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ حالات غیر یقینی ہیں، ہمیں کیا کر جیت پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“ پھر وہ شاہ زمان سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تم جاؤ..... اور اگر وفد ابھی گیا ہو تو ان کی سن گن

اگلے چند ہی سیکنڈوں میں یہ تینوں باہر تھے۔ شام اتر چکی تھی اور سنگار ویرانوں میں رات کے کاجل کے پھلنے کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ تینوں انجی اندھیاروں کا حصہ بنے ایک طرف کو بڑھنے لگے، ابھی انہوں نے یہ مشکل چند ہی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ انہیں خشک کر کرنا پڑا۔

ایک چٹائی اوٹ سے انہیں ناگہرہ ریاست کی سرحدی پٹی کے ساتھ ساتھ بتیاں ٹٹھاتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے معاملہ صرف وفد بھیج جانے کا نہیں ہے۔“ علی رحمان نے پُر سوچ انداز میں سرگوشی کی اور آگے بولا۔ ”انہیں پختہ یقین تھا کہ ان کے حکمران ہی بستی میں فروکش ہیں، اسی لیے انہوں نے بستی کے گرد و رافاصلے پر پہرا ڈال رکھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا بستی چھوڑنے کا یہ بروقت فیصلہ درست تھا۔“ احسان جامو بولا۔

”لیکن..... ہم اب بھی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔“ شاہ زمان نے کہا۔ اس کے لہجے میں فکر کا عنصر غالب تھا۔ ”خالی جمونڈی پاتے ہی ہماری ڈھنڈا پڑ جائے گی۔“

”لیکن دشمنوں کے اس پہرے کی طویل اور مضبوط زنجیر توڑنا ہمارے لیے آسان نہ ہوگا۔“ علی رحمان بولا۔

”یہ توڑنا پڑے گی۔ مقابلے کے سوا اب کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ میں بارودی تھیلوں کو دوستی بموں کی طرح استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔“ شاہ زمان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”میرا خیال ہے ابھی یہ قتل از وقت ہوگا۔ ہمارے پاس سنگینیں ہیں۔ ہم ان سے کام لیتے ہوئے چیرا لگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گوریلا حملے کا تقاضا بھی یہی ہے۔“ علی رحمان بولا۔ دونوں نے تائید میں اپنے سر ہلا دیے۔

وہ تینوں جاننا زور گریلا جاسوس دشمنوں کے اس کڑے پہرے کی زنجیر کاٹنے کی غرض سے اس طرف کو جانے والے ایک نسبتاً تنگ اور مل کھاتے فنی راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ ملگسٹا اندھیرا ان کے چار اطراف پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے، جو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ کوہ شمالیہ کی شہزادیاں غسل شب کے لیے تیار تھیں۔ کیونکہ سیاہ گہرے اور گھٹا دار بادل ان عظیم الشان چوٹیوں کو چھوتے محسوس ہو رہے تھے۔ دشمنوں کے اس پٹی دار کڑے پہرے میں کوئی خیمہ

”ہمارے جاں نثار آدمیوں کو ان خطرناک جاسوسوں نے ہلاک کر ڈالا ہے اور یہ تب تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہاں سے انہیں مدد نہ ملی ہو۔“

”سرکار کی ہے، ہم تو عرصے سے سرکار اور ہمارا جا کی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے آ رہے ہیں۔“ کھیا کر جیت جواب میں کہہ رہا تھا۔ ”ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ باغیوں کے کردہ کی خفیہ مدد کریں..... آپ کو کوئی شبہ ہے تو وہ دور کر سکتے ہیں۔ میں ابھی سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا حکم دیتا ہوں۔“

”وہ تو ہم کریں گے ہی..... نیلی وردی والے نے کڑک دار لہجے میں کہا اور گویا حکم صادر کرتے ہوئے مزید بولا۔

”سب کو ایک جگہ اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں! ان سے یہ کہہ دو کہ سب اپنی اپنی مڑھیوں (جمونڈیوں) تک محدود ہو جائیں اور کوئی ہمیں باہر یا ادھر ادھر حرکت کرتا دکھائی نہ دے، ورنہ ہم اسے ہی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

”جیسا حکم سرکار.....!“ کھیا کر جیت نے کہا اور اسی وقت اس نے بستی میں یہ منادی کرا دی کہ لوگ باگ سب اپنی اپنی کشتیوں تک محدود ہو جائیں۔ کوئی باہر نہ نکلے، جب تک کہ حکم نہ ہو.....

شاہ زمان بھی اسی وقت اٹھنے لگے پاؤں دوڑتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا جو بڑے بے چینی سے اسی کی واپسی کے منتظر تھے، کیونکہ اعلان کی بازگشت ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

”ایک ریاستی سالار کے ہمراہ... فرنگی گن مین وفد کی شکل میں آئے ہوئے ہیں اور انہیں اس بات کی ہمت بھی پڑ چکی ہے کہ ان کے آدمیوں کو ہلاک کرنے میں جن باغی جاسوسوں کی مدد کی گئی ہے وہ انہی کی بستی کا تعلق دار ہے۔“ شاہ زمان نے انہیں بتایا۔

”یہ فرنگی بہت عیار ہیں۔“ علی رحمان نے پُر غور لہجے میں کہا۔ ”سب کو ایک جگہ جمعے کی صورت اکٹھا کرنے کے بجائے اپنی اپنی کشتیاں تک محدود کر دیا گیا ہے۔“

”ان کی اس حکمت عملی اتنے ہم دھریلے جائیں گے۔“ احسان جامو بولا۔

”تو پھر جو کتنا ہے چند سیکنڈوں میں سوچ کے کر گزرو..... مجھے بھی پہنچنے کی کوئی خاص امید نہیں نظر آتی ہے۔“ شاہ زمان بولا اور پھر تینوں فوراً ہی ایک فیصلے پر متفق ہو گئے۔

گزا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وہ سب کے سب نکلے
 ڈارر انگلوں کے ساتھ دست بدست چوکس کھڑے
 تھے۔ تاہم موسم کے تیور دیکھ کر انہیں بے چینی محسوس ہونے
 لگی تھی۔

”ادھر ہی رک جاؤ..... ہمیں بارش کا انتظار کر لینا
 چاہیے۔“ علی ریحان، جو سب سے آگے تھا۔ ایک قریبی
 چٹائی جمجھے تلے آ کر رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

ٹھیک اسی وقت زوردار کڑا کا ہوا۔ یہی سمجھا گیا کہ
 آسمانی بجلی نے بارش کا اعلان کیا ہے، مگر یہ گولی چلنے کی
 آواز تھی جس نے ان تینوں کو بری طرح چونکا دیا تھا۔

”شاید وہ لوگ ہماری جھوپڑی تک پہنچ چکے ہیں اور
 اسے خالی یا کر فائر کی صورت سنل دیا ہے۔“ شاہ زمان نے
 خیال ظاہر کیا لیکن اسی وقت جب فائر ہوا تو قدرے اونچائی
 پر واقع بنجاروں کے اس عارضی پڑاؤ پر شور مچ گیا۔ اسی
 وقت مزید تلے اوپر گولیاں چلیں..... لوگوں کے شور کا سوا
 ہوتا اضافہ بھی عروج اختیار کر گیا۔

”گلتا ہے..... ان لوگوں نے غصے میں آ کر بنجاروں
 کے کھیا کو گولی ماری ہے۔“ زیرک دماغ اور زود فہم شاہ
 زمان نے سرسراہٹ میں قیاس آرائی کی۔

اوپر بلوے کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔ گلتا کچھ ایسا
 ہی تھا جیسے ریاستی وفد اور بنجاروں کے درمیان ٹھن گئی
 تھی۔ اسی سبب، پہرا بند اور ہتھیار بدست فوجی حرکت میں
 آ گئے اور بنجاروں کے اس عارضی پڑاؤ کا رخ کرنے لگے۔
 یہی وہ وقت تھا جب تاریک آسمان پر بادلوں کی بہت
 ناک گرج ابھری اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش
 شروع ہو گئی۔

”گلتا ہے، تقدیر ہمارا پورا پورا ساتھ دے رہی
 ہے۔ آگے بڑھو دستو!“ علی ریحان کی پُر جوش آواز
 ابھری۔ پہرے کی زنجیر کٹ چکی تھی۔ یہ تینوں کلینیں
 سنبھالے آگے بڑھنے لگے۔ تعداد میں صرف تین ہونے
 کے باوجود یہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے
 تھے۔ سب سے آگے علی ریحان تھا، درمیان میں احسان
 جامو اور آخر میں شاہ زمان تھا۔ بارش کے پانی سے اپنے
 ہتھیاروں کو بیکار ہونے سے بچانے کے لیے انہوں نے
 موسمی تقصیرات کو پہلے ہی سے مد نظر رکھا ہوا تھا اور انہیں
 کیڑوس کے خول میں لپیٹ دیا گیا تھا۔

اوپر ”پڑاؤ بستی“ میں ہنگامہ ہونے کے سبب پہرا
 ٹوٹ چکا تھا۔ یہ لوگ ناگرہ کی سرحد یا پٹی کے قریب پہنچ

چکے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے آگے کی پیش قدمی
 کے لائحہ عمل پر غور کرنے کے لیے سرجوڑے۔

”شکر ہے کہ ہمارا فیصلہ بروقت اور درست ثابت
 ہوا۔“ علی ریحان بچی آواز میں بولا۔

”ٹھیک کہا علی بھائی! وہ پڑاؤ ہمارے گلے کا پسندا
 بھی بن سکتا تھا۔ مجھے نہیں گلتا کہ اب ان بنجاروں کو اتنی
 جلدی پر روانہ راہداری مل سکے گا۔“ احسان جامو نے
 کہا تو شاہ زمان بولا۔

”ان بنجاروں کا معاملہ گمبیر ہو گیا ہے۔ گلتا ایسا ہی
 ہے کہ اس فرنگی فوجی افسر نے کھیا مگر جیت کو گولی مار کے
 ہلاک کر دیا ہے۔ وہ ہماری خالی جھوپڑی دیکھ کر معاملے کی
 یہ تک پہنچ گیا ہوگا۔ جس کا واضح مطلب ہے کہ ان پہاڑیوں
 میں ہماری دھڑ یا پڑستی ہے اور اب ہمیں اپنی صوابدید پر
 جلد از جلد یہ پٹی پار کرنا ہوگی۔“

تینوں نے فوراً وہاں سے کوچ کیا۔ تنگ دروں سے
 گزرتے اور گہری اندھی کھائیوں کو جان لیوا رسک سے
 پار کرتے ہوئے وہ بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ کر تعویذی دیر کو
 رکے تھے جہاں سے انہیں روشنی آتی دکھائی دی تھی۔ انہیں
 سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی کہ وہ ایک مورچا نما سرحدی
 چوکی کے قریب تھے۔

طوقان بادو باران کا یہ موسم..... اگر چان کے لیے
 معاون ثابت ہو سکتا تھا مگر اس کے باعث پتھر لیے راستے
 پھسلواں ہونے لگے تھے۔ انہیں بہت سنبھل سنبھل کر قدم
 اٹھانے پڑ رہے تھے۔

”اس پٹے پر حملہ کیے بغیر ہم اسے پار نہیں کر سکتے۔“
 شاہ زمان نے ہولے سے کہا۔

”حملہ ہمارے لیے موت کا پسندا ثابت ہو سکتا
 ہے۔“ احسان جامو بولا۔

”گور پلا ایکشن کے ذریعے انہیں موت کی نیند سلانے کی
 کوشش کرنا ہوگی۔“ شاہ زمان نے اپنی بات کی وضاحت چاہی۔
 ”معاملہ بڑ گیا تو ہم بھی یہی طرح رخنے میں آ جائیں
 گے۔“ علی ریحان نے بھی پہلو بٹھائی کر لی تھی۔

”اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔“ شاہ زمان بولا۔
 ”تم لوگ اس موہ چلنا چوکی کا یہ مقام دیکھ ہی رہے ہو کہ
 اس کے اطراف میں تازیکی..... گہری اور سنگناخ کھائیاں
 ہیں، جو ناگرہ کی چوری جیسے سرحد پار کرنے والوں کے لیے
 موت کا پیغام لاسکتی ہیں۔“

”ہم.....“ علی ریحان نے پُر سوچ انداز میں ہونٹ پیچھے۔

رہے گا۔“

ایک بار پھر بجلی زور سے کڑکی۔ علی رحمان اور شاہ زمان نے اس کی اور اپنے ساتھی کی بات کی روشنی میں فوراً اور بہ غور جائزہ لیا تو انہیں احسان جامو کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ اس کھڑکوبھرنے میں کافی دیر بیت سکتی تھی، دوسرے یہ کہ اس کے اطراف میں ان گنت راستے نالیوں کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ چونکا سی آب کا ایک قدرتی ذریعہ سمجھے جاسکتے تھے۔ لہذا پانی کی سطح ایک حد تک ہی بلند ہو سکتی تھی، مگر اتنی زیادہ نہیں کہ یہ لوگ پکٹ تک پہنچ سکتے۔

چنانچہ تینوں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر ایک ایسی عمودی دراڑ کا رخ کیا جو پکٹے کے عین نیچے والی پتھرلی دیوار کو چرتی ہوئی اوپر جاری تھی۔ یہاں بھی کافی سارا بارش کا پانی جمع ہو چکا تھا۔ وہ تینوں اس میں داخل ہو گئے۔ دراڑ کا حجم فقط اسی قدر تھا کہ اس میں ایک وقت میں ایک ہی نفر سلا سکتا تھا۔ ان کی پیش قدمی کی ترتیب وہی رہی تھی۔ یعنی پہلے علی رحمان اندر سایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کو دراڑ کی سخت مگر پھسلواں دیوار کے ابھرے ہوئے ٹیلے پتھروں پر اٹکا یا۔ پھر اپنے جسم کو اوپر کھینچا تا کہ دوسرے ساتھی کے لیے جگہ بن سکے۔ اس کے بعد احسان جامو اندر داخل ہوا اور پھر شاہ زمان.....

اب تینوں جری جاناز..... اپنی نہایت کٹھن، ممبر آزما اور خطرناک عملی کارروائی سے گزر رہے تھے۔ بارش کی تیز پھوار دراڑ کے اندر بھی پڑ رہی تھی۔ پانی کے سر اور آرائی کی طرح جیسے جیسے ان کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے مگر وہ تینوں اس کی پروا کے بغیر دراڑ کا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

اس کوشش میں ان کے ہاتھ پاؤں اور جسم بھی تھک کر شل ہونے لگے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کچھ سیکنڈوں کے لیے ٹھہر جاتے اور پھر بڑھنا شروع کر دیتے تھے۔

ان کے بچو اب اندر پیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ البتہ بجلی چمکتی تو کھڑ میں بڑھتی ہوئی پانی کی سطح نظر آ جاتی تھی جس کا کافی سارا حصہ دراڑ کے اندر بھی جمع تھا۔ گویا ان کے پاس اب صرف ایک ہی راستہ بچا تھا۔ یعنی اوپر اور آگے بڑھتے رہنا۔

دراڑ کی تنگ دامانی اگرچہ ان کے اس عمودی سفر میں معاون و مددگار بھی ثابت ہو رہی تھی، کیونکہ وہ خود کو اس کے پتھر لیے رختوں میں پھنسا کر اپنا کٹھن اور عمودی سفر جاری رکھے ہوئے تھے لیکن..... ایک خطرہ ان کے سر پر۔ الفاظ دیگر ان کے نیچے پانی کے ایک ایسے تالاب کی صورت میں

”اس سے پہلے کہ ان کے باقی ساتھی بھی ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آچکیں، ہمیں اپنا کام کر گزرتا چاہیے۔“ شاہ زمان نے اس لائحہ عمل پر گویا آخری کیل ٹھوکتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنا آتشیں اسلحہ ٹھولتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تکینہ بنیں ہنوز ان کے ہاتھوں میں ہی دہی ہوئی تھیں جبکہ آتشیں ہتھیار بھی کچھ اس پوزیشن میں ان کے جسموں کے ساتھ تھی تھے کہ وہ بوقت ضرورت ہل کے ہل ان کے ہاتھوں میں کھینے لگتے۔

ایک تنگ سے درے میں داخل ہونے کے بعد پکٹے سے آتی ہوئی روشنی ٹھوڑی مزید گہری ہوئی۔ وہ تینوں اب پکٹے کے کسی نسبتاً قریبی نشیب میں ایک ایسی جگہ محسوس تھے، جہاں آسانی بجلی کی لحاظی روشنی میں تنگ پہاڑی رخنے اور اندھی دراڑیں کسی ہولناک عفریت کی طرح انہیں ٹنگنے کے لیے گھورتی نظر آ رہی تھیں۔ قدرے عمودی رخ پر بنے پکٹے کے مورچے کی روشنی دھواں دھار بارش کے چمپینوں سے گدلی پڑنے لگی تھی۔ بارش کا طوفانی شور بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک سے اطراف کا سنگناخ ماحول مزید ہیبت ناک کی منظر پیش کرنے لگا تھا۔ اس پر سوا یہ ہوا کہ جمع شدہ آب استادہ، اس کھڑ میں پانی کی سطح کو رفتہ رفتہ بلند کر رہا تھا۔ جو کسی وقت بھی ایک پہاڑی تالاب کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔

”ہمیں پانی کی اس سطح کے بلند ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔“ علی رحمان بولا۔ دھواں دھار پانی کے شور میں اب انہیں ٹھوڑا اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ ”پانی کی بلند ہوتی سطح ہمیں پکٹے کے قریب پہنچا دے گی۔“

اس کی تجویز شاہ زمان کو مقبول محسوس ہوئی مگر احسان جامو بولا۔ ”اگر اس سے پہلے ہم کسی اوپر جاتی دراڑ میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔“

”اگر بارش کے اس تالاب کا پانی بلند ہو کے اس دراڑ کے اندر آ گیا تو ہمیں اذیت ناک موت سے کوئی نہیں بچا سکا گے۔“ شاہ زمان نے کہا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ پانی کی سطح ایک چوتھائی سے زیادہ بھی بلند ہو سکتی ہے۔“ احسان جامو نے بجلی کی ابھرتی کڑک اور اس کی روشنی میں ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔

”کیونکہ ہم جس کھڑ میں موجود ہیں، یہ پیالہ نما گڑھا نہیں ہے۔ اس کی دیواروں میں ان گنت روزن اور چھوٹی موٹی راہ گزاریں بنی ہوئی ہیں۔ جمع شدہ پانی وہاں سے ٹکنا

اور رخنوں میں ہاتھ پاؤں پھنسا کے چڑھتا اگر سخت جاں طلب کام تھا تو اس سے زیادہ جاں عمل اور خطرناک کام نیچے اترتا تھا، جبکہ اس دہری مشقت میں شاہ زمان پہلے ہی تھک کر چڑھ رہا تھا مگر اس نے اپنے ساتھی کی جان بچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے دوستوں کی ہلاکت سے غمگین تھا جو اس کے گروپ ”کاروان مجاہد“ سے بھی تعلق رکھتے تھے، مگر احسان جامو کو بھی وہ اب کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کی اپنی جان کو بھی خطرہ تھا۔ وہ خود بھی کسی وقت پھسل کر گر سکتا تھا یا اگر خدا نخواستہ احسان جامو نہ ملتا تو اس میں اب اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ عمودی ستر پر روانہ ہو سکتا، اس کا جسم ہنوز شدید ٹھنکن اور دھن سے شل ہو چکا تھا۔

بہر طور..... وہ بدستور نیچے اترتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں سرد پانی کو چھونے لگے۔ سردی کا احساس بھی بڑھنے لگا تھا مگر اس مشقت طلب کام میں اس کا احساس کم ہی ہو رہا تھا۔

”احسان..... احسان.....“ اس نے ایک بار پھر ہانپتی کانپتی آواز میں اسے پکارا مگر سوائے پانی کے شور کے کچھ سنا ہی نہ دیا۔ دراز ٹنگ ہونے کے باعث آسجین کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ خود اس کی اپنی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔

استے قریب پہنچ کر بھی احسان کی طرف سے جواب نہ پا کر شاہ زمان کوششیں ہونے لگی۔ وہ کچھ اور نیچے پانی میں اترتا۔ ٹھیک اسی وقت بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز ابھری اور بجلی کی کڑکڑاہٹ ابھری۔ روشنی کا بڑا سالہا چمکا اور شاہ زمان نے نیچے پانی کی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی..... مگر بے سود، اسے احسان جامو کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شاہ زمان کا دم ٹھکنے لگا۔ وہ وہیں رک گیا۔ اس کے دل دو ماخ مایوسی کی انتہاؤں کو چھونے لگے تھے کہ ایسے میں ایک گوجیلی آواز ابھری۔

”شاہ زمان.....“ یہ علی رحمان تھا، جو اوپر سے اسے آواز دے رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں.....“ اس نے بہ مشکل اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن..... احسان کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔“

”خدا کے لیے تم اب اوپر آ جاؤ.....“ علی رحمان کی بارش کی جھنکار میں غم سے لڑکھائی دہی دی سی آواز ابھری۔ شاہ زمان بالآخر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اپنے

رہا تھا جو ان میں سے کسی ایک کے گرنے کی صورت میں لٹکنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔

سب سے اوپر علی رحمان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دراڑ کا عمودی سرا، جہاں سے مقدور بھر نظر آنے والا برستا آسمان اسے اب قریب نظر نہ لگتا تھا، بجلی کی تیز اور چمکتی کڑک میں اسے پکٹنے کے ایک حصے کی دیوار بھی نظر آ سکتی تھی۔ اسے احسان جامو کی یہ تجویز نہایت کارآمد نظر آنے لگی تھی۔ اس کے شروع اور دور رس نتائج علی رحمان کو بہت جلد نظر آنے لگے تھے کہ ٹھیک اسی وقت اس کی شور زدہ سامعوں سے ایک چیخ گھرائی۔ اس کے رینگنے کی مثل ہاتھ پاؤں لکھت وہیں جامد ہو کر رہ گئے اور تب ہی اسے اپنے نیچے سے شاہ زمان کی لرزتی ہوئی آواز سنا دی۔

”علی.....! احسان نیچے گر گیا ہے۔“

”اوہ..... میرے خدا.....!“ علی رحمان دھک سے رہ گیا۔ ”کیا وہ ڈوب جائے گا؟“

”میرا خیال ہے نہیں.....“ شاہ زمان نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کے لیے سے محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کا اسے خود بھی مکمل طور پر یقین نہ تھا۔

”اسے آواز دو.....“ علی رحمان نے کسی خیال کے تحت شاہ زمان سے کہا۔

”احسان.....!“ علی رحمان کے نیچے ٹانگوں کے قریب موجود شاہ زمان نے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ دو، تین بار مزید پکارنے پر بھی جواب نہ ملا تو شاہ زمان نے علی رحمان سے کہا۔

”کیا تم خود کو کچھ دیر کے لیے اسی طرح قابو میں رکھ سکتے ہو؟“

”ہاں مگر.....!“ رحمان نے اکتاتے لہجے میں کہا مگر شاہ زمان نے اسے جملہ پورا کرنے نہ دیا اور بولا۔

”میں نیچے جا رہا ہوں۔“

”نہیں.....“ علی رحمان نے اسے فوراً منع کیا۔ ”کہیں تم بھی.....“ شاہ زمان پر جوش اور پرعزم تھا۔ اس نے بات کاٹ دی۔

”میں سنبھلا ہوا ہوں..... نیچے جاتا ہوں۔ تم انتظار کرو.....“

شاہ زمان نے نیچے کا سفر شروع کر دیا اور گاہے بہ گاہے احسان جامو کو پکارتا بھی جاتا تھا مگر اس کی طرف سے مکمل خاموشی طاری رہی۔ ماسوائے بارش کے شور کے..... دراڑ کی دیواروں پر ابھرے ہوئے ٹپیلے پھروں

ایک اور جری ساتھی سے محروم ہو چکے ہیں۔ ساتھی کی جان بچانے کا جب تک اس میں ایک جوش اور ولولہ تھا تو ممکن کا احساس بھی نہیں ہوا تھا مگر اب..... دکھ اور مایوسی نے ایک دم ہی یہ احساس جگا دیا تھا اور وہ کچھ ٹائمن کے لیے وہیں چپکا رہا۔ اس کے بعد مشن کی تکمیل کے عزم نے اسے ٹھہرنا تو اس نے ایک بار پھر اپنے شکست و جود کی رسی سہی طاقت کو سمیٹا اور اوپر کی طرف سرکے لگا۔

”تم آرہے ہونا.....؟“ علی ریحان کی آواز دوبارہ آئی۔ شاہ زمان کے اندر جواب دینے کی بھی سکت نہ رہی تھی، پھر بھی اس نے قوت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں.....“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا، بارش اور طوفان باد و باران کے شور میں نجانے اس کی آواز دراز کی بلندی پر موجود چپکے کھڑے علی ریحان تک پہنچی تھی یا نہیں۔ اس کا کسی کو احساس نہ ہوسکا۔ تاہم بجلی کی کڑک کے ساتھ ہی ابھرنے والی تیز روشنی میں علی ریحان کو نیچے سے شاہ زمان کی جھلک دکھائی دے گئی تھی۔

شاہ زمان کی رفتار نسبتاً تھی، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور اوپر اٹھتا رہا۔ جب وہ اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا تو علی ریحان نے اپنا کار ہوا عمودی سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ بالآخر کوشش پیہم نے انہیں لب منزل تک پہنچا دی، جب علی ریحان کا ہاتھ دروازے کے آخری سرے کے ایک قدرے ابھرے ہوئے اور کیلے پتھر کو چھو گیا۔ اس نے اسی پر زور لگا کر تھوڑا اور اپنے وجود کو اوپر کھینچا اور پھر دونوں ہاتھوں کو جما کر وہ پکے کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سینے کے بل پتھر کی زمین پر لیٹ کر اپنا ایک ہاتھ نیچے شاہ زمان کی طرف بڑھا دیا جس نے فوراً ہی اسے تمام لیا اور پھر مشترکہ کوشش سے وہ بھی اوپر اچکا تھا۔

پکے کی یہ دیوار خاصی بلند نظر آتی تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق، لگ بھگ کوئی بارہ تیرہ فٹ تھی۔ ”کیا احسان جاموم میں نہیں رہا.....؟“ علی ریحان نے دیوار سے پشت لگا کر ڈبڈبائے سے لہجے میں کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں چلا گیا؟“ شاہ زمان بھی دہمی لہجے میں بولا۔

”اوپر سے گرنے والا سیدھا پانی میں گرنا چاہیے تھا۔ احسان ایک سخت کوش آدی تھا۔ اس نے خود کو بچانے اور ڈھسے جانے سے بچنے کی کوشش تو ضرور کی ہوگی۔ وہ اتنی آسانی سے حالات کشمی کا شکار ہونے والا بھی نہیں تھا۔ پھر پتا

نہیں کیا ہوا اس کے ساتھ.....؟“

”ممکن ہے بلندی سے گرنے کے باعث اس کا سر کسی ابھرواں سنگ سے ٹکرایا ہو اور وہ بے ہوشی کی حالت میں پانی میں گرنے کے بعد بہہ گیا ہو۔“ شاہ زمان نے خیال ظاہر کیا۔ علی ریحان اس کی تائید میں محض سر ہلا کر رہ گیا اور پھر بولا۔

”اللہ اس پر اپنا رحم فرمائے دوست! ہم اس وقت دشمن کی ناک کے عین نیچے موجود ہیں۔“

”ہاں! ہمارا یہاں زیادہ دیر تک لگے رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا لیکن یہ دیوار.....“

”اس طرف بڑھو.....“ علی ریحان نے پہلے اپنے بائیں طرف ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دائیں جانب دیکھا اور شاہ زمان کو اسی طرف اشارہ کیا۔

آسمان کی تاریک دستوں میں طوفانی گھن گرج جاری تھی۔ لمحے بھر کی بجلی چمکتی تو طوفان باد و باران سے شرابور ماحول میں، اس چٹائی بلندی پر واقع پکے کی قلعہ بند دیوار سے لگے دونوں کے سامنے لرزیدہ سے دکھائی دیتے بڑا پرسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ بارش کا زور ٹوٹنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

دونوں دائیں جانب سینے کے بل رہ گئے۔ انہیں امید تھی کہ اس پتھر کی دیوار کے کسی جانب کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جو اندر داخلے میں انہیں مدد فراہم کر سکتا ہے۔ جلد ہی ان کی یہ مراد برآئی مگر ایک قباحیت معصیت بن کر سامنے بھی کھڑی تھی۔

وہ ایک پکے کا اندر جانے والا راستہ تھا جس پر کوئی دروازہ نہ تھا۔ وہ حصہ کھلا بڑا تھا۔ البتہ وہاں کچھ بھری ہوئی پوریاں رکھی تھیں جن پر ٹکوں کی تالیں لگی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ منظر بھی ان دونوں نے چمکتی ہوئی آسمانی بجلی کی روشنی میں دیکھا تھا۔

”جلد بازی مت کرنا علی.....!“ شاہ زمان نے علی سے سرگوشی میں کہا۔ وہ اس کے چہرے پر موجود جارحانہ جوش کی پرچھائیاں دیکھ چکا تھا۔ ”ہم اس وقت دشمن کی شہ رگ کے پاس ہیں اور پوری طرح گھات میں ہیں۔“

علی ریحان اور شاہ زمان، اب دونوں کی حیثیتیں لیڈر کی ہی تھیں۔ علی ریحان گروپ لیڈر تھا مگر اب گروپ تتر بتر ہو چکا تھا جبکہ شاہ زمان خود بھی اپنے گروپ ”کاروان مجاہد“ کا لیڈر تھا۔ دونوں ٹاپ مائنڈ ڈیپتھ گوریل تھے۔ اتنے ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد ہی وہ

برقی کی طرح اچھلا مگر اس سے زیادہ علی ریحان نے چپے جیسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سنگین اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور ساتھ ہی اپنا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر بھی رکھ دیا۔ مادا اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ مور چا نما اس چوکی کے دیگر گوشوں میں مجبوس فرنگیوں کو ہوشیار کر دے۔

فرنگی پہرے دار جنہم داخل ہوتے ہی علی کے ہاتھوں میں جھول گیا تو اسی وقت شاہ زمان نے اس کے مردہ وجود کو اٹھا کر پکے کی کبلی دیوار سے نیچے اندھی کھائی میں لڑکھا دیا۔ بادل گر جا، بجلی چمکی اور بارش میں مزید تیزی آگئی۔ پکے کا یہ حصہ چند لمحے کے لیے روشن ہوا تو علی کی عقابی نظروں نے ایک مختصر سارا سہ مورچے کی دوسری جانب جاتے دیکھا۔ وہاں سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں اسی طرف کو رینگ گئے۔ سنگینیں ہنوز ان کے ہاتھوں میں چمک رہی تھیں۔

مورچے کے اس طرف ”ڈک“ بنا ہوا تھا۔ اسی کے نیچے ایک میز اور دو کرسیوں پر تین افراد عسکری لبادوں میں نظر آئے۔ ان میں دور یا سنی چوب دار معلوم ہوتے تھے، جنہوں نے سر پر گڑبھی باندھے ہوئے تھے جبکہ تیسرا فرنگی فوجی تھا، جو میز والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھونچو والا ریبیور تھا جس کا ٹانگہ الگ سے اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ دوسرا میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی گمراری دار چرخی گھما کر لائن ملانے کی کوشش میں مگھو تھا۔

مہاراجا چندر گپتا کی ریاست میں فرنگیوں کی ان کلیدی عہدوں پر شمولیت کی وجوہات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ مہاراجا کی ریاست ناگرہ میں یہ فرنگی لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شاگس قدر دخل انداز ہو چکا تھا۔

تینوں شکاران کے سامنے تھے۔ علی ریحان اور شاہ زمان نے ایک باہر نظر یوں نظروں میں ایک دوسرے کا پیغام پڑھا اور پھر اگلے ہی لمحے یہ دونوں جیسے آسمانی بجلی کی طرح ان پر کڑے۔ علی ریحان نے کرسی پر بیٹھے فرنگی کو اپنی سنگین کا نشانہ بنانا چاہا تھا جو اس کے دائیں پہلو کے پار ہوئی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ عین اس وقت بدکا تھا، جب اس نے اپنے ایک ساتھی کو کراہ آمیز انداز میں لہراتے ہوئے گرتے دیکھا تھا اور سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی۔ اسے شاہ زمان نے شکار کیا تھا۔

فرنگی کے حلق سے تکلیف کی شدت سے چیخ خارج

یہاں تک پہنچے تھے اور شاہ زمان نہیں چاہتا تھا کہ ان کے ساتھیوں کی یہ عظیم قربانیاں ضائع جائیں۔ اسی لیے اس نے علی ریحان کو صبر و احتیاط کی تلقین کی تھی۔

”میں سمجھ رہا ہوں دوست!“ علی ریحان نے خفگی سے مسکراہٹ تلے کہا۔ ”فتح ہمارے نزدیک ہے۔ اس پکے کو کامیابی سے سر کرنے کا مطلب ہے ہمارا نصف مشن مکمل ہوا کیونکہ اس کے بعد آگے ناگرہ جانے کی اور کوئی رکاوٹ ہماری راہ میں نہیں آئے گی۔“

”اور..... سب سے زیادہ ضروری اور اہم مرحلہ بھی ہمارے لیے یہی ہے۔“ شاہ زمان بھی سرکشی کرتے ہوئے جوش تلے مسکرایا۔

”سنگین ہاتھ میں پکڑ لو..... آتشیں ہتھیار استعمال کرنے کا سوچنا بھی مست.....“

شاہ زمان نے کہا اور اسے مذکورہ راستے والی جگہ کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ سنگین اس کے دائیں ہاتھ میں چمکنے لگی تھی۔ علی ریحان نے اسی طرح اس کے سامنے سے رینگتے ہوئے دوسری جانب پوزیشن بنائی۔ شاہ زمان نے اسے مخصوص اشارہ کیا تو علی ریحان نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ شاہ زمان دھڑکتے دل کے ساتھ، بالکل دھیرے دھیرے پتھریلی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے گھڑا ہونے لگا اور جیسے ہی اس نے بھری ہوئی بوریوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک فرنگی پہرے دار برساتی اوڈھے زمین پر پکے کی اندرونی دیوار سے پشت لکائے بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سامان گمان میں بھی نہ تھا کہ موت اس سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ نہ ہی وہ سوچ سکتا تھا کہ اس طوفانی بارش اور تیز سرد ہواؤں میں کوئی اس چٹانی مورچے کو سر کرنے کی ہمت بھی کر سکتا ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک سچا مسلمان جب اپنے کسی نیک مقصد کو پورا کرنے کا عزم کرتا ہے تو پھر رکاوٹ کی ہر دیوار کو اپنی جان پر کھیل کر بھی عبور کرنے اور اسے سمار کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتا ہے، یہ کوئی جادوگری نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے بہت مردان اور مدد خدا..... والی طاقت کا فرما ہوتی ہے۔ یہ دونوں مجاہد بھی اس دیوار کو ریت کا ڈھیر ثابت کر چکے تھے۔

شاہ زمان کا شبت اشارہ باتے ہی علی ریحان چپے جیسی پھرتی کے ساتھ بوریوں پر رینگ گیا اور ایسے ہی وقت میں وہ فرنگی کچھ چونک کر بیٹھے بیٹھے پلٹا تھا۔ لہجہ بھر کو آسمانی بجلی چمکی اور اس نے جیسے ملک الموت کی جھلک دیکھی۔ وہ

ہوگئی اور خدا جانے وہ کرسی سے خود الٹا تھا یا دانتہ اس نے یہ حرکت کی تھی کہ گرتے ہی اس نے اپنے بھاری بھر کم چڑے کے بوٹ کی ٹوکی ضرب علی ریحان کے چہرے پر بھی رسید کر دی تھی۔ جو زیادہ زوردار تو ثابت نہ ہوئی تھی مگر اس نے ایک لمحہ کے لیے علی ریحان کو گڑبڑا ضرور دیا تھا اور پھر یہی وہ وقت تھا جب تیسرے پہرے دار نے، جس پر شاہ زمان اپنا پہلا شکار مگرانے کے بعد حملے کے لیے پرتوئے ہوئے تھا۔۔۔۔۔ بجائے قارح یا جنگ کے اس نے اندر ڈک کی جانب دوڑ لگا دی۔ شاہ زمان بھی طوفانی بکولے کی طرح خون آلود سنگین لیے دوڑا تھا اور جب تک وہ اس ”فراری“ پہرے دار کے سر تک پہنچتا، اس نے ایک جھوٹی ہوئی رسی پھینچ ڈالی۔ ایک زوردار بھگ بھاگتا تھا ہی فضا میں ایک پٹاخہ جھونکنے کی آواز بلند ہوئی۔

اینا ”کام“ کرتے ہی وہ پٹاخہ شاہ زمان اس کے سینے میں سنگین گھونپ چکا تھا۔ وہ وہیں ڈیر ہو گیا۔ شاہ زمان پٹاخہ تو شہرہ درہ گیا۔ فضا میں لاتعداد چٹخوٹیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ”اس بد بخت نے خطرے کا سنگٹل فائر کر دیا ہے، کسی بھی وقت پوری پٹالین کا رخ اس پکٹے کی طرف ہو سکتا ہے۔ فوراً منزل کی جانب دوڑو۔۔۔۔۔“ علی ریحان نے چلا کر کہا اور دونوں پکٹے کی دوسری سمت میں آکر ٹکاسی کے ایک ایسے کھلے راستے سے نکلے جو شیش میں جا کر تارہ ریاست کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں اس پر تیزی کے ساتھ دوڑتے چلے گئے۔ بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

کسی بھی جانور کے قریب گولی چلانا اس کے سواروں کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، یہ بات شوکت کے باپ کریم بخش نے اسے تربیت کے پہلے دن ہی سمجھا دی تھی، بالخصوص کسی سرکش جانور کے سامنے۔۔۔۔۔ اور مارگریٹ تو مٹی ہی منہ زور اور سرخس گھوڑی۔۔۔۔۔ لیکن خلاف توقع وہ نہ بدکھی تھی اور نہ ہی اس نے منہ زوری کا مظاہرہ کیا تھا جبکہ شوکت کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

جب ہی اس کی نظر ایک بغیر ہڈ والی جیب پر پڑی۔ وہ چونک گیا۔ جیب کے بوٹ کے پاس ایک درمیانے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا ایک خوب دوسا انگریز نوجوان اپنے دونوں پاؤں پھیلانے لگا تھا۔ اس کا اسٹائل ویسٹرن فلموں کے کاڈیو اتریجیا تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں ہولسر جھول رہے تھے۔ ایک میں پستول اور دوسرا خالی

نظر آ رہا تھا کیونکہ دوسرے ہولسر کا پستول اس کے داہمیں ہاتھ میں تھا ہوا تھا اور جس کی نال غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کا انداز جارحانہ تھا اور لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ شوکت کے ساتھ ”ڈونکل“ لڑنے کے پورے پورے موڈ میں ہو لیکن۔۔۔۔۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس کے ہمراہ ایک طرح دار حسینہ بھی کھڑی تھی، نہایت چست چنٹ شرت پہنے، جس میں اس کا فردا کے کیمیں جدو کی تمام تر حشر سامانیاں نمایاں تھیں۔۔۔۔۔ سرحدی زبان میں وہ خاصی گل بدن تھی۔ شباب تو جیسے ٹوٹ کر اس پر برس رہا تھا۔ جسم بھرا بھرا تھا اور جسے خالص یورپین اصطلاح میں ”چونی گرل“ کہا جاسکتا تھا۔ کمر کا حصہ خاص طور پر سبک رو تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گورا چٹا جس میں سرخی بھی ملی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بال ہوائے کٹ اور براؤن تھے۔ چست اور فٹ لباس میں اس کا بھرا بھرا جسم دعوتِ نظارہ دے رہا تھا بلکہ ایک ایک انگ چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلارہا تھا۔

”ہے، گائیز۔۔۔۔۔! گارشا۔۔۔۔۔ رابرٹ!“ رینا اس نوجوان جوڑے کی طرف دیکھ کر شہساز انداز کی مسرت سے چیختی اور اپنے دونوں بازو پھیلائے ان کی طرف لپکی۔ گارشا سے لپٹ کر دونوں اپسراؤں نے ایک دوسرے کے گال چومے اور پھر آخر میں رینا، رابرٹ نامی اس کا ڈیوئے نوجوان کے ساتھ بغل گیر ہوئی اور شوکت نے رینا اور رابرٹ کو ایک دوسرے کے گال پر بوسہ لیتے دیکھا تو اس کی طبیعت متعصب سی ہونے لگی۔ اسے غصہ اس نوجوان پر آ رہا تھا جس نے اپنے لمبی نال والے پستول سے ہوائی فائر کیا تھا۔ وہ اس نوجوان کو سخت تادیب کرنے کے موڈ میں نظر آتا تھا اور اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے گولی نہیں چلانی چاہیے تھی۔ وہ نوجوان اپنے پستول کی دھواں اڑاتی نال کو پھونک پار کر شوکت کی طرف گھورنے لگا۔ اس کے انداز میں رعونت تھی۔

شوکت آگے بڑھا تو رینا نے پہلے اس کا تعارف کرواتے ہوئے ان سے کہا۔

”یہ ہمارا سائیکس ہے، مسٹر شوکت! بہت بہادر اور دلیر۔۔۔۔۔ مجھے اسی نے گھڑ سواری سکھائی ہے۔“ رینا کے منہ سے اپنی تعریف شوکت کو بمبلی محسوس ہوئی تھی۔

”اور۔۔۔۔۔ مسٹر شوکی! یہ میرے کزن ہیں۔۔۔۔۔ سسٹر اینڈ برادر۔۔۔۔۔ گارشا اینڈ رابرٹ۔۔۔۔۔“

تعلق داری قریبی تھی۔ مالکوں کے مہمان بھی اس کے افسروں کا ہی درجہ رکھتے تھے۔

شوکت کو خازنہ نظر توں سے گھورے جا رہا تھا۔ لمبی نال والا پستول ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا ہوا تھا، بولا۔

”مظہور.....! میں ایک قہاش تو ضرور دکھانا چاہوں گا اس غلام کو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے مارگریٹ کے قدرے فریب جا کر فضا میں ایک اور فائر کر دیا۔ کوئی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مارگریٹ زور سے ہنہائی اور اپنے پچھلے پیروں پر زور ڈالا اور اگلے پیروں کی کنوٹیاں ملائیں..... اور الف ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قریب کھڑے رابرٹ کو ٹکڑی ماری..... رابرٹ کو معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی عام گھوڑی نہیں بلکہ ایک سرکش گھوڑی ہے، جو ابھی سدھانے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ لہذا وہ اس کے اگلے سموں کی ٹکڑی سے سنبھل نہ سکا اور گر پڑا..... مگر اپنی عزت کو بچانے کے لیے وہ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ دوبارہ اٹھاتے ہوئے مارگریٹ کو ڈوٹ لگا چکی تھی۔ رابرٹ اپنا پستول ہولسٹر میں اڑے اس کی جانب بھاگا مگر وہ مارگریٹ کے پیچھے نہیں بھاگا رہا تھا بلکہ قوس کی شکل میں گھومتے ہوئے میدان کے وسط میں راستہ کاٹ کر ڈوٹ اور جلد ہی مارگریٹ کو چالیا۔ وہ اب ہل کے بل مارگریٹ کی پیٹھ پر نظر آ رہا تھا۔ شوکت کو تسلیم کرنا پڑا کہ رابرٹ بھی کم نہ تھا مگر وہ رابرٹ کی طرح کب اڑا تھا۔

ریتا، گارشیاد اور شوکت جیب کے قریب کھڑے رابرٹ کو مارگریٹ پر سواری کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور شوکت کی تیز اور بھانپتی ہوئی نظریں بتا رہی تھیں کہ مارگریٹ کو کوئی چلنے کا زیادہ غصہ تھا اور اس پر سزا دینی تھی اس کی پیٹھ پر زبردستی سوار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارگریٹ، رابرٹ کو اپنی پیٹھ سے گرانے کے لیے سرکش کا زیادہ ہی مظاہرہ کرنے لگی۔ اس نے دیکھا خود پر اتارنے والا یہ مفرد صفت فرنگی نوجوان جو اس کا ہم عمر بھی تھا، پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ تب ہی ریتا نے تشویش زدہ انداز میں شوکت سے کہا۔

”شوکی اتم جاؤ..... رابرٹ اسے نہیں سنبھال پائے گا۔ مارگریٹ بہت غصے میں لگ رہی ہے۔ وہ کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دے.....“

”نہیں.....“ اچانک گارشیاد بولی۔ ”رابرٹ نے بہت ٹیز تک (یعنی بگھارنا) کی ہے، اسے بھگتنا چاہیے.....“ شوکت بھی یہی چاہتا تھا۔

اسی وقت..... مارگریٹ نے ایک ایسی تباہ کن پلٹی کھائی کہ اس کی پیٹھ پر سوار رابرٹ اس کی پشت سے گرتے گرتے بچا اور یہاں تک کہ وہ اس کی گردن سے جھول

”ہائے..... سونائس آف یو..... ویری وینڈسم.....“ گارشیاد نے شوکت کو دلچسپ اور گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”گلیڈ ٹو میٹ یو..... وینڈسم.....“ شوکت نے بھی اس سے مصافحہ کیا تو اس نے محسوس کیا کہ گارشیاد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گھوڑا معنی خیز انداز میں دیا ہوا تھا۔ شوکت نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مسکرا کر قریب کھڑے رابرٹ کی طرف بڑھا دیا۔

”نہو راپور..... میں ملازم ہو گیا اور نوکروں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا.....“ رابرٹ نے کئی اور روغنوت کے ساتھ شوکت سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ شوکت کو اس مفرد فرنگی نوجوان کی اس بات پر طیش تو آیا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنا خالی ہاتھ گرا دیا تاہم اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھنڈی ہوئی خنیدگی سے بولا۔

”مسٹر رابرٹ! جانور کے آگے دوبارہ فائر کرنے کی غلطی بھی مت کیجیے گا..... یہ بدکنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگایا کرتے..... اور روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔“

”مائی فنٹ.....!“ رابرٹ نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آخر میں ریتا سے کہا۔

”تم لوگوں نے ان نوکروں کو کس قدر سر پر چڑھا رکھا ہے، یہ ہمیں نصیحتیں کرتے ہیں اور یہ گھوڑے پر اس قدر تمہارے قریب تھا؟..... ڈیم اٹ..... اسے بتاؤ ریتا! میں کون ہوں..... آئم رابرٹ..... آ..... مل فائٹر..... میں وحشی سانڈوں کو نہتا کئی کا ناچ چھاتا ہوں اور..... یہ ایشیائی گھوڑے میرے سامنے گدھوں سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتے۔ میں تو بیک وقت تین تین گھوڑوں کو قابو کر لیتا ہوں.....“ اس اکلڑے فرنگی نوجوان کو شاید ریتا کے منہ سے اس کی تعریف بری لگی تھی۔

”ادوہ..... سو ری ٹو..... مسٹر شوکی! (شوکت)“

ریتا نے کہا۔ ”رابرٹ کا اصل تعارف یہی ہے کہ یہ ایک ماہر مل فائٹر ہے۔ یہ دونوں آج ہی لندن سے آئے ہیں۔“

”براہر! ہر کوئی اپنے فن میں ماہر ہوتا ہے۔ خود پر اتارنا مت اترا یا کرو ہر وقت.....“

اس کی بہن گارشیاد نہایت بیزاری سے اپنے بھائی سے بولی۔ اسے شوکت کے ساتھ اپنے بھائی کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔

”اچھا چھوڑو..... اندر چل کر آرام سے باتیں کرتے ہیں..... آؤ.....“ ریتا نے ان سے کہا۔ رابرٹ ابھی تک

اور تب ہی اسے اور اک ہوا کہ وہ سایہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کسی عورت کا ہی ہو سکتا تھا۔
”رینا!“

ایک ہی نام اس کے ذہن میں چمکا تھا۔ مگر جب اس سائے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور وہ کچھ سا، قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی حرکات و سکنات، چال ڈھال دیکھ کر شوکت کو اپنے دل میں کلک ہونے والے اس آوارہ خیال کی نفی کرنا پڑی کہ وہ رینا نہیں کوئی اور تھی۔ پر کون تھی؟ اگلا خیال کلک ہونے کے بجائے سوالیہ آنکڑے کی طرح اس کے حلق میں جیسے انک کر رہ گیا۔

اس نے بھی اسی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اُصطلیل میں روشنی کا پورا پورا بندوبست تھا مگر کہیں کہیں بلب بجھے ہوئے تھے۔ روشن دان بھی بند تھے، کچھ کھلے ہوئے پھر اچانک ہی دونوں روشنی میں اور ایک دوسرے کے قریب آگئے تو شوکت کے چونکنے تک اس سائے نے گویا حملہ کر دیا۔ وہ اچھل کر اپنی بانہیں پھیلاتا ہوا اس پر آن پڑا۔ اس طرح کہ..... وہ کھڑے کھڑے اس کے پیٹ اور سینے سے چپک گیا اور اس کی گردن میں اپنی شاخ قفل جیسی بانہیں ڈال کر لپٹ گیا۔

”یو سو بریو.....“ یہ کہتے ہی اس نے اپنے ہونٹ شوکت کے ہونٹوں سے لگا دیے۔

شوکت اس ”حملے“ سے بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ ”حملہ“ اگرچہ بے خود کر دینے والا تھا مگر شوکت خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ وہ ان نرم و گداز لبوں کی حلاوت آگئیں پس کو بھی پل کے پل فراموش کر بیٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس سائے کو اپنے سے دور دھکیلا تو وہ نیچے گر پڑا۔ مترنم چیخ ابھری۔

”اوہ..... مس گارشا! ام.....“ وہ اسے پہچان کر چونکا اور آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف سہارے کے لیے بڑھایا۔

”یونول! جانگلی، وحشی، یو ہرٹی..... ایک عورت کو خود سے اس طرح دھکا دیتے ہیں.....؟ ائس سوئیر تیل فارمی.....“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے، برہمی سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو شوکت جھینپ سا گیا اور قفل سی پٹی کے ساتھ بولا۔

”سوری! میں دراصل گھبرا سا گیا تھا۔ اس لیے کہ پہلے کبھی میں ایسے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ ٹس! گین اینڈ ایکسٹریسہلی سوری.....“ شوکت کو بھی فرنگیوں کے ساتھ رہتے

آیا اور کوئی وقت جاتا تھا کہ وہ پھری ہوئی مارگریٹ کے اگلے دونوں سوں کی زد میں آجاتا۔ رینا جتنی اور شوکت نے چٹ کر بولی۔

”پلیز..... پلیز فارمائی سیک..... شوکی! رابرٹ کی مدد کرو.....“

بس..... یہی وہ لمحہ تھا جب شوکت کو رینا کے سم تن کے لمس ہی نے نہیں، اس کے ملتجیانہ انداز نے کھد بڑا ڈالا۔ مارگریٹ دوڑتی، اچھلتی کودتی، قریب آگئی تھی اور شوکت نے وہیں سے ایک جست بھری..... رابرٹ کا جسم تب تک بھر بھری مٹی والی زمین سے رگڑنے لگا تھا۔ شوکت مارگریٹ کی پیٹھ پر سوار ہو چکا تھا اور اس کی لگا میں کس کر اسے قابو کرنے کے ساتھ ساتھ مخصوص انداز میں پچکارنے بھی لگا۔

بدست مارگریٹ کا ابال کم ہوا تو اس کی رفتار بھی آہستہ ہونے لگی اور تب ہی شوکت نے ایک ہاتھ بڑھا کر رابرٹ کو کندھے سے تھام کر نیچے اتار دیا۔ رابرٹ زمین پر گرا اور اپنا لباس جھاڑتا ہوا فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے غصیلے پن سے زیادہ غجالت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ رینا اس کی طرف دوڑی جبکہ گارشا کی نیم باز سی نگاہیں، سرکش مارگریٹ کی سبک رو پیٹھ پر بڑی شان سے جتے بیٹھے شوکت پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کے گداز لبوں پر بھیدوں بھری مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت حویلی سے کچھ اور لوگ بھی دوڑے چلے آئے، ان میں خدا موں کے علاوہ کئیں بھی تھے۔ وہ فکر مندی کے ساتھ رابرٹ کو دیکھ رہے تھے اور اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔

شوکت، مارگریٹ کو میدان کا ایک چکر لگانے کے بعد اس کے اُصطلیل میں لے گیا۔ وہاں اس نے مارگریٹ کو بانعہا، اس کے سفید گورے چہرے پر ”تو بڑا“ چڑھایا اور چارے کا کھارا آگے کر کے اس کا منہ اس میں ڈال دیا۔

اُصطلیل میں دائیں بائیں دس فٹ لمبے اور پانچ فٹ چوڑے چوبی خانے بنے ہوئے تھے۔ ان میں اسٹینبل نمبر درج تھے۔ درمیانی راستہ گلی نہ تھا۔ سب خانوں میں اصل نسل کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہر سائز کے تھے، لمبے، ٹیڈی، پونی ٹیڈ اور چکبرے۔ سائے اُصطلیل کا بڑا سا چوبی گیٹ تھا جس کا ایک در کھلا پڑا تھا۔ وہاں سے دھوپ کی موٹی لکیر اندر پڑ رہی تھی۔ اسی دھوپ میں کسی کا سایہ تھرکا۔ شوکت کی عقابی نگاہیں گیٹ پر چست ہوئیں

زندگی

زندگی بدلنے کے لیے لڑنا پڑتا ہے اور آسان کرنے کے لیے سمجھنا پڑتا ہے۔ وقت آپ کا ہے چاہے تو سونا بنا دو چاہو تو سونے میں گزار دو۔ اگر کچھ کرنا ہے تو بھیڑ سے ہٹ کر چلو۔ بھیڑ ہمت تو دیتی ہے لیکن شناخت چھین لیتی ہے۔ منزل نہ ملے جب تک ہمت نہ بارو اور نہ ہی ٹھہرو کیونکہ پہاڑ سے نکلنے والی نہروں نے آج تک کسی سے نہیں پوچھا کہ سمندر کتنی دور ہے۔ سب تبدیلی چاہتے ہیں اگر آپ واقعی حقیقی تبدیلی چاہتے ہیں تو اپنے گھروں میں قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ فلی گانے بند کر دیں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق گزاریں۔ انشاء اللہ آپ کی زندگی میں حقیقی تبدیلی آئے گی اور سکون اور چین نصیب ہوگا۔ (مرسلہ: ڈاکٹر ظفر اسلام۔ جام علی پور)

اپنی جانب بیکھلائی نظروں سے نکتے ہوئے شوکت کو پر معنی انداز میں آنکھ باری۔

”ج..... جی ہاں!“ شوکت جھجکا۔ اس کے بعد اس نے گارشیا کی مست خیزیوں کو بریک لگانے کی غرض سے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر گارشیا کو پیچھا تار دیا۔

اسی طرح وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ ”آر یو میریڈ؟“ (تم شادی شدہ ہو) باہر میدان کی ہری ہری دوب پر چہل قدمی کرتے ہوئے گارشیا نے اس سے سوال کیا۔

”نو.....“ شوکت نے جواب دیا۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھا، یوں کہ اسے برا بھی نہ لگے۔ ”ہیو یو گرل فرینڈ؟“

”نو.....“ شوکت نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ ان فرنگیوں کی آزاد خیال معاشرت اور چلن سے یہ خوبی واقف تھا۔ وہ ایسے سوال بے دھوک پوچھ لیا کرتے تھے۔

”حریت ہے۔ تم جیسے پڑوسیہ اور پیٹرم نو جوان بغیر لڑکی کے..... کیسے گزارہ کر لیتے ہیں؟“ گارشیا بولی۔ شوکت اسے کیا جواب دیتا؟ اس کے باپ نے اسے سمجھا رکھا تھا کہ ان فرنگیوں کی زلفوں کے سائے سے بھی دور رہنے کی کوشش کرنا۔ یہ پہلے اس میں چھانسی ہیں اور پھر

ہوئے اس طرح کے ادب و آداب آگئے تھے۔ گارشیا اس کی سادگی پر اپنا طعنے بھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

”یو آر سو سیمبل..... ہٹ ویری کیوٹ اینڈ سو پیٹرم..... مجھے تمہاری یہ اداس پنڈ آئی..... اپنی دے.....“ اس نے مزاحیہ لہجے کے ساتھ مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، جسے شوکت نے بھی کسی مصلحت کے ساتھ دوستانہ انداز میں ہی تمام لیا۔

”مجھے اپنے اسٹبل کی میر نہیں کرواؤ گے؟“ وہ ایک ادائے دلبرانہ انداز میں سر جھٹک کر بولی تو شوکت نے بدستور خفیف سی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر طاری رکھتے ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔

وہ اسے اور اندر لے آیا۔ گارشیا ایک ایک چوٹی خانوں میں کس کر گھوڑوں کو برائیا شتیاق لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ ان کی سبک پیٹھ سہلائی، انہیں کھر کھراتی.....

”مجھے اس گھوڑے پر بٹھاؤ گے؟“ گارشیا کو ایک سیاہ پیٹھ والا گھوڑا پسند آیا۔ وہ اس کی سبک خرام پیٹھ پر ہاتھ ٹھما تے ہوئے بولی۔ وہ پونی لسل کا چھوٹے سائز کا گھوڑا تھا۔

”ضرور، کیوں نہیں۔“ شوکت نے کہا اور اس کی سبک کمر کے گرد اپنا ایک بازو مائل کر دیا۔ گارشیا جیسے اسی کی منتظر تھی، وہ اس بہانے ایک بار پھر گلے کا ”ہار“ بن گئی۔ اس نے پونی کی پیٹھ پر چڑھنے کے دوران خود کو شوکت کے اس قدر قریب کر لیا جیسے وہ گھوڑے پر نہیں شوکت پر سوار ہونا چاہتی ہو۔ اس کے بھرے بھرے گمدا جسم کا لسل شوکت کے اندر تھرملی سی چمانے کے لیے کافی تھا۔

اس نے گارشیا کو جیسے جلدی سے گھوڑے کی پیٹھ پر چھبک دیا اور دوسرے ہی لمحے گارشیا نے ایک عجیب سی حرکت کر ڈالی۔ وہ آگے کو ڈرا جھک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سینے کے بل اس سے چھبک کر لیٹ گئی اور تو بہ شکن انگڑائی لینے کے انداز میں اپنے جسم کو ٹھم دیتے ہوئے شوکت کی طرف نیم بازی اس گھوڑوں سے دیکھا۔ ایک سکاری لی اور اسی انداز میں بولی۔

”آہ..... کتنی مضبوط، سخت، پکلی اور کشادہ پیٹھ ہے اس کی.....“ ایک ایک سے اس کے طاقت و جواں خیزی کا چشمہ پھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ ”یہ کہتے ہوئے گارشیا نے

جکڑ لیتی ہیں۔

شوکت نے فوراً بات کا موضوع بدل ڈالا۔ ”گلتا ہے آپ کو بھی گھڑ سواری کا شوق ہے؟“

”تم نے بھلا کیسے اندازہ لگایا؟“ گارشیا نے جیسے اس کی چوری پکڑی ہو، شوکت کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ ”آپ نے بڑے شوق سے اسٹبل کی سیر جو کی تھی۔“ شوکت نے جلدی سے بات بتائی۔

”ہا ہا ہا.....“ گارشیا نے اپنے حلق سے ایک آزاد منٹ سا قبضہ بلند کیا اور بولی کسی دن تمہارے ساتھ گھڑ سواری ضرور کروں گی۔ اسی طرح جس طرح تم ابھی تھوڑی دیر پہلے ریٹنا کو کروار رہے تھے۔

شوکت اس کے منہ سے ریٹنا کا ذکر سن کر تھوڑا چٹکا تھا مگر پھر خود کو مطمئن رکھتے ہوئے جواب میں سکرادیا۔ ”ضرور.....“

”تم ادھر ہی رہتے ہو؟“

”ہاں اڈی سینٹ کوارٹر میں۔“

”اپنے کوارٹر لے چلو مجھے.....“

”پھر کبھی سکی۔ ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں، بڑے صاحب آنے والے ہیں..... انہیں ریس کے گھوڑے چن کر دیتا ہیں۔“

”اوکے.....“

یہ اسی دن شام کا ذکر تھا۔ شوکت لوٹا تو باپ نہیں تھا۔ اس نے غسل وغیرہ کیا اور ذرا آرام کرنے لیٹ گیا۔ ذرا دیر بعد اس کا باپ لوٹا تو اس کا چہرہ اترا اترا اور اداس و پریشان تھا۔

”کیا ہوا شوکت کے ابا؟ یہ تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟“ سکینے نے گھر مندی سے پوچھا۔

”صاحب لوگوں کے ہاں ولایت (لندن) سے جو مہمان آئے ہوئے ہیں نا..... وہ کوہ شالیہ کی کسی لمبی مہم پر جا رہے ہیں..... کہہ رہے تھے، شوکت بھی ان کے ساتھ جائے گا۔“ کریم بخش نے جواب دیا تو سکینے نے اپنا کلیجا تھا لیا فوراً بولی۔

”ہائے اللہ! میں ہر گز اپنے بچے کو کسی مہم پر نہیں بھیجوں گی۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ حالات کس قدر خراب ہیں؟“

شوکت بھی وہیں تھا بولا۔ ”ابا! کیسی مہم؟ کچھ پتا تو چلے..... اور میرا ہی کیوں انتخاب کیا ہے؟ میں تو یہیں ٹھیک ہوں۔“

”بیٹا! تم اکیلے نہیں جاؤ گے اور لوگ بھی شامل ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا بلاوا آنے والا ہے اس سلسلے میں..... تم ایسا کرنا کوئی بہانہ کر دینا.....“

”تم اس کی فکر نہ کرو ابا! میرے پاس بہت بہانے ہیں۔“ شوکت مسکرایا۔ اسی وقت دروازے پر دسک ہوئی۔ حویلی سے ایک خادم آیا تھا شوکت کو لینے کے لیے۔ وہ اس کے ساتھ ہوا۔

حویلی میں ایک کمرے میں اسے بٹھا دیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب (لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا) کسی شکاری مہم پر نکلنے والا تھا۔ اسی وقت کمرے میں ایک موٹا اور ٹھنڈا سا شخص اندر داخل ہوا۔ شوکت اسے پہچان کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حویلی کا منتظم اعلیٰ..... لالہ جواری لال تھا۔ اس نے صرف بڑے صاحب (جنرل مائیکل شا) کا حکم ایک پیغام کی صورت اسے سنا کر چلتا کر دیا جس کا کلب باب بھی تھا کہ جنرل مائیکل شا کے دوست پروفیسر ہنری برنارڈ کو اپنی مہم پر نکلنے کے لیے کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ جس کا وہ پہلے ہی انتخاب کر چکے ہیں اور ان کے انتخاب میں سرفہرست شوکت تھا۔

انتہائی پیغام سننے کے بعد شوکت نے دل ہی دل میں فوراً ایک بہانہ تراش لیا تھا، وہ کسی بھی صورت میں ریٹنا سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن جب اسے یہ پتا چلا کہ ریٹنا بھی ان کے ہمراہ ہوئی اور ہنری کے خاندان کے رشتے دار دونوں بہن بھائی رابرٹ اور گارشیا کے علاوہ کچھ خدام اور دو فوجی بھی ساتھ ہوں گے تو شوکت نے ریٹنا کی خاطر اس مہم پر جانے کے لیے ہامی بھری۔

پروفیسر ہنری نے لندن سے یہاں تک کا سفر اسی مقصد کے لیے کیا تھا کہ وہ کوہ شالیہ اور اس سے ملحق کوہ ہمالیہ کی وادیوں، بستیوں اور پہاڑیوں میں بسنے والے قبیلوں کی علاقائی زبانوں پر تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا پڑاؤ ان کا ریاست ناگرہ تھا۔ وہاں تک روانہ کرنے کا پورا بندوبست مائیکل شانے کیا تھا۔ جس میں ایک عدد فوجی کار، ایک جیپ، جس کے پیچھے بڑا سا اتریشی تھا۔ دو گھوڑے اور اپنے خاندان کے علاوہ کچھ خدام بھی تھے۔ ریٹنا اور اس کے دونوں مذکورہ کزنز..... شوقیہ طور پر ساتھ ہو لیے تھے۔

روانگی کی تیاری قریب آئی تو شوکت کے ماں باپ پریشان ہو گئے۔ شوکت نے ان سے یہی کہا کہ ”حکم حاکم مرگہ مفاجات“..... تاہم انہیں تسلی دی کہ یہ مہم محد وعر سے کے لیے ہے اور بہت جلد وہ دیگر لوگوں کے ساتھ بہ خیریت لوٹ آئے گا۔

شوکت کو ماں باپ کی فکر نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان

تھے۔ موسم کی خرابی نے بھی انہیں آگے بڑھنے سے مانع رکھا تھا۔ لہذا وہ وہیں پر ہی خیمہ زن ہو گئے۔ بارش تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن..... آثار بتا رہے تھے کہ کسی وقت بھی آسمان برسنے والا تھا۔

سرہنگ پہاڑیوں کے دامن میں ایک مسلح قطعہ زمین پر یہ لوگ تین بڑے خیمے گاڑ چکے تھے۔ آسمان پر بادل چھا جانے کی وجہ سے سرشام ہی رات کاگماں ہونے لگا تھا سی لیے سالار قافلہ پروفیسر ہنری نے رات کے کھانے کی تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ زادراہ کا بیشر حصہ جیب کے ڈالر سمیت محرومی کے باعث گنوا چکے تھے اور پروفیسر ہنری کو اس سلسلے میں بہت فکر تھی، تاہم شوکت نے ان سے یہ کہہ کر پریشانی دور کر دی تھی کہ اگر خوراک کا مسئلہ ہوا تو انہیں بہ آسانی یہاں چھوٹا موٹا شکار بھی مل سکتا تھا۔ یوں بھی ریاست ناگرہ کچھ کر صرف یہ مسئلہ ہی نہیں اور بھی بہت سے چھوٹے موٹے مسائل حل کیے جاسکتے تھے۔ ہنری کو اس کی باتوں سے کافی حد تک اطمینان ہوا تھا۔ یوں بھی پروفیسر ہنری اس کی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ اسے اپنا محسن سمجھتا تھا، کیونکہ وہ اس کا احسان آج تک نہیں بھولا تھا جب شوکت نے اس کی پیاری اور لاڈلی بیٹی کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس منہ زور گھوڑی مارگریٹ کے پیروں سے روکنے سے بچایا تھا۔

شہری آبادی سے کسی حد تک قریب ہونے کی بنا پر یہاں انہیں قریب سے گزرتی ایک ریلوے لائن بھی دکھائی دی تھی۔ اس لیے وہ ادھر ہی فروش ہو گئے تھے جبکہ ان کی منزل ابھی بہت آگے تھی۔

ہندو جوڑے نے الاؤ روشن کر دیا اور ہلکے ہلکے کھانے کی تیاری میں جت گئے۔ کچھ خشک خوراک کے ڈبے بھی تھے۔ مخصوص شراب بھی تھے جس سے گارشیا اور رابرٹ زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے، جبکہ پروفیسر ہنری اپنے پائپ پر گزارہ کر رہا تھا۔ سبھی سبھی وہ بھی بی لیا کرتا تھا۔ دونوں فوجیوں کو پہرے پر لگا دیا گیا تھا جبکہ شوکت ان دونوں کے قریب ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا، جن میں سے ایک میں پروفیسر ہنری اور اس کی بیٹی رہنا موجود تھے جبکہ دوسرے میں وہ دونوں بہن بھائی گارشیا اور رابرٹ تھے مگر اس وقت خاندان کے یہ چاروں افراد بھی اپنے خیموں سے باہر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ بعد میں پروفیسر ہنری نے قریب پتھر پر اکیلے بیٹھے شوکت کو بھی قریب ہی بلایا تھا، جو بہر حال

سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ یہاں انہیں کوئی ننگی تکلیف نہیں تھی۔ وہ آرام اور راحت سے رہ رہے تھے مگر شوکت تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اگر ریاست سفر میں نہ ہوتی تو وہ اس ہم پر جانے سے ہی انکار کر دیتا مگر ریاست کی وجہ سے وہ ایک بہانہ بھی نہ بنا سکا تھا اور بتانا بھی کیوں.....؟

☆☆☆

یہ ریاست ناگرہ کے مضافاتی علاقے میں ایک خوبصورت پہاڑی وادی کا منظر تھا جس کے دائیں جانب زوردار کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی دم کو بھادوں میں برسنے والی تھی۔ یہ ان کا یہاں پر ابھی پہلا ہی بڑا وقت تھا کہ انہیں ایک ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ کوہ نشالیہ کی پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی ان کا ٹریلر جیب سمیت الٹ کر گہرے گھڑ میں جا گر تھا۔ شکر تھا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا، کیونکہ ڈرائیور نے خطرہ بھانپتے ہی جیب سے بروقت چھلانگ لگا دی تھی، البتہ کچھ ضروری سامان سے محرومی انہیں بہر حال سہتا پڑی تھی۔۔۔ جبکہ دو گھوڑوں کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ فوسکی کار کو یہ دیے ہی چھوڑ چکے تھے، جو ان سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں ان کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ اب بس یہ لوگ پیادہ تھے۔ سامان خدا مومن نے اٹھارے تھے، جن کی تعداد چھ تھی (ڈرائیور احمد خان بھی ان میں شامل تھا) جن میں دو فوجی، دو ہندو میاں بیوی اور شوکت تھا۔ اس کے ذمے صرف پروفیسر ہنری کے خاندان کے افراد کو سنبھالنے کی ذمہ داری تھی اور ”ڈے داری“ میں پروفیسر کی محل رعنائی رہنا بھی شامل تھی۔ شوکت کو صرف اسی کی پروا تھی جبکہ ان دونوں بہن بھائی گارشیا اور رابرٹ کی خدمت بھی اس کی ذمہ داری تھی۔

مصیبت اصل میں ملازم ہی بے چارے جمیل رہے تھے، جبکہ خاندان کے لوگ اس ایڈوانچر سے انجھائے کر رہے تھے۔ خیمہ زنی، کمپینگ کا سامان تک ان کے پاس موجود تھا۔ شوکت کو تو ویسے ہی ایسی مہمات کا تجربہ تھا، کیونکہ وہ اکثر فرنگی افسروں کے ساتھ ان کی شکاریات کی مہمات میں جاتا رہتا تھا۔ تاہم رینا، گارشیا اور رابرٹ بھی اسکا ڈنک کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ یوں بھی یہ انگریز لوگ زیادہ ہی ایڈوانچر پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ان سب سختیوں اور باتوں کا تجربہ پہلے سے ہی ہوتا ہے۔

ایک پہاڑی دامن میں انہیں شام نے آلیا تھا مگر ابھی تک انہیں کسی پہاڑی بستی یا آبادی کے آثار نہیں ملے

رابرٹ کو برا لگا تھا مگر پروفیسر ہنری کی موجودگی میں وہ چپ رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں سردی کا احساس ایک خوشگواریت کا تاثر دیتا تھا۔ تاہم انہوں نے موسم کی مناسبت سے گرم اور موٹے کپڑے پہن رکھے تھے۔ الاؤ تاپنے کے دوران ہی تندو بابا اور اس کی بیوی شانٹا نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ اس نے پھلکے بنائے تھے اور اٹلیٹ انڈے سالے دار آلو کے ساتھ تلے تھے۔ انگریز لوگ ایسے ”ایسپانی“ کھانے کی تمنا کرتے ہیں، کھانے میں بھی کچھ بچا تھا سو شکر کر کے کھا لیا گیا۔ ابلے ہوئے چاول بھی تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پروفیسر صاحب نے تو اپنے خیمے کی راہ لی کہ انہیں نیند نے آیا تھا جبکہ ریٹا، گارشا اور رابرٹ وہیں الاؤ کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شوکت بھی موقع نکال کر وہیں ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اگرچہ اب تک مسلسل رابرٹ کی طرف سے نفرت خیزی کا نشانہ بنا ہوا تھا تاہم ضبط سے کام لیے خاموش تھا۔ وہ بھی اس کے روپنے سے دل برداشتہ ہو کر اس سے بے حد نفرت کرنے لگا تھا اور کئی بار جی چاہا تھا کہ اسے آڑے ہاتھوں لے۔ اس پورے قافلے میں رابرٹ ہی ایک ایسا بد طینت آدمی تھا جس کا سلوک شوکت سے ناروا تھا۔ اگرچہ گارشا نے ہی نہیں بلکہ ریٹا نے بھی اسے ٹوکا تھا کہ وہ شوکت کے ساتھ ایسا رویہ نہ رکھے مگر رابرٹ کی زبان پر ایک لفظ ہوتا تھا کہ جو نوکر ہے وہ نوکر ہی بن کر رہے، دوست بن کر نہیں۔

الاؤ دھک رہا تھا، یہ تینوں ہنسی ٹھٹھنے میں مصروف تھے، شوکت ذرا قافلے پر بیٹھا تھا۔ ان ”صاحب لوگوں“ کی رکھوالی کا ذمہ نہ ہوتا تو وہ کب کا اٹھ کر چلا جاتا۔ یوں بھی وہ ریٹا کے دیدار سے اپنا دل بہلائے ہوئے تھا۔ رات سر پر آگنی۔ آسمان پر بادلوں نے وقفہ وقفہ سے گرجنا شروع کر دیا تھا تب ہی ریٹا نے اپنے خیمے کی طرف رخ کیا اور گارشا اور رابرٹ اپنے خیمے کی طرف چل دیے۔ شوکت نے بھی اپنے خیمے کی راہ لی۔

اسی وقت زور سے بادل گرے، بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پہاڑیوں میں بارش برسنے سے شرانے گونج رہے تھے۔ ان کے دائیں جانب ہر دو ارکا تازیک جنگل برسات میں بھجک رہا تھا۔ وہاں گھوڑا اندھروں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اطراف کی پہاڑیاں برستے پانی کے شور میں ترتیر ہو رہی •

تھیں۔ خیموں میں نیند اتر چکی تھی، سب ہی تھکے ہوئے تھے اور لیٹتے ہی سو گئے تھے۔ تیز و مرطوب ہواؤں کی سیٹیاں سنگلاخ رختوں میں پھنس کر یوں چلا رہی تھیں جیسے لاتعداد بدرجہاں پہنچ رہی ہوں..... شوکت دیگر ملازمین کے ساتھ اپنے خیمے میں گہری نیند سو رہا ہوا تھا..... ان کے خیمے موٹے کپڑے کے بنے ہوئے تھے، وہ بھی بارش کے پانی میں بھجک رہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا۔ الاؤ کب کا سر پہنچا تھا۔ رفتہ رفتہ بارش کا زور بھی ٹوٹنے لگا، یہاں تک کہ وہ بالکل بند ہو گئی۔ برستے طوفان بادلوں کے ہم جانے کے بعد ماحول میں یلکھت ایک عجیب اور اسرار بھری سی خاموش طاری ہو گئی تھی۔ آسمان سادوں بھادوں میں برساکے صاف و شفاف ہو چکا تھا جس کے باعث طہاق چاند نے بھی اپنا سنہرا چہرہ اس پہاڑی وادی میں اٹھا لیا تھا۔ خیموں کی دھلی ہوئی موٹی چادریں اس کی طلسماتی روشنی میں چمکنے لگی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب جانے کس کھلے پر شوکت کی آنکھ ایک دم کھل گئی تھی۔ وہ پشت کے ٹل سینے پر دونوں ہاتھ رکھے اسی طرح پڑا رہا، یوں جیسے اطراف کے اسرار بھرے ماحول نے اسے ہٹا کر رکھ دیا ہو۔ اس کی کھلی آنکھیں خیمے کی مخروطی دیوار پر جم کر رہ گئی تھیں اور تب ہی اسے وہاں کسی کاسایہ متحرک سا نظر آیا۔ اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ سائے کا حجم بتدریج بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ پورا خیمہ اس دیو پھیل سائے میں آکر تاریک پڑ گیا اور ٹھیک اسی وقت ایک عجیب سی آواز ابھری تھی۔

وہ خیمے کے اندر اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ دونوں عمر رسیدہ میاں بیوی تندو بابا اور شانٹا بھی ایک طرف سوئے پڑے تھے۔ شوکت نے تیز خزانے کی آواز سن کر یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کوئی دیو پھیل پہاڑی ورنے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے خیمے میں کوئی اچھا بھلا موجود نہ تھا ماسوائے ایک لمبے پھل والی آڑی سی فرد کی..... وہ اسے ہاتھ میں لیے دبا بیٹھا خیمے کی اندر دنی چادر والی دیواروں کو دیکھتا رہا جو ابھی تک سیاہ اور تاریک پڑی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً وہ دیو پھیل سائے متحرک ہوا اور خیمے کا ایک حصہ کسی دباؤ کے باعث جھک چلا گیا، تب ہی شوکت ایک دم باہر نکل آیا۔

چلتی ہوئی چاندنی میں اس نے اپنے خیمے کے قریب جو منظر دیکھا، وہ اسے حیرا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے سامنے ایک دیو قامت ”گریزی“ (Grizzly) کھڑا تھا۔

جاری ہے

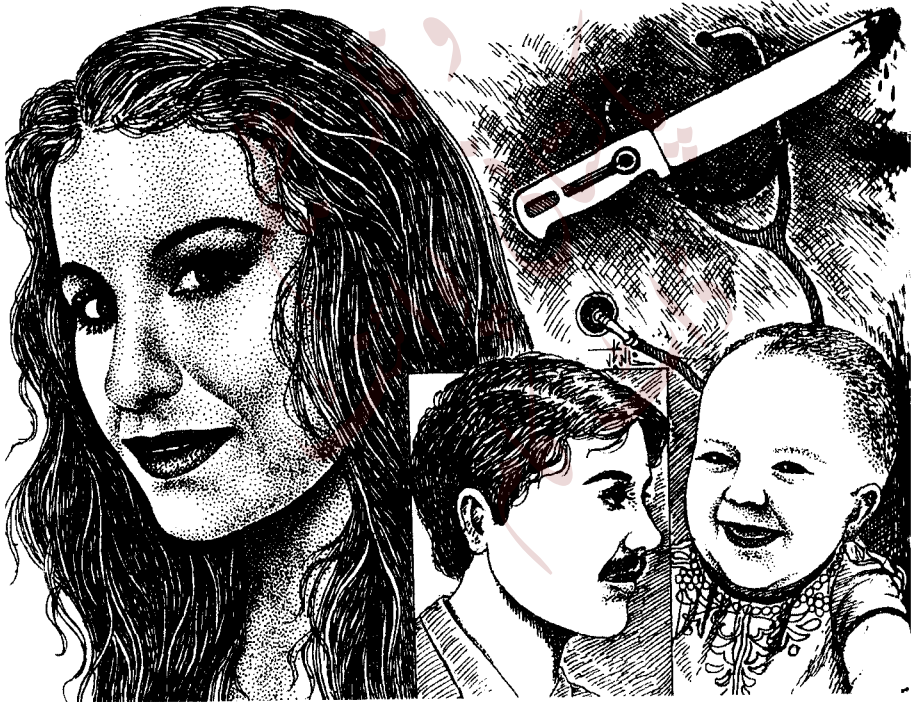
غلط فہمی

شیر عباس

غلط فہمی ہمیشہ دو پیار کرنے والوں کے دلوں میں ہی گھر کرتی ہے۔ چاہے آپس میں تعلق کوئی بھی ہو بس ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے وقت کے فیصلوں کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ وہ بھی علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن... وقت نے ان کے درمیان ایک ننھے فرشتے کو لا کر سارے فاصلے مٹا ڈالے... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

مختلف سمت میں چلنے والے ایک

جوڑے کے ملاپ کا انوکھا انداز



”ابلیٹ! میں اپنے بچے کا نام ہارپونٹیں رکھوں گی۔“ شیرون نے مجھے بالکل اسی انداز میں دیکھا جب میں نے علیحدگی کے موقع پر اس سے معاوضے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت اس سے بحث میں جیت گیا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اس کی یہ بات مان سکوں گا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جو میں نے کامیڈی ٹو نائٹ کی لابی میں واضح اسٹیک بار کے قریب رکھی تھی۔ تھمر کا دروازہ کھلنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ کوکہ تھمر کا اڑکنڈ میٹر چل رہا تھا لیکن پرانے ماڈل

سسپنس ڈائجسٹ

کا ہونے کی وجہ سے اس کی کارکردگی واجبی تھی۔

شیردن سے میری علیحدگی ہو چکی تھی لیکن ہونے والے بچے پر ہم دونوں کا مسادی دعویٰ تھا تاہم قانون کے مطابق وہ بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کی ہتھار تھی۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو نقصان میں محسوس کیا۔

”باب ہونے کی وجہ سے میرا حق زیادہ ہے اس لیے تمہیں میرا تجویز کردہ نام قبول کر لینا چاہیے۔“ میں نے ڈھیٹ بٹے ہوئے کہا۔

شیردن نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”نہیں، یہ ایک احمقانہ نام ہے جس کی وجہ سے بچہ ساری عمر مذاق اور لے عزتی کا نشانہ بننا رہے گا۔“ پھر وہ اپنے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”ویسے بھی اگر لڑکی ہوگی تو؟“

”یہی اس نام کی خوبصورتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر لڑکی ہوگی تب ہی تم یہ نام رکھ سکتی ہو۔“ بحث میں مددگار پکڑ لی لیکن خوش قسمتی سے ہمارا ایک اسٹاف ممبر جو تاجن وہاں آگیا اور مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی اہم بات کہنے والا ہو۔

”کیا بات ہے جو تاجن؟“

”صوفی کا کہنا ہے کہ میں تنہا سوڈا مشین پر کام کر سکتا ہوں۔“

صوفی اسے آہستہ آہستہ اسٹیک بار کے کام سکھار رہی تھی تاکہ وہ اس کی جگہ لے سکے کیونکہ آنے والے موسم خزاں میں اسے پرنسٹن میں کلاسیں اینڈ کرنا تھیں۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے جو تاجن۔“ میں نے اس کے کندھے پر چھکی دی۔

”کیا تم میرے ساتھ چل کر دیکھنا چاہو گے؟“

جو تاجن نے اسٹیک بار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یقیناً۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ اسٹیک بار کی طرف چل دیا جو وہاں سے پندرہ فٹ دور تھا۔

اس نے ایک مشروب بنا کر مجھے دیا اور بلا۔ ”کیا ہے؟“

اس مشروب کا ذائقہ ڈائٹ کوک جیسا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی تبصرہ کرتا میرے دائیں کندھے کے قریب ایک آواز آئی۔ ”مسٹر فریڈ۔“

یہ آتھوئی تھا۔ میرا انمول پروڈیجنٹس۔ انمول اس لیے کہ صرف وہی ہمارے قدیم پروڈیجنٹ کو کھدگی سے جلا سکتا تھا۔

”تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں کل ایک گھنٹا تاخیر سے آؤں؟“

مجھ کو یہ ہے کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا اور اتھوئی نے اس سے پہلے کبھی چھٹی نہیں مانگی تھی۔ اسے تھیر میں کام کرنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ شروع کے دو مہینے عملاً نہیں رہا۔ اس نے بڑی محنت اور پیار سے اس کا کارہ پروڈیجنٹ کو کام کے قابل بنایا اور پھر پروڈیجنٹس روم کے لیے اپنی یونیورسٹی کے سات عدد کلاس فیلوز بھرتی کیے۔ لہذا اس کا چھٹی مانگنا ایک غیر معمولی بات تھی۔

”تمہیں کس کام کے لیے چھٹی چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اپنے اسکرین پلے پر کام کرنا ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”تم ہمیشہ ہی کسی نہ کسی اسکرین پلے پر کام کرتے رہتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں کیا خاص بات ہے؟“

”یہ میرا بڑا پروڈیجنٹ ہے۔“ اتھوئی نے کہا۔ ”مجھے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہ سب سے بہتر ہو۔ میں رات کو جانے سے پہلے کل کے لیے تمام ریلیس ترتیب سے رکھ جاؤں گا۔ صرف ایک گھنٹے کی تو بات ہے۔“

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ شیردن کی ہلکی سے کراہ سن کر چونک پڑا۔ میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس کی زبان پر میرا ہی نام تھا۔ ”ایلیٹ.....“

فلوں میں دیکھا ہے کہ جب کسی عورت کے یہاں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آتا ہے تو تمام سرگرمیاں خیز ہو جاتی ہیں۔ کچھ بے وقوف پانی گرم کرنے لگتے ہیں یا اسپتال کی طرف دیوانہ وار دوڑ لگا دیتے ہیں جبکہ زیادہ تر بچے ٹیکسی میں ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ حقیقی تجربہ اس سے مختلف ہے۔ میں شیردن کو رابرٹ وڈ جینس یونیورسٹی اسپتال لے گیا۔ شیردن خود بھی ڈاکٹر تھی۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایمر جی روم کے بجائے براہ راست میٹرنٹی ونگ میں لے جایا گیا جو بہت عمدگی سے بنایا گیا تھا۔ ہسپتال میں لے جایا کہ پورے اسپتال میں یہ سب سے اچھی جگہ ہے۔ وہ شیردن کو اس کے کمرے میں لے گئی۔

فورا ہی ڈیوٹی پر موجود جی کے ماہر ڈاکٹر وائزمن سوچا

شیردن کا معائنہ کر کے بتایا کہ بچے کی پیدائش میں اتھوئی نے

ابھی بارہ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ڈاکٹر مویکا کو آنا تھا۔ حتیٰ رائے وہی دے سکتی تھی لگاتار

لیکن اس کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ جب تک ڈاکٹر وائزمن اسے رپورٹ نہ دیتا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

اپنی سابقہ بیوی کو اس حالت میں دیکھنا کچھ زیادہ متقل

خوشگوار نہیں تھا۔ ڈاکٹر وائزمن نے پہلا کام یہ کیا کہ جبکہ چو

نومبر 2017ء

چاہتا، اس نے فون بند کر دیا اور کھڑی ہو گئی۔

اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے ایک میل ٹرس نے بھی یہ گفتگو سن لی اور بولا۔ ”کیا ہوا؟“

”سپلائی روم میں ایک شخص چاقو سمیت موجود ہے۔“ وہ شخص کرسی سے اٹھا اور تیزی سے اس کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے دکھاؤ۔“

میں نے جائے وقوعہ پر دوبارہ جانے کے خیال کو پسند نہیں کیا کیونکہ بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہم دونوں ابھی تک کسی نام پر متفق نہیں ہوئے تھے۔ اگر میں مارا جاتا تو شاید وہ بچے کا نام فلپ رکھ لیتی لیکن میں پھر بھی چلا گیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسپتال کا عملہ مجھے بزدل سمجھے۔

میل ٹرس کا نام ریڈی تھا۔ وہ مجھ سے پہلے سپلائی روم میں پہنچ گیا۔ دروازہ نہر چار منتقل تھا۔ اس نے تاب پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول دیا۔ مجھے تشویش ہوئے لگی کہ اس طرح مجرم کی انگلیوں کے نشانات ضائع ہو جائیں گے۔ وہ دلیز پر کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگا اور اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”تم نے کیا دیکھا تھا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔
”کیوں؟“

”کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں ہے۔“ واقعی وہاں کا منظر دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک منٹ پہلے اس کمرے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ دونوں افراد وہاں سے چائے تھے اور سب چیزیں اپنی جگہ پر ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس دیوار اور فرش کو غور سے دیکھا، وہاں خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا۔
”میرا خیال ہے کہ اس نے یہ جگہ صاف کر دی ہے۔“ میں نے کمزور آواز میں کہا۔

”اونہہ۔“ ریڈی نے منہ بناتے ہوئے کہا جیسے اسے میری کہانی پر یقین نہ آیا ہو لیکن یہ بحث کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ عین اسی وقت اسپتال کے دو مسلح باوردی سیکورٹی گارڈز وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے لےبے قد اور سیاہ رنگت والے نے مجھ سے پوچھا۔
”کیا ایمر جنسی ہے؟“

میرے بجائے ریڈی نے جواب دیا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ اس نے یہاں ایک عورت پر چاقو سے حملہ ہوتے دیکھا ہے۔“
چھوٹے قد والے سیکورٹی گارڈ نے ریڈی کو دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”کب؟“

”تقریباً دو منٹ پہلے۔“ ریڈی نے جواب دیا۔
”لےبے قد والے نے مجھ سے پوچھا۔“ تم نے یہاں کیا دیکھا؟“ میں نے کہا۔ ”ایک پچیس تیس سال کی عمر کے شخص نے اسپتال کے نیل لباس میں سنہرے ہٹکرا لے بالوں والی نوجوان عورت کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی قسم کا بلیڈ تھا اور یہاں اس عورت کے کپڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔“ میں نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں میں نے عورت کے کپڑوں پر خون کا دھبہ دیکھا تھا۔
”چھوٹے قد والے گارڈ نے کمرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔“ اب یہاں کچھ نہیں ہے۔“

”میرا اندازہ ہے کہ اس نے یہاں کی صفائی کر دی۔“ اس بار مجھے یہ جملہ کچھ احمقانہ لگا۔
”اندازہ!“ گارڈ نے میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی اور میں نے جلی کر کہا۔ ”کیا تم لوگوں کو عمارت کے دروازے بند کر کے اس شخص کو تلاش نہیں کرنا چاہیے؟ یہاں ایک شخص تیز دھار آلہ لیے پھر رہا ہے جس نے شاید اس کمرے میں ایک عورت کو قتل کر دیا۔“
”کیا وہ مر گئی؟“ ریڈی نے پوچھا۔ ”تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟“

وہ تینوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس عورت کی آنکھیں بند تھیں اور مرد نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ یقیناً اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اس نے کچھ نہیں کہا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مر چکی تھی۔“

”لےبے قد والے نے پوچھا۔“ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے جملاتے ہوئے کہا۔
”میرا مطلب ہے کہ تم یہاں اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟“

”میری سابقہ بیوی یہاں داخل ہے۔ اس کے یہاں بچہ ہونے والا ہے۔“
”لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ چھوٹے قد والے نے کہا۔

”کیونکہ میں اپنے بچے کی پیدائش کے موقع پر یہاں موجود رہنا چاہتا ہوں۔“
”تمہارا بچہ؟“ ریڈی نے حیرت سے پوچھا۔

”ماہجہ بیوی کے یہاں ہونے والے بچے سے تمہارا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”ہاں۔ یہ میرا ہی بچہ ہے۔“

لے لے قدوالے میکیو رٹی گاڑنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور وہ تینوں مجھے لے کر برآمدے میں آگئے۔ چھوٹے قدوالے نے پوچھا۔ ”کیا یہ تمہارا پہلا بچہ ہے؟“

”ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

وہی گاڑ دو بارہ بولا۔ ”بعض اوقات جب کسی کے یہاں پہلا بچہ ہونے والا ہو تو وہ تھوڑا سا جذباتی اور گھبراہٹا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے یہ کئی مرتبہ دیکھا ہے اور یہ ایک فطری بات ہے۔ تمہاری یا تم از کم تمہاری سابقہ بیوی کی زندگی میں تبدیلی آ رہی ہے اس لیے تمہاری پریشانی کچھ میں آتی ہے۔“

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”میں نے کوئی تمنا نہیں دیکھا۔ پھر کہہ رہا ہوں کہ اس کمرے میں دو افراد تھے جن میں سے ایک بے حس و حرکت تھا اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے علاوہ تمہیں کیا بتاؤں۔“

”تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔“ چھوٹے قدوالے نے کہا۔ ”ہم کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے ہیں جس کا حلیہ تمہارے بیان کے مطابق ہو۔“

”کیا یہ کافی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تم کچھ نہیں کرو گے؟ شاید وہ عورت مر نہ جائے۔“

چھوٹے قدوالے نے کہا۔ ”شاید تم نے کچھ دیکھا ہو لیکن تم واضح طور پر نہیں سوچ رہے۔“ اس کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار مچی۔ ”تم کمرے میں جا کر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھو۔“ اس نے لفٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس لمحے میں نے بڑی بے عزتی محسوس کی اور غصے سے کہا۔ ”کیسا ہوگا اگر میں پولیس کو فون کروں؟“

”تمہیں ایسا کرنے کی آزادی ہے۔“ چھوٹے قدوالا بولا۔ ”لیکن اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو اسپتال سے باہر جا کر فون کرو۔ تم یہاں غلط ڈال رہے ہو۔“

”میں نے کیا غلط ڈالا ہے؟“

”مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کرو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہتر یہی ہے کہ کمرے میں جا کر اپنی بیوی کی خبر گیری کرو۔“ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں میرے والدین بھی آچکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شیروں نے کہا۔

زندگی

☆ بظاہر تو بہادر کی طرح شاداب ہے مگر حقیقت میں بڑھاپے کی طرح اداس ہے۔

☆ ہوا کے سرد جھونکے کے مانند ہے جو انسان کو خشکی محسوس کروا کے چلی جاتی ہے۔

☆ پانی کے اس ٹیلے کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لیے خشک ہو جاتا ہے۔

☆ ایک ٹٹمٹاتے ہوئے چراغ کی طرح ہے جو ہوا کے جھونکے سے بھی بجھ سکتی ہے۔

رشتہ

ایک صاحب کی اپنی کزن سے شادی ہوئی۔ ایک مہینے بعد ہی کم کا تعارف کروا تے ہوئے بولے۔ یہ ہیں میری اہلیہ..... پہلے ان سے میرا بلڈ کارڈ رشتہ تھا اور اب بلڈ پریش کر رہا ہے۔

پنگھا

آج آدھے گھنٹے میں اتنی بار لائٹ آئی گئی ہے کہ پنگھا خود بھول گیا ہے..... میں سچے پاسے کھومنا ہے یا کبچے پاسے.....

(مرسلہ: دزیر محمد خان۔ محل ہزارہ)

اکٹھی خوراک

ایک صاحب نے مڑک پر پیٹھے ایک گداگر کو دس روپے دیے اور کہا میں بیمار ہوں، میرے لیے دعا کرو۔

فقیر نے دعا دی۔ پھر بولا۔ ”ساتھ روپے اور دیں۔“

ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

فقیر بولا۔ ”ایک دن کی دعا سے شاید آقا قد نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک پیٹے کی خوراک اکٹھی ہی لے جائیں۔“

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

”ملک فیک کہاں ہے؟“

”کیا تم آج کے دن ملک فیک لے سکتی ہو؟“ میری ماں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں! شیرون سے پہلے میں بول پڑا۔“ ویسے بھی یہاں کہیں ملک فیک نہیں ملا۔

شیرون نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”برف کے ٹکڑے بھی نہیں ملے؟“

میں نے اسے کھورتے ہوئے کہا۔ ”اپنی زبان پر قابو رکھو یا میں تم سے دوبارہ شادی کر لوں۔“

”خواہوں میں.....“ اس نے کہا اور بستر کے ساتھ لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ اس وقت اس کے بائیں ہاتھ میں

ڈرپ لگی ہوئی تھی اور اسے برف کے ٹکڑے منہ میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسی وقت جین دروازے میں نمودار

ہوئی۔ اس نے مجھے سختی خیز انداز میں دیکھا اور شیرون کے پاس آ کر بولی۔ ”ڈاکٹر! تمہیں کچھ چاہیے؟“

”کیا مجھے برف کے ٹکڑوں کا ایک کپل سکا ہے؟“ ”یقیناً۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“

میں اس کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ پہلے نرس سے معلوم کر لوں۔ بلاوجہ ادھر ادھر

تاک جھانک کرتا پھرتا رہا۔ خیر یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جرم ہوتے دیکھ لیا۔

”تمہیں خبر کیسی ہے؟“ میں نے اپنے والدین سے پوچھا۔ ”شیرون نے ہمیں فون کیا تھا۔“ میرے والد نے

وضاحت کی۔ ”تمہیں تو یہ خیال ہی نہ آیا کہ میں فون کر لیجے۔“ میری ماں نے ہنسنے لگا۔

”سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔“ شیرون نے کہا۔ ”خوش قسمتی سے تمہارے والدین اسی علاقے میں تھے۔“

”تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”دراصل میں ایک الیکٹریک میٹر کی ضرورت ہے۔ وہی دیکھنے آئے تھے۔“

اسی وقت جین برف سے بھرا ہوا ایک کپ لے کر آ گئی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر وائزمن بھی تھا۔ جین نے

شیرون کو وہ کپ دیا اور واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر وائزمن نے شیرون کے قریب جا کر کہا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو

تو ایک زیر تربیت ڈاکٹر کو تمہارے معائنے کے لیے کہہ دوں؟ ویسے تو وہ سرجری کے شعبے میں ہے لیکن باری باری اس وارڈ میں بھی ڈیوٹی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے

آپریشن سے زیادہ دلچسپی ہے۔“

”یقیناً!“ شیرون نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ مجھے آپریشن کی طرف نہ دھکیل دے۔“

وائزمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“

چند منٹوں بعد وہ ایک نوجوان ڈاکٹر کے ساتھ واپس آیا اور شیرون کے بستر کے قریب جا کر بولا۔ ”یہ ڈاکٹر ایڈرن ہے۔“

اس کی عمر پچیس اور تیس برس کے درمیان ہوگی۔ اگر نے اسپتال کے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ

وہ بالکل نیا تازہ اور دھلا ہوا ہے اور اس کی ایک مقبول دم تھی کیونکہ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے سلائی روم میں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے لباس اسی وجہ سے تبدیل

کیا کہ اس کی پیٹنٹ شرٹ پر خون کے دھبے دیکھ کر لوگ فکر مند ہو جاتے اور کوئی بھی اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کس مریض کا خون ہے۔

ایڈرن نے بڑی کوشش کی کہ وہ مجھے دیکھ کر کوئی رد عمل ظاہر نہ کرے۔ میرے علاوہ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر یہی سمجھتا کہ وہ ایک عورت کا معائنہ کرتے ہوئے کچھ گھبرا رہا ہے لیکن میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔

دراصل وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔

شیرون اسے دیکھ کر مسکرائی تاکہ وہ سکون سے اس کا معائنہ کر سکے۔ وہ خود بھی تربیت کے مرحلے سے گزر چکی تھی اور جانتی تھی کہ زیر تربیت ڈاکٹروں کو مریضوں کو مطمئن کرنے میں کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔

”آ جاؤ۔“ اس نے کہا پھر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔

”ایلیٹ! تم ٹھیک تو ہو؟“

ڈاکٹر وائزمن نے ایک مانیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک نظر اس پر بھی ڈالو۔“

”سب کچھ نارمل ہے۔“ اس نے ڈاکٹر سے کہا لیکن وہ پورے وقت مجھے دیکھتا رہا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں سب جانتا ہوں۔

”تمہارے خیال میں بچے کی پیدائش میں کتنی دیر ہے؟“ ڈاکٹر وائزمن نے پوچھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کا

امتحان لے رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اتنا ہی احمق ہے کہ مریض، اس کے سابق شوہر اور سسرال والوں کے سامنے پیدائش کا صحیح وقت بتا دے۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسنیک بار پر کون ہے؟“
 ”کارلا..... ویسے بھی آج تھیرٹر میں صرف بیس لوگ

آئے ہیں۔“

پردہ ہٹا اور دونوں ڈاکٹر باہر آ گئے۔ شیرون نے
میرے ساتھ صوفی اور جونا تھن کو دیکھا تو بولی۔ ”اوہ
میرے خدا!..... ایلیٹ! تمہیں تو اس وقت حمیڑ میں ہونا
چاہیے تھا۔“

میں نہیں چاہتا تھا کہ سیکورٹی گارڈز کے آنے سے پہلے اینڈرسن کمرے سے جائے۔ میں نے بستر کے قریب جا کر شیردن سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر وائٹمین کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ڈاکٹر! تم کیا کہتے ہو؟“

”تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمام علامات نارمل ہیں۔ البتہ تمہیں چند کھٹے انتظار کرنا ہوگا۔ میں تمہاری دیر بعد پھر چیک کروں گا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ آپریشن کی ضرورت پیش آئے گی۔“ اینڈرسن نے کہا۔

ان دونوں نے دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس وقت میرے طے چلے جذبات تھے۔ وقتی طور پر اطمینان ضرور ہوا کہ وہ قصائی شیروں سے دور جا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تشویش بھی ہو رہی تھی کہ اگر وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ پورٹی گاڑڈز کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا تم دونوں کو یقین ہے کہ ابھی ڈیلیوری میں وقت لگے گا؟“ میں نے ایک بے چین باپ کا لہجہ اپنانے کی کوشش کی۔ ”پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

”ایلیٹ ا“ شیرون نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔
”یہ ڈاکٹر ہیں۔“

”کوئی بات نہیں ڈاکٹر۔“ ڈاکٹر وائزمن بولا۔ ”ہم
نک پریشانی کو سمجھتے ہیں، خاص طور پر جب پہلے بچے کا
حاملہ ہو۔“

جب وہ دونوں جانے لگے تو میں نے ایڈرسن کے قریب ہو کر اس سے کہا۔ ”تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

ڈاکٹر وارمین آگے جا چکا تھا۔ اینڈرسن نے میری
 طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ اس نے شیرون کی

”پانچ سے جو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر
اعزمین کے جال میں پھنس گیا۔

”میں بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتا۔“ اس کے استاد نے کہا، ایڈورسن کا منہ اتر گیا۔ وہ امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔

”صرف ایک بات۔“ شیرون نے کہا۔ ”میرا خیال ہے لارپ کی سوئی مل گئی ہے شاید ٹیپ ڈھیلا ہو رہا ہے۔“

”اوہ۔ میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور شیرون
لے برابر رکھی ہوئی ٹرے میں سے کچھ نکالنے لگا۔

”تم کچھ مت کرو۔“ میں چلایا۔ ”میں جین کو بلاتا ہوں۔“
میں تیزی سے چلا ہوا زرسنگ اسٹیشن تک گیا۔ اس

وقت ریٹھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کے کان کے قریب جا کر کہا۔ ”وہ مل گیا۔ وہی جو سپلائی روم میں تھا، اب

وہ ہمارے کمرے میں ہے اور میری سابقہ بیوی کو زخمی کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

اس نے لمحہ بھر تو قف کیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔
 ”آؤ.....“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”ہمیں وہاں

”کہاں؟“ اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں

”ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ سیکورٹی والوں کو فون

اب وہ میرے کمرے میں ڈاکٹر اینڈرسن کا روپ دھارے

کھڑا ہے۔ ہمیں اسے روکنا ہے۔ انہیں جلدی بلاؤ۔ میں
والہیں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“

کمرے کا ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ اب صوفی اور جوناہن بھی آگئے تھے۔ میں نے بستر کی طرف بڑھنا

الکڑ شمعوں کا معائنہ کر رہے تھے لیکن مجھ سے برداشت

ہندو رن ایک طرف کھڑا اُس نے استاد کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔

میری نظر اس کی جیب پر گئی جس میں ایک روٹی کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا اور اس پر خون کا دھبہ لگا ہوا تھا۔

”ایلیٹ!“ شیرون نے کہا۔ ”اگر تم برائے
 ہو تو.....“

میں اس کا اشارہ سمجھ کر باہر چلا گیا۔ مجھے اس بات پر
نفرت ہو رہی تھی کہ سیکورٹی گارڈز کو آنے میں اتنی دیر

کیوں ہو گئی۔ صوفی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے میری طرف کھڑک کر بوجھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

طرف دیکھ کر سر ہلایا اور چلا گیا۔ شیرون بستر پر لیٹی ہوئی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم ڈاکٹر سے کیا بات کر رہے تھے؟“

”ایک سیکنڈ.....!“ میں نے کہا اور زیگ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ وہاں ریڈیو بیٹھا ہوا تھا۔ ”سیکیورٹی گارڈز کہاں ہیں؟ وہ جا رہے۔“

ریڈیو نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اس بارے میں سنجیدہ تھے؟“

مجھے ایک بار پھر نا کامی ہوئی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر کمرے میں آ گیا۔ میرے پاس اور بھی طریقے تھے۔ میں بہ آسانی سیڑھیاں اتر کر سیکیورٹی اسٹیشن جا کر وہاں کے انچارج کو بتا سکتا تھا یا براہ راست پولیس کو فون کر دیتا یا پھر اسپتال کے برآمدوں میں چلا چلا کر ٹل کا شور مچا تا لیکن اس سے مریمیں کو تکلیف ہوتی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسپتال کے مردہ خانے میں جا کر دیکھتا کہ وہاں کسی سنہرے کینٹرائلے بالوں والی لڑکی کی لاش تو نہیں جس کے پیٹ میں چاقو کا زخم ہو لیکن مجھے شبہ تھا کہ اینڈرسن یہ بے وقوفی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مجھے مردہ خانے میں داخل نہ ہونے دیتا۔

ایک اور امکان یہ تھا کہ میں واپس اس کمرے میں جاؤں جہاں میری سابقہ بیوی ڈیلیوری کا انتظار کر رہی تھی اور اینڈرسن کے مکتہ حملے سے بچانے کے لیے اس کے پاس رہوں۔ میں نے میٹرنی وارڈ کا ایک پکڑ لگایا تاکہ اپنے ذہن کو اس الجھن سے آزاد کر سکوں جو اس عورت کا خون دیکھ کر مجھ پر سوار ہو گئی تھی۔ تاہم سب سے پہلے مجھے شیرون کے کمرے کی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کر سکتا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”مجھے باہر جا کر کچھ چیزوں کو دیکھنا تھا لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔“

”باہر کیا دیکھنے گئے تھے؟“ میری ماں نے پوچھا۔

”شیرون تو یہاں ہے۔“

میں نے بستر کے پاس جا کر شیرون کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ ”میں ڈیلیوری ہونے تک یہیں ٹھہروں گا پھر مجھے تمہارے ڈاکٹر کے خلاف رپورٹ درج کرانے کے لیے قریبی پولیس اسٹیشن جانا ہے۔“

”وہ تو یہاں ابھی آئی ہی نہیں۔“

”میں اس کی نہیں دوسرے ڈاکٹر کی بات کر رہا ہوں۔“ اسی وقت ڈاکٹر وائزمن اندر داخل ہوتے ہوئے

بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ سکو او کی رفتار بڑھ گئی ہے۔“

”ہاں۔ ہر پانچ منٹ بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔“ شیرون نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ وہ بستر کی طرف بڑھا اور اس نے پردہ کھینچ کر برا کر دیا۔ اسی وقت ڈاکٹر اینڈرسن بھی آ گیا اور جیسے ہی شیرون کے بستر کی طرف بڑھا، میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”رک جاؤ۔ یہ شخص قاتل ہے۔“

سب لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ اینڈرسن بھی حیران پھر اس نے بولنے میں پہل کی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

اس کے ساتھ ہی کمرے میں مختلف آوازیں گونج گئیں۔ وہ چلا چلا کر سوالات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر وائزمن نے بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کوئی آواز نہیں آئی۔

شیرون درد سے کراہ رہی تھی۔ اس نے چلائے ہوئے کہا۔ ”ایک قاتل..... کیا تم باطل ہو گئے ہو؟“

”میں نے اسے سپلائی روم میں ایک عورت کو پکڑا دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو یا ایسی ہی کوئی چیز تھی۔“

عورت کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ ”میں نے کہا۔ ”لیکن شاید نہیں..... رکو۔“

اینڈرسن میری طرف ایک قدم آگے بڑھا۔ ہوئے بولا۔ ”میں نہیں بتاتا ہوں۔“

اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جین کمرے میں داخل ہوئی۔ ”میں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میری شفٹ ختم ہو گئی ہے اور یہ.....“

اس کے پیچھے وہ نرس تھی جسے اگلے آٹھ گھنٹوں کے لیے جین سے چارج لینا تھا۔ اس نے ٹھنکرائے بال تھے اور..... صاف شہر اٹھا لباس پہنے ہوئے تھی۔

”ہائے!“ اس نے کہا۔ ”میں پامیلا ہوں۔“

نے اینڈرسن کو عجیب انداز میں دیکھا جسے اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

اینڈرسن میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ میں تمہارے بارے میں غلطی پر تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم پامیلا کو زخمی کر رہے ہو لیکن تم مجھ اور یہی کر رہے تھے اور تم نہیں چاہتے ہو کہ لوگوں کو اس بارے میں پتا چلے۔“

پامیلا مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

”کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

پامیلا کا لباس کاٹ رہا تھا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا

ہے لکہ زندگی میں کوئی پہلا سلسلہ مندی کا کام کیا ہے۔

ٹارگٹ

سرزا امجد بیگ

بعض اوقات انسان کی مفاد پرستی کی عادت اسے ظلم کی انتہا پر بھی لے جاتی ہے۔ اپنی بہتری کی خواہش لیے وہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودتا رہتا ہے اور انجانے میں اپنے انجام کو تیزی سے قریب لا رہا ہوتا ہے۔ کچھ یہی حال ان رشتوں کا بھی تھا جو سسرال کے نام پر اسے ملے اور وہ ان کی جانچ کر کے... کبھی اپنی پڑتال پر پرے ڈال کر بھی اپنے عیبوں کو چھپا نہ پائی۔ اپنے پرانے کی عینک لگائے وہ اسی تفریق میں متفرق مسائل کا شکار ہو کر بھی اپنی غلطی کو تسلیم نہ کر سکی... مگر مجرم کے ماننے یا نہ ماننے سے جرم سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی نشاندہی کے لیے بیگ صاحب جیسے لوگوں کو میدان میں آنا اور انصاف کی زنجیر کو بلانا پڑتا ہے اور بالآخر ثابت ہو جاتا ہے کہ شاطرانہ چال چلنے کے باوجود مجرم کبھی اپنے ٹارگٹ تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ... قدرت کے قوانین انسان کی سوچ سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں اور جب یہ بات اسے سمجھ میں آئی تب تک وہ بہت سے معصوم لوگوں کا دل دکھا چکی تھی۔

ایک جرم کی ہولناک تباہی سے بچنے والے خاندان کی خوش قسمتی کا ماجرا

آہی جاتی ہے۔ اسی کو معاشرت کہا جاتا ہے۔ رشید بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ خاموش طبع، خوددار، اپنے ماحول سے الگ تھک رہنے والا اور ایک متوکل انسان..... اسی لیے ایک روز میں رشید احمد کو عدالت میں دیکھ کر چونک اٹھا تھا، میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی طرف جا رہا تھا کہ چانک اس پر میری نظر پڑ گئی تھی۔

رشید احمد کا تعلق درس و تدریس سے تھا۔ وہ ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی رہائش کورنگی کے علاقے میں تھی۔ رشید احمد سے میری دو چار ملاقاتیں تھیں۔ کسی زمانے میں میرا ایک دوست کورنگی میں رہتا تھا۔ میں بھی

کچھ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کم گو اور معاشرے سے الگ تھک رہنے والے۔ ایسے افراد بہت محتاط زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل اس طور ترتیب دیتے ہیں کہ انہیں شاذ و نادر ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بد قسمتی سے اگر کبھی ان کا مشکلات سے واسطہ پڑ بھی جائے تو وہ اپنی مدد آپ کے تحت تنہا اس بحران سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انتہاء درجے کی خودداری کے باعث یہ لوگ دوسروں سے مدد مانگنے کو اچھا نہیں سمجھتے..... اپنی ذات پر بھروسہ کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن بعض اوقات انتہائی مجبوری کے عالم میں ایک انسان کو دوسرے انسان کے تعاون کی ضرورت پیش



کسی قانونی جھیلے میں پھنس گیا تھا جس کی وجہ سے رشید احمد اس وقت عدالت میں موجود تھا۔
 ”عارف کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

وہ زخمی لہجے میں بولا۔ ”عارف پر چوری کا الزام ہے۔“
 میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ عارف چوری چکاری کے معاملات میں ملوث ہوگا۔ رشید احمد نے اپنی اولاد کی مثالی تربیت کی تھی۔ میں عارف سے مل چکا تھا۔ وہ بہت ہی شیطانی اور محل مزاج نوجوان تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”اس وقت عارف کہاں ہے؟“
 ”وہ ریمانڈ پر ہے۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”پچھلے پندرہ دن سے وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ پتا نہیں، کب اس مصیبت سے ہماری جان چھوٹے گی؟“
 ”آپ نے عارف کے لیے کسی وکیل کا بندوبست کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تک تو میں نے یہ معاملہ اللہ کے سپرد کر رکھا تھا۔“ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
 ”لیکن میرے ممبر کا پتہ نہ چھلکنے والا ہے۔ سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا ہے کہ ماسٹر جی، اگر بیٹے کو قانون اور پولیس کے چکر سے نکلانا ہے تو کوئی وکیل کرنا بہت ضروری ہے۔ میں کسی ایسے وکیل کی تلاش ہی میں ٹٹی کوٹ آیا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔“

”ماسٹر جی! اللہ پر بھروسہ کرنا بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے رشید احمد کی دیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس عمل کو توکل کہتے ہیں لیکن توکل کا ایک بنیادی اصول ہے۔ توکل کے دعویدار اکثر اس اصول کو فراموش یا نظر انداز کر دیتے ہیں اور بڑے اطمینان سے یہ کہتے پھرتے ہیں..... ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے اب آگے جو اللہ کی مرضی۔ وہ جو بھی فیصلہ کرے گا، ہمیں منظور ہوگا۔“

”ہاں، میں نے لوگوں کو اکثر ایسا کہتے سنا ہے۔“ رشید احمد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور ایسا کہنے والے اکثر افراد کے خلاف فیصلہ آ جاتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”وہ اپنی ناکامی کے لیے اللہ کو تو مورد الزام ٹھہرا نہیں سکتے لہذا مخالفین ان کی کڑی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ وہ دوسروں کو کوستے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا اور فلاں نے وہ کر دیا۔“
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ

کبھار اپنے اس شاعر دوست سے ملنے چلا جاتا تھا تو رشید احمد سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب گزشتہ کئی سال سے میرا اس طرف جانا نہیں ہوا تھا۔ رشید احمد اپنے محلے میں ”ماسٹر جی“ کے نام سے مشہور تھا۔
 ”السلام علیکم.....“ میں نے رشید احمد کے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔

”وکیل السلام!“ اس نے گردن اٹھا کر میری جانب دیکھا۔
 ”ماسٹر جی! آپ کیسے ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔
 چند لمحات تک وہ متذبذب نگاہ سے مجھے تنکٹا رہا پھر اس کے چہرے پر شائستگی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بے حد جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

”ارے..... وکیل صاحب..... آپ یہاں!.....!“
 اس کا استفسار بڑا بے ساختہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی وقت نہ ہوئی کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے رشید احمد سے مصافحہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ماسٹر جی! میں یہاں اس لیے کہ ایک وکیل کو عدالت ہی میں ہونا چاہیے مگر آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟ آپ نے یہ اپنی کیا حالت بتا رکھی ہے؟ سب خیریت تو ہے نا.....؟“

گہمی بات تو یہ ہے کہ رشید احمد کو ایسی سخت حالت میں دیکھ کر مجھے حیرت بھرا دکھ ہوا تھا۔ ڈاڑھی بے ترتیب بڑھی ہوئی، سر کے بال بکھرے ہوئے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے جیسے وہ کافی عرصے سے سوایانہ ہو اور چہرے پر پریشانی خیمہ زن۔ اس سے قبل میں نے بھی ماسٹر جی کو اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے متذبذب کا شکار دیکھ کر میں نے اہانت بھرے انداز میں کہا۔

”ماسٹر جی! مجھے بتائیں، کون سی مصیبت آپ کو عدالت کا راستہ دکھایا ہے؟“

”وکیل صاحب!.....!“ وہ بے چارگی سے بولا۔
 ”آپ نے ایک سانس میں اتنے سوالات کر دیے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ عارف کی جگہ میں کٹھنرے میں کھڑا ہوں اور عدالت کے احاطے میں اس کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔“

رشید احمد کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا عارف اور ایک بیٹی تھینہ۔ عارف، تھینہ سے دو سال چھوٹا تھا۔ رشید احمد کے منہ سے ”عارف اور کٹھنرے“ کے الفاظ سن کر میں چونک اٹھا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں دیر نہ لگی کہ عارف

اس نے حذب ب انداز میں جملہ ادورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا باسٹرجی؟“

”وہ..... وہ آپ نے اپنی فیس کے بارے میں بتایا ہی نہیں.....!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”فیس کا معاملہ بھی دفتر میں بیٹھ کر طے کر لیں گے۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔“ لچائی توقف کر کے میں نے رشید احمد کو گہری نظر سے دیکھا اور استفسار کیا۔

”پولیس عارف کو عدالت میں کب پیش کرے گی؟“ ”وہ دو ہفتے سے پولیس کی تحویل میں ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”گرفتاری کے بعد پولیس نے ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کیا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد عدالت میں عارف کو پیش کر کے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ لے لیا کہ ان کی تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ اب دو روز کے بعد اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔“

”دو روز بہت ہیں.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”آپ میرے دفتر آ جائیں پھر بات کرتے ہیں۔“ وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دو روز کے بعد میں پوری تیاری کے ساتھ متعلقہ عدالت میں موجود تھا۔ رشید احمد نے میرے دفتر آ کر مجھے اپنی پتا سنا دی تھی۔ عارف کی کہانی رشید احمد کی زبانی سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عارف بے تصور ہے اور اسے چوری کے اس معاملے میں کسی گہری سازش کے تحت ملوث کیا گیا ہے۔ عارف کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی اور وہ خاصا سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو مجسٹریٹ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اس کیس کی پیروی کے لیے طرم کی طرف سے آپ پیش ہو رہے ہیں؟“

”جی ہاں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے طرم کی درخواست ضمانت کے ساتھ اپنا کالت نامہ داخل کر دیا ہے۔“

مجسٹریٹ نے بے یقینی سے طرم عارف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن بھری حیرانی مترشح تھی۔ مجھے مجسٹریٹ کی الجھن کو سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ مجسٹریٹ مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور اسے یہ بھی

مرکوبہ ثابتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”ایسا دیکھنے میں آیا ہے.....“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر مجھ سے مشفق ہوا۔ ”آپ توکل کا کون سا بنیادی اصول بتا رہے تھے؟“

”پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہیے۔ اس کے بعد اپنے اونٹ کی حفاظت کے لیے اللہ پر تکیہ کرنا چاہیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مطلب یہ کہ جو کام آپ کے اختیار میں ہے پہلے اسے پورا کرنا چاہیے اور جو کام آپ کے بس میں نہ ہو، اس کے لیے اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ اپنی ذمہ داری کو نظر انداز کر کے بیٹھ جانا اور یہ امید لگائے رکھنا کہ اللہ سب غمیک کر دے گا، میرے خیال میں یہ کوئی مستحسن عمل نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو اپنے فرائض کی تو پر داند نہ ہو لیکن اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار ہو۔“

”آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے وکیل صاحب۔“ وہ بڑی رسان سے بولا۔ ”مجھے پہلے عارف کے لیے کسی باہر وکیل کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اللہ سے بہتری کی آس باندھنا چاہیے۔“

”اصول تو یہی ہے باسٹرجی۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”باتی جو اللہ کی مرضی۔ وہ قادر مطلق ہے۔ ہم اس کے اختیار اور طریقہ کار کے لیے کوئی اصول وضع نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“

”آپ کی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں وکیل صاحب۔“ وہ بڑی عقیدت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ سے زیادہ قائل وکیل مجھے کہیں نہیں ملے گا۔ میں درخواست کروں گا کہ عارف کا کیس آپ ہی لیں۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنا ڈیوٹی ٹیگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس پر میرے گھر اور دفتر کا نمبر موجود ہے۔ اسے سنہال کر رکھیں۔ آپ کو مجھ سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔“

اس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد میرا تعارفی کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے کہا۔ ”ایک عدالت میں اس وقت میرا ایک کیس لگا ہوا ہے۔ مجھے وہاں جانا ہوگا۔ آپ ایسا کریں کہ دوپہر کے بعد میرے دفتر میں آ جائیں پھر آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔ میرا دفتر ادھر قریب ہی میں ہے۔“ ”شک ہے وکیل صاحب مگر.....“

معلوم تھا کہ میں اپنے ٹوکوں سے خاصی بگڑی فیس وصول کرتا ہوں۔ عارف اور ماسٹر جی کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ میری فیس کا بوجھ اٹھا سکتے اور مجسٹریٹ کی حیرانی کا سبب بھی بنی تھا۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے عارف کی درخواست ضمانت کو بہ غور پڑھا پھر وکیل سرکار سے استفسار کیا۔

”کیا طرم کا کوئی پرانا پولیس ریکارڈ بھی ہے؟“

میں نے درخواست ضمانت میں عارف کی نیک نائی، خوش اطواری اور کردار کی مفصّل و تفصیلاً بیان کیا تھا۔ وکیل استفسار سے مجسٹریٹ کا یہ سوال اسی تفصیل کی روشنی میں تھا۔

”جناب عالی! طرم نہایت ہی شریف قسم کا چور ہے۔“

وکیل استفسار نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ ”اس کا طریقہ“

واردات مختلف نوعیت کا ہے۔ یہ پیشہ ور چوروں کی طرح

چھپ کر گھروں میں داخل نہیں ہوتا بلکہ ایک معزز مہمان کے

روپ میں یہ اپنے میزبان کے گھر تشریف لے جاتا ہے اور

موقع ملے ہی یہ اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے۔“

”جناب عالی!“ میں نے وکیل مخالف کی بات پوری

ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”مجھے اپنے موکل کے لیے

استعمال کی جانے والی ”شریف چور“ کی اصطلاح پر سخت

اعتراض ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ جب تک کسی طرم کا جرم

ثابت نہیں ہو جاتا، اسے چور یا مجرم نہیں کہا جاسکتا۔“

”یور آزا“ وکیل استفسار نے اکیوڈ باکس میں

کھڑے میرے موکل اور اس کیس کے طرم عارف کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”یہ لوجوان

بہت شاطر اور گھٹا ہے۔ اس نے ابھی تک پولیس کو اپنے

دوسرے کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر

عدالت مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ دے دے تو۔۔۔“

”وکیل صاحب! میں نے آپ سے طرم کے سابق

ریکارڈ کے حوالے سے سوال کیا ہے؟“ مجسٹریٹ نے

قدرے برہمی سے وکیل سرکار کی بات قطع کرتے ہوئے

کہا۔ ”جہاں تک مزید ریمانڈ کا معاملہ ہے تو عدالت پہلے

ہی دوسرے درجے تک جلی ہے۔“

وکیل استفسار نے کٹ جتنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”جناب عالی! اگرچہ پولیس کے ریکارڈ میں طرم کے کسی

جرم کا سابق اندراج نہیں ہے لیکن یہ صرف شکل سے معصوم

نظر آتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا طریقہ واردات بڑا

نرالا ہے۔ یہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا۔۔۔“

”آپ تو یہ بات اتنے ذوق کے ساتھ اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے یا تو اس نے آپ کی آنکھوں کے سامنے کئی وارداتیں کی ہوں اور یا پھر اس نے اپنی زبان سے اقبال جرم کر لیا ہو۔“ مجسٹریٹ نے وکیل استفسار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اس کیس میں طرم نے اقرار جرم کر لیا ہے؟“

”اقبال جرم تو نہیں کیا مگر۔۔۔۔۔!“ وکیل استفسار

گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

مجسٹریٹ نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے جارحانہ

انداز میں استفسار کیا۔ ”کیا پولیس نے طرم سے سروقتہ مال

برآمد کر لیا ہے؟“

”جناب عالی! میں یہی تو عرض کرنے کی کوشش کر رہا

ہوں کہ طرم نہایت ہی عیار اور منصوبہ ساز ہے۔“ وکیل

صفائی نے طرم کی ضمانت کے خلاف اپنے دلائل کا سلسلہ

جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مال سروقتہ کوئی معمولی رقم نہیں

ہے۔ پاکستانی روپے اور سعودی ریال کی مجموعی رقم ایک لاکھ

میں ہزار روپے بنتی ہے۔ ہم ابھی تک طرم سے یہ رقم

برآمد نہیں کر سکتے۔ ہمیں شک ہے کہ اس نے بڑی کارکنگری

سے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت اس بگڑی رقم کو کسی خفیہ

جگہ چھپا دیا ہے۔ مذکورہ خفیہ مقام تک رسائی حاصل کرنے

کے لیے طرم کی زبان کھلوانا ضروری ہے اور اس مقصد کے

لیے استفسار معزز عدالت سے ایک ہفتے کے مزید ریمانڈ کی

درخواست کرتا ہے۔“

”یور آزا“ میں نے کھٹکھار کر گلا صاف کرتے

ہوئے کہا۔ ”میرے فاضل دوست ایک سیدھے سادے

معاملے کو سننی خیز اور پراسرار بنانے کی کوشش میں مصروف

ہیں۔ ان کے موقف کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ پولیس

کے پاس میرے موکل کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں

ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ طرم عادی

مجرم نہیں۔ علاوہ ازیں، اس کیس میں ابھی تک پولیس طرم

کے پاس سے چوری شدہ مال یعنی مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار کی

موتی رقم برآمد نہیں کر سکی۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ طرم بہت شاطر

اور گھٹا ہے، اس نے چوری کی بھاری رقم کو کسی خفیہ طریقے

سے چھکانے لگا دیا، میرے خیال میں یہ محض قیاس آرائی

ہے اور اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر

وکیل استفسار کے موقف کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر

سیدھے سادے آدمی پر ”شریف چور“ اور ”شاطر گھٹا“ کے

لیبل چپاں کر کے اسے جیل میں بند کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔“ میں

دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جواب میں ہم بھی انہیں مالی قاعدہ پہنچاتے ہیں اور یہ سب آف دی ریکارڈ ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ نے مذکورہ ضامنی کو اندر بلا لیا۔ اس کے بعد ضمانت کے کاغذات چیک کے اور مطمئن ہونے کے بعد میرے موکل کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو رشید احمد نے مجھ سے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی مہربانی سے میرے بیٹے کی ضمانت ہو گئی ورنہ پتا نہیں، عارف کو اور کتنے دن پولیس کی تحویل میں گزارنا پڑتے۔“

”شکریہ اس مالک کا ادا کریں جو آپ کا، میرا اور ہم سب کا خالق و رازق ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”ابھی محض عارف کی ضمانت ہوئی ہے۔ یہ نہیں سمجھیے گا کہ کیس ختم ہو گیا۔ عارف کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ابھی مجھے بہت زور لگانا پڑے گا۔“

”جی..... میں سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے آپ کا انداز بہت اچھا لگا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد عارف کو اس محبوز سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ!“ میں نے یہ وثوق امرائے میں کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اگلی پیشی ہے۔“ لیے مجسٹریٹ نے دس دن بعد کی تاریخ دی ہے۔ آپ کل یا پرسوں سہ پہر میں میرے دفتر آ جائیں۔ آپ نے اس کیس کے حوالے سے ابتدائی معلومات تو مجھے فراہم کر دی ہیں لیکن ابھی بہت سی باتوں کی وضاحت باقی ہے۔ اس سلسلے میں، میں آپ کا تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی، میں کل ہی حاضر ہو جاؤں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا پھر قدرے جھجک کر مستغفر ہوا۔ ”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں عارف کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں؟“

”آپ نے میرے منہ کی بات سمجھ لی ہے یا سٹر جی۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں ابھی آپ سے بھی کہنے والا تھا کہ اکیلے نہیں آئیے گا۔ مجھے عارف سے بھی متعدد سوالات کرنا ہیں۔ اسے بھی ساتھ لے کر آئیے گا۔“

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں اس سے مصافحہ کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

جس وقت ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی، اس دوران میں عارف وہاں موجود نہیں تھا۔ ضمانت کی کاغذی کارروائی میں تھوڑا وقت لگتا ہے اور ان لمحات میں عارف

نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! حقیقت یہ ہے کہ میرا موکل ایک قانون پسند اور شریف انفس انسان ہے۔ اس کے والد کی ساری زندگی درس و تدریس میں صرف ہوئی ہے اور طرم بھی ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ یہ کسی اچھی نوکری کی تلاش میں ہے اور سر دست ٹیوشن پڑھا رہا ہے۔ یہ اس معاشرے کا ایک مفید فرد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی گہری سازش کے تحت یا پھر کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے موکل کو اس معاملے میں پھنسا یا گیا ہے۔ اگر میرے موکل کو ضمانت پر رہا نہ کیا گیا تو اس کی نیک نامی کو شدید دھچکا لگے گا اور یہ اصولاً انصاف کے بھی منافی ہو گا۔“

”آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟“

مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

”جناب عالی! ابھی تک پولیس کی تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔“ وکیل استغاثہ نے حذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

”تفتیش کی تکمیل کے بعد ہی کوئی حتمی بات کہی جاسکتی ہے۔“

”پولیس بہ زور بازو میرے موکل کی زبان سے اقبال جرم کروانے کا ارادہ رکھتی ہے اور اسی مقصد کی خاطر اسے مزید رہمانڈ کی ضرورت پیش آرہی ہے۔“ میں نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”قابل غور امر یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ روز سے طرم پولیس کی تحویل میں ہے۔ اتنے عرصے کا رہمانڈ کسی سنگین فوج داری معاملے کی تفتیش کے لیے بھی کافی ہوتا ہے لیکن پولیس کی اب تک کی کارکردگی کا گراف زیر و کے ہند سے ذرا سا بھی اوپر نہیں اٹھ سکا لہذا میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کو انسانی ہمدردی کی بنا پر ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں، پولیس کو اس بات کے لیے پابند کیا جائے کہ وہ طرم کے گھر والوں کو ہراساں کرنے کی کوشش نہ کرے۔“

مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا طرم کا ضامنی موجود ہے؟“

”میں سراسر!“ میں نے سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”معزز ضامنی عدالت کے کمرے کے باہر برآمدے میں موجود ہے۔“

عارف کے لیے میں نے ایک صاحبزادے پر پیشہ ور ضامنی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ بد وقت ضرورت ایسے ریڈی میڈ افراد ہمیں میسر ہوتے ہیں جو ہم پر بھروسہ کر کے ضمانت

جانے دیتی تھی۔ ایک سیدھی اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ اس کی رہائش اختر کالونی میں تھی اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اختر کالونی کا یہ حصہ ڈیفنس فیژون سے متصل تھا۔ اس اتصال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سب کو یہی بتاتی تھی کہ ہم ڈیفنس سوسائٹی میں رہتے ہیں۔

فرید احمد کی تین اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا رضوان غیر شادی شدہ تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی انیلا تھی۔ انیلا کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ انیلا کا شوہر درزی تھا۔ ان کی رہائش لیاقت آباد میں تھی لیکن ان دونوں وہ لوگ ناہید اختر ہی کے گھر میں قیام پذیر تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ انیلا کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اور ناہید کا یہ پروگرام تھا کہ بچے کا عقیدہ کرنے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کرے گی۔

انیلا سے چھوٹی بہن شائلہ تھی۔ شائلہ کی عارف سے متعلق ہوئی تھی۔ جب تک فرید احمد یہ قید حیات تھا تو وہ اور رضوان مل کر کاروبار کو سنبھالتے تھے لیکن فرید کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری رضوان کے کاندھوں پر آن پڑی تھی اور وہ بڑی ہمت اور حوصلے سے اس فرض کو نبھاتا تھا۔ ان لوگوں کی صدر کے علاقے میں کپڑے کی ایک بڑی دکان تھی جو خوب چلتی تھی۔

رشید احمد کے بارے میں، میں آپ کو کہانی کی ابتدا میں مختصر آیتا چکا ہوں۔ رشید کی بیوی کا نام دل شادیگم تھا۔ وہ بھی رشید احمد کی طرح سادہ طبیعت کی مالک اور قناعت پسند قسم کی عورت تھی۔ کم آمدنی کے باوجود بھی یہ گھرانہ بہت مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہا تھا جبکہ دوسری جانب ناہید اختر کے گھر میں کسی نوعیت کی کوئی معاشی گراؤ دیکھنے کو نہیں ملتی تھی مگر وہ لوگ اطمینان اور سکون کو ترسے ہوئے تھے۔ اگر خوش کا تعلق مالی آسودگی سے ہوتا تو پھر کوئی بھی صاحب ثروت آپ کو بے سکون دکھائی نہ دیتا جبکہ انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بے سکونی کا مرض سب سے زیادہ دولت مند افراد کو لاحق ہوتا ہے۔

انیلا ڈیپوری کی وجہ سے اپنی ماں کے گھر میں رکی ہوئی تھی۔ ناہید اختر کا ارادہ تھا کہ جلد عمل ہونے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کرے گی۔ انیلا کے شوہر اعجاز حسین کا نیل رنگ کا کام کچھ خاص نہیں چلتا تھا۔ اسی سبب ناہید نے بیٹی کی ڈیپوری اپنے گھر میں رکھ کر کرائی تھی اور اب عقیدے کا پروگرام تھا۔

عقیدے میں رشید احمد کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ فرید

اسی عدالتی کارروائی سے گزر رہا تھا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ پیش منظر کو سمجھنے کے لیے پس منظر سے شناسائی لازمی ہوتی ہے۔ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے اس کیس کی سماعت کے دوران میں پتا چلی تھیں۔ بہر حال، خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ چند باتیں میں نے سر دست دانستہ آپ سے چھپائی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی کے اندر سسپنس کا پہلو کو ریش بدلتا نظر آئے۔

☆☆☆

پڑھنے اور سننے میں یہی آیا ہے کہ..... اپنا اپنا، غیر غیر۔ یہ ایک محاورہ بھی ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح لیا جاتا ہے کہ اپنا ہر حال میں غیر سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی محاورے کو انگریزی میں ”بلڈ از ٹھکر دین واٹر“ یعنی ”خون پانی سے بہر حال گاڑھا ہوتا ہے“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست کہ اگر اپنا مارے گا تو مار کر چھاؤں میں پھینکے گا..... وغیرہ وغیرہ لیکن عملی زندگی میں بعض ایسے واقعات بھی سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ذہن چکرا کر رہ جاتا ہے اور صدیوں سے مروج محاورے بھی کھوکھلے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ عارف والا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ ماسٹر رشید احمد کے صاحبزادے عارف پر چوری کا الزام تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ الزام عارف پر اس کی سگی ممانی نے عائد کیا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ کہ اسی ممانی کی بیٹی سے عارف کی متعلق بھی ہو چکی تھی.....!

عارف کا ماموں فرید احمد اختر کالونی میں رہتا تھا۔ فرید احمد کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی شائلہ کو بہن کے گھر میں بیٹا ہے لہذا اس نے شائلہ کا رشتہ اپنے بھانجے عارف سے طے کر دیا تھا۔ اس رشتے کے لیے فرید احمد کی بیوی ناہید اختر راضی نہیں تھی تاہم اس نے کھل کر اپنی مخالفت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ عارف کی بد قسمتی کہ یہ رشتہ طے ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد فرید احمد کا انتقال ہو گیا لہذا شادی والا معاملہ فی الحال تاخیر کا شکار ہو گیا تھا۔

ناہید اختر اپنے مزاج اور عادات کی بنا پر فرید احمد کے برعکس تھی۔ فرید احمد ایک سادہ طبیعت اور بھلا مانس شخص تھا جبکہ ناہید اختر کو نمود و نمائش کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی شان کو ماؤنٹ ایوریٹ پر چڑھانے کا کوئی موقع اتھ سے نہیں

ماہنامہ جاسوسی فائبرسٹ



موسم کی بدلتی گرماہٹ

نومبر کے شمارے

کی یادگار نماہٹ

اولین صفحات

ظلم و زیادتی کی ایک حد ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسا کردار تھا جس نے زندگی و سفاکیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ **ایچ اقبال** کے قلم کی نشتر زنی **انگارے**

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپین کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے سرسبز پیکار و جوان کی سرگزشت۔۔۔۔۔ **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے دار کہانی

سردق کے رنگ

نفرت۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔ سادگی و وارفتگی کے رنگوں سے مزین سردق کے رنگ

ان کے علاوہ

مظفر امام، تنویر، باض، سلیمہ انور، امیر شدید، جمال دستی، تمکین مرضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاو ترجمہ کہانیاں

چنی تکتے چنی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

احمد کے انتقال کے بعد ناہید اختر کے اکھڑے ہوئے رویے کو اگرچہ رشید احمد نے بہت اچھی طرح محسوس کر لیا تھا لیکن وہ اپنے منہ سے کوئی بات نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ رشید احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عقیقے کی تقریب میں شریک ہوا۔ خوشی کے ان لمحات میں رشید احمد یا اس کی فیملی کے کسی بھی فرد کو ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ تقریب ان کی زندگی میں کون سا بھونچال لانے والی ہے!۔۔۔۔۔

وہ لوگ نصف شب کو گھر پہنچے اور لمبی تان کر سو گئے۔ اگلے روز ایک مصیبت نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ پتا چلا کہ ناہید اختر کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ صورت حال جاننے کے لیے رشید احمد، عارف کو اپنے ساتھ لے کر فوراً اختر کا فون پیچھے کیا۔ رسی علیک سلیک کے بعد اس نے ناہید سے پوچھا۔

”بہن! یہ سب کیسے ہوا؟“

ناہید نے شک زدہ نظر سے رشید احمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہ کب ہوا، کیسے ہوا اور کس نے کیا، سب پتا چل جائے گا۔ آپ اپنی بیٹی اور بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے؟“

”میں اور عارف افراتفری میں گھر سے نکلے ہیں۔“ ماسٹر جی نے کہا۔ ”اگر آپ ضروری سمجھتی ہیں تو میں تمہیں اور دل شاد بیگم کو بھی بلا لیتا ہوں۔۔۔۔۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔

”آپ مجھے چوری کے بارے میں تو کچھ بتائیں؟“

”میرے گھر سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے چوری ہوئے ہیں۔“ ناہید اختر نے دونوں باپ بیٹے کو باری باری گھورتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ”پانی باتیں اس وقت ہوں گی جب تمہیں اور دل شاد بھی یہاں آ جائیں گی۔“

”ایک لاکھ تیس ہزار روپے!“ ماسٹر جی نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ”یہ تو خاصی بڑی رقم ہے۔ آپ نے اتنے پیسے اپنے گھر میں کیوں رکھے ہوئے تھے؟“

”یہ میری ذاتی رقم تھی اور یہ گھر بھی میرا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”بہن! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ رشید احمد جلدی سے بولا۔ ”میں تو حفاظت کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔“

آج کل ایک لاکھ تیس ہزار کو کٹری رقم نہیں کہا جاسکتا لیکن چالیس، پینتالیس سال پہلے یہ رقم بہت معنی رکھتی تھی۔ ”بھائی صاحب! آپ ہماری حفاظت کے خیال کو تو اپنے

ذہن سے نکال ہی دیں۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں سب جانتی ہوں، کون ہمارا ہمدرد ہے اور کون.....!“ اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر سرسری لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”آپ اپنی بیگم اور بیٹی کو بھی بلا لیں پھر بات کرتے ہیں۔“ یہ بات ناہید پہلے زور دے کر کہہ چکی تھی۔ رشید احمد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

”بہن! مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ ہمیں شک کی نظر سے دیکھ رہی ہیں؟“

وہ ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! جس کا نقصان ہوتا ہے اسے تو سب پر شک ہوتا ہے۔“

رشید احمد کو احساس ہوا کہ معاملہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اس نے فوری طور پر عارف کو گھر بھیج دیا تاکہ وہ تہینہ اور دل شاد بیگم کو اپنے ساتھ لے آئے پھر وہ ناہید اختر سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”بہن! مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کا نقصان ہوا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آپ کو ہم لوگوں پر کیوں شبہ ہو رہا ہے؟“

”بھائی صاحب! سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ ”لیکن مجھے اس امر کی کوئی پروا نہیں کہ آپ کو اچھا لگتا ہے یا برا..... میں تو یہی کہوں گی کہ مجھے آپ لوگوں پر شک ہے۔“

ناہید کے واضح الفاظ نے ماسٹر جی کو اندر سے زمیں بوس کر دیا۔ وہ ناہید کی جانب سے اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس شک کا کوئی سبب تو ہو گا بہن.....؟“

”حساب میں کمی آیا ہے۔“ ناہید نے جواب دیا۔

”کس کے حساب میں؟“ رشید احمد حیرت بھری نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہم نے ایک سیانے سے حساب لگوایا ہے۔“ ناہید کہہ ہی تنہید کی سے بولی۔ ”اور اس سیانے نے آپ لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔“

”ناہید بہن! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔“ رشید احمد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں یا میرے بھوی بچوں کا اس چوری

سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کس نوعیت کا سیانا ہے جس نے آپ کو ہم لوگوں کے خلاف کر دیا ہے۔“

”وہ بہت پتہ چا ہوا بندہ ہے اور مجھے اس کے حساب پر پورا یقین ہے۔ میں پہلے بھی دو چار معاملات میں حساب لگوا کر اسے آزمایا چکی ہوں۔ اس سیانے کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور جہاں تک قسم کھانے کی بات ہے تو.....“ ناہید نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے آپ کے گھر کے باقی افراد کو اسی مقصد کی خاطر تو بلا یا ہے.....!“

”اوہ.....!“ رشید احمد ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ناہید اسے ڈرامنگ روم میں چھوڑ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ موجودہ صورت حال نے ماسٹر جی کو گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ وہ ناہید کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات لے کر گھر سے نکلا تھا اور یہاں، تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا تھا۔ ناہید کسی نام نہاد سیانے کے ایمان پر ان لوگوں کو چور گردان رہی تھی اور اب انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے قسم اٹھانا تھی۔

ان لمحات میں ماسٹر جی کو اپنی کم مائیگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ وہ اتنی ذلت اور بے عزتی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ناہید نے یہ بڑی گری ہوئی حرکت کی تھی۔ جب تک فرید احمد زندہ تھا، اس گھر میں ان لوگوں کی آؤ بھگت ہوتی تھی مگر فرید کے دنیا سے پردہ کرتے ہی اس گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ خاص طور پر ماسٹر جی کو تو یہاں کا ماحول اب بہت زہریلا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بے اعتمادی کی فضا میں اسے عارف اور شائلہ کے رشتے کی نیامی کسی کنارے لگتی دکھائی نہیں دے رہی تھی.....!

تھوڑی دیر کے بعد عارف کے ہمراہ دل شاد بیگم اور تہینہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ اس گھر میں کیا ہونے جا رہا ہے کیونکہ ”قسم کھانے“ کا معاملہ ناہید اختر اور رشید احمد کے بیچ ڈکس ہوا تھا۔

جب ناہید کے مطلوبہ تمام افراد وہاں جمع ہو گئے تو وہ ایک قرآن پاک اٹھا لائی اور مطالبہ کیا کہ وہ لوگ باری باری یہ قرآن اپنے سر پر رکھ کر قسم کھائیں کہ انہوں نے ناہید کے گھر سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے نہیں چرائے۔

”ممائی جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

عارف نے پرہی سے کہا۔ ”کیا آپ مجھے اور میرے گھر والوں کو چور سمجھتی ہیں؟“

”آپ لوگ میرے بچھنے اور نہ بچھنے کے چکر میں نہ پڑیں۔“ ناہید کمرے لچھے میں بولی۔ ”اگر آپ سچے ہیں تو پھر آپ کو قرآن اٹھانے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔“

دل شاد بیگم نے کہا۔ ”ناہید بہن! تمہارا نقصان ہوا ہمیں اس بات کا دکھ ہے مگر تمہارا یہ انداز ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ کل رات اس گھر میں ہمارے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے۔ کیا تم نے ان سب کے سروں پر قرآن رکھا ہے؟“

”جو حساب میں آئے گا، میں اسی سے قسم اٹھاؤں گی نا!“ ناہید ہاتھ نچا کر بولی۔ ”باقی سب کا اس معاملے سے کیا تبادلتا۔“

”میں قرآن نہیں اٹھاؤں گا۔“ عارف نے خمدی لچھے میں کہا۔

ناہید نے طنزیہ لچھے میں کہا۔ ”لگتا ہے تمہارے دل میں کوئی چور چھپا بیٹھا ہے!“

رشید احمد صورت حال کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ناہید بہن جو کہہ رہی ہے، ہمیں اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

”ابو! یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔“ تہینہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”ہمیں گھر بلا کر بے عزت کیا جا رہا ہے۔“

”یہ..... میرا حکم ہے.....!“ رشید احمد نے دو ٹوک لچھے میں کہا۔

اس کے بعد عارف، تہینہ اور دل شاد بیگم کی طرف سے ایک بھی اعتراضی لفظ سننے کو نہیں ملا۔ ان سب نے باری باری قرآن اٹھا کر ناہید کی خواہش کی تکمیل کر دی اور ”بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے“ کے مصداق وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آ گئے۔

دل شاد بیگم، عارف اور تہینہ اس وقت پر راستے بھر بچ دتا بکھاتے رہے تھے مگر رشید احمد مسم خاموش بیٹھا رہا تھا۔ گھر پہنچنے ہی ان میں گرامر بحث شروع ہو گئی۔

”ناہید نے یہ کس قسم کا ڈراما کیا ہے؟“ دل شاد بیگم نے غصیلے لچھے میں کہا۔

تہینہ شاک لچھے میں بولی۔ ”ابو! آپ کو ممانی جان کی بات نہیں ماننا چاہیے ٹھی!“

”میں نے ایسی ذلت کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

عارف برہمی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”ممانی جان سے مجھے ایسی سچ حرکت کی توقع نہیں تھی۔ انہیں ایک لمحے کے لیے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں اس گھر کا داماد بننے والا ہوں.....!“

”سچ لوگوں سے اعلیٰ وارفع حرکات کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔“ دل شاد بیگم نے ٹھہرے ہوئے لچھے میں کہا۔

”فرید بھائی زندہ تھے تو ناہید کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی، کوئی گھٹیا بات کرنے کی۔ یہ وہ ہوتے ہی اس کے تو پر نکل آتے ہیں۔ میں نے بھائی صاحب کی ضد پر عارف کا شاملہ سے رشتہ طے کر دیا تھا لیکن ناہید کے حالیہ رویے کے بعد تو یہ بتل مجھے منڈے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی.....!“

”بتل منڈے نہ چڑھے یا سارے جہن کو آگ لگ جائے لیکن ایک بات طے ہے کہ میں ممانی جان کی اکڑوں نکالنے کے لیے ہر قیمت پر شاملہ سے شادی کروں گا۔“

عارف نے مچرمز انداز میں کہا۔ ”اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اس سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ ہونہیں سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”تم سب لوگ جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔“

رشید احمد نے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ ”انتظار کرو..... کچھ ہی عرصے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”یہ آپ کی خوش فہمی ہے ماسٹر جی!“ دل شاد بیگم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لچھے میں کہا۔ ”ہم چاہے جتنا بھی انتظار کر لیں، اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہونے والا۔ میں تو آج کے بعد اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھوں گی۔“

”اگر تم ناہید کے گھر میں قدم نہیں رکھو گی تو اپنے لیے بہو کیسے بیاہ کر لاؤ گی؟“ رشید احمد نے معقول انداز میں کہا۔

”دنیا میں ایک شاملہ ہی نہیں رہ گئی میری بہو بننے کے لیے۔“ دل شاد بیگم نے ہاتھ مچا کر کہا۔ ”میرے بیٹے کے لیے لاکیوں کی کوئی کمی نہیں۔“

”میری کو خیر ہے۔ ناہید یا فرید سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔“ رشید احمد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن فرید تمہارا سگا بھائی تھا۔ اس حوالے سے شاملہ تمہاری بیٹی لگتی ہے۔ یہ رشتہ فرید کی خواہش پر جوڑا گیا تھا۔ اگر تم اسے توڑ دو گی تو سرے ہوئے بھائی کی روح کو اذیت پہنچاؤ گی۔“

”جس بھائی نے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔“ دل شاد بیگم ایک مغموم سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”باقی جہاں تک اس رشتے کو توڑنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں بھابی ناہید نے پہل کر دی

سپس ڈائجسٹ

ہے۔ میں تو اس کے شروع کیے ہوئے عمل کو آگے بڑھانے کی بات کر رہی ہوں۔ آج اس گھر میں ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد رشتے داری کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔“

”اللہ ناہید کو نیک ہدایت دے۔“ رشید احمد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوگی۔“

”اونہ..... نادم ہوگی وہ!“ دل شاد بیگم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ہمیں آپ یہ توقع تو نہیں کر رہے کہ شدید ندامت کے بعد وہ ہم سب سے معافی مانگنے کے لیے یہاں چلی آئے گی؟“

”ایسا ہو بھی سکتا ہے۔“ رشید احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنا چاہیے۔ اللہ ناہید کو بھی سیدھی راہ دکھا سکتا ہے۔“

”اللہ کی ہدایت صرف انہی لوگوں تک پہنچتی ہے جن کے اندر قبولیت کے جراثیم ہوتے ہیں۔“ دل شاد بیگم نے کہا۔ ”ناہید کی نیت میں کھوٹ شامل ہو چکی ہے۔ ایسے افراد نہ تو اپنے کیے پر شرمندہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی آنکھیں راہِ راست کو پہچاننے کے لیے آمادہ ہوتی ہیں۔ آپ چاہے ناہید کے سدھرنے کا انتظار کریں لیکن میری طرف سے تو ہر دروازہ بند ہی سمجھ لیں۔“

میاں بیوی کی تکرار کے دوران میں عارف گھر سے باہر نکل گیا تھا اور تہینہ بھی مکن کی طرف چلی گئی تھی۔ رشید احمد نے سمجھانے والے انداز میں دل شاد بیگم سے کہا۔

”تم بڑے شوق سے ناہید پر اپنے دل کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کسی عمل سے عارف کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچنا چاہیے!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ دل شاد بیگم نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”شاید تم نے عارف کے الفاظ پر غور نہیں کیا جو یہ سوال کر رہی ہو.....!“

وہ الجھن زدہ انداز میں متفکر ہوئی۔ ”کون سے الفاظ؟“

”عارف نے تھوڑی دیر پہلے بڑے عزم سے کہا تھا..... بتل منڈے نہ چڑھے یا سارے چمن کو آگ لگ جائے لیکن ایک بات طے ہے کہ میں ممانی جان کی اکڑنوں نکالنے کے لیے ہر قیمت پر شاملہ سے شادی کروں گا۔ اپنی

ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اس سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ رشید احمد نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اگر تم اپنے بیٹے کے لیے سنجیدہ ہو تو اس کے آخری الفاظ پر غور کرو۔ وہ شاملہ سے شادی کے لیے ”کچھ بھی کرنے“ کی دھمکی دے کر گیا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں، عارف نے یہ سب جذبات کی رو میں کہہ دیا ہے۔“ دل شاد بیگم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا غصہ اتنے گا تو نازل ہو جائے گا۔“

”میں بھی تو اتنی دیر میں تمہیں یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ رشید احمد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس وقت تم بھی جذبات میں ترک تعلقات کے بڑے بڑے دعوے کر رہی ہو۔ جب تنہائی میں بیٹھ کر کھل سے سوچو گی تو تم بھی نازل ہو جاؤ گی۔“

آئندہ دو روز خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے دن ناہید، رضوان کے ساتھ رشید احمد کے گھر پہنچ گئی۔ اس وقت عارف وہاں موجود نہیں تھا۔ رشید احمد یہی سمجھا کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو کر ان لوگوں سے معذرت کرنے آئی ہے لیکن جب کھنگو کا آغا ہوا تو یہ کوئی اور ہی معاملہ نکلا۔

”رشید بھائی! آپ کو دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی۔“ ناہید نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”ورنہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”کون سا مسئلہ؟“ دل شاد بیگم نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ایک لاکھ بیس ہزار دالامسلہ۔“ ناہید نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

دل شاد بیگم طنز یہ انداز میں بولی۔ ”مطلب ہماری بے عزتی کرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے جو تم یہاں تک چلی آئی ہو.....؟“

”یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے جو میں مبر کر کے بیٹھ جاؤں۔“ ناہید نے پھٹکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ”میں تو ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گی۔“

”تم تو یہ بات ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم نے اپنی آنکھوں سے ہمیں وہ رقم چراتے ہوئے دیکھا ہے!“ دل شاد بیگم نے نفرت بھرے انداز میں ناہید کو گھورا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ ناہید نے متقی خیز انداز میں کہا۔

رشید احمد پوچھے بتانہ رہ سکا۔

الفاظ میں اضافہ کیا۔
”اگر آپ کا رقم واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو پھر آپ لوگوں کو ایک امتحان سے گزرنا ہوگا تاکہ میں ثابت کر سکوں کہ چوری تم لوگوں ہی نے کی ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کو میرے ساتھ آئندہ جمعرات کی سہ پہر تین بجی جانا ہوگا۔“

”تین بجی.....“ رشید احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہاں کیا ہے؟“

”تین بجی کے علاقے میں ایک بہت پہنچے ہوئے اللہ والے کا آستانہ ہے۔“ ناہید وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
”اسی سائے نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ میری رقم آپ لوگوں میں سے کسی نے چرائی ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ کام عارف نے کیا ہے۔“

”دیکھو ناہید بہن!“ رشید احمد نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ ہم میں سے کسی نے تمہاری رقم نہیں چرائی لہذا رقم کی واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم نے حساب لگنے والے کی لغویات پر یقین کر لیا ہے تو پھر ہمیں اس فتنہ پرورد شخص کے پاس کیوں لے کر جانا چاہی ہو؟“

”وہاں پر آپ لوگوں کو ایک امتحان سے گزرا جائے گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”جس کے نتیجے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم میں سے کس نے میری رقم چرائی ہے۔“

”تم کس قسم کے امتحان کی بات کر رہی ہو؟“ رشید احمد کی الجھن میں پریشانی کا عنصر لہ لہ کر بڑھتا جا رہا تھا۔

”اس اللہ والے نے کہا ہے کہ جمعرات کی سہ پہر میں تم لوگوں کو اس کے آستانے پر لے آؤں۔“ ناہید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ آپ لوگوں کے سامنے اپنے آستانے کی بنی ہوئی ایک روٹی رکھے گا۔ آپ میں سے ہر کوئی اس روٹی میں سے ایک ٹوٹا توڑ کر کھائے گا۔ اس بندے کا دعویٰ ہے کہ جس نے رقم چرائی ہے، وہ ٹوٹا کھاتے ہی خون کی لٹی کر دے گا۔ اس تجربے سے ثابت ہو جائے گا کہ میری رقم کو چرانے والا چور کون ہے۔“

رشید احمد نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت ہی خطرناک تجربہ ہے!“

”خطرناک اور خوفناک کے بارے میں غور و فکر کرنا آپ کا کام ہے ماسٹر جی۔“ ناہید اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”دو دن کے بعد جمعرات ہے۔ میں آپ

”ناہید بہن! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے کب ہمیں رقم چراتے ہوئے دیکھا تھا؟ اور بالقرض محال، اگر دیکھا بھی تھا تو اسی وقت روکا کیوں نہیں؟“

”بھائی صاحب! میں یہاں بحث مباحثہ کرنے نہیں آئی۔“ وہ بے مروتی سے بولی۔ ”مجھے کچھ ایسی شہادتیں ملی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ چوری آپ کے بیٹے عارف نے کی ہے اور پھر حساب میں بھی ایسی ہی بات آ رہی ہے.....“
”بھائو میں کیا تمہارا حساب۔“ ناہید کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دل شاد بیگم پھٹ پڑی۔ ”تمہاری مت ماری گئی ہے جو اپنے ہونے والے داماد پر چوری کا الزام لگا رہی ہو۔“

”بھائو میں جائے یہ ہونے والا داماد!“ ناہید نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ”دل شاد بیگم! تم اپنا منہ دھور رکھو۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنی بیٹی کو ایک چور سے نہیں بیاہ سکتی۔“
”آپ سن رہے ہیں، یہ عورت کیا اول فول بکے جارہی ہے؟“ دل شاد بیگم نے رشید احمد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ عورت تمہاری بھائی ہے دل شاد بیگم!“ رشید احمد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اور اس وقت یہ ہمارے گھر میں بیٹھی ہے، ہماری مہمان ہے۔ تم خوش خلقی کے دامن کو قحط کر رکھو۔“

”اخلاقیات تو ناہید پر آ کر ہی اختتام پذیر ہوتی ہیں۔“ دل شاد بیگم نے چلے گئے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر میں اس کے شایان شان بات نہیں کر رہی تو پھر یہ مذاکرات آپ ہی کر لیں۔ میں ایسے ناخوش گوار ماحول میں نہیں بیٹھ سکتی۔“

بات کے اختتام پر وہ ایک جھجکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پاؤں دھوئے ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔
اس دوران میں رضوان بھی وہاں موجود تھا لیکن اس نے ابھی تک اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔

رشید احمد نے ناہید کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے تحمل لہجے میں کہا۔ ”ہاں بہن! مجھے بتاؤ، وہ کون سی دو باتیں ہیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جن میں سے ہمیں ایک ماننا ہوگی؟“

”نمبر ایک.....“ ناہید نے مضبوط لہجے میں کہا۔
”آپ لوگ میرے ایک لاکھ بیس ہزار روپے واپس کر دیں تو یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے گا اور میرا دو.....“ لچائی توقف کر کے اس نے تلوتلی ہوئی نظر سے رشید احمد کو دیکھا پھر ان

لوگوں کو لینے آؤں گی۔ آپ سب تیار رہنا۔“
 ”اور..... اگر..... ہم اس تجربے کے لیے..... راضی نہ ہوں تو؟“
 رشید احمد نے شکست لے کر ہنس کر کہا۔
 ”تو پھر مجھے تیسرا اور آخری راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔“ وہ سفاکی سے بولی۔ ”اور اس کام کے لیے مجھے تمہارے دروازے تک آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

”تیسرا راستہ.....“ رشید احمد بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ کیوں سارا راستہ ہے ناہید؟“
 ”پولیس.....!“ وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔
 ”تنگ..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ رشید احمد چکر کر رہ گیا۔

”مجھے ہر صورت میں اپنی رقم واپس چاہیے۔“ وہ دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اگر مگر سیدھی انگلی سے نہ نکل سکا تو یہ حالت مجبوری مجھے اپنی انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا۔ میں پولیس اسٹیشن جا کر عارف کے خلاف ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی چوری کی رپورٹ لکھوا دوں گی۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میرے پاس ایسے شواہد ہیں کہ عارف کو چور ثابت کرنے کے لیے ہائیکس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔“

اپنی اس سنسنی خیز دھمکی سے ماسٹر جی کو سپردِ خطاب کرنے کے بعد ناہید وہاں سے رخصت ہو گئی۔
 تھوڑی دیر کے بعد عارف بھی گھر آ گیا پھر یہ چاروں سر جوڑ کر موجودہ صورت حال پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ رشید احمد نے ناہید سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں ان سب کو بھی بتا دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ ناہید بکواس کر رہی ہے۔“ دل شاد بیگم نے کہا ”جب ہم میں سے کسی نے اس کی رقم نہیں چرائی تو پھر اس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، وہ دھونس دھمکی سے ہمیں دھمکانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”سب سے زیادہ خطرہ عارف کے لیے ہے۔“ رشید احمد نے سر ايسہ لے کر کہا۔ ”ناہید نے اپنی ساری توپوں کا رخ اس کی جانب کر رکھا ہے۔“

”عارف! سن لیا تم نے، ماسٹر جی کیا کہہ رہے ہیں!“ دل شاد بیگم نے بیٹے سے پوچھا۔ ”کیا اب بھی تم اس فریبی عورت کی دامادی میں آنے کے لیے بے قرار ہو؟“
 ”تم لوگ ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے

صورت حال کی تکنی پر غور کرو تو تب ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا ہے۔“ رشید احمد نے منت ریز لہجے میں کہا۔
 ”ابو! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ عارف نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں اور میرا رب جانتا ہے کہ میں نے کوئی چوری نہیں کی، لہذا مجھے یقین ہے کہ میرے اس فرضی جرم کا کسی کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہو سکتا۔ ناہید ہمانی پولیس اسٹیشن جائے یا کورٹ بکھری، مجھے کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔“
 ”اور وہ جو ناہید نے تین مہی والے کسی آستانے کی بات ہے.....؟“ رشید احمد نے سوالیہ نظر سے باری باری سب کو دیکھا۔

”ابو! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ تہینہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں وہ روٹی نہیں کھاؤں گی جس سے خون کی لٹی ہوتی ہے۔“

”تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تہینہ!“ عارف نے..... بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی تین مہی والے آستانے پر نہیں جائے گا۔ ہم اللہ کے ماننے والے ہیں۔ اس کے آخری نبی ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید پر ہمارا پختہ ایمان ہے۔ آستانوں پر کیے جانے والے اس نوعیت کے مکروہ تجربات کا حصہ بننا ہمارے دین کے منافی ہے۔ اگر جمعرات کو ممانی اس مقصد سے یہاں آئے تو اس کے لیے دروازہ کھولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ باہر کھڑے کھڑے ہی اس پر واضح کر دیں کہ اسے ہمارے خلاف جو بھی کرنا ہے، یہ بد شوق کرے۔ ہم کھرے اور سچے ہیں لہذا ہمیں اس کی کسی کارروائی کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”شباباش میرے بچے! تم نے تو میرا کلیجا ٹھنڈا کر دیا ہے۔“ دل شاد بیگم نے سراپنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ کی نا تم نے مردوں والی بات۔ لعنت بھیجوا لیے نامراد لوگوں پر۔ سب کو لو کہ آج سے ناہید اور اس کے گھر سے ہمارا ہر تعلق واسطہ ختم۔ میں کسی بہت اچھی جگہ پر دیکھ بھال کر تمہاری شادی کراؤں گی۔ ناہید نے اپنی اصلیت دکھا دی ہے۔ شامک نے بھی ناہید کا دودھ پیا ہے۔ وہ اپنی ماں سے دس ہاتھ آگے ہی ہو گی۔“

”اللہ نے ہمیں بہت بڑی پریشانی سے بچالیا ہے۔“ رشید احمد نے کہا۔ ”واقعی، تم ٹھیک کہتی ہو دل شاد بیگم۔ عارف کو اب شامک کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے۔“ پھر اس نے عارف کی جانب دیکھتے ہوئے

”حرام زناوے.....رقم کہاں چھپائی ہے؟“

سب انسپکٹر کے اس جملے نے ان کے تمام تر اندازوں پر ہر قسم تصدیق جھٹ کر دی کہ ناہید نے عارف کے خلاف پولیس کو سرگرم کر دیا تھا۔

”میں نہیں جانتا، آپ کس رقم کا ذکر کر رہے ہیں؟“

عارف نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔

”تمہارے پاس وقت ہے۔“ سب انسپکٹر نے

عارف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خوں خوار لہجے میں

کہا۔ ”تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ کچ اگل دو۔ اگر میں

تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے گیا تو وہاں پہنچ کر تمہارا حشر

کردوں گا۔ تم کسی کو بتانے کے قابل بھی نہیں رہو گے کہ

تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔“

”میں کچ کر رہا ہوں۔“ عارف مت ریز لہجے میں.....

”جیسے کسی رقم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں.....“

”مجھے پتا چلا ہے کہ چند روز پہلے تم اپنی فیملی کے ساتھ

ناہید اختر کے گھر دعوت اڑانے گئے تھے۔“ سب انسپکٹر

نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم سب کی آنکھ بچا کر ناہید اختر کے

بیڈ روم میں گئے اور وہاں ان کی الماری میں رکے ایک لاکھ

بیس ہزار روپے چپکے سے اڑا لیے۔ تمہاری اس ہوشیاری کی

کسی کو کانوں کا خبر نہ ہو سکی۔“

”میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے ممانی جان کے

گھر سے کوئی رقم نہیں چرائی۔“ عارف نے برہمی سے کہا۔

رشید احمد نے سب انسپکٹر سے کہا: ”سرا! آپ نے

ہمارے گھر کے سامان کو الٹ پلٹ کر دکھ دیا ہے۔ آپ اس

وقت ہمارے گھر میں موجود ہیں۔ آپ خوب اچھی طرح

تلاشی لے لیں۔ اگر میرے بیٹے نے آپ کی مطلوبہ رقم

کہیں چھپا رکھی ہوگی تو آپ اسے برآمد کرنے میں کامیاب

ہو جائیں گے۔“

رشید احمد کی مدلل تجویز میں وزن تھا۔ ایس آئی کے حکم

پر دونوں کانسٹیبلوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا اور کھدرا کھدرا

جھانک ڈالا لیکن وہ کسی بختری رقم تک رسائی حاصل کرنے

میں کامیاب نہ ہو سکے۔

”سریجی!“ ایک سپاہی نے سب انسپکٹر سے کہا۔

”گلتا ہے، اس بد معاش نے رقم کو گھر سے باہر نہیں نکالنے

لگایا ہے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ ایس آئی عارف کو

گھورتے ہوئے بولا۔ ”اسے ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔

چند روز حوالات میں گزارے گا تو اس کی عقل ٹھکانے

”بیٹا! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”ابو! بچی بات یہ ہے کہ اس وقت جو بھی گندرجی ہوگی

ہے اس کی ذمے دار صرف ناہید ممانی ہی نظر آتی ہیں۔“

عارف نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس گھر کے کسی اور فرد

نے ابھی تک اپنی زبان سے ہمارے خلاف ایک لفظ نہیں

نکالا لہذا سب کو ایک ہی لاشی سے ہانکنا مناسب نہیں ہوگا۔

ہاں، آگے چل کر اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شاملہ بھی اس گم

کا حصہ تھی تو میں آپ لوگوں کی خواہش اور آپ کے حکم سے

ایک انچ بھی اور ادھر حرکت نہیں کروں گا۔“

عارف نے بہت ہی معقول اور سمجھ داری کی بات کی

تھی۔ رشید احمد اور دل شاد بیگم ستائی نظروں سے اسے

دیکھنے لگے۔

☆☆☆

وہ چاروں آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد

ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ آئندہ جمعرات کو

ناہید اختر ان کے دروازے پر پہنچ گئی تاکہ انہیں ایک تجربے

سے گزارنے کے لیے بابا کے آستانے پر لے جائے لیکن

انہوں نے ناہید کے منصوبے پر اوس ڈال دی اور اسے

دروازے پر ہی سے خرخادیا گیا۔

ناہید پاؤں پٹخ کر واپس چلی گئی۔

دو دن امن و سکون سے گزر گئے لیکن تیسرے روز

شام کے وقت ایک ایس آئی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ان کے

دروازے پر پہنچ گیا پھر وہ کوئی سرچ وارنٹ دکھائے بغیر ہی

رشید احمد کے گھر میں گھس گئے۔ افرادِ خانہ پولیس کی ہنگامی

آمد پر حیران و پریشان تھے تاہم ان میں سے کسی ایک کو بھی

اس امر میں شک و شبہ نہیں تھا کہ یہ کارروائی ناہید اختر کے

ایما پر ہو رہی تھی۔ آخری ملاقات میں ناہید نے بڑے

واشگاف الفاظ میں انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر سیدی انگلی سے

کمی نہ نکل سکا تو وہ عارف کے خلاف تھانے میں ایک لاکھ

بیس ہزار روپے کی چوری کی رپورٹ درج کروا دیں گی۔

چھوٹ کے اندر سب انسپکٹر نے اپنے ساتھی دونوں

کانسٹیبلوں کے ساتھ مل کر پورے گھر کا سامان اوپر تلے کر

ڈالا۔ رشید احمد نے اس بے ہودگی پر احتجاج کرنے کی

کوشش کی تو اسے دھکے مارے گئے۔ عارف اپنے باپ

کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر لب کشا ہوا تو سب

انسپکٹر نے ملنے مار مار کر اس کا چہرہ سرخ کر دیا پھر اسے

مرگیاں سے کچتے ہوئے مستفسر ہوا۔

آجائے گی۔“

سب انکپٹر کے اشارے پر کانسٹیبلو نے عارف کو حراست میں لے لیا۔ سب انکپٹر نے دیگر افرادِ خانہ کی جانب دیکھتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

”تم لوگوں میں سے اگر کسی بھی شخص کو رقم کے بارے میں کچھ پتا ہے تو مجھے بتا دو۔ یہ سید حامید حاچوری کا کیس ہے۔ ناہید اختر نے عارف کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے۔“

حقیقت یہی تھی کہ وہ لوگ کسی رقم کی چوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اگر دقتاً ناہید اختر کے گھر میں کوئی چوری بھی ہوئی تھی تو اس میں عارف کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ناہید بیٹھے بٹھائے اچانک ڈھنی پر کیوں اتر آئی تھی!

پولیس والے جب عارف کو گرفتار کر کے گھر سے باہر نکلے تو وہاں آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ رشید احمد اور اس کے گھروالوں کی محلے میں بڑی عزت تھی۔ عارف کی گرفتاری نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عارف نے کوئی جرم کیا ہوگا.....!

☆☆☆

پولیس کے روزنامے کے مطابق، تھانے میں چوری کی رپورٹ اٹھارہ بجے کو درج کرائی گئی تھی۔ اس سے اگلے روز یعنی انیس بجے کی شام عارف کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا تھا جبکہ ناہید اختر کے گھر میں انیلا کے بیٹے کے عقیقے کی تقریب بارہ بجے کو منعقد کی گئی تھی۔

ابتدائی چند جیشیوں میں کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ اس دوران میں ضابطے کی کارروائیاں چلتی رہیں۔ ایسی کارروائیوں میں آپ کی دلچسپی کے لیے کچھ نہیں ہے لہذا میں ان کے ذکر کو گول کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

اس کیس کے طرم اور میرے موکل کو میں نے ضمانت پر رہا کر دیا تھا لیکن ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔ جب کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا تو مجسٹریٹ نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ جس پر طرم نے صحبتِ جرم سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے ناہید اختر سب سے پہلے گواہی کے لیے پیش ہوئی۔ ناہید بچپن سے متوادنی لیکن اس نے تیس کی نظر آنے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ ناہید

نے نارنجی رنگ کی ریشمی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے بال شانوں پر کئے ہوئے تھے اور پاؤں میں پانچ انچ ہیل والی سیڈل جپن رکھی تھی۔ بنیادی طور پر ناہید اختر کا قد قدرے کم تھا۔ مذکورہ سیڈل نے اس کی پست قامتی کو کچھ پایا تھا۔ جب وہ عدالت میں داخل ہوئی تو وہاں موجود ہر شخص اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

ناہید نے بیچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے آگے بڑھا۔ وٹس باکس کے نزدیک پہنچ کر وکیل استغاثہ نے طرم کی سمت انگلی اٹھا کر پہلا سوال کیا۔

”میڈم! کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ ناہید نے نفرت آمیز نظر سے اکیڈڈ باکس میں کھڑے میرے موکل عارف کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”بہت اچھی طرح جانتی ہوں لیکن.....“

وہ بولتے بولتے رکی تو وکیل استغاثہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”میڈم! لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ.....“ وہ ایک معاندانہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرے مرحوم شوہر کا بھانجا ہے مگر اس سے رشتے داری کا اظہار کرتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔ اس بد بخت نے میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔“

”میڈم! استغاثہ کے مطابق، وقوعہ یعنی بارہ بجے کی رات آپ کے گھر سے ایک بھاری رقم مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپے چوری ہو گئے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کو یقین ہے کہ مذکورہ رقم طرم نے چرائی ہے؟“

”جی بالکل۔“ مجھے پکا یقین ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

وکیل استغاثہ نے عیسے انداز میں پوچھا۔ ”اس یقین کا کوئی سبب؟“

”جی ہاں۔“ ناہید نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نامراد کے جرم کا پکا ثبوت ہے میرے پاس۔“

وکیل استغاثہ نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا اور مزید دو چار سرسری سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پریز وٹس باکس کے نزدیک پہنچ گیا پھر اس کیس کی مدنی ناہید اختر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”میڈم! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کے گھر سے ایک بھاری رقم چوری ہو گئی.....“

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”ہرودی جتنا کا شکریہ۔“
 ”میڈم! اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ کے
 دعوے کے مطابق، آپ کے گھر سے مبلغ ایک لاکھ بیس
 ہزار روپے چوری ہوئے ہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے
 اس کی طرف دیکھا۔
 ”آپ بالکل غلطی نہیں کر رہے۔“ وہ منہ ہرے ہوئے
 لہجے میں بولی۔ ”میری اتنی ہی رقم گئی ہے اور جو بھی آپ
 کے سامنے کھڑا ہے۔“ اس نے طرہ کی جانب اشارہ کیا
 اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”اور آپ۔۔۔۔۔ اسی چور کی
 وکالت کر رہے ہیں!“

ناہید کے آخری جملے میں طنز کی وافر مقدار موجود تھی۔
 میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! چور اور شاہد
 کی بحث بعد میں کریں گے۔ آپ اس بات کی فکر میں اپنی
 جان ہلکان نہ کریں کہ میں کس کی وکالت کر رہا ہوں اور کس
 کو روک دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے
 صرف اثبات بتادیں کہ مذکورہ رقم کی حیثیت کیا تھی؟“
 ”حیثیت۔۔۔۔۔!“ اس نے چونک کر میری طرف
 دیکھا۔ ”میں بھی نہیں کہ آپ پوچھنا کیا جا رہے ہیں؟“
 ”میرا مطلب ہے کہ یہ رقم کس کرنسی کی شکل میں
 تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”اوہ اچھا۔۔۔۔۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے
 ہوئے بولی۔ ”اس میں دس ہزار روپے پاکستانی کرنسی میں
 تھے اور باقی کے سعودی ریال تھے جن کی پاکستانی کرنسی میں
 قیمت ایک لاکھ دس ہزار روپے بنتی ہے۔ اس طرح کل ملا کر
 پاکستانی کرنسی کے مطابق، یہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی رقم
 ہو جاتی تھی۔“

”سمجھ گیا۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے
 ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ”کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ گھر میں
 اتنی زیادہ غیر ملکی کرنسی رکھنے کی کیا وجہ تھی؟“

”آپ کے سوال کا جواب دینے میں مجھے کوئی
 مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ پُر اعتماد انداز میں بولی۔ ”بات
 دراصل یہ ہے کہ اس واقعے کے دو ماہ بعد میرا عمرہ کرنے کا
 ارادہ تھا۔ ایک نیک مقصد کے لیے تو دس ہزار ہی کافی
 تھے۔ سعودی ریال میں اپنے ساتھ لے کر سعودی عرب
 جانا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے سونا خرید کر لاسکوں۔ اس رقم
 میں کچھ پیسے میرے اپنے تھے اور کچھ میرے جاننے
 والوں کے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سعودی عرب والا
 گولڈ بہت معیاری ہوتا ہے اگرچہ وہاں پاکستان کی

مارکیٹ کی بہ نسبت سونا قدرے مہنگا ملتا ہے مگر۔۔۔۔۔“ لہجائی
 توقف کر کے اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر اپنی بات
 مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”مگر اب تو یہ سب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ نہ رہا
 بانس، نہ بچہ گی بانسری۔۔۔۔۔“

”میڈم! آپ نے یہ رقم کہاں رکھی ہوئی تھی؟“ میں
 نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے پرس میں۔“ اس نے جواب دیا۔
 میں نے سوال کیا۔ ”اور آپ کا رقم والا پرس گھر کے
 کس حصے میں رکھا تھا؟“

”میرے بیڈروم کی الماری کے اندر۔“ اس نے بتایا۔
 ”میڈم! میں یہ جانتا جا رہا ہوں کہ آپ کے علاوہ یہ
 بات اور کس شخص کے علم میں تھی کہ رقم سے بھرا ہوا پرس آپ
 کے بیڈروم کی الماری میں رکھا ہوا ہے؟“

”مجھے اور میری اولادوں کو۔“
 ”یعنی آپ کے علاوہ رضوان، انیلا اور شائلہ کو اس
 رقم کی الماری میں موجودگی کا علم تھا؟“ میں نے سوالیہ نظر
 سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی۔۔۔۔۔“ آپ بالکل خشک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے
 اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور اپنے داماد اعجاز حسین کے بارے میں آپ کا
 کیا خیال ہے؟“ میں نے تیز نظر سے اسے گھبراہٹ
 ”اعجاز حسین کو اس رقم کی خبر نہیں تھی۔“

”آپ نے مذکورہ رقم والا پرس جس الماری میں رکھ
 چھوڑا تھا کیا وہ لاک تھی؟“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں
 میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔!“ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
 بتایا۔ ”الماری بند تھی مگر اس میں تالائیں لگا ہوا تھا۔“

”گویا چور کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو الماری میں رقم
 کی موجودگی سے واقف تھا۔“ میں نے اسے اپنے جال میں
 پھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ایسا شخص یہ بات بھی
 بہ خوبی جانتا تھا کہ مذکورہ الماری کو لاک نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔؟“

”جی۔ اصولی طور پر تو آپ کی منطق درست نظر آتی
 ہے۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔

”لیکن میرا معاملہ اور اس کیس کا طرہ تو چور کی منطقی
 کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔“ میں نے ناہید آخر کو گھبرانے کا
 عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”طرہ کم کو یہ پتا تھا کہ آپ نے
 اپنی الماری میں رقم سے بھرا ہوا پرس رکھا ہوا ہے، نہ ہی وہ

گیا اور اٹلا کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھا..... میں
داش روم میں گیا تھا..... اس کم بخت کو میرا ہی داش روم
استعمال کرنے کا خیال کیوں آیا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ
بدنیت چوری کی غرض سے میرے کمرے میں گھسا تھا۔“

”اگر چند لمحات کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ
چوری میرے مؤکل ہی نے کی ہوگی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ آخرا اس کو یہ خبر کیسے ہوئی کہ آپ کے بیڈ روم کی الماری
میں ایک پرس کے اندر ایک لاکھ بیس ہزار مالیت کے کرنسی
نوٹ موجود ہیں اور مذکورہ الماری لاک بھی نہیں ہے؟“

میرے اس سوال پر وہ گھڑا کر رہ گئی پھر اچھن زدہ
لہجے میں بولی۔ ”میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ اللہ شکر
خورے کو ضرور شکر دیتا ہے.....!“

”یہ مثال سمجھ میں نہیں آئی میڈم۔“ میں نے بیزاری
سے کہا۔ ”آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ..... اس مردود نے نوٹوں کی
خوشبو سونگھ لی ہوگی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”میں
نے سنا ہے، چوروں کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے.....“

”چوروں کی نہیں، جانوروں کی۔“ میں نے
استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”خاص طور پر کتے اور بلی کی.....“

”یہ منحوس بھی کسی جانور سے کم تو نہیں!“ وہ معاندانہ
نظر سے طرہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ کی بیٹی اٹلا اور اس کے شوہر اعجاز حسین نے
وقعہ کی رات کیا دیکھا اور کیا نہیں دیکھا، یہ میں انہی سے
پوچھ لوں گا۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو سینٹے ہوئے کہا۔

”آپ صرف یہ بتائیں کہ واقعہ کی رات آپ کے گھر میں کل
کتنے افراد موجود تھے؟“

کیس کی باقاعدہ سماعت کافی تاخیر سے شروع ہوئی
تھی۔ مجھے ہوم ورک کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔

اس دوران میں، میں نے عارف اور رشید احمد کی فراہم کردہ
معلومات کی روشنی میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر اور
اپنے عمل کے پرندے اڑا کر مفید اور کارآمد معلومات
حاصل کر لی تھیں جو اس کیس کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے

میری بھرپور مدد کر سکتی تھیں۔

ناہید اختر نے اٹلیوں پر حساب لگاتے ہوئے یوانا شروع
کیا۔ ”میں، رضوان، اٹلا، شامکہ، اعجاز حسین، سندس، فرقان،
رشید احمد، دل شاد بیگم، تبینہ اور یہ چور.....“ اس نے عارف کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کر دی۔ ”کل گیارہ افراد۔“
”لیکن میرا حساب بتاتا ہے کہ اس رات آپ کے

یہ جانتا تھا کہ آپ نے مذکورہ الماری کو لاک نہیں کیا ہوا.....
پھر میرا مؤکل کس طرح سو در الزام ٹھہرتا ہے؟“

”دیکھیں..... بات یہ ہے کہ..... یہ بد بخت کچھ جانتا
تھا..... یا کچھ نہیں جانتا تھا..... مگر میں پورے دوثق سے کہہ
سکتی ہوں کہ..... چوری اسی نے کی ہے.....“ وہ سنبھلتے
ہوئے بولی۔

”ارے ہاں..... آپ کے دوثق سے ایک بات یاد
آئی.....“ میں نے گھسائی منجھائی کا عمل جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک
سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ کے پاس طرہ کے جرم

کا پکا ثبوت موجود ہے۔ آپ نے ایسا کہا تھا.....؟“

”بالکل..... میں نے ایسا کہا تھا۔“ وہ مضبوط لہجے
میں بولی۔

”کیا آپ مجھے اس پکے ثبوت کے بارے میں کچھ
بتانا پسند کریں گی۔“ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے، معزز

عدالت اس محسوس ثبوت کی حقیقت جاننا چاہتی ہے۔“

”اس امر کے دو گواہ موجود ہیں کہ چور عارف کے سوا
اور کوئی ہونہیں سکتا۔“ وہ خاصے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ”نمبر

ایک، اعجاز حسین، نمبر دو، اٹلا۔“

”میڈم عدالت آپ سے وضاحت کا تقاضا کرتی
ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”پلیز.....؟“

”اس رات میرے گھر میں اٹلا کے بیٹے فرقان کے
عقیدے کی تقریب چل رہی تھی۔“ وہ نمبر ے ہوئے لہجے میں

وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اور ہم سب لوگ گھر کی
چھت پر موجود تھے۔ موسم گرما کے سبب میں نے کھانے کا

انتظام اپنے گھر کی چھت پر کر رکھا تھا تاکہ مکمل فضا کا لطف
اٹھایا جاسکے۔ موسم کو خوشگوار بنانے کے لیے میں نے چھت

پر تین چار پیڈل فنن بھی رکھوا دیے تھے.....“ وہ سانس
ہوار کرنے کے لیے ایک لمحے کو تھکی پھر اپنے بیان کو جاری

رکھتے ہوئے بولی۔

”تقریب اپنے عروج پر تھی کہ اعجاز حسین کو کسی کام
سے گھر کے نچلے حصے میں جانا پڑا اور اسی وقت اعجاز حسین

نے چوروں کے انداز میں طرہ کو میرے بیڈ روم کے اندر
داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اعجاز حسین نے اس بات پر کوئی توجہ

نہ دی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد
اٹلا کو نیچے جانے کا اتفاق ہوا تو اس نے طرہ کو میرے بیڈ

روم کے اندر سے باہر نکلتے دیکھا۔ اٹلا پر نگاہ پڑی تو یہ گھبرا

ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میری رقم مٹی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔“

”ضرور۔ آپ کو کچھ نہ کچھ لازمی کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”لیکن اس سلسلے میں آپ نے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے تھے!“

”کون سے تقاضے؟“ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سندس کی عمر تین سال ہے اور فرقان نے تو ابھی

اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے لہذا یہ بات تو طے ہے کہ ان

دلوں میں سے کوئی آپ کی رقم نہیں چراسکتا تھا۔“ میں نے

اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان دونوں کو

وہاں موجود افراد کی فہرست سے خارج کر دیا جائے تو باقی

دس افراد بچیں گے۔ اصولی طور پر تو ان سب سے قسم اٹھوائی

جانا چاہیے مگر لیکن آپ نے اثیلا، شامہ، رضوان،

اعجاز حسین اور کنڈا ماسٹر کو خاص رعایت دی اور..... باقی

ایک ہی خاندان کے چار افراد کے سروں پر قرآن رکھ دیا

کیا۔ یہ سراسر ان انصافی نہیں ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ پوری ڈھٹائی سے بولی۔ ”شامہ،

اثیلا اور رضوان میری اولاد میں ہیں اور میں اعجاز حسین کی

فطرت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ ان میں سے کوئی

چوری نہیں کر سکتا۔“

”یعنی آجاکرتان ماسٹر کی فیملی پر ہی ٹوٹی ہے.....؟“

”جی بالکل۔ حساب میں یہی آیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”جب آپ نے ان لوگوں سے قرآن اٹھوایا تھا تو

پھر یہ معاملہ گویا آپ نے قرآن کے سپرد کر دیا تھا۔“ میں

نے نامید آخر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے

بعد مزید کسی حیل و حجت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

اب جو بھی فیصلہ کرنا تھا وہ قرآن مجید نے کرنا تھا مگر چند روز

کے بعد آپ نئی اسکیم کے ساتھ ماسٹر جی کے گھر پہنچ گئیں.....

وہ روٹی کے ٹوالے اور خون کی اٹی والی اسکیم.....؟“

”یہ میری اسکیم نہیں تھی۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”تین ہٹی والے بابا نے یہ مشورہ دیا تھا۔“

”یعنی وہی سیانا جس نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ

چوری ماسٹر جی کی فیملی میں سے کسی نے کی ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”اور اسے شک تھا کہ یہ تمام کام اس کیس کے ظرم اور

میرے ٹوکل عارف کا ہے؟“

”جی..... میں اسی سیانے کی بات کر رہی ہوں۔“

”میزم! کیا آپ مجھے اس سیانے کا نام بتانا پسند

کریں گی؟“ میں نے پوچھا۔

گھر میں نکل بارہ افراد موجود تھے!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”تو پھر آپ اپنے حساب کے مطابق، بارہویں

بندے کا نام بتادیں؟“ وہ حقارت بھرے انداز میں بولی۔

میں نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”شاہر علی عرف کنڈا ماسٹر.....“

”اوہ..... آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ گہری

سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”شاہر علی الیکٹرک کا کام

کرتا ہے۔ وہ ہمارا محلے دار ہے۔ مجھے گھر کی چھت پر

پینڈل شین وغیرہ کے لیے تار اور سوچ کی سینگ کرانا بھی

اس لیے میں نے شاہر کو بلا لیا تھا۔ وہ اپنا کام کر کے تھوڑی

ہی دیر میں واپس چلا گیا تھا۔“

”کیا آپ نے شاہر سے کوئی فنکارانہ کام بھی کر دیا

تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ہلکے سچکاٹے ہوئے بولی۔ ”میں سمجھی نہیں.....!“

”شاہر علی، ”کنڈا ماسٹر“ کے نام سے مشہور ہے۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ

نے اس کی خدمات سے استفادہ کیا تھا یا نہیں؟“

”بالکل نہیں!“ وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ”ہم بجلی

چور نہیں ہیں۔ شاہر نے چھت پر پنکھوں کے لیے جو تار

وغیرہ کا بندوبست کیا تھا اس کا کنکشن ہمارے میٹر ہی سے لیا

کیا تھا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے سرسری انداز

میں کہا۔

وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے تنکے لگی۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی

کہ میں نے اس کی تعریف کی ہے یا اس پر طنز کیا ہے۔ میں

نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”چوری کے اگلے روز یعنی تیرہ مئی کو آپ نے رشید

احمد، دل شاد بیگم، تبینہ اور عارف سے قرآن اٹھوایا تھا

کیونکہ آپ کو شک تھا کہ آپ کی رقم انہی میں سے کسی نے

چرائی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن

ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ایسا کیا تھا۔“

”اور ایسا آپ نے اس لیے کیا تھا کہ کسی سیانے نے

حساب لگا کر آپ کو بتایا تھا کہ آپ کی رقم چرانے میں انہی

لوگوں کا ہاتھ ہے..... ہیں نا؟“

”جی بالکل..... میں نے ایک پتہ ہوئے اللہ کے

بندے سے حساب لگوا لیا تھا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن

وسیلہ استغاثہ تھا پھر اگر اس سے سوالات کرتا رہا کیونکہ استغاثہ کے ریکارڈ کے مطابق اعجاز حسین نے وقوعہ کے روز ملزم عارف کو چوروں کے انداز میں ناہید اختر کے بیڈ روم میں جاتے دیکھا تھا۔ میرے نزدیک اعجاز حسین یا اس کی گواہی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی کیونکہ یہ بات مجھے اپنے موکل کی زبانی معلوم ہو چکی تھی کہ وہ وقوعہ کی رات واقعتاً اپنی ممانی جان کے بیڈ روم میں گیا تھا اور اس آمد و جہاد کا مقصد وہاں سے رقم چراتا نہیں بلکہ واش روم استعمال کرنا تھا۔ ان لمحات میں گھر کا کامن واش روم کسی کے استعمال میں تھا لہذا وہ اپنی حاجت رفع کرنے کے لیے ممانی جان کے بیڈ روم میں جا گسٹا تھا۔

ایک دوسری سوالات کے بعد میں نے اعجاز حسین کو فارغ کر دیا۔ اس کے بعد اعجاز حسین کی بیوی انیلا گواہی دینے کے لیے وٹس باکس میں پہنچ گئی۔ وسیلہ استغاثہ نے جرح مکمل کی تو میں انیلا والے کٹھنرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ ”آپ کو میری جانب سے بہت بہت مبارک ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بیٹے کو جنم دے کر اپنی فیملی کو مکمل کر لیا ہے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔“

اس نے مختصر جواب دیا۔ ”جی، خیر مبارک!“ ”فرقان کیسا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”جی اللہ کا شکر ہے۔“ ”اللہ اسے سدا سلامت رکھے۔“ میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

”جی..... آپ کا شکریہ۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”انیلا جی! اس کیس میں آپ کی گواہی بہت اہمیت کی حامل ہے۔“ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ استغاثہ کے مطابق، آپ نے ملزم کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے دیکھا تھا؟“

انیلا کی عمر کا اندازہ میں نے اٹائیس اور تیس کے بیچ لگا دیا۔ وہ ناہید اختر کی بڑی بیٹی تھی تاہم وہ رضوان سے کم و بیش دو سال چھوٹی تھی۔ انیلا درمیانے قد کی مالک ایک فریہ اندام اور گوری چٹنی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر مصمومیت پائی جاتی تھی۔ وہ میرے سوال کے چکر میں آ گئی۔

”جی بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”انیلا جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس بات کا کب انکشاف ہوا کہ آپ کی والدہ کے گھر سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے چوری ہو گئے ہیں؟“

”میں ان کا نام نہیں جانتی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”وہ شاہ جی کے نام سے مشہور ہیں۔“ ”آپ ان شاہ جی کو کب سے جانتی ہیں؟“ میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے پوچھا۔“ اس کم عرصے میں شاہ جی سے آپ کی کتنی ملاقاتیں ہو چکی ہیں؟“ ”آں..... ایک..... بھی نہیں.....“ وہ گڑ بڑائی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ ”جب آپ کی بھی شاہ جی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پھر کیا آپ نے ان سے خواب میں حساب لگوا لیا تھا؟“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ.....“ وہ خاصی نزوس ہو گئی تھی۔ ”انیلا حساب لگوانے کے لیے شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی۔“ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ مجسٹریٹ نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر نکلے تو ماسٹر رشید احمد بہت خوش تھا۔ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”وسیلہ صاحب! آپ کی جرح کا انداز مجھے بہت اچھا لگا ہے۔“ ”آپ نے تو کمال کر دیا جناب!“ عارف کی آواز سے بھی طمانیت بھگتی تھی۔

”یہ تو ابھی ابتدا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آگے آگے دیکھتے جاؤ، کون کون سے کمال، جمال اور وصال ہوتے ہیں۔“ وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے چند سوالات اس کیس کے تفتیشی افسر سے کر لیے کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

تفتیشی افسر سے میں نے جائے وقوعہ اور ملزم کے فکر پرش کے حوالے سے سوالات کیے تھے لیکن وہ کوئی نئی بات جواب نہ دے سکا کیونکہ جب پولیس کو اس معاملے میں کھینٹا گیا تو وقوعہ کو گزرے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انیلا کے شوہر اعجاز حسین کی گواہی ہوئی۔

”میں ان دنوں فرقان کی ڈیلیوری کے باعث امی کے گھر میں رکی ہوئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ میرے بیٹے کے عقیقے کی تقریب تھی۔ ہم اس فنکشن سے لگ بھگ آدھی رات کو فارغ ہوئے تھے۔ تھکاوٹ اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ ہم لوگ جلدی سو گئے۔ اگلے روز صبح جب امی نے اپنے پرس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ رقم غائب ہے۔“

”اوہ..... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات کو رقم کی چوری کسی کے علم میں نہیں آئی تھی؟“ میں نے اپنے مخصوص انداز میں قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”جی..... میرا بھی مطلب ہے۔“ وہ سرکوا ثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

”حالانکہ یہ سنسنی خیز انکشاف رات ہی کو ہو جانا چاہیے تھا جب سارے مہمان گھر میں موجود تھے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے، آپ نے اس معاملے میں خاصی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے!“

”میں نے کون سی غفلت کی ہے؟“ وہ بھونچکا نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا کام جاری رکھا اور کہا۔ ”اگر آپ نے غفلت نہ کی ہوتی تو رقم کو بازیا ب کرنا نہایت ہی آسان تھا۔ اسی لئے تمام گھر والوں اور تمام مہمانوں کی تلاشی لے لی جاتی۔ جو بھی چور ہوتا اس کے پاس سے رقم برآمد ہو جاتی۔“

”پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ ”جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی بے سرو پا باتوں سے استغاثہ کی معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس عمل سے روکا جائے۔“

”یوراز! میں بالکل درست سمت میں جرح کر رہا ہوں۔“ میں نے براہ اعتماد انداز میں کہا۔ ”اگر وکیل سرکار تھوڑا جھل سے کام لیں تو میں معزز عدالت کے سامنے ابھی یہ ثابت کر دوں گا کہ میرے ان سوالات کا سر بھی ہے اور پاؤں بھی۔“

میں نے یہ بات ایسے ٹھوس انداز میں کہی تھی کہ مجسٹریٹ نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کر دے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

”بیک صاحب! پلیز پروسیڈ۔“

میں شیر ہو گیا۔ ”انٹرایٹی؟“ میں نے تیز نظر سے

استغاثہ کی گواہ کو گھورتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ ”معزز عدالت یہ جاننے کے لیے بات تاب ہے کہ آپ نے وقوعہ کے روز مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیوں کیا؟ اگر آپ اس چوری کے بارے میں رات ہی کو زبان کھول دیتیں تو چور اس بھڑکی رقم کو گھر سے باہر نہیں لے کر جاسکتا تھا۔“

”مجھے تو خود اگلی صبح پتا چلا تھا کہ امی کے پرس سے رقم چوری ہو گئی ہے۔“ وہ قدرے روہانسی ہو گئی۔ ”میں رات کو اس چوری کا اعلان کیسے کر سکتی تھی.....؟“

”انٹرایٹی! آپ بڑی عجیب بات کر رہی ہیں!“ میں نے اسے گھورا۔

”کیوں..... اس میں ایسا کیا عجیب ہے؟“ وہ حیرت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”عجیب یہ ہے کہ.....“ میں نے اس کے کالوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کے دعوے کے مطابق، وقوعہ کی رات آپ نے طرم کو اپنی امی کے بیڈروم سے نکلنے دیکھا تھا۔ ان لحاظ میں وہ بری طرح گھبرا یا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے سوال کے جواب میں بھری عدالت میں بتایا ہے کہ آپ نے طرم کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے دیکھا تھا۔ اس تناظر میں تو آپ چوری کی واردات کی عینی شاہد یعنی آئی وینس ہو جاتی ہیں اور..... اب آپ فرما رہی ہیں کہ آپ کو بھی اگلی صبح ہی پتا چلا تھا کہ گھر میں چوری ہو چکی ہے۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟“

”میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو بھی امی کے پرس سے رقم چراتے نہیں دیکھا۔“ وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

میں اسے زچ ہی کرنا چاہتا تھا سو، میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے سمجھانے کا موقع نہیں دیا اور کاٹ داراً واز میں پوچھا۔

”تو پھر آپ نے وقوعہ کی رات کیا دیکھا تھا؟“

”میں نے عارف کو امی کے کمرے سے نکلنے دیکھا تھا..... بس!“ وہ سٹپٹا ہوا لہجے میں بولی۔

”بس.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بس..... وہ خاصا گھبرا یا ہوا بھی تھا۔“ وہ بولی۔

”اس کے چہرے پر کس نوعیت کی گھبراہٹ تھی؟“

”وہ پیسے سے شرابور تھا۔“ اس نے بتایا۔

”طرم کے چہرے پر پینا دکھ کر آپ نے فحشی صادر کر دیا کہ وہ بہت گھبرا یا ہوا تھا۔“ میں نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”وہ آپ کا ہونے والا بہنوئی تھا۔ آپ کا فرض بنا

تھا کہ اس کی گھبراہٹ کا سبب جاننے کی کوشش کرتیں۔“

”اس وقت میرے ذہن میں ایسی بات نہیں آئی تھی۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ انسانی ذہن بعض اوقات ایسی کوتاہی کر جاتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ زیادہ فیشن نہ لیں اور مجھے بتائیں کہ کیا آپ کی امی کا کمر انرکنڈیشن ہے؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”امی کے گھر کے کسی بھی حصے میں کوئی انرکنڈیشنز نہیں لگا ہوا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ہم لوگ حقیقی کے قریب کا انتظام صحت پر کیوں کرتے.....!“

”یہ آپ نے سچے کی بات بتائی ہے۔“ میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ میرے تبصرے پر کچھ نہیں بولی۔

”ایٹلا جی واقعہ مئی کے مہینے میں ہوا تھا۔“ میں نے استفسار کی گواہ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور اس رات تو بڑی شدید گرمی بھی تھی۔ ایسے موسم میں اگر کسی کو دس پندرہ منٹ کسی ٹان انرکنڈیشنڈ واش روم میں بیٹھنا پڑ جائے تو آپ کے خیال میں اسے پینا نہیں آئے گا؟“

”کوئی ایسا ویسا پینا.....“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”میں تو سمجھتی ہوں وہ بندہ پیسنے میں نہا ہی جائے گا لیکن..... آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“

”وہ اس لیے کہ جب آپ نے طزم کو اپنی امی کے بیڈ روم سے پیسنے میں شراہور نکلنے دیکھا تو وہ اپنی انتہائی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ کی امی کے واش روم میں دس پندرہ منٹ گزار کر آیا تھا اسی سبب وہ آپ کو گھبرایا ہوا بھی دکھائی دیا اور پیسنے میں شراہور بھی نظر آیا۔ گھر کا کاسن واش روم اس وقت کسی اور کے زیر استعمال تھا لہذا طزم کو مجبوراً آپ کی امی کے بیڈ روم کا رخ کرنا پڑا تھا۔“

”جی..... ایسا ہو سکتا ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”ایسا تو ہو سکتا ہے اور ویسا بھی ہو سکتا ہے ایٹلا جی۔“ میں نے بھی سادے سے لہجے میں کہا۔

”کیسا؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”جیسا آپ کی امی نے کیا ہے.....!“

”میری امی نے کیا کیا ہے؟“ اس کی حیرت میں پریشانی بھی شامل ہو گئی۔

”ناہید اختر نے سارا ملبا آپ پر ڈال دیا ہے۔“ میں

نے کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں.....؟“

”آپ کو وہ تین مٹی والے شاہ جی یاد ہیں نا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جنہوں نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ چوری رشید احمد کی نیکی میں سے کسی نے کی ہے اور ان کا ٹھک طزم کی جانب تھا؟“

”جی..... مجھے یاد ہے۔“ وہ جلدی سے سرکواٹھات

میں ہلاتے بولی۔

”آپ کی امی نے ان شاہ جی سے اعلانِ لالہ لعلی

کر دیا ہے۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”کک..... کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ وہ

گھبرا گئی۔

”آپ کی امی فرماتی ہیں کہ وہ تو شاہ جی کو جانتی ہیں

اور نہ ہی سمجھی ان سے ملی ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”آپ کی امی نے معزز عدالت کے سامنے بتایا

ہے کہ چوری کا حساب لگوانے کے لیے آپ شاہ جی کے

پاس مئی تھیں؟“

”امی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔“ ایٹلا نے کہا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ان شاہ جی کو اچھی

طرح جانتی ہیں؟“ میں نے نٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ بولی۔ ”اچھی طرح تو نہیں۔ بس جانتی ہوں۔“

”اس جان کاری کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“

”کم ہی بتا دیں.....؟“

”بھئی کوئی پانچ چھ ماہ۔“ اس نے بتایا۔

”ان پانچ چھ ماہ میں آپ شاہ جی سے کتنی بار ملی

ہیں؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”صرف دو بار۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہلی بار شاہ جی سے آپ کی ملاقات کب اور کس

سلسلے میں ہوئی؟“

”جب امی کے گھر میں چوری ہوئی تو میں حساب

لگوانے شاہ جی کے پاس مئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”شاہ جی

نے بتایا تھا کہ چوری مہمانوں میں سے کسی نے کی ہے اور

ان کا زور طزم پر تھا لیکن جب ان لوگوں نے چوری کا اقرار

نہیں کیا اور جموٹی قسم اٹھائی تو مجھے دوبارہ شاہ جی کے پاس

جاننا پڑا تھا۔ جب انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں کوری

والی نیکی کو ان کے آستانے پر لے جاؤں تو وہ اپنے آستانے

پر بیٹھ کر روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھا کر ثابت کر دیں گے کہ

چور کون ہے۔ جس نے امی کی رقم چرائی ہوگی وہ نوالہ حلق سے اترے ہی خون کی الٹی کروے گا۔“

”اور آپ سمجھتی ہیں کہ شاہ جی نے چور پکڑنے کا جو طریقہ بتایا اس میں صداقت ہے؟“ میں نے اس کی اندھی رائے کو عدالت کے ریکارڈ پر لانے کی کوشش کی۔ ”اگر شاہ جی کی اسکیم پر عمل کیا جاتا تو چور واقعی خون کی الٹی کرویتا؟“

”جی بالکل..... اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔“ وہ بڑے احماد سے بولی۔

”تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ شاہ جی خون کی الٹی والے اس عمل میں اللہ کے کلام کا سہارا لیتے ہیں؟“

”جی وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں.....!“ وہ جاہلانہ انداز میں بولی۔

”لیکن آپ لوگ تو اللہ کے کلام پر یقین ہی نہیں رکھتے؟“ میں نے زہر پلے لہجے میں کاری دار کیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ ”یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اس پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ لوگوں کو اللہ کے کلام پر یقین ہوتا تو ماسٹر جی اور ان کی فیملی سے قرآن اشوائے کے بعد آپ چپ ہو کر بیٹھ جاتے اور کلام پاک کے فیصلے کا انتظار کرتے لیکن آپ لوگوں نے کیا کیا..... لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”چند روز کے بعد آپ کی امی جان خون والی الٹی اسکیم کے ساتھ ماسٹر جی کے پاس پہنچ گئیں لیکن جب ان لوگوں نے ایسے کسی مکروہ تجربے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تو تب آپ کی والدہ نے انتقامیہ سیرے منوکل کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔“

”امی کا بھاری نقصان ہوا ہے۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ”وہ اپنے مال کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی تو کریں گی نا.....!“

”چارہ جوئی کرنے سے کس نے روکا ہے؟“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ ساری وضاحت کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ اس نوعیت کے معاملات میں اللہ کے کلام کو بھی سچ میں نہیں لانا چاہیے اور..... اگر یہ تاگزیر ہو جائے..... اس کے سوا سب سے کڑی اور کوئی حل نظر نہ آ رہا ہو تو پھر اللہ کے کلام کی تاثیر کو دل و جان سے مانتے ہوئے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے مگر آپ کو تو حساب لگانے والے شاہ جی پر بھروسہ ہے۔ اس

کی بات ماننے کو آپ زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔“

میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولی۔ بس خجالت بھری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے اپنی جرح کو سیٹھتے ہوئے کہا۔

”انٹلا جی! آپ نے بتایا ہے حساب لگانے والے شاہ جی سے آپ کی صرف دو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ان دو ملاقاتوں میں آپ اور آپ کے گھر والے شاہ جی کے کشف و کرامات پر ایمان لے آئے ہیں۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ یہ حساب کتاب والے شاہ جی کس کے حساب میں آئے تھے..... میرا مطلب ہے، آپ کو شاہ جی کے بارے میں کب اور کس نے بتایا تھا۔ یہ نابندہ روزگار کس کی دریافت ہے؟“

”شاہ جی کے بارے میں مجھے شاکر علی سے پتا چلا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

”شاکر علی..... اچھا وہ کنڈا ماسٹر؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی جی..... میں شاکر بھائی ہی کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”شاکر بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔ لوگوں نے ایسے ہی ان کے نام کے ساتھ ”کنڈا ماسٹر“ لگا کر انہیں بدنام کر رکھا ہے۔“

”تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ شاکر علی بھلی چور نہیں ہے؟“ میں نے ٹوٹنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ مجھ بھلی کے تاروں پر کنڈا نہیں ڈالتا.....؟“

”میں مانتی ہوں کہ شاکر بھائی یہ کام کرتے ہیں لیکن اس حوالے سے ان کا مقصد نیک ہوتا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ صرف مجبور اور لاچار لوگوں کے ہی کام آتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ہمارے محلے میں ایک یوزمی بیوہ خاتون رہتی ہیں۔ ان کا استعمال ایک پتھکا اور ایک ٹیوب لائٹ سے زیادہ نہیں ہے لیکن الیکٹرک کمپنی والے ان کا بل ہمارے بل کے برابر بھیجتے ہیں جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ اگر شاکر بھائی نے ان یوزمی خاتون کو کنڈا لگا دیا تو اس میں کیا برائی ہے!“

انٹلا کی باتوں سے تو واضح ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دل میں شاکر علی کے لیے گہری ہمدردی رکھتی تھی اسی لیے وہ اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”جی بالکل.....“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”شاہر بھائی اس قائل ہیں کہ ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ میرے اس عمل پر آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے ایٹلا کے سوال کے جواب میں زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر روئے سخن مجسٹریٹ کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”یور آئر! یہ کیس دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ میرے ٹوکھل اور اس کیس کے ملزم عارف کے خلاف استغاثہ کی جانب سے ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہو کہ چوری اسی نے کی ہے۔“

”علاوہ ازیں پولیس کی دو ہفتے کی کڑی تفتیش کے باوجود بھی مال مسروقہ یعنی ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی رقم ملزم کے پیاس سے برآمد نہیں ہوئی اور نہ ہی کہیں اور سے بازیاب کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے ٹوکھل کو ایک گہری سازش کے تحت چوری کے اس مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ استغاثہ اور اس کیس کی مدعی ناہید اختر کے پاس میرے ٹوکھل کو ملزم گردانے کے لیے صرف ایک پوائنٹ ہے اور وہ پوائنٹ ہے، شاہر جی..... شاہر جی جو کوئی بہت ہی پچھتا ہوا اور سیانہ بندہ ہے۔ اس کے حساب کتاب میں آیا ہے کہ مدعی کے گھر میں میرے ٹوکھل نے چوری کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اتنے اہم شخص کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ نیز اس فہرست میں اس صلاح کار کا نام بھی شامل نہیں جس کے مشورے پر ایٹلا تین ہٹی والے آستانے پر گئی تھی لہذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ آئندہ پیشی پر ان دونوں افراد کو عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کرے تاکہ.....“ لگاتی توقف کر کے میں نے ٹھیکسی نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور ڈرامائی انداز میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”..... تاکہ میں بھی اپنے بعض مقدمات کے سلسلے میں شاہر جی کی روحانی قوتوں سے فیض یاب ہو سکوں اور..... میں نے کنڈا ماسٹر سے بھی چند مفید مشورے لیتا ہوں..... دیش آل یور آئر۔“

مجسٹریٹ نے متعلقہ عدالتی عملے اور تفتیشی افسر کو ہدایات جاری کیں کہ اگلی پیشی پر شاہر جی اور شاہر علی کو بہ طور گواہ استغاثہ عدالت میں پیش کیا جائے۔ اس کے بعد عدالت درخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ ازا یڈ جارنڈ.....!“

”اگر آپ کے بیان کردہ نیکی و برائی کے فلسفے کو درست مان لیا جائے تو پھر رابن ہڈ، سلطانہ ڈاکو اور ملنگی بھی لہائیت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ یہ تینوں اور انہی کے قبیل کے دیگر معروف کردار بھی امیروں کو لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرتے تھے.....“

”جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ”وکیل صفائی غیر متعلق اور فردی باتوں کو زیر بحث لا کر عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

”بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو زیر سماعت کیس تک محدود رکھتے ہوئے اپنی جرح کو آگے بڑھائیں۔“ مجسٹریٹ نے میری جانب دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

”یس سر.....!“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا اور استغاثہ کی گواہ ایٹلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”ایٹلا جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ صرف دو مرتبہ تین ہٹی والے پہنچے ہوئے شاہر جی سے ملی ہیں۔ اس سے پہلے آپ اس سیانے کو جانتی تک نہیں تھیں اور شاہر جی سے رجوع کرنے کا مشورہ آپ کو شاہر علی کنڈا ماسٹر نے دیا تھا.....“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر استفسار کیا۔

”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟“

”نہیں۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔“ وہ دیر سے بولی۔

”شاہر جی سے ملاقات کرنے آپ اکیلی گئی تھیں؟“

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں..... اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے سوال کیا۔ ”کیا آپ کا شوہر اعجاز حسین آپ کے ساتھ گیا تھا؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“

”پھر.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔ ”آپ کس کے ساتھ دو مرتبہ شاہر جی سے ملاقات کرنے گئی تھیں؟“

”شاہر بھائی کے ساتھ۔“ اس نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

”آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شاہر علی اور اس کے مشوروں پر بہت بھروسہ کرتی ہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اس وقت عدالت میں بھی خلق خدا موجود ہے جنہیں آپ کے علم کے استعمال کی ضرورت ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ کو میری درخواست پر یہاں بلایا گیا ہے۔ امید ہے، آپ ضرور ہم سب کی مشکل آسان فرمائیں گے۔“

”ضرور..... ضرور..... کیوں نہیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولا۔

اس نے میرے پھیلے ہوئے ہم رنگ زمیں جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے غیر محسوس انداز میں جال کو دیر سے دیر سے کھینچنا شروع کر دیا۔

”شاہجی! کچھ عرصے پہلے آپ کی ایک عقیدت مند خاتون انٹلانے آپ کے آستانے پر آکر کچھ حساب لگوا رہی تھی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انٹلانے کے گھر سے ایک موٹی رقم چوری ہو گئی تھی اور آپ نے اپنے علم کے زور پر حساب لگا کر چوری کی نشاندہی کر دی تھی۔ آپ کا بتایا ہوا اور اس کیس کا طرم عارف اس وقت آپ کی نظر کے سامنے آئی کہ زڈ باکس میں کھڑا ہے۔“ بات کے اختتام پر میں نے اپنے منہ کی سمت اشارہ بھی کر دیا۔

شاہجی نے ناپسندیدہ نگاہ سے عارف کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”وکیل صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے یہ حساب لگایا تھا۔“

”حضرت! میں جانتا چاہوں گا کہ آپ کے حساب لگانے کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟“ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے..... کوئی مراقبہ یا پھر استعارہ.....؟“

”میں کئی ایک علوم کا ماہر ہوں۔“ وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہ علم جفر، علم رمل، مراقبہ، استعارہ، علم ارواح وغیرہ وغیرہ.....“

”ماشا اللہ!“ میں نے سناٹے انداز میں کہا۔ ”اللہ کرے زور علم اور زیادہ لیکن قبلہ..... اس وقت معزز عدالت صرف اس علم کے بارے میں جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے جس کی مدد سے آپ نے سزا انٹلانے کے گھر میں ہونے والی رقم کی چوری کا حساب لگایا تھا۔!“

”اس حساب کا تعلق علم قیافہ سے ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”نیز اس سلسلے میں علم جفر سے بھی میں نے مدد لی تھی۔“

”بہت خوب.....“ میں نے اوزار گھسا کی منجھائی اٹھالے اور اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ”کیا علم قیافہ اور علم جفر سے استفادہ کرنے کے لیے کوئی وقت مخصوص

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں پہنچا ہوا سیانا شاہ جی کھڑا تھا۔ شاہجی کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے بیچ لگایا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا شلوار کرت زین تن کر رکھا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ مرغن غذاؤں نے اس کے بدن خصوصاً گردن کے عقبی حصے پر چربی کی تھیں چڑھا رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھاری موچیں اور ہلکی سی ڈاڑھی بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے سر کے بال کندھوں تک بڑھا رکھے تھے جن میں کوئی چمک دار تیل بھی ڈالا ہوا تھا بلکہ تیل کی مقدار کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے سر کے بالوں کو تیل میں ڈال رکھا تھا۔ شاہجی کی آنکھوں میں ایک مخصوص نوعیت کی سرفی دکھائی دیتی تھی جو عموماً رت جکے کے باعث پیدا ہو جاتی ہے یا پھر..... جس کا نشر کرنے کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے!

اپنی باری پر میں شاہجی والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا اور نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ”شاہجی! آپ کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اللہ کا رحم ہے۔“ اس نے کراری آواز میں جواب دیا۔ ”شاہجی! اس وقت میری شدید خواہش ہے کہ آپ کی دست بوسی کروں۔“ میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن عدالت اجازت نہیں دیتی کہ میں اپنی تمنا پوری کر سکوں لہذا میری معذرت قبول فرمائیے۔“

اس نے چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو..... کہ کہیں میں اسے باتس پر تو نہیں چڑھا رہا۔

”وکیل صاحب! آپ کبھی میرے آستانے پر تشریف لائیں۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”آپ کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔“

”زبے نصیب..... میں بہت جلد حاضری دوں گا۔“

میں نے احرام میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے کمالات کے بارے میں سن کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ بہت پیچھے ہوئے ہیں۔ کشف و کرامات آپ کی جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ آپ حساب کتاب کے ماہر ہیں۔ آپ اپنی باطنی آنکھ سے میٹروں اور ہزاروں میل دور کے مناظر کو بھی واضح طور پر دیکھ لیتے ہیں۔“

وہ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی رعوت سے بولا۔ ”بس جناب، مخلوق خدا کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“

فراری نظر سے کبھی مجھے اور کبھی مجسٹریٹ کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن اب میں اسے کسی بھی قسم کا سیف فٹنج دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے کسی ماہر کلاڈی کے انداز میں تاش کی گڈی کو چھینا پھر اس میں سے تین پتے نکال کر باقی گڈی شاہ جی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”قبلہ! آپ ان پتوں پر اپنے تمام علوم کی بارش فرمادیں، پاتال میں جھانکنے والی اپنی باطنی آنکھ کو زحمت دیں اور مجھے بتائیں کہ میں نے کون سے تین پتے نکالے ہیں؟“

چند لمحات کے لیے وہ گڑبڑایا لیکن بندہ کانیاں تھا چنانچہ فوراً ہی سنبھل گیا اور شاہ جی کے انداز میں بولا۔ ”میں سارا حساب نوری علم سے لگاتا ہوں اور یہ تاش شیطانی مکمل ہے۔ میں اسے اتھ نہیں لگاؤں گا۔ دین میں پتے کھیلنے اور پانسہ پھینکنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں حرام قرآنی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ہم حلال چیزوں کی بات کرتے ہیں۔“ میں نے تاش کی گڈی کو دواہیں اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جو کوٹ پتلون پہن رکھا ہے اس میں کل آٹھ جیمیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جیب میں میرا بیوہ..... اوہ، ایک بات تو میں پوچھنا ہی بھول گیا.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”شاہ جی! آپ لیدر کو کبھی حرام تو نہیں سمجھتے؟ کیا دین میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں کا نام لینے کی ممانعت تو نہیں ہے؟“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

اس روز میں اس پہنچے ہوئے فراڈی شخص کو بری طرح ذلیل کرنے کا بندوبست کر کے عدالت پہنچا تھا۔ میں نے رشید احمد کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ جہنمہ اور دل شاد بیگم کو کبھی ساتھ لے کر آئے۔ عارف تو آل ریڈی اکیڈمی کے باکس میں موجود تھا۔ دوسری جانب سے ناہید اختر، رضوان اور انیلا عدالت آئے تھے۔ شاملہ گھر پر رکی ہوئی تھی۔ بہ قول کسے، اس وقت عدالت کا کمر اکھاچ بھرا ہوا تھا۔

”شکر ہے.....“ میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے شاہ جی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ ان آٹھ جیموں میں سے کسی ایک میں، میں نے اپنا چمڑے کا بیوہ رکھا ہوا ہے۔ آپ معزز عدالت

ہوتا ہے یا یہ حساب کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے؟“ وہ ”وقت کے محتاج اناڈی عامل ہوتے ہیں۔“ وہ ٹھہرانہ انداز میں بولا۔ ”ماہر فن کسی بھی وقت اور کہیں بھی اپنے علم کو استعمال کر کے سو فیصد نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔“ ”اور ماشاء اللہ! آپ ماہر فن ہیں!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”اس میں کیا شک ہے۔“ ”علم جعفر، علم ریل، عمل قیادہ اور اسی نوعیت کے جتنے بھی علم صدیوں سے رائج ہیں، میں ان کی حقیقت اور اہمیت پر یقین رکھتا ہوں لیکن میں نے اس دوران میں اس جینچے ہوئے سیانے کے بائے میں اچھی خاصی ریسرچ کر لی تھی اور میں یہ بات جانتا تھا کہ شاہ جی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ڈھونگی عامل تھا جو سادہ لوح لوگوں کو الو بنا کر اپنا مال سدا کرتا تھا۔ یہ بطور درج کرنے کا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر میں جرح کے دوران میں شاہ جی کی شان میں کوئی گھوٹی بڑی گستاخی کر دوں تو ان علوم کے سچے اور کھرے ماہرین کو برا نہیں منانا چاہیے۔ انسان نما حیوانوں اور معاشرتی ناسوروں کو بے نقاب کرنا عین عبادت ہے..... اس عبادت میں سستی کرنا ٹھیک نہیں!“

”حضرت! آپ نے جس بھی علم کی مدد سے انیلا صاحبہ کو یہ بتایا تھا کہ ان کے گھر میں چوری کورنگی سے آنے والی نیپلی نے کی ہے، خصوصاً آپ کا اشارہ اس کیس کے ظلم عارف کی جانب تھا۔“ میں نے جرح کو خطرناک موڈ کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”معزز عدالت آپ کے اسی علم کا عملی مظاہرہ دیکھنے کی مشتاق ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں.....“ وہ بد کے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں..... سمجھتا ہوں۔“ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے تاش کی گڈی برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس گڈی میں سے کوئی بھی تین پتے نکال رہا ہوں۔ آپ اپنے علم کے زور پر حساب لگا کر بتائیں گے کہ میں نے باون پتوں میں سے کون سے تین پتے نکالے ہیں؟“

میں نے جس تفریحی میل کا آغاز کیا تھا اسے حاضریں عدالت کے علاوہ مجسٹریٹ بھی گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی اور وہ سب شاہ جی کو کبھی دیکھ رہے تھے۔ صورت حال ڈرامائی رنگ اختیار کر گئی تھی۔

شاہ جی کا ایک پریشانی میں گھر گیا تھا۔ میرے بڑے نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ بے چین

کے رو برو حساب لگا کر بتائیں کہ میرا بوا کون سی جیب میں ہے؟“

وہ میرے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ جیسی کیفیت کا شکار نظر آتا تھا۔ ایک لمحہ متذبذب رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”آپ کا بوا پتلون کی عقیب جیب میں ہے۔“
”حساب لگا کر بتا رہے ہیں یا محض ٹکا لگا رہے ہیں؟“ میں نے اسے گہری نظر سے گھورا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں نے باقاعدہ حساب لگایا ہے۔“

”آپ کا حساب غلط ہو گیا شاہ جی۔“ میں نے اپنے کوٹ کی لندرونی جیب میں سے ایک پھولا ہوا بوا برآمد کرتے ہوئے کہا پھر مذکورہ بوا اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے حساب کے مطابق، اس بٹوے کے اندر کتنی رقم ہوگی۔ آپ رقم کے بارے میں حساب لگانے کے بڑے ماہر ہیں۔“

اس نے چند لمحات تک میرے ہاتھ میں موجود پھولے ہوئے بٹوے کو گھورا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں یہ حساب تو نہیں لگا سکتا کہ اس بٹوے کے اندر کتنی رقم ہے لیکن میں بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا بوا نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔“

”میں آپ کے وثوق کا عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنا بوا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کے اندر موجود نوٹوں کو کن کر معزز عدالت سے حساب میں ماہر ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں۔“

ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے بوا لے لیا لیکن جیسے ہی اس نے بوا کھولا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

”یہ کیا..... آپ کے بٹوے میں تو..... مختلف قسم کے کارڈز..... اور تہ شدہ کاغذات..... بھرے ہوئے ہیں..... یہاں تو ایک روپیہ بھی موجود نہیں.....“

”جس طرح زنگ لوہے کو اور دیمک لکڑی کو کھا جاتے ہیں بالکل اسی طرح دروغ گوئی انسان کے اعتبار کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا بوا لیتے ہوئے کہا پھر اپنی میز کے پاس پہنچ کر قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”اس میز پر تین فائلیں رکھی ہوئی ہیں

اور تینوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا ہے۔ آج عدالت میں میرے تین کیس لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر کیس کی ایک فائل ہے۔ آپ اپنے تمام علوم کے گھوڑے دوڑا کر حساب لگائیں اور معزز عدالت کو بتائیں کہ ان میں سے زیر سماعت کیس کی فائل کون سی ہے؟“

میں نے اسے چکروں کے لیے ایک غیر متعلق فائل کو کھول رکھا تھا۔ میری اب تک کی جرح نے اسے خاصا بدحواس کر دیا تھا۔ وہ آسانی سے میرے چکر میں آ گیا اور اضطرابی انداز میں کھلی ہوئی فائل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ فائل..... جو نیلے رنگ کی ہے..... اور کھلی ہوئی ہے.....“

”ایک دم بکواس.....“ میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا پھر ”آپ“ سے ”تم“ کے میدان میں چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم جھوٹے ہو..... تمہارا حساب جھوٹا ہے..... اور یہ بات عدالت کے سامنے عملاً ثابت ہو چکی ہے۔“ پھر میں نے کھلی ہوئی نیلی فائل کو اٹھا کر مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی ایہ فائل کے ایک مقدمے کی فائل ہے۔ آپ میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہ شخص جھوٹا، عیار، مکار اور دھوکے باز ہے۔ اس کی دروغ گوئی نے ایک بے گناہ نوجوان کو کئی ماہ سے عدالت کے بکھیروں میں الجھا رکھا ہے۔“

پھر میں وہ بارہ شاہ حساب داں کی جانب متوجہ ہو گیا اور کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تم طرم کو کب سے جانتے ہو؟“

وہ اپنے ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آج پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔ اس سے پہلے میں نے صرف اس کا نام سنا تھا۔“

”کس سے..... تم نے کس سے طرم کا نام سنا تھا؟“ میرے لہجے میں درشتی درآئی۔

”انیلا سے..... اور شاکر سے.....“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا کبھی طرم نے تمہارے کھیتوں کو غدر آتش کیا؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں..... کبھی نہیں.....“ وہ ہٹلایا۔

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ
کراچی

شمارہ نومبر 2017ء
کی جھلکیاں

سخن ساز

ساجد امجد کے قلم سے ایک
بڑے شاعر کی روداد حیات

انوکھی شادیاں

وسیم بن اشرف نے دنیا بھر
سے دلچسپ رسوم جمع کی ہیں

بھڑیے

کاشف زبیر کی ایک دلچسپ تحریر،
بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کا تذکرہ

روایت شکن

زدیا اعجاز کی زبانی، ایک باہمت لڑکی کی کہانی

سفرِ حجاز

ندیم اقبال کی دلچسپ سفر کہانی
”شمشال سے ٹورنٹو“ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی
”ناسور“ مسلمی اعوان کی ”کالی گوری“ کے
ساتھ ساتھ بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں سچے
قصے، تاریخی واقعات

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ
سچے قصے اور تاریخی واقعات

”اس نے کبھی تمہارے جھوٹ اور فراڈ کے ٹھکانے
یعنی تمہارے آستانے پر کوئی بم مارنے کی کوشش کی؟“ میں
نے زہر پلے لہجے میں سوال کیا۔
”نہیں جی..... ایسا بھی نہیں ہوا.....“ وہ مریل سی
آواز میں بولا۔

”پھر کیوں..... تم نے کیوں اسے اس کیس میں
پھنسانے کی کوشش کی؟“ میرے لہجے کی خطرناکی میں لہجہ بہ
لہجہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ”مزم سے تمہاری ایسی کون سی دشمنی
تھی جو تم نے حساب کا ڈھونگ رچا کر اسے اس دلدل میں
دھکیلا.....؟“

قبل اس کے کہ کاذب حساب داں میرے سوال کا
جواب دیتا، انیلا ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی
ہو گئی پھر اس کے قدم دروازے کی سمت اٹھنے لگے۔ میری
گھٹی حس نے بتایا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے آواز دے کر
اسے مخاطب کر لیا۔

”انیلا جی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟“
”واش روم.....“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے
میں جواب دیا۔ ”میں کافی دیر سے ضرورت محسوس
کر رہی تھی۔“

بات ختم کرتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی جانب
بڑی۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”رک جائیں۔ جہاں اتنا
برداشت کیا ہے، تھوڑا اور برداشت کر لیں۔ اپنے حساب
داں شاہ جی کا جواب سن لیں، پھر چلی جائیے گا۔“
”میں نہیں رک سکتی..... مجھ سے اور برداشت نہیں
ہو رہا.....“ وہ بے پردائی سے بولی۔

”آ بجیکشن پور آرز۔“ وکیل استغاثہ نے فوراً
اعتراض جڑ دیا۔ ”میرے فاضل دوست سر اسر زیادتی
کر رہے ہیں۔ استغاثہ کی معزز گواہ کو حوائج ضروریہ سے
روکنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے۔“

”بیگ صاحب! آپ گواہ انیلا کو واش روم جانے
سے کیوں روکنا چاہتے ہیں؟“ مجسٹریٹ نے مجھ سے
استفسار کیا۔ ”کیا اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔“
”نہیں سر! میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔“ میں نے سر کو
انتہائی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں کذاب
حساب داں کا جواب انیلا کے لیے کوئی پریشانی کھڑی
کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، عدالتی کارروائی کو چھوٹ کے لیے
موقوف کیا جاتا ہے۔“ مجسٹریٹ نے فیصلہ کن انداز میں

کہا۔ ”کسی خاتون کو واش روم جانے سے روکنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب مسز ایلا واپس آجائے گی تو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے گا۔“

مجسٹریٹ نے خاتمی معقول بات کی تھی لیکن میرے ذہن میں چونکہ خطرے کی کھنٹی بج چکی تھی لہذا میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا۔

”او کے سر۔ میں معزز عدالت کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میری ایک درخواست ہے۔“

”کیسی درخواست؟“ مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔
 ”میں چاہتا ہوں، عدالت سے متعلق کسی ذمے دار

”ختمیک ہے!“ مجسٹریٹ نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی پھر ایک لیڈی سرچ کو اٹلا کے ساتھ دواش روم تک جانے اور اسے واپس عدالت کے کمرے کے اندر لانے کی ہدایت کر دی۔

اس صورت حال نے عدالت میں موجود ہر شخص کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ آپسی میں چبکھوٹیاں کر رہے تھے۔ شاہ جی کی حالت دیدنی تھی۔ میری جرح نے اسے ایک ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا تھا کہ جہاں بولنے میں تباہی اور چپ رہنے میں بربادی تھی۔

آپنا واپس آئی تو اس کی حالت خاصی غیر ہوری تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ آئی تھی اور وہ نروس دکھائی دیتی تھی۔ مجسٹریٹ نے بھی اس کی کیفیت کو نوٹ کر لیا تھا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ عدالتی کارروائی شروع کی تو میں ڈھونگ شاہ جی کی جانب بڑھ گیا پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا۔

”معزز عدالت کو بتاؤ کہ ملزم سے تمہاری کیا وضاحت تھی۔ تم نے اپنے حساب کی آڑ میں اسے پھسانے کی کیوں کوشش کی؟“

جب کسی شکار کو یہ یقین ہو جائے کہ شکاری نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے اور اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تو وہ سہڑا لے کر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاہجی کی بھی تھی۔ وہ میرے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔

”میں سچ بولنا چاہتا ہوں.....!“
 ”میں تمہارے اس فیصلے کو قدر کی نگاہ سے دیکھوں گا۔“ میں نے قدرے نرم لہجہ میں کہا۔ ”سچ بول کر تم اپنے لیے آسانیاں پیدا کر سکتے ہو۔“

”ظلم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ وہ ٹھہرا ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔“

”گویا..... تم نے کسی کی ہدایت پر ملزم کو پھنسا کے لیے اپنے حساب کا ڈھونگ رچا یا تھا؟“ میں حاطرے انداز میں کہا۔ ”اس کام کے لیے تمہیں کتنی رقم دے گئی تھی؟“

”جی..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جموٹ بولنے کے لیے ایک ہزار روپے دیے گئے تھے۔“

”اوہ..... یہ تو اچھی خاصی رقم ہے۔“ میں نے
آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”اس مشن کا ماسٹر مائنڈ کون
ہے..... تم نے کس کے ایما پر اتنا بڑا جھوٹ بولا؟“

”شا کر ملی.....“ اس نے سرسراہتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کیا تم یہ بات شاکر علی کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جب میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو آپ جہاں کہیں گے، میں سچ ہی بولوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”آپ شاکر کو میرے سامنے لا لیں، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

مجلسِ عزّت نے انکو آری آفریں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گزنہ پیش پر شاہ جی اور شاکر علی کا نام گواہوں کی ہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ کیا آج شاکر علی کو بھی گواہی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے؟“

”سوری مرا“ نقیضی افسر نے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا۔ ”شاہ کر علی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس نے یہ نیکل سرٹیفکیٹ بھیجا ہے۔ اسے آئندہ پیشی پر پیش کر دیا جائے گا۔“

”جناب عالی!“ میں نے روئے سخن مجسٹریٹ کی باب موڑتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت معزز گواہ استغاثہ انیلا صاحبہ عدالت میں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شاکر علی کے بیان میں انیلا صاحبہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکتی ہیں کیونکہ انیلا صاحبہ نے اپنے شاکر بھائی کے مشورے پر ہی نامہ جی سے حساب لگوا یا تھا اور یہ دومرحبہ شاکر کے ساتھ ہی تھیں۔ ہٹی والے آستانے پر گئی تھیں۔ یہ تمام حقائق عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔“

مجموٹ نے انیلا کو وٹس باکس میں بلالیا اور میں

کرنے کی غرض سے کہا۔ ”یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ سردست میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ نے بھی شاہ جی کی طرح عقل مند کی مظاہرہ کیا ہوتا تو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ سکتی تھیں خیر..... ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اگر آپ کو نیل کی سلاخوں کے پیچھے رہائش اختیار کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں کون ہوتا ہوں آپ کی خواہش کی راہ میں رکاوٹ بننے والا.....!“

میری نفسیاتی ٹریٹ منٹ نے بڑے مثبت نتائج دیے۔ انیلا کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ پھٹ پڑی اور بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

”اگر شاہ جی نے اپنی زبان کھول دی ہے تو میں بھی سچ بولوں گی اور سچ بولتے ہوئے مجھے کسی قسم کا ڈر خوف نہیں ہے کیونکہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ میری اور شاکر بھائی کی منصوبہ بندی میں خلوص شامل تھا۔ ہماری نیت صاف تھی۔ ہم نے جو بھی کیا وہ حالات اور وقت کا تقاضا تھا۔ مجھے اپنے اس عمل پر کوئی ندامت نہیں ہے۔“

”انیلا جی! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس سارے پروگرام میں آپ کی نیک نیتی کیسے ظاہر ہوئی ہے؟“ میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”شاہ جی کو ایک ہزار روپے رشوت دے کر ان کی زبان سے جھوٹ بلوانا اور ایک بے گناہ انسان کو ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی چوری کے الزام میں پھنسانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی؟“

”ابو بہت سیدھے انسان تھے۔“ وہ روہانے لہجے میں بولی۔ ”وہ ہر قسم کا نقصان اٹھا کر رشتوں کو نبھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ میری شادی بھی انہوں نے اپنے رشتے داروں میں کی اور میں آج تک آرام و آسائش کو ترس رہی ہوں۔ اعجاز حسین کی اتنی آمدنی نہیں ہے کہ ہم ایک خوش حال زندگی بسر کر سکیں۔ اوپر سے ابو نے شائلڈ کار شہ پھوپھی کے بیٹے عارف سے ملے کر دیا جو بے روزگار ہے۔ اس کے پاس کوئی مستقبل نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری طرح شائلڈ بھی زندگی بھر کسمپرسی کی حالت میں رہے اس لیے میں نے شاکر بھائی کی مدد سے یہ چال چلی تھی تاکہ عارف پر چوری کا الزام لگے اور یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔“

”ٹھیک ہے، تم نے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ رشتہ توڑنے کی کوشش کی۔“ میں

اس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹکڑا ہاتھ ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ ”م..... میں ٹھیک ہوں.....“ وہ بدحواسی سے بولی۔ ”آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں ہے۔“ ”اب میں آپ کو یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔

”وہی.....“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”جو آپ کے بچپن ہوئے شاہ جی نے کیا ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ چونک کر مجھے نکلنے لگی۔ ”شاہ جی نے سچ بول کر اپنے جرم کی تکفینی میں خاصی رعایت حاصل کر لی ہے۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ ڈھٹائی سے دروغ گوئی پر ڈنٹا رہتا تو میں اس بچپن ہوئے بندے کو ایسی جگہ پہنچا دیتا جہاں سے واپسی میں اسے کئی سال لگ جاتے.....“ میں سانس بھرا کر نے کو ہما پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ ”اب مجھن زدہ انداز میں بولی۔ ”میں سمجھی نہیں.....!“ ”معزز عدالت آپ کے منہ سے سچ سننا چاہتی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لہذا آپ بتائیں کہ شاکر علی نے شاہ جی کو جھوٹ بولنے کے لیے ایک ہزار روپے کیوں دیے تھے؟ میرے ٹوکھل سے شاکر کی کیا دشمنی تھی؟ اس نے عارف کو چوری کے مقدمے میں کیوں پھنسایا؟“

”م..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی.....“ وہ کمزوری آواز میں بولی۔ ”آپ..... یہ سارے سوال..... شاکر سے کریں.....“

اس کے لہجے کی شکلگی اور ناتوانی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے لیکن کسی خاص سبب کی بنا پر زبان نہیں کھول رہی۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے، آئندہ پیشی پر میں یہ سوال شاکر علی کنڈا ماسٹر سے کر لوں گا اور پھر آپ کا جو بھی ہوا اس کی ذمہ دار آپ ہی ہوں گی.....!“

”کیوں..... میرا کیا ہونے والا ہے.....“ وہ سراپہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“ میری دھمکی کارگر رہی تھی۔ میں نے اسے مزید خوفزدہ

نے تلخی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس کوئی بہتر قمیض البدل تھا؟“

”جی..... بالکل تھا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کون؟“

”شاہد بھائی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس خارج کر رہ گیا۔

”شاہد بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔“ وہ اپنی ہی

دھن میں بولتی چلی گئی۔ ”میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔

وہ ٹائلڈ کو پسند کرتے ہیں اور اس سے شادی کرنا چاہتے

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ٹائلڈ شاہد بھائی کے ساتھ بہت خوش

رہے گی۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔“

”انٹاجی! تمہارے اور شاہد جی کے بیان کی روشنی

میں میرا منہ کل تو صد فیصد بے گناہ ثابت ہو گیا ہے۔“ میں

نے غصے سے بولے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ابھی تک چوری شدہ

رقم کی بہتری حل نہیں کی۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند

کریں گی کہ وہ بھڑی رقم کہاں گئی؟“

”وہ رقم میں نے اسی کے پاس سے نکال کر شاہد

بھائی کے حوالے کی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر شاہد بھائی

وہاں سے چلے گئے تھے۔“

”تمہارے اور شاہد کے علاوہ اس منصوبے میں اور

کون کون شامل تھا؟“ میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”شاہد جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں تمہارے گھر کے افراد کے بارے میں

پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”کیا ناہید اختر،

رضوان، ٹائلڈ اور اعجاز حسین میں سے کسی کو تمہارے

عزائم کی خبر تھی؟“

”جی نہیں.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”میں نے کسی کو ہینک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔“

انٹاجی کے واضح بیان پر ناہید اختر بیچ و تاب کھا رہی

تھی۔ وہ بار بار پہلو بدلتی رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا

کہ اٹھ کر انٹاجی کا منہ ٹوچ لے۔ میں نے ناہید اختر کے زخموں

پر مرہم رکھتے ہوئے انٹاجی سے کہا۔

”تم نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے دوران میں ایک

لہجے کے لیے بھی سوچا کہ تمہاری ماں نے وہ رقم عمرہ کرنے

کے لیے جمع کر رکھی تھی؟“

”امی جھوٹ بولتی ہیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں

بولی۔ ”انہوں نے سب کو یہی بتا رکھا ہے کہ وہ عمرہ

پر جانے والی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ رضوان کے

ساتھ ملائیشیا اور تھائی لینڈ کی سیر کرنے جانے والی تھیں۔

اس رقم کی امی سے زیادہ میں ضرورت مند تھی۔ میرے

اور شاہد بھائی کے بیچ طے ہوا تھا کہ ہم اس رقم کو آپس

میں بانٹ لیں گے۔ وہ ساٹھ ہزار سے اپنی شادی کا

انتظام کر لیں گے اور میں اعجاز حسین کو ٹیڑھک شاپ کھلوا

دوں گی تاکہ وہ اپنا کام کر سکے۔ اعجاز کبھی دوسرے کے

پاس کمیشن پر سلائی کا کام کرتا ہے۔ آمدنی اتنی کم ہے کہ

تغزارہ نہیں ہوتا۔ میں نے جو بھی کیا، اس میں میری نیک

نیتی شامل تھی لیکن میرے نصیب میں کامیابی نہیں تھی اس

لیے وقت سے پہلے ہی میرا منصوبہ فیل ہو گیا۔“

”تم نے جو کچھ بھی کیا وہ بہر حال قابل دست

اندازی پولیس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں اور شاہد علی کو

اپنے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔ کم یا زیادہ..... اس کا فیصلہ

عدالت کرے گی۔“

اس نے گردن جھکا دی۔ اس کے پاس بولنے کے

لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

”یور آؤ!“ میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”صورت حال روز روشن کی طرح عیاں

ہو چکی ہے۔ حالات و واقعات اور گواہوں کے بیانات کی

روشنی میں میرا منہ کل بے گناہ ثابت ہو گیا ہے۔ اس معصوم کو

ٹارگٹ بننا کر جو گناہ نامہ لکھ لیا گیا اس کا پول کل چکا ہے

لہذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مظلوم عارف کو اس

کیس سے باعث بری کیا جائے، مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب

عالی۔“

جج نے فیصلے کے لیے دو روز بعد کی تاریخ دے کر

عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پٹنی پر مجسٹریٹ نے عارف کی باعث

بریت کے احکام صادر کر دیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں

کہ شاہد علی کو شال غلطی کر کے اس کے پاس سے ایک لاکھ

دس ہزار کی رقم برآمد کر لی گئی تھی۔ اس دوران میں وہ دس

ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے..... جو کسی کے لیے گڑھا

کھودتا ہے، ایک روز وہ خود اس گڑھے میں گرتا ہے۔ شاہد

اور انٹاجی نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے عارف کو

ٹارگٹ بنایا تھا لیکن میری کوشش اور بالک کے کرم نے

اسے بچالیا۔ عارف پر یہ مثال صادق آتی تھی..... جسے اللہ

رکھے، اسے کون چکھے!

(تحریر: حسام بٹ)

بدلہ

شاہ زین رضوان

اکثر یہ خبری میں انسان اپنے ہی دشمنوں کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور اپنا دوست سمجھ لیتا ہے۔۔۔ اور دشمن اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مکاری پر خوش ہوتا ہے مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ ایک لمحہ آگہی کا جب اس کی معصومیت کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے تو بہت ساری سرگوشیاں اسے حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہیں اور بس یہ وہی لمحہ ہوتا ہے جب ناحق بہنے والا خون اپنے مجرم کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ اسے بھی جب حقیقت کا ادراک ہوا تو پل کے پل میں اس نے بدلے کی ٹھان لی۔

آستین کے سانپوں کے درمیان ادھورے مشن

کی تکمیل کا اجرا

دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور واپس آنے کا اشارہ کیا۔
”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا تم ایوس سے نہیں ملو گے؟“

ریمنڈ، انٹرنیشنل ہوٹل میں ہونے والا ایوس پریلے کا شو دیکھ کر باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے منہ پر ٹام پارکر کی نظر اس پر پڑ گئی جو بیرونی لابی میں پریلے کی ریکارڈ البم، تصویریں، پوسٹر اور دیگر یادگاری اشیاء بیچ رہا تھا جنہیں لینے کے لیے پرستاروں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ٹام نے اسے



الہ آباد

”اس وقت نہیں نام۔ مجھے ایک مینٹگ میں جانا ہے۔“
 ”رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اس وقت
 کون سی مینٹگ ہے؟“ نام نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ
 بہت باؤس ہوگا اگر تم نے اس سے ملنے اور یہ بتانے کے
 لیے کچھ وقت نہیں دیا کہ آج کا شو بہت شاندار تھا۔“
 ”تم میری طرف سے اسے بتا دینا۔“

نام اپنے چہرے پر مسکراہٹ سمجھتے ہوئے بولا۔
 ”تم جانتے ہو کہ وہ لوگوں کے منہ سے براہ راست سنا پسند
 کرتا ہے۔ ویسے وہ کون ہے جس سے ملنے کے لیے تم اتنی
 جلدی کر رہے ہو؟“

ریمینڈ نیز پر جھکا اور اس کے کانوں میں سرکشی
 کرتے ہوئے وہ نام بتا دیا۔ نام کی آنکھیں پھیل گئیں اور
 وہ بولا۔ ”تب تو تمہیں بالکل بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔
 ایلس اور میری جانب سے بھی اسے نیک خواہشات کا پیغام
 پہنچا دینا۔“

ریمینڈ کا دفتر ایک غیر معروف سڑک پر واقع تھا جہاں
 بیشتر دکانیں اور دفاتر خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس کی
 بیرونی گھڑی پر تاریک شیش لگا ہوا تھا اور باہر سے یہ نظر نہیں
 آتا تھا کہ اندر کوئی سرگرمی ہو رہی ہے۔ البتہ دروازے پر
 اس کے نام کی تختی ضرور لگی ہوئی تھی۔ وہ صرف ان لوگوں
 کے لیے کام کرتا تھا جو کسی کی معرفت اس کے پاس آتے یا
 وہ انہیں پہلے سے جانتا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک نام تک
 سائمن کا تھا جسے وہ کیا بلکہ لاس ویگاس کا ہر شخص اچھی طرح
 جانتا تھا۔ وہ ایلا سو کے نام سے ایک بہت بڑے جوئے
 خانے کا مالک تھا جو اس نے انڈر ورلڈ کی کمائی سے بنایا تھا
 اور جہاں بڑے پیمانے پر جوئے کے ساتھ ساتھ تفریح کے
 مواقع بھی فراہم کیے جاتے تھے۔

اس کی سیکریٹری نے آٹھ بجے کے قریب فون کر کے
 ریمینڈ کو بتایا کہ مسٹر سائمن اس سے ملنے کے لیے دفتر آ رہے
 ہیں۔ اس لیے وہ وقت مقررہ پرواں موجود رہے۔ اس نے
 تنہائی انداز میں کہا کہ مسٹر سائمن انتظار کرنا پسند نہیں
 کرتے۔ اس نے ریمینڈ کی جانب سے تعذیق ہونے کا
 انتظار بھی نہیں کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریمینڈ نے اپنی گاڑی پارکنگ لائٹ میں گھڑی کی۔
 عین اسی وقت وہاں ایک کیڑی لاک آن کر رہی جس کے
 ڈرائیور کو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ بھری سیٹ کا دروازہ
 کھول رہا تھا جہاں لیوڈون براجمان تھا جس کی شہرت
 لائن کے نام سے تھی۔ ریمینڈ اسے اچھی طرح جانتا تھا اور

جن دنوں وہ ویگاس پولیس میں سرانگ رساں تھا تو اس کا
 واسطہ کئی بار اس سے پڑا تھا۔ وہ ویگاس کا نامی گرامی غنڈا
 تھا۔ اس کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کئی بار پکڑے جانے
 کے باوجود وہ جیل سے رہا ہو جاتا کیونکہ کوئی بھی اس کے
 خلاف کو ای دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

سائمن گاڑی سے باہر آیا اور اسے دیکھ کر ہاتھ کا
 اشارہ کرتے ہوئے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی چال
 میں ہلکی سی لنگراہٹ تھی۔ اسی لیے ڈون اس کے بالکل
 قریب ہو کر چل رہا تھا تا کہ اسے گرنے سے بچالے۔
 سائمن نے ریمینڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے
 ایک اہم معاملہ پر گفتگو کرنی ہے اور ہمارے پاس بہت
 کم وقت ہے۔“

ریمینڈ کا دفتر کسی لیوٹک روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔
 وہاں ایک کاؤچ، دو آرام دہ کرسیاں، کافی کی میز، ایک
 آفس ٹیبل جس پر چار عدد فون رکھے ہوئے تھے اور نصف
 درجن فائل کینٹ دیواروں پر نصب تھے۔ سائمن اور
 ریمینڈ آمنے سامنے آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ لائن
 دروازے کے ساتھ ہی کھڑا رہا۔ اس کی اسپورٹس جیکٹ کا
 ابھار بتا رہا تھا کہ وہ پوری طرح مسلح ہے۔

”میرے نزدیک فوری کارروائی کی بڑی اہمیت ہے
 اور میرے اندازے کے مطابق تم اس کے اہل ہو۔“
 سائمن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک بہت ہی
 خطرناک کام ہے لیکن اس کی کسی کو بھجوا نہیں پڑتی چاہیے۔
 مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ لوگ تمہاری
 ایمان داری اور فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔“
 ”لگتا ہے کہ تم نے مجھے فون کرنے سے پہلے اپنا ہوم
 ورک مکمل کر لیا ہے۔“ ریمینڈ نے کہا۔

”بالکل۔ میں ہر کام میں احتیاط اور چھان بین کا
 قائل ہوں۔ تم نے ویگاس پولیس میں رہ کر قابل رشک
 کامیابیاں حاصل کیں اور بطور سرانگ رساں مجرموں کو پکڑ کر
 انہیں سزا بھی دلوائی۔ ایک بار فائرنگ کے تبادلے میں تمہارا
 ایک کان متاثر ہوا اور تمہارا دیرینہ ساتھی مارٹن ریان تمہیں
 بچاتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی موت کا تمہیں اتنا صدمہ ہوا
 کہ تم نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور کچھ عرصہ شراب
 سے اپنا غم غلط کرتے رہے پھر پرائیویٹ سرانگ رسائی
 شروع کر دی۔ کیا میں شیک کہہ رہا ہوں مسٹر ریمینڈ؟“

”ہاں۔ سوائے اس کے کہ میں ابھی تک اس کتیا کے
 بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں جس نے مارٹن پر گولی چلائی تھی اور یہ

خو اکر لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بد معاشوں کے سرغنہ کی پوتی ہے۔

”اور انہوں نے دس لاکھ ڈالر تاوان کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر بہتر گھنٹوں کے اندر یہ رقم ادا نہیں کی تو لڑکی کو مار دیا جائے گا۔“

جو اس جب دفتر آئی تو اس نے ریمنڈ کو کاؤچ پر سوتے ہوئے پایا۔ وہ خود رات دیر تک اسٹارڈسٹ میں جو کھیلتی رہی تھی اور وہاں سے اٹھارہ سو ڈالر جیت کر آئی تھی۔ اب وہ دفتر کے بکن میں بیٹھے کافی اور سینڈوچ سے ناشتا کر رہے تھے۔

ریمنڈ نے کہا۔ ”سائن کو بالکل بھی اندازہ نہیں کہ ان لوگوں کو لڑکی کی اصلیت کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ یہ بات بہت خفیہ رکھی گئی تھی اور بہت کم لوگوں کو حقیقت کا علم تھا۔ وہ لڑکی یہی چاہتی تھی کہ خاص طور پر ریگس میں کسی کو سائن یا مارکس سے تعلق کے بارے میں معلوم نہ ہو لیکن اس کے باوجود کسی کو یہ پتا چل گیا۔“

”ہم اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتے ہیں؟“

”تم کیا سمجھتی ہو اگر ہم ان لوگوں کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو مارکس مقررہ وقت ختم ہونے سے پہلے ہی روزانی کو بچانے کے لیے نکل پڑے گا؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ اگر ہم اس کا کام نہ کر سکتے تو ہمیں زمین کے نیچے چھٹ سے زیادہ جانا پڑے گا؟“

”ہم نہیں صرف میں۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر میں سے نو گھنٹے گزر چکے ہیں، ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

”تم ہمیں بتا رہے ہو کہ اس کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں۔ میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔“ بلی اینڈ دی بلونڈ کے بلی نے کہا۔ وہ یہ خبر سن کر دوگ رہ گیا تھا۔ ”کیا تم مجھ سے کوئی خطرناک مذاق تو نہیں کر رہے مسٹر ریمنڈ؟“

”یہ سچ ہے۔“ جو اس نے کہا۔ ”کیا تم نے مس مارکس کی گمشدگی کے بعد اس کے بارے میں کوئی خبر سنی؟“

”تمہارا مطلب جولی سے ہے۔۔۔۔۔ جولی جیمسن۔ میں اسے اسی نام سے جانتا تھا۔“

وہ ایلامو کے میزائٹس قبر پر واقع سائن کے جدید کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بلی کی غالباً نیند پوری

کہ مارٹی کی بیٹی جو اس اب میری پارٹنر ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں اپنے لیے نہیں آیا بلکہ یہ معاملہ ایک بڑی طاقت کا ہے۔ کیا تم نے ایلی مارکس کا نام سنا ہے؟“

”اسے کون نہیں جانتا۔ اسے شکاگو میں ہونے والے جرائم کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ایلامو کا اصل مالک وہی ہے اور تم اس کے فرنٹ میں ہو۔ اس کے علاوہ ریگس میں اس کی تنظیم کے ذمے دار بھی تم ہی ہو۔“

سائن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بہت عمدہ۔ اب کام کی بات کرتے ہیں۔ یہ مسٹر مارکس کے لیے ایک فیور ہوگا اور کامیاب ہونے کی صورت میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔“

”اور اگر کامیابی نہ ہوئی تو؟“

”تو تمہیں مار دیا جائے گا اور ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”اور اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اس کام کے لیے کسی اور کو تلاش کرو۔“

”تب بھی تمہیں مار دیا جائے گا۔“

لیوڈون کا ہاتھ بے اختیار اس جگہ پر گیا جو ابھری ہوئی تھی۔ سائن نے اسے ایک نظر دیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت تمہارا لیصلہ سنا چاہتا ہوں۔“

”مسٹر مارکس مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ مجھے اس کی تفصیل بتاؤ۔“

”یہ ہوئی نا عقل کی بات۔“ اس نے نیا سگریٹ سلاگتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بلی اینڈ دی بلونڈ سے واقف ہو؟ یہ دونوں گلوکار ہمارے کیسینو میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔“

”ہاں۔ میں نے انہیں چند مرتبہ سنا ہے لیکن ان دونوں کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بہت کچھ مسٹر ریمنڈ۔“

☆☆☆

”تم سن رہی ہو۔“ ریمنڈ نے جو اس کو بتایا۔ ”دا بلونڈ دراصل ایلی مارکس کی پوتی روزالی مارکس ہے اور وہ شو بزنس کی دنیا میں جولی جیمسن کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ تین یا چار سال کی تھی جب اس کے والدین وفات پا گئے تھے اور اس کی پرورش مارکس نے ہی کی۔“

”اوہ میرے خدا! اسے کسی نامعلوم فرد دیا افراد نے

نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیوڈون اسے ہوٹل کی سولہویں منزل پر واقع دو بیڈ روم کے سوئٹ سے اٹھا کر لایا تھا جسے وہ اور جولی ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لیوڈون نے اسے لباس تبدیل کرنے کے لیے باج منٹ دیے اور خود اسے لے کر کافرنس روم تک آیا۔ وہ آخری شو ختم کر کے بہ مشکل تین گھنٹے ہی سو سکا تھا۔

”ہاں۔ اس کا نام جولی جیمسن تھا اور میں پہلے بلی ولیمز کے نام سے انفرادی طور پر گایا کرتا تھا۔ پھر ہم نے اپنا گروپ بنالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گئے۔ میری ماں نے اپنے پسندیدہ جوگی کے نام پر ولیم جی رومانو رکھا اور اس طرح میں اپنا خاندانی پیشہ اختیار کرنے کے بجائے شو بزنس میں آ گیا۔ ماں نے میری حوصلہ افزائی کی اور فیصلہ کیا کہ مجھے رقص بھی سیکھنا چاہیے۔ وہ اپنے پسندیدہ اسٹارز فریڈ اسٹیلیرز اور جین کیلی کی طرح مجھے بھی رقص اور گلوکار دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے مجھے اپنے خرچ پر ڈانس اسکول میں داخل کروا دیا۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ جوآنس نے کہا۔ ”کیا تم نے کشدگی کے بعد اس کے بارے میں کچھ سنا؟“

”ذرا میرا۔ میں اسی جانب آ رہا ہوں۔ ایک شو کے دوران میری اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میری پرفارمنس کی تعریف کی اور میرے ساتھ مل کر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا چہرہ اور جسم اتنا خوب صورت ہے کہ نہ جانے کتنے لوگ اس پر مرتے ہوں گے۔ پھر ہم نے بلی اینڈ دی بلونڈز کے نام سے جوڑی بنائی۔ آہستہ آہستہ ہماری مقبولیت بڑھتی گئی اور ہمارا ذکر اخباروں میں ہونے لگا پھر ہمیں ایلامو سے ایک بڑی رقم کی پیشکش ہوئی جسے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے اس کی وجہ معلوم ہوئی کہ وہ مسٹر مارکس کی پوتی ہے۔“

”تمہارے اور اس کے درمیان کوئی لڑکے لڑکی والا معاملہ تو نہیں ہے؟“

”ابھی تک تو ایسی بات نہیں مسٹر ریمنڈ۔ ویسے بھی جولی ایک شخص سے ملتی رہتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں کا تعلق کتنا پرانا ہے؟“

”وہ کون ہے؟“

”اس نے ایک دفعہ حادثاتی طور پر اس کا نام لے دیا تھا۔ شاید وہ جونی یا جیری تھا۔ وہ کوئی پروڈکشن منیجر ہے۔“

”تمہیں جولی کا پتا معلوم ہے؟“

”وہ مغربی بیٹی کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ میں خود کبھی وہاں نہیں گیا۔ پرنس ڈیپارٹمنٹ میں گاہ کرنے والی لڑکی تمہیں اس بارے میں بتا سکتی ہے۔“

اپنی انگلیاں چٹختے ہوئے بولا۔ ”کیا تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ ان دونوں نے بھاگ کر شادی کر لی اور اب کہیں مومن منار ہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کسی اور پھوٹے ہالہ والی کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اگلی بار سرخ ہالہ والی مل جائے۔“ اس نے ایک بار جوآنس کو دیکھا اور بولا۔ ”تمہارے بال قدرتی سرخ ہیں۔ میں اس پر بھی تیار ہوں۔“

”اگر تم میرے پیکیج کا حصہ بن جاؤ۔“

لیوڈون کا کافرنس روم کے باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ”مسٹر سائنس تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ انہیں ام

بھرا سائنس کے دفتر میں لے گیا۔

”تمہارے پاس میرے لیے کوئی خبر ہے؟“

اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ”میری ابھی ابھی مسٹر مارکس سے بات ہو رہی ہے۔ وہ کسی ایسی خبر کا منتظر ہے جس میں کسی پیش رفت کا جھلک نظر آئے۔“

ریمنڈ نے کہا۔ ”فی الحال کوئی خاص پیش رفت نہیں۔“

”مسٹر مارکس کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے میں یہ اطلاع انہیں نہیں دوں گا۔ بلی ولیمز کے بارے میں آگے بڑھتے ہو؟ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جس سے یہ شہر ہو کہ ابھی اس انفرامیں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ ریمنڈ نے کہا اور پھر اسے بلی کے سامنے ہونے والی گفتگو سنائی۔

سائنس نے انٹرکام پر سیکریٹری سے کہا کہ وہ پرنس ڈیپارٹمنٹ سے اس کی بات کروائے۔ رابطہ کرنے پر اس نے ان سے جولی کے گھر کا پتا معلوم کیا اور ایک کاغذ پر لکھ کر ریمنڈ کو بکڑا دیا۔ ”تم نے مجھے اتنا تو بتا دیا کہ پہلی بات معلوم ہوئی۔ اب یہ بوائے فرینڈ کی کہانی سامنے آگئی ہے۔ گوکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی نیام آگیا ہے لیکن یہ تو نئی والی بات میرے لیے ایک خبر ہے۔“

اس معاملے سے کس طرح نمونے یا میں لائن کو یہ ذمہ داری سونپ دوں؟“

”مسٹر ڈون کی شہرت کو دیکھتے ہوئے اسے اس معاملے میں شامل کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔“ ریمنڈ نے کہا۔ ”جوآنس میرے ساتھ رہے گی۔ اسے شہر کے تمام جوتے

لالوں اور علاقوں سے واقفیت ہے۔“
”عمدہ سوچ ہے مسٹر ریمنڈ۔ کیا تم اس سے متفق نہیں
ہو لائن؟“

لائن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے
گماں کے ذریعے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ وقت تیزی
سے گزر رہا ہے اور تم یہ بھی نہیں چاہو گے کہ مسٹر مارکس کو
پایس کرو۔ کیا تمہیں یہ بات یاد ہے؟“
”میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں۔“

جولی کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں اسے کوئی وقت
نہیں ہوئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی، کھٹتی
بھائی۔ چند مرتبہ جولی کا نام لے کر اسے آواز دی لیکن کوئی
جواب نہیں ملا۔ ایک پُرکشش عورت اسے دیکھ کر رک گئی اور
بولی۔ ”تمہاری قسمت خراب ہے مسٹر۔ جولی کو یہاں سے
گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی۔“
”کتنا وقت گزر گیا؟“

”چار دن پہلے میں اس کے ساتھ آخری بار صبح کی
سیر کے لیے گئی تھی۔ جب میں اسے لینے آئی تو وہ موجود
نہیں تھی۔ تب میں نے اس کے بارے میں پوچھا ہوتا
شروع کر دیا اور میں پولیس کو فون کرنے ہی والی تھی۔“ پھر
وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم جولی کے دوست
ہو یا کچھ اور؟“

”میں جولی کا کزن ہوں اور چھٹیاں منانے نیویارک
سے آیا ہوں۔ میرا ارادہ اسے اچانک حیران کرنے کا تھا۔
شاید وہ بھی چھٹیوں پر چلی گئی ہے اس نے بوائے فرینڈ کے
ساتھ جس کے بارے میں اس نے مجھے لکھا تھا۔ میرا خیال
ہے کہ اس کا نام جونی ہے اور وہ کوئی گلوکار ہے۔“

”بہت خوب۔ وہ آئے دن دوست بدلتی رہتی
ہے۔ اس کا نیا دوست فریڈی ہے۔ فریڈی ناش۔ وہ ایک
کارڈیلر ہے۔“

ریمنڈ دفتر پہنچا تو جو اس وہاں پہلے سے موجود کسی
سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے ہونٹوں
پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریمنڈ نے فریڈی سے
شروب کی بوتل نکالی اور انتظار کرنے لگا کہ کب اس کی
گفتگو ختم ہوتی ہے۔ جو اس نے ریسیور رکھ کر پوچھا۔ ”کچھ
معلوم ہوا؟“

”پڑوس میں رہنے والی ایک عورت نے بتایا ہے کہ
اس نے جولی کو چار دن سے نہیں دیکھا۔ وہ اچانک ہی
نائب ہو گئی۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس کا موجودہ

بھکاری

ایک بھکاری بینک کے دروازے سے اندر داخل
ہونا چاہتا تھا گاڑی نے اسے روکے ہوئے کہا۔
”بینک میں بھیک مانگنا منع ہے۔“
بھکاری۔ ”بے وقوف آدمی آگے سے ہٹ جائیں
یہاں بھیک مانگنے نہیں آیا بلکہ اپنے اکاؤنٹ میں دس
ہزار روپے جمع کروانے آیا ہوں۔“

ٹرک کانمبر

دو بیوقوف عجیب گھر دیکھنے گئے۔ انہوں نے ایک
انسانی ڈھانچا دیکھا جس پر 1580 لکھا ہوا تھا۔
ایک بیوقوف اپنے ساتھی سے بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ
کسی ٹرک کے نیچے آکر مر تھا۔“
دوسرا بیوقوف ہنس کر بولا۔ ”ظاہر ہے تبھی تو ٹرک کا
نمبر لکھا ہوا ہے۔“

سالگرہ

ایک بھکاری نے ایک کوشی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
دروازے پر ایک عورت آئی تو بھکاری نے اس سے کہا۔
”کیا آپ کے ہاں ایسے شخص کے لیے جس نے
دو دن سے کھانا نہیں کھایا کیک مل سکے گا۔“
عورت نے کہا۔ ”کیک کیوں..... روٹی سے کام
نہیں چلے گا؟“

بھکاری۔ ”بیگم صاحبہ! آج میری سالگرہ ہے۔“
(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

خوش خبری

”ممی! آپ کو معلوم ہے اس سالگرہ پر میں آپ کو
کیا تحفہ دے رہی ہوں؟“

”نہیں بیٹی! مجھے تو معلوم نہیں۔ کیا دے رہی ہو؟“
”اچھا سا ایک ٹی سیٹ۔“

”لیکن ایک بہت اچھا ٹی سیٹ تو ہمارے گھر میں
بھی موجود ہے نا؟“

”اب نہیں ہے ماما۔ وہ مجھ سے گر کر ٹوٹ
گیا۔ ابھی ابھی جو زردار آواز آپ نے سنی تھی۔ وہ اسی
کے گرنے کی تھی۔“

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی)

دوست فریڈی ناش ہے جو تقریبات کے لیے گاڑیوں کا انتظام کرتا ہے۔“

”فریڈی ایک ہفتے پہلے تک وہاں جزوقتی کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنا معاوضہ وصول کیا اور چلا گیا۔ اسی ہی ایک کہانی میں نے پہلے بھی سنی تھی۔ جس جگہ وہ پہلے کام کرتا تھا وہاں بھی اس کی یہی حرکتیں تھیں۔“

”ہم ایک بار پھر بندگی میں آگئے ہیں۔“ ریمنڈ نے کہا۔ ”کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ مختلف لوگ ایک ہی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ جولی اپنے کسی دوست کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ رہا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔“

”ممکن ہے کہ ناش نے ہی اسے اغوا کیا ہو؟“

”وہ ایسا کیوں کرے گا جبکہ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ جولی کا مارکس سے خونی رشتہ ہے اور وہ اس کے خاص بندے تک سائنس کی زیر نگرانی رہ رہی ہے۔“

”ممکن ہے کہ قربت کے لمحات میں جولی کی زبان سے یہ بات نکل گئی ہو۔“

”زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی نے ان لوگوں کو معاوضہ دے کر یہ کام کروایا ہے اور اس کے بعد تمہیں روزالی کی تلاش پر لگا دیا۔“

”تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”مجھے سائنس پر شبہ ہے۔ اگر روزالی مردہ حالت میں ملتی ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے تمہیں اس کی تلاش پر لگا دیا کیونکہ تمہیں ایک کامیاب سراغ رساں سمجھا جاتا ہے لیکن تم نے نہ صرف اسے بلکہ ایکی مارکس کو بھی مایوس کیا۔“

”فرض کر لیتے ہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں کیونکہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور بہتر ٹھکنے کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔“

”ایک بار پھر ملی ولینز سے شروع کرتے ہیں۔ کوشش کرو کہ وہ اپنے بجائے جولی کے بارے میں باتیں کرے۔ میں نے پہلی ملاقات میں یہ تاثر لیا ہے کہ جب تم نے اسے جولی اور مارکس کے بارے میں بتایا تو وہ بالکل حیران نہیں ہوا۔“

☆☆☆

ریمنڈ نے لاس ویگاس میں پولیس کے ان سراغ رسالوں میں ایک سے ملی ولینز کے گھر کا پتا اور فون نمبر معلوم کیا جواب بھی اس سے رابطے میں تھے اور کسی معاوضے کے بغیر اس کی مدد کرتے تھے۔ چھٹی گھنٹی پر آپریشن بتایا کہ

مسٹر ولیمز ایلا موچینے والے ہیں جہاں وہ اپنے نئے شو کے بارے میں بات کریں گے۔ جب وہ دونوں ریزورٹ میں پہنچے تو وہ انہیں لاؤنج یا اپنے سوٹ میں نظر نہیں آیا البتہ لائن کاؤن آگیا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر سائنس تمہاری گرل فرینڈ اور تم سے ابھی اور اسی وقت اپنے دفتر میں ملنا چاہتے ہیں۔“

”زبان سنبھال کر بات کرو لائن۔“ ریمنڈ نے غصے سے کہا۔ ”وہ میری پارٹنر ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟“

”غیر ضروری سوالوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ تم اچھی طرح جاننے ہو کہ مسئلہ کیا ہے۔“ یہ کہہ کر لائن نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ دونوں سائنس کے ایگزیکٹو سوٹ میں داخل ہوئے تو وہاں ایلی مارکس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ریمنڈ نے اسے فوراً پہچان لیا کیونکہ وہ پولیس کی ملازمت کے دوران اس کی کچھ تصویریں دیکھ چکا تھا۔ اس میں کوئی خاص تہذیبی نہیں آئی تھی۔ وہ ایک کونے میں چھت کے قبی صوفے پر بیٹھا مشروب کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس کے برابر ہی میں سائنس ایک آرام دہ کرسی پر مودبانہ انداز میں موجود تھا۔

”مسٹر مارکس کو ہیلو کہو۔“ سائنس نے کہا۔ ”یہ تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔“

مارکس کچھ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ ریمنڈ نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مارکس نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ تم نے اب تک روزالی کو تلاش کر لیا ہوگا۔ ورنہ میں یہاں نہ آتا۔ تم دونوں بیٹے جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہو رہا ہے۔ تم کہاں تک پہنچے؟“

اس کی محکمہ خیر شخصیت دیکھ کر ریمنڈ کو یقین نہیں آیا کہ یہ شخص جرائم کی دنیا کا بادشاہ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، مارکس کی آواز گونجی۔ ”مجھے جواب چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔“

ریمنڈ کچھ ہچکچایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ جوائس اس کی طرف سے جواب دینے والی ہے تو اس نے اسے روک دیا اور بولا۔ ”جو تم سنو گے، وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا مسٹر مارکس۔“

”کیا تم ذہن پڑھنا بھی جانتے ہو؟ جو کہتا ہے، کہہ ڈالو۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں۔“

”میں روزالی کا پتا لگانے میں ابھی تک کامیاب نہ ہو سکا۔ ہمارے پاس یہ مشکل ایک دن اور رہ گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ تمہاری خواہش کے مطابق نتیجہ نہیں دے سکوں گا۔“

کہا۔ ”تم نے فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں دیکھا ہوگا جیسے ایک کیک کا ٹکڑا۔“

ریمینڈ اس سے متفق نہیں تھا اور اس نے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔

”آ خر کیوں؟ تم مجھے کوئی ایک مثال بتاؤ۔“ سائنس نے کہا۔

”یہ فطرت کا قانون ہے مسٹر سائنس۔ جس کام کی ابتدا غلط ہو، اس کا انجام بھی غلط ہوتا ہے۔ میں نے بھی ٹیلی ویژن اور فلموں میں یہی دیکھا ہے۔“

مارکس بولا۔ ”اس کی بات میں وزن ہے تک۔ اسے باقی بات بھی بتاؤ۔“

”ہم بالکل سیدھا کام کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی رسی یا پھندا نہیں لگا ہوا ہے اور نہ ہی روزالی کے لیے کوئی خطرہ ہے۔ وہ ہماری اکلوتی ستارہ ہے اور یہ رقم مرغیوں کی خوراک جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اسے بہت کم وقت میں دوبارہ حاصل کر لیں گے۔“

”لیکن اگر انہوں نے کوئی دھوکا دیا تو کیا ہوگا؟ اگر روزالی ہمیں خستہ حالت میں ملی یا.....“

”خدا نہ کرے۔“ مارکس اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”یادہ مسل ہو اور پیچھے ہٹتے ہوئے ہم دونوں پر فائر کھول دے پھر دم کے بیگ سمیت کار میں پیچھے کر فرار ہو جائے۔“

”وہ زیادہ دور نہیں جاسکے گا۔“ سائنس نے کہا۔ ”لائسنس گاڑی کی معیقی سیٹ پر مسٹر مارکس کے ساتھ ان کی حفاظت کے لیے مسل بیٹھا ہوگا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ کار روائی کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟“

”یہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔“ ڈون نے کہا۔ ”اس نے ایک وفد مجھ پر رپ کر لیا ہے۔“

”تمہاری قسمت اچھی کمی جوج گئے اور دوبارہ مجھ سے واسطہ نہیں پڑا۔“ ریمینڈ نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”تم لوگ کس بحث میں الجھ گئے۔ تمہیں صرف آنے والی صبح پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمیں مسٹر مارکس کی حفاظت اور روزالی کو محفوظ طریقے سے گھر لانا ہے۔“

”تک! تمہیں میرا کتنا خیال ہے؟“ مارکس نے کہا۔ ”تم ہمیشہ میری بھلائی کے لیے سوچتے ہو۔“

”یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے لوگوں کے معاملات دیکھوں۔“

”اس کی مراد ہم سے ہے۔“ جوائس بولی۔ ”ہم اکٹھے کام کرتے ہیں۔“

”تم چپ رہو جوائس۔“ ریمینڈ نے اسے منع کیا۔ ”ہرگز نہیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر سارا الزام آئے۔“

”بہت ہو چکا۔“ مارکس بولا۔ ”کس نے الزام کی بات کی خاتون؟ کیا میں نے کچھ کہا؟“

”نہیں لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں بھی نہیں کہانیاں سن سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے لوگوں سے سن رکھا ہے۔ ریمینڈ کہ تم پہلے پولیس کی ملازمت اور اب پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر بھی ایماندار اور اپنے کام سے غافل ہو۔ جس کا ثبوت تم نے اس وقت بھی سچ بول کر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے سر پر نکلارنگ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے کہو۔“ ریمینڈ نے کہا۔ ”میں سن رہا ہوں۔“

”اب بہتر ٹھیکے کی مدت ختم ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ آج صبح مجھے شکار کو سے اغوا کرنے والے کا فون موصول ہوا۔ اس نے کہا کہ کل صبح سورج نکلنے پر یہ مدت ختم ہو جائے گی اور بتایا کہ روزالی کے بدلے ایک ملین ڈالر رزکب اور کہاں دیے جائیں گے۔ میں نے فوراً ایک پرائیویٹ جیٹ طیارہ چارٹر کیا اور یہاں چلا آیا۔ اب مجھے تم دونوں کی ضرورت ہے تاکہ میری پوتی کو بحفاظت واپس لاسکو۔“

”ہماری ضرورت..... وہ کیسے مسٹر مارکس؟“

”غور سے سنو تک! نہیں بتاؤ۔“

سائنس نے جو منصوبہ بتایا، وہ بہت ہی سادہ تھا۔ وہ مقررہ وقت اور مقام پر اغوا کنندہ سے ملنے۔ ان کے عقب میں سائنس اپنی سیاہ کیمریز میں ہوتا جو اس کے ذاتی استعمال میں رہتی تھی اور وہ اسے اغوا کنندہ کی گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑی کرتا۔ مارکس کو اس کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا جاتا تاکہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکے۔ لیکن دن کا کام ریمینڈ اور جوائس کرتے۔ جب ریمینڈ کو اطمینان ہو جاتا کہ روزالی بالکل محفوظ ہے تو وہ دم دینے سے پہلے اسے جوائس کے ساتھ کیمریز کی جانب روانہ کر دیتا اور اس کے بحفاظت کار تک پہنچنے کے بعد دم کے بیگ اغوا کنندہ کے حوالے کر کے خود بھی واپس آ جاتا۔

”بالکل سادہ۔ ایک دو تین کی طرح۔“ سائنس نے

”پرست سمجھنا کہ میں تمہاری وفاداری کو تسلیم نہیں کروں گا یا تمہیں اس کا انجام نہیں ملے گا۔“

”مجھ پر تمہارا اعتماد ہی سب سے بڑا انجام ہے۔“
ریمنڈ بولا۔ ”مداخلت کی محذرت چاہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اب مجھے اور جوآنس کو چلے جانا چاہیے تاکہ ہم بھر پور نیند لینے کے بعد صبح تازہ دم ہو کر اپنے مشن پر جا سکیں۔“

”مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹا پہلے یہاں پہنچ جانا۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔“ سائنن نے کہا۔

اگلے روز صبح سائنن کی لیموزین مقررہ مقام پر سورج نکلنے سے آدھ گھنٹا پہلے پہنچ گئی۔ اس وقت دور پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے عقب سے سورج کی تاریخی شعاعیں نمودار ہو رہی تھیں اور جنگی پرندوں کی آوازیں فضا میں نغمہ بکھیر رہی تھیں۔ اس مقام کی نشاندہی کے لیے ٹیکس کی جھاڑیوں پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ یہ جگہ مرکزی شاہراہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک دو روہ پرانی سڑک پر واقع تھی اور دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ لاس ویگاس کے جرائم پیشہ گروہ اس جگہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ سائنن کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسی ایک براؤن اور سفید رنگ کی اسٹیشن ویگن آئی ہوئی دکھائی دی اور ان سے پچاس گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس نے تین مرتبہ ہارن دیا۔ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے پھر ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے مزید تین دفعہ ہارن بجایا۔ اس دوران گاڑی کا انجن چلتا رہا۔

”ٹک! پڑ سکون ہو جاؤ۔“ مارکس نے کہا۔ ”وہ یہاں آگئے ہیں۔ یہ زیادہ اہم ہے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ہونٹوں کو اس طرح حرکت دینے لگا جیسے زیر لب کوئی دعا پڑھ رہا ہو۔ پھر اس نے ریمنڈ اور جوآنس کو اس گاڑی کی جانب روانہ کر دیا۔ وہ سب لیموزین کے ساتھ کھڑے انتظار کرتے رہے۔ جیسی ایک شخص کرپسٹر کی پچھلی سیٹ سے باہر آیا اور بولا۔ ”نال لے آئے؟“

ریمنڈ نے بیگ اوپر کر کے دکھایا تو وہ بولا۔ ”یہ مجھے دے دو۔“

”نہیں۔“ ریمنڈ بولا۔ ”پہلے تم لڑکی دکھاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ صحیح سلامت ہے یا نہیں۔ جب وہ آدھا راستہ طے کر کے میرے پاس آ جائے گی تو میں یہ رقم تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس شخص نے ایک ہاتھ بڑھا کر گاڑی میں سے لڑکی کو باہر آنے میں مدد دی جسے دیکھتے ہی ریمنڈ نے پہچان لیا۔

”تم ٹھیک تو ہو س مارکس؟“ ریمنڈ نے پوچھا۔
اس لڑکی کے بند ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”تمہیں کسی قسم کی تکلیف یا درد تو محسوس نہیں ہو رہا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا تو ریمنڈ نے جوآنس کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھنے لگی۔ ریمنڈ نے سر کوٹھکی میں کہا۔ ”یہ احمق کوئی بھی غلط حرکت کر سکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ ایسی صورت میں کیا کرنا ہے؟“

”ایک قدم پیچھے رہ کر تمہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کروں گی یا اس کے علاوہ کوئی پلان بی بھی ہے؟“
”تم تیزی سے زمین پر لیٹ کر فائرنگ سے بچنے کی کوشش کرو گی اور میں اپنے ریوالور سے انہیں جواب دوں گا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ وہ میرے ٹخنے سے بندھا ہوا ہے۔“
”ہمیں سسل ہونے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔“ جوآنس نے کہا۔

”ہمیں مرنے کے لیے بھی نہیں کہا گیا تھا۔“
”یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میری کمرے کوٹ کو برا بندھا ہوا ہے۔“ وہ احمق کسی ڈانسر کے انداز میں چلتا ہوا آیا۔ اس نے مقبول لباس پہن رکھا تھا اور چلیے سے اپنے گرد ب کاسرنگ رکھا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو رعب دار بنانے کے لیے کلاڑی کیمبل جیسی مومچیں رکھی ہوئی تھیں۔

ریمنڈ کا خیال تھا کہ وہ جولی کا بوئے فرینڈ فریڈی ناش ہے لیکن اس وقت ان کے درمیان ایسا کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مغبوطی سے جولی کی کلاڑی پکڑ رکھی تھی اور وہ اسے تحارت آیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔
”بیگ کھولنا کہ میں ایک نظر دیکھ سکوں۔“ اس احمق نے کہا۔

”پورے دس لاکھ ہیں۔ تم اپنے اطمینان کے لیے انہیں گن سکتے ہو۔“ ریمنڈ نے بیگ کھول کر رقم دکھاتے ہوئے کہا۔

”مسٹر مارکس عزت دار شخص ہیں۔ انہوں نے مجھے پوری رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مجھے ان کے کہے ہوئے پر اعتماد ہے۔ تم ان کی پوتی کو لے جا سکتے ہو۔“
جوآنس نے جولی کی کمرے کر گرد بازو ڈالا اور اسے

اللہ کے نام پر

ایک فقیر ایک چمچ والے کے پاس گیا اور کہا کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ پھل والے نے فقیر کو گھور کر دیکھا اور پھر ایک گلاسز آٹا کھٹ کر فقیر کی جمولی میں ڈال دیا۔ فقیر کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر پھل والے کو تیس روپے نکال کر دیے اور کہا تیس روپے کے آٹا دو۔ دکاندار نے دو بہترین آٹا اٹھائے اور لفافے میں ڈال کر فقیر کو دے دیے۔ فقیر نے ایک ہاتھ میں گلاسز آٹا اور دوسرے ہاتھ میں بہترین آٹا والا لفافہ لیا اور آسان کی طرف نگاہ کر کے کہنے لگا..... دیکھ اللہ انسان کی سوچ۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی پسندیدہ چیز اللہ کے رستے میں قربان نہ کرے۔

(مسئلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ)

”اور تم غلط تھے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟“

”نہیں۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ میں بالکل صحیح تھا۔“

”بہر حال تمہیں مارنے کا اعزاز میرے حصے میں آئے گا جبکہ لائن بقیہ لوگوں کو دیکھے گا۔ ٹھیک ہے لائن! میں کتنی شروع کرتا ہوں۔“

”وہ ابھی دو تک ہی پہنچا تھا کہ لائن نے فائر کر کے اسے گرا دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔“

”اس غدار کی بھی سزا ہونی چاہیے۔“ مارکس نے کہا۔ ”شکر ہے لائن۔“

لائن نے جواب میں سرخم کیا پھر اپنی گن کا رخ ریمینڈ اور جو اس کی طرف کر لیا جنہوں نے بدحواسی میں اپنے ہتھیار نکال لیے تھے اور اسے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔

”تم دونوں گولی چلانے سے پہلے ہی مار دیے جاؤ گے۔“ لائن نے کہا۔ ”مشر مارکس! تم کیا چاہتے ہو.....“

”میں ان کے ساتھ کیا کروں؟“

”ابھی کچھ نہیں لائن۔ تم اپنی گن ہٹالو۔ تم دونوں سے بھی میں یہی کہوں گا۔ آج کافی شوٹنگ ہو چکی ہے۔“ پھر

— سر مارکس۔ ریمینڈ بائیں دیوار سے مار رہا ہے۔ مارکس سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ہلایا اور ایک منٹ بعد وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ وہ بے تحاشا اس کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ وہ احمق تیزی سے اسٹیشن وین تک پہنچا اور کوڈر کبجریٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی اور اس کی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ریت ڈالتا ہوا چلا گیا۔

جب ریمینڈ لیوزین کے پاس پہنچا تو مارکس نے پھرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں نے میرے لیے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے اور میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”تم اسے یاد رکھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں رہو گے اور نہ ہی اس سے کسی کو کوئی فرق پڑے گا۔“ سامنن نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے تم تینوں ہی ایک ساتھ اس دنیا سے جاؤ گے۔“ یہ کہہ کر وہ اور لائن لیوزین سے باہر آ گئے۔

انہوں نے اپنے ریوالور کا رخ مارکس اور دوسرے افراد کی جانب کر لیا تھا۔

”تیرے کیسی باتیں کر رہے ہو تک؟“

”تمہیں کیا لگ رہا ہے چلی؟ میں اسی دن کے لیے وعامیں کر رہا تھا اور مجھے صرف صبح وقت اور موقع کا انتظار

تھا۔ روزانی کے انخوا سے یہ موقع مل گیا اور آج ہم یہاں موجود ہیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تمہاری لاش دریافت ہوگی تو میں بہت بڑے پیمانے پر تمہاری تجویز و تکلیف کا

اجتہاد کروں گا جو اس سے پہلے دیگاس میں کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔“

”میں نے سنا تھا کہ تم میرے بارے میں غلط باتیں کر رہے ہو لیکن مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ مجھے اتنے سالوں

سے تم پر بھروسہ ہے اور میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ بیٹے جیسا سلوک کیا.....“

”لیکن میں کبھی تمہارا وارث نہیں بن سکا جو کہ میں چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے دیگاس تک محدود کر رکھا ہے جبکہ میں

ڈیگا کو کا کنٹرول چاہتا ہوں تاکہ تمہارے بعد میں پورے آپریشن کی نگرانی کر سکوں۔“

”تم جانتا جا رہے ہو کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں بتاتا ہوں کیونکہ یہ عہدہ تمہاری شخصیت اور خواہشات کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ لہذا میں نے تمہیں دیگاس بھیج

دیا اور تمہیں ایلا موڈ دے دیا۔ یہ کوئی سزا نہیں تھی بلکہ تمہارا ٹیسٹ تھا کہ تم ثابت کر سکو کہ میں غلط ہوں۔“

وہ روزانی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم تو ٹھیک ہو میری شہزادی؟“
 ”بالکل ٹھیک۔ سب کچھ ایسے ہی ہو جیسا تم چاہتے تھے؟“
 ”ہاں۔“
 ”میرا کام کیسا رہا؟“
 ”میں اس سے بہتر کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے اپنا کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔“
 ”میں کچھ سمجھا نہیں۔ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟“
 ریمینڈ بولا۔

مارکس اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تک کے دل میں کیا خواہش بکھر رہی ہے۔ اس نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ میں بوزحہ ہو گیا ہوں۔ اس لیے میری جگہ اس جیسے کسی شخص کو لایا جائے جس کے پاس تنظیم کو چلانے کے لیے نئے اور تازہ خیالات ہوں تاکہ گروہ کے ہر رکن کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے۔ وہ اس معاملے میں اس حد تک بے پروا ہو گیا کہ ان لوگوں کے سامنے بھی برلا اس بات کا اظہار کرنے لگا جو میرے وفادار تھے۔ ان میں لائن بھی تھا۔ یہ سب لوگ اس کے بارے میں مجھے پوری طرح باخبر رکھے ہوئے تھے۔۔۔ بالآخر میں نے اس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس طرح کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔“

”بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں روزانی کے جھوٹے اغوا کا خیال آیا۔ اسی طرح میں تک کو گھیر سکتا تھا لیکن اس کے لیے روزانی کو رضامند کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اسے فون کر کے پوری صورت حال بتائی اور کہا کہ کیا وہ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔ اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا کہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گی۔“
 روزانی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔۔۔ اور اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”میں ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گی۔“

مارکس نے کہا۔ ”تک کو اس ڈرامے میں اس وقت شامل کیا گیا جب میں نے اس سے کہا کہ وہ روزانی کی بازیابی کے لیے تم سے رابطہ کرے۔ اس کے علاوہ اس نے لائن سے یہ بھی کہا کہ اگر میں تادان کی ادائیگی کے لیے ویکس آیا تو یہ اس کے لیے اچھا موقع ہوگا کہ میں واپس نہ جا سکوں اور وہ میری جگہ لے سکے۔ اس وقت تک میں دوسرے لوگوں کو تیار کر چکا تھا کہ وہ جہیں بھی جاتے رہیں اور

تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے۔“
 ”یوئے فرینڈ فرینڈی ٹاش کے بارے میں کیا کہو گے؟ کیا وہی اغوا کنندہ کا رول ایلے کر رہا تھا؟“
 ”ہاں۔ روزانی کا کہنا ہے کہ اس نے پہلی بار کوئی کام ڈھٹک سے کیا ہے۔ لہذا میں نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ اب وہ کیا کرے گا اور وہ دس لاکھ ڈالرز کہاں استعمال کرے گا جو میں نے شادی سے پہلے ہی اسے تحفے میں دے دیے۔“
 ”اسٹیشن ویکن کا ڈرائیور کون تھا؟“

”بلی ولیمز۔ میں نے اس کے سامنے دو راستے رکھے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ ٹاش کو دی جانے والی رقم میں حصے دار بن جائے یا مرکزی ہال میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اس نے مرکزی ہال کا انتخاب کیا۔“
 ”مجھے اس سے یہی توقع تھی۔“ روزانی نے کہا۔
 مارکس بولا۔ ”اگر تمہارے سوالات ختم ہو گئے ہوں مسٹر ریمینڈ تو لائن ہمیں واپس ایلا مولے جائے گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی لیوزن کی غیر موجودگی پر توجہ دے۔“
 ”میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے مسٹر مارکس۔ کیا تم واقعی یہ توقع رکھتے ہو کہ میں اور جوئس اس معاملے میں خاموش رہیں گے۔ ہم دونوں نے لائن کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ اسے اس کا خلیانہ بھگتنا ہوگا۔“
 جوئس بولی۔ ”چپ ہو جاؤ ریمینڈ۔ تم بہت زیادہ بولتے ہو۔“

لائن غرایا۔ اس نے اپنی گن نکالی اور ریمینڈ کو نشانے پر لے لیا۔
 ”ابھی نہیں لائن۔“ مارکس نے کہا۔ ”اپنی قبر کھودنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لو مسٹر ریمینڈ۔ تم لائن کو گرفتار اور اس پرنٹل کا الزام عائد کرنا چاہتے ہو۔ تم نے روزانی اور مجھ پر بھی اٹلی اٹھائی ہے۔ ہم دونوں ذاتی دفاع کا حق استعمال کر سکتے ہیں۔ البتہ لائن پر مقدمہ چلے گا اور تم دونوں بھی اس کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں کہ تم میرے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہو۔“
 جوئس کو سب نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کولٹ کو برا نکالا اور لائن کے سینے میں چار گولیاں اتار دیں جس کی آنکھوں میں زمین پر گرنے سے پہلے حیرت اتر آئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے قاتل کو پہچان گئی تھی۔

اللہ کو پیارے ہو گئے۔
لال حویلی سے متعلق مختلف اندازے اپنی جگہ لیکن دل
کشا کا اپنا دامن ہر قسم کی تہمت سے بالکل پاک تھا۔ یہی وجہ
تھی کہ آج بھی دل کشا کی لال حویلی شرفاء کی ادبی محفلوں کا
مرکز بنی ہوئی تھی۔ لکھنؤ کی دم توڑی ادبی تہذیب کم از کم لال
حویلی میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ ہر مہینے لال حویلی میں
مشاعرے کی محفل برپا ہوتی تھی جس میں لکھنؤ کے بہت سے شاعر اور

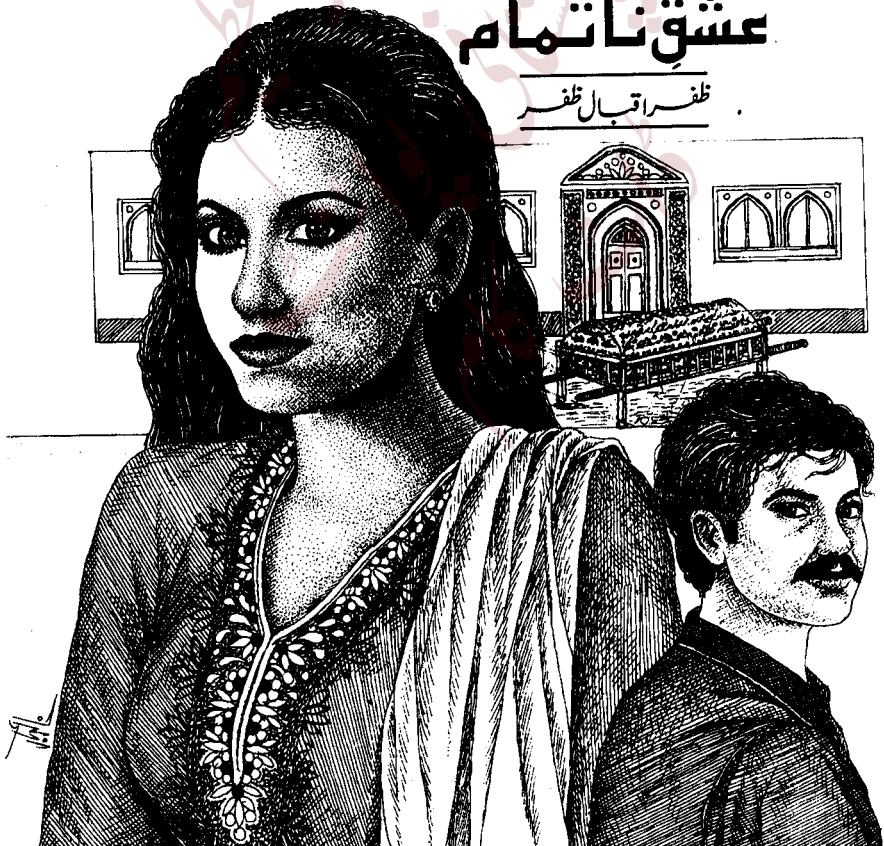
دل کشا بانی کی لال حویلی لکھنؤ کی گھنچان آبادی میں
بالکل نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ اس لال حویلی کے بارے میں
طرح طرح کی روایات مشہور تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دل
کشا نے اپنی نوعمری میں ہی بھرا میلا چھوڑ کر اپنی جگہ پونجی سے
یہ لال حویلی خریدی جبکہ یہ بات زیادہ مشہور تھی کہ لکھنؤ کے ایک
دل پیچک نواب نے دل کشا کو بازار حسن سے نکال کر یہ حویلی
جتنے میں دی لیکن نواب صاحب دل کشا کو اپنانے سے پہلے ہی

عشق کی منازل طے کرنے والے دو عاشقوں کی دلگداز روداد

منزل ملے نہ ملے مگر کبھی کبھی ادھر سے سفر میں بھی زندگی
مکمل ہو جاتی ہے اور پھر انہی رستوں پر قدرت دوسرے
مسافر کو لے آتی ہے تاکہ مطلوبہ منزل کا ہدف پورا ہو سکے۔
کچھ ایسا ہی کھیل مقدر نے یہاں بھی کھیلا جب اس کے عشق
نا تمام کی تمام آزمائشیں پوری ہو گئیں اور اگلے مسافر نے
سفر مکمل کر کے منزل مقصود پالی تو قدرت کی مصلحت
سمجھ میں آ گئی۔

عشق نا تمام

ظفر اقبال ظفر



نئے شاعروں کے علاوہ سامعین شرفاء بھی اچھی بھلی تعداد میں باقاعدگی سے آتے اور دل کشا کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے تھے۔

دل کشا کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پرکشش اور جاذبِ نظر نقوش کے ساتھ ساتھ نوانوی حسن سے بھرپور دل کشا اپنے اعزاز و اطوار اور شانستہ گفتگو سے گھنٹوں کے طلسماتی حسن کی چلتی پھرتی تصویر اپنی عمر سے آدمی نظر آتی۔ شہر کے بعض نوابین اور دل چیلے شعراء صرف اور صرف دل کشا کی قربت میں کچھ وقت گزارنے کی خاطر لال حویلی میں آیا کرتے تھے۔ دل کشا کے رویے میں سردہری نہیں تھی تاہم رکھ رکھاؤ اور بے حجابی میں بھی دل کشا کا محتاط تکلف کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ جس کر لوگوں سے بات ضرور کرتی تھی لیکن اس کی خاموشی بے تکلفی اور وارفتگی کی دعوت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے دل کشا کی محفل اور قربت میں گھنٹوں بیٹھنے والے شرفاء محتاط رہ رہا کرتے تھے پھر ایک دن اس حویلی میں ہو بہو دل کشا کی شکل و شخصیت کو دیکھ کر شور ہوا۔

وہ نوجوان آج تیسری بار اس محفل میں شریک ہوا تھا۔ اکیس بائیس سال کا گورا چٹا، چھیکے ناک نقشے والا نو عمر لڑکا، خاموش طبع، اجنبی اور تاملانوس، شاعر تو وہ تھا نہیں کہ اسے اظہار کا موقع دیا جاتا بس چپ چاپ سامعین میں بیٹھا اپنی بوٹی آنکھوں سے دل کشا کے سراپا کا طواف کرتا رہتا تھا اور ساتھ ہی اس کا عکس بھی تلاش کرتا رہتا تھا۔ جسے اچانک اس نے پہلی بار ہی محفل میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا لیکن وہ پھر نظر نہ آئی۔ اس نو عمر لڑکے کی اجنبیت پہلی بار تو کئی لوگوں کو کھلی لیکن جب آج تیسری بار بھی وہ محفل میں خاموشی کے ساتھ شریک ہوا تو دوسرے حضرات نے اس پر توجہ دینی چھوڑ دی لیکن آج بھی ایسا ہو رہا تھا کہ دل کشا کو سرتا یا اپنے وجود میں اس لڑکے کی نگاہیں بہتست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

شاعرے میں سب سے زیادہ داد حاصل کرنے والے شاعری غزل کو محفل کے اختتام پر دل کشا ترنم کے ساتھ پیش کیا کرتی تھی اور یہ لہجہ قیامت کا ہوتا تھا۔ دل کشا کا ترنم اور دل گداز ترنم اور گانگی کا انداز حاضرین کو یوں مسحور کر دیتا کہ سماعتوں میں نغماتی گھنٹیوں کی مدھڑاواز اور سینوں میں بے ترتیب سانسوں کا بیجان برپا ہونے لگتا تھا۔

اس نوجوان کا معمول سب سے مختلف اور کسی قدر حیرت انگیز تھا۔ دل کشا جو نبی غزل سرا ہوتی وہ ایک سنسناتی ہوئی بھرپور نظر دل کشا کے سراپا پر ڈالتا اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر

چلا جاتا تھا۔ شاید آج بھی ایسا ہی ہوتا لیکن دل کشا نے غزل چھیڑنے سے پہلے معمول سے ہٹ کر حاضرین کو ایک پراسرار حیرت میں ڈال دیا۔

”اجنبی لڑکے! محفل کے اختتام تک آپ تشریف رکھیے گا، ہم تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“ دل کشا نے اس مختصر اعلان کے بعد اپنا ترنم بکھیرنا شروع کر دیا۔

آج حاضرین کی کیفیت جدا تھی۔ سب کے دلوں میں اجنبی نوجوان کھلک رہا تھا۔ عام حالات میں حاضرین کی توجہ ایک بل کے لیے بھی دل کشا کے ترنم سے نہیں ہٹتی تھی لیکن آج حاضرین عدم دلچسپی کا شکار ہو رہے تھے۔ دہلی دہلی سرگوشیاں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں سوالوں کا حقیر، دلوں میں اجنبی نوجوان سے متعلق رقابت کی آنچ..... اور پھر اس کے ساتھ ہی دل کشا نے غزل ملل کر ڈالی۔

محفل اختتام کو پہنچی۔ حاضرین ایک ایک کر کے اجنبی لڑکے کو رشک و حسد سے دیکھتے اور گھورتے روانہ ہو گئے۔ اب لال حویلی میں دل کشا تھی اور وہ اجنبی نوجوان۔

☆☆☆

فیض آباد گھنٹوں کے رکاب گنج میں خیر جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پھیل گئی کہ نواب صاحب علی خان اور رییس بیگم میں طغیانی ہو گئی ہے۔ ہر طرف کوچہ و بازار میں چہ میگوئیاں تھیں کہ جتنی جلالت میں نواب صاحب علی خان اور رییس بیگم کی شادی ہوئی اتنی ہی جلد یہ تانواٹ گیا۔

نواب صاحب علی خان ابھی عمر کے بائیسویں سال میں تھے کہ انہیں ان کی خالہ زاد رییسہ بانو کے ساتھ شادی کے بندن میں باندھ دیا گیا اور یوں رییسہ بانو بہت ہی کم عمری میں رییسہ بیگم بن کر نواب صاحب علی خان کے ہاں آ گئیں۔ فیض آباد کے نوابوں کی روایت سے ہٹ کر یہ پہلی شادی تھی جو اتنی کم عمری اور عجلت میں چٹ مٹتی اور پٹ بیاہ کے انداز میں کی گئی تھی۔ بعض لوگوں کو دے دے انداز میں کہتے سنا گیا کہ نواب صاحب علی خان کو شاعری کا روگ لگ گیا تھا۔ شاعری میں تشنہ تخلص فرمانے لگے تھے۔ ان کا اکثر آنا جانا شاعروں کی محفل میں تو تھا ہی اب سنا تھا کہ مشتری بانی کے گوشے پر بھی جانے آنے لگے ہیں۔

خاندان والوں نے کسی اندیشے کے پیش نظر انہیں رییسہ بیگم کی زلفوں سے باندھ ڈالا۔ نواب صاحب علی خان تشنہ اور رییسہ بیگم کا ازدواجی گھمٹا ہونے ایک سو سال ہی ہوا تھا کہ خدا نے انہیں بیٹے کی دولت سے بھی نواز دیا۔ اس مضبوط رشتے

کے باوجود اور بیٹے کی ولادت کے تین سال بعد نواب صباحت علی خان اور نیرہ بیگم میں علیحدگی ہو گئی۔

خاندان میں دونوں طرف سے بھونچال آ گیا۔ نیرہ بیگم کم عمری میں طلاق کا ٹیکا مانتے پر سجانے اور اپنے تین سالہ بیٹے کو سینے سے لگا کر دوسرے پورٹن میں چلی گئیں اور نواب صاحب نے خاندان والوں کی طعن و تشنیع اور لعنت طامت سے یکدم بے نیاز ہو کر چپ سادہ لی اور گوش نشین ہو گئے۔

تین ماہ کی قلیل مدت میں نواب صباحت علی خان تشنہ اپنی تہائی اور گوش نشینی کے سبب بجائے کس موذی مرض میں مبتلا ہوئے کہ عمر کے چھبیسویں سال میں دنیا چھوڑ گئے۔ ان کی بس ایک ہی وصیت تھی کہ انہیں دفنانے سے پہلے ان کا جنازہ چند خانے کے لیے مشتری بائی کے کوٹھے تک ضرور لے جایا جائے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ رکاب گنج کی ایک نیم تارک سی گلی میں ایک سال خوردہ اور خستہ حال مکان کے سامنے نواب صباحت علی تشنہ کی میت کچھ دیر کے لیے رکھی گئی اس دوران میں گلی میں کھٹنے والی کوٹھے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا۔ لوگوں نے چند سیکیوں کی آواز سنی اور کھڑکی بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب صباحت علی تشنہ کا جنازہ اٹھایا گیا۔

☆☆☆

لال حویلی کے دیوان خانے سے اتر کر جانے والوں کے قدموں کی چاپ معدوم ہوئی تو دل کشا نے نوجوان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

”آپ متواتر ہماری محفل میں آنے لگے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سخن بھی کا ذوق آپ کو لال حویلی میں بھیج کر لاتا ہے؟“

”جی نہیں، ہمیں شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”تو پھر، آپ کے یہاں آنے کا مقصد؟“ اب دل کشا کے سوال میں حیرت چھی شامل تھی۔

”ہمیں شاعروں کی صحبت نہیں بلکہ ایک انجانی سی کشش لال حویلی میں بھیج کر آتی ہے۔“ نوجوان نے بلا خوف و تردد سادگی سے اپنے دل کی سچائی اظہار دی۔ دل کشا نے نوجوان کی سادگی اور جرأت کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

”اچھا تو آپ ہماری قربت کے لیے یہاں آتے ہیں، مگر کیوں؟“

”ہم نے فیض آباد کے گلی کوچوں سے لے کر بازار و مگرارت تک آپ کے حسن اور شائستگی کے چرچے سنے ہیں، سوچا ذرا ہم بھی تو دیکھیں وہ کون ہے جس کی بازگشت پورے کھنڈو

میں سنائی دیتی ہے۔“

نوجوان نے متانت کے ساتھ اپنی کتاب دل کا ایک اور ورق الٹ دیا۔ دل کشا نے نوجوان کے چہرے پر وارفتگی کے رنگ بھرتے دیکھے اور ذرا توقف کے بعد بات آگے بڑھائی۔

”ہمارا نام تو آپ نے کھنڈو کے کوچہ بازار میں سن لیا، کیا آپ اپنا تعارف نہیں کرنا چاہتے؟“

”ہمیں نواب فراست علی خان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

جواب پا کر دل کشا کی نظریں نوجوان کے سراپا کا طواف کر کے اس کے چہرے کے نقوش میں جھٹکنے لگیں۔

”آپ ہمیں اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

نوجوان کے استفسار سے بے نیاز دل کشا کی نگاہیں نواب فراست علی کی صورت میں شناسائی کی الجھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کر رہی تھیں پھر دل کشا نے اپنے لبوں پر گہری مسکراہٹ سجا کر سوال کیا۔

”فراست علی! آپ کا شغل کیا ہے؟ روایتی نواب زادوں کی طرح پر آسائش فراغت یا کچھ اور؟“

”ہم لی۔ اسے کہتے ہیں، کچھ اور ضروری تعلیم کے بعد کلکٹر بننا چاہتے ہیں کیونکہ کلکٹر بننا ہمارا خواب ہے۔“

فراست علی کے جواب سے ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔ ”اور آپ کا ہماری لال حویلی میں آنا جانا کب تک رہے گا؟“ دل کشا نے سوال کیا۔

”جب تک ہم آپ کے تعلق کو کوئی نام نہ دے دیں۔“

”کیا مطلب؟“ دل کشا فراست علی کے جواب پر چونک اٹھی۔ دل کشا کا دل سینے میں لرز اٹھا تھا۔

”ہم آپ سے رشتہ جوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لیے آپ کی صحبت میں پناہ لینا چاہتے ہیں دل کشا۔“

فراست علی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

لال حویلی کے دیوان خانے میں دل کشا کی ہنسی ٹھٹھکانی اور فراست علی کے سینے میں جلتے بج گئے۔

”آپ نے تو ہم سے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ یوں سنا ڈالا جیسے یہ سب کچھ آسان ہو۔“

”ہم شاعر تو نہیں کہ محبت کا اظہار کرنے کے لیے دل آویز لفظوں کا سہارا لے سکیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ سچا ہو تو مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔“

”ہم آپ کے جذبہ محبت کی قدر کرتے ہیں لیکن پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنا کلکٹر بننے کا خواب تو پورا

کر لیں۔“

دل کشا نے اپنے لہجے کی نمی سے فراست علی کے اندر کی آج کو سرد کرنا چاہا۔ ”تعلیم تو آپ سے تعلق داری کے بعد بھی مکمل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی کلکفر بننے کا خواب پورا کیا جاسکتا ہے۔ پہلے ہم اس خواب کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں جو خواب ہمیں لال حویلی کے زندان عشق کا امیر کیے جا رہا ہے۔“

فراست علی نے بمشکل تمام اپنا آخری جملہ مکمل کیا۔ اب اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اترا آئی تھی۔ شاید اندر سے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ دل کشا نے اگر اسے چھو اتو ڈھٹ کر بکھر جائے گا۔

”نواب فراست علی! آپ جانتے ہیں لال حویلی میں رہنے والی دل کشا کی شہرت کا تعارف حسن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے، بکھنوں کے کوچہ و بازار آپ کو دل کشا بانی کے نام سے جانتے ہیں۔“

”تو پھر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود آپ.....؟“ دل کشا کا یہ سوال ٹیکھا بھی تھا اور مشکل بھی۔

”شاید آپ کو اس دل کی تشنگی کا اندازہ نہیں..... یہ تو جس کے حصے میں آجائے وہی جانتا ہے۔“

”لیکن معروں کا فرق جانتے ہی ہیں آپ؟“

دل کشا نے ماہ و سال کے تفاوت کا سپار لایا۔ جانے وہ فراست علی کی باتوں سے کیا مطلب اخذ کر رہی تھی۔

”معروں کا فرق ہم اور آپ تو سمجھتے ہیں لیکن کیا کیجیے یہ دل اس فرق کو نہیں مانتا۔ ہماری عمر بائیس سال ہے۔“

فراست علی کا جواب سن کر دل کشا نے بے یقینی سے پہلو بدلا۔ اب دل کشا کے لیے جواب کی مشکل آ پڑی تھی۔ ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش تھا۔

”ٹھیک ہے نواب فراست علی! آپ کے جذبہ عشق سے سچائی کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہم دل سے آپ کی محبت کے مترقب ہو گئے ہیں۔ لال حویلی کے درود یوار آپ کی برات کے لیے چشم براہ ہو رہے۔“

دل کشا کی مٹنی چٹکوں کے سائبان مجاہدانہ انداز میں گرے تو فراست علی کی روح میں مسرت اور خوشی کا موسم گل ایک نئی زندگی اور تازگی کی نوید لے کر آ گیا۔

”لیکن ہماری رضامندی مشروط ہے۔“

دل کشا کی مترنم آواز نے فراست علی کی سانسوں میں آزمائش کی ایک نئی گرہ لگا دی۔

”کیسی شرط؟“ فراست علی خوشی سے سرشار ہوتے

ہوتے تڑپ اٹھا۔

”جب تک آپ کلکفر بننے کا خواب تعبیر نہیں کر لیتے ہم اپنی لال حویلی میں آپ کے لیے سراپا انتظار رہیں گے۔“

دل کشا نے پلکیں اٹھائیں تو جھل جھلی گہری آنکھوں میں لہجے کی لنگر انداز کشتیوں پر انتظار کے بادبان پھڑ پھڑ اٹھے۔

فراست علی نے بادبانوں کی پھڑ پھڑا ہٹ اپنے کانوں سے سنی اور محبت کی کھڑکی میں متاع اعتماد سینٹے ہوئے یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

”دل کشا! ہم آپ کی شرط ضرور پوری کریں گے۔ کلکفر بننے کے خواب کی تعبیر ہر ایک ایک دن ضرور لوٹیں گے۔ آپ اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔“

پھر فراست علی نے چاروں طرف گھوم کر لال حویلی کے درود یوار کو دیکھا جیسے درود یوار کو گواہی کا پندار سونپا جا رہا ہو۔

نواب فراست علی نے ایک بھر پور اودامی نظر ڈالی پھر خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دیوان خانے سے اترنے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

دل کشا بائیس برس کے نواب فراست علی خان کو جاتے دیکھ کر خود بھی بیس سال پیچھے ماضی کے تنگ و تنار یک رستوں سے گزر کر رکاب بیج کے اس خست و تنار یک کوٹھے تک پہنچ گئی جہاں ایک مشتری بانی لگی میں کھٹنے والی کھڑکی کے پت کھول کر کسی کی راہ دیکھا کرتی تھی۔

☆☆☆

نواب مباحث علی خان نوخیز جوان تھے۔ کھنوں کی ادب پرور فضاؤں نے انہیں شاعری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ انتہا درجے کے حساس طبیعت تھے۔ اپنے احساسات اور جذبات کو لفظوں کی پوشاک پہنانے کا فن اچھی طرح سیکھ چکے تھے۔

نواب مباحث علی خان سے مباحث تشنہ بننے میں عمر انگاں نہیں گئی تھی۔

نواب مباحث تشنہ نے آج اپنی غزل سنائی تو مشتری بانی نے خلاف معمول داد نہیں دی، بس یک تک وہ نواب مباحث کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا ہوا مشتری بانی؟ آج آپ کے اس سکوت کا ہم کیا مطلب لیں؟“ نواب مباحث نے اچھٹے ہوئے پوچھا۔

”نواب مباحث علی خان! اب آپ ہمارے کوٹھے پر آنا جانا چھوڑ دیجیے۔“ مشتری بانی نے گہرے سکون سے جواب دیا۔

”آخر کیوں؟“

علحدگی کا دُغم سوہان روح بن چکا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو ایک بھیا تک خواب کی طرح بھلا دینا چاہتی تھیں۔ اب ریسیہ بیگم کی کل کائنات ان کا بیٹا تھا۔ ریسیہ نے فراست علی کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ فراست علی خود بھی حد درجہ ذہین، منجیدہ مزاج اور کم گدوا قبح ہوا تھا۔

وہ خوبصورتی اور مردانہ وجاہت میں بالکل نواب صباحت علی پر گیا تھا۔ اس کی تعلیم کا سفر بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نجمانے کیوں ریسیہ بیگم نے صباحت علی خان کی ایک خواہش کو اپنے دل میں جگہ دے دی تھی اور یہ خواہش صباحت علی خان کی امانت کے طور پر ریسیہ بیگم کے دل میں پروان چڑھ رہی تھی۔

فراست علی کی پیدائش پر نواب صباحت علی خان نے واجبی طور پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور بے ساختہ ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا۔

”ریسیہ بیگم! ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بڑھ لکھ کر نکلتے ہو۔“
پھر حالات نے ایسا پلٹا لکھا یا کہ کچھ ہی عرصے بعد نواب صباحت علی اور ریسیہ بیگم میں علیحدگی ہو گئی۔

ریسیہ بیگم نے دیکھوں کی گود میں صباحت علی کے اس جیلے کی پرورش کی تھی۔ اب ریسیہ بیگم کو اپنے خواب کی تعبیر ملنے ہی والی تھی۔

☆☆☆

دل کشا کو فراست علی سے کیا ہوا عہد بھولا نہیں تھا۔ چار سال بعد بھی فراست علی کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کی بازگشت دل کشا کو لال حویلی میں سنا دی جیتی تھی۔

ان چار برسوں میں فراست علی بھی بھولے سے بھی لال حویلی کی طرف نہیں آئے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا کوئی رابطہ بحال رکھا تھا۔ اس کے باوجود دل کشا کو یقین تھا کہ فراست علی اپنے عشق کی خود سری سے مجبور ہو کر ایک دن لال حویلی میں ضرور آئیں گے۔

صحیحی میں دلی ریت کی طرح سے تین برس روز و شب کی گردش میں بھر گئے۔ ان چار برسوں میں بہت کچھ بدل گیا اور بہت کچھ بڑھ گیا۔

دل کشا بیمار رہنے لگی۔ ادنیٰ محفلوں کی رونقیں دم توڑ گئیں۔ شاعروں اور سخن نگیم حضرات کی آمد کم ہوتے ہوتے بالکل محدود ہو گئی۔ لے دے کر لال حویلی میں بیماری کے سبب گری پڑی دل کشا بھی یا حویلی کی پرانی خادمہ خورن۔ بھی بکھا کوئی بھولا بھٹکا ملنے والا آجاتا تو کچھ دیر کے لیے لال حویلی کے آباد ہونے کا احساس جاگ اٹھتا تھا، ورنہ دن رات خاموشی اور سائے میں ڈوبی

”نواب صاحب! ہم طوائفوں کے کوشٹوں پر لکھنؤ کے شرفاء اپنی اولاد کو تہذیب و شائستگی کے آداب سکھانے کے لیے توجیج کیے ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ نواب صباحت علی کی بے چینی بڑھ گئی۔
”لیکن شرفاء کی آداب سکھانے والی طوائف کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کرتے۔“

”ہم ان شرفاء سے مختلف ہیں مشتری بانی، ہم ہر قیمت پر.....“

”لیکن آپ کی توشادی ہو گئی ہے۔ ریسیہ بیگم نے آپ کا گھر آباد کر دیا ہے۔“ مشتری بانی نے تڑپ کر جواب دیا۔

”ہم اپنی کشتیاں جلا کر آئے ہیں مشتری بانی۔ ہم نے اپنے آباد گھر کو ریسیہ بیگم کے وجود سے خالی کر دیا ہے۔ اپنے دل کی طرح۔“

”کیا مطلب؟“ مشتری بانی کی آنکھوں میں حیرت کی طغیانی آئی۔

”ہم نے ریسیہ بیگم کو طلاق دے دی ہے اور اپنا بچہ بھی ان کی آغوش میں ڈال دیا ہے۔“

مشتری بانی کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں لہرائیں اور دل میں ایک ککک کے سرچکننا شروع کر دیا۔

”نواب صاحب! کاش آپ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ملے ہوتے تو آپ کو ایک قیامت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔“

”قیامت! ایسی قیامت؟“ نواب صباحت علی کی بے چینی ان کے ذہن و دل میں ایڑیاں رگڑنے لگی۔

”آپ نے ریسیہ بیگم اور اپنے لخت جگر کو جس کی خاطر چھوڑ دیا، میں کچھ دن پہلے ہی خاموشی سے اس کے ہاتھ پہلے کر کے اس کو ٹھٹھے سے رخصت کر چکی ہوں۔“

”کیا..... مشتری بانی کیا کہا آپ نے؟“ دنیا جہان کا کرب نواب صباحت علی کی سماعت سے گزر کر دل میں جمع ہو گیا تھا۔

”ہم نے جو کچھ کہا ہے، درست کہا ہے نواب صباحت! مشتری بانی کے ضبط نے آخری ہنگامی اور آنسو بہت کی دیواروں میں شگاف ڈال کر باہر اٹکے۔“

نواب صباحت علی نے چند ثانیے مشتری بانی اور کوٹھے کی خاموش دیواروں کو گھورا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے نیچے اترنے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس زمانے میں عورت کے لیے دوسری شادی کا تصور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی ریسیہ بیگم کے لیے نوعری میں

لال حویلی بھوت بھلا دکھائی دینے لگی تھی۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم کی تدفین کے بعد کئی دنوں تک فراسٹ علی اپنی سوگوار حویلی میں کھویا کھویا سا ذہن اور بھجا بھجا سادل تھا۔ درود یوار سے نظریں چراتا رہا۔ آنکھوں کے چشمے خشک ہوئے تو اس کے عشق بلاغیر نے سرا بھار لیا۔

جونہی لکھنؤ کی شام رکاب گنج میں گہری ہوئی، فراسٹ علی کے قدم لال حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔

تیسری دستک پر حویلی کا دروازہ کھلا۔ فراسٹ علی نے ڈیوڑھی عبور کر کے بالائے خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ دیوان خانے میں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا۔ پوری حویلی کا سناٹا دیوان خانے کے درود یوار پر کچھ زیادہ ہی ناچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

دل کشا کی خواب گاہ سے پرانی خادمہ ٹھکون کاہر آئی۔ ”نواب صاحب! ادھر آئیے، بیگم صاحبہ اندر ہیں۔“

فراسٹ علی ٹھکون کے پیچھے چلتے ہوئے اندر خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ بستر پر دل کشا کا مٹی بھر و جود ایک ڈھانچے کی طرح سمٹا ہوا پڑا تھا۔

”ٹھکون! ہماری طرف سے پھولوں کے ہار نواب فراسٹ علی کے گلے میں ڈالو۔“ دل کشا کی نفاہت بھری آواز ابھری۔

فراسٹ بت بنا یک تک دل کشا کو دیکھے جا رہا تھا۔ ٹھکون نے کھنٹی پر سلیقے سے لٹکے تازہ پھولوں کے ہار فراسٹ علی کے گلے میں ڈال دیے۔

فراسٹ علی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دل کشا کی جانب بڑھا اور قریب پہنچتے ہی دل کشا کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام لیا۔

”تین برسوں میں، صرف چار برسوں میں یہ کیا ہو گیا؟“ فراسٹ علی کے آنسو جیسے حلق میں اترنے لگے تھے۔ ٹھکون سر جھکائے خواب گاہ سے نکل گئی۔

”مبارک ہو آپ کو فراسٹ علی! آپ نے گلکٹر بن کر ہماری شرط پوری کر دی۔“ دل کشا کے بے رنگ چہرے پر بھیجی مسکراہٹ کا کرب سلگ اٹھا۔

”لیکن دل کشا! ہمیں یوں لگتا ہے، جیسے ہم آپ کی شرط پوری کر کے بھی ہار گئے ہیں۔ ہم کیوں ہار گئے؟ ہم تو..... اپنے خواب کو جیتنا چاہتے تھے۔“

فراسٹ علی کی آواز اب آنسوؤں میں بھیگ چکی تھی۔ ”فراسٹ علی! یہ اچھا ہوا کہ ہمیں جگر کے سرطان نے اس حال کو پہنچا دیا۔ اگر ہم اس حال کو نہ بھی پہنچتے تو آپ سے شادی ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔“

”کیا..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ..... شادی اور آپ

فراسٹ علی نے مقابلے کا استحقاق پاس کر لیا تھا۔ اب اعتدال کے مرتلے سے کامیاب ہو کر جیتنے کا انتظار تھا۔ گلکٹر بننے کا خیال محض اس وجہ سے فراسٹ علی کو سرشار کیے جا رہا تھا کہ گلکٹر بن کر اپنے خواب کو پالنے کی شرط پوری ہو جائے گی اور لال حویلی کے درود یوار محبت بھرے انداز سے فراسٹ علی کا استقبال کریں گے۔

اب نواب فراسٹ علی کے گلکٹر بننے کی خبر رکاب گنج فیض آباد سے ہوتی ہوئی پورے لکھنؤ کے قریب وازار تک پھیل گئی۔

رئیسہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کے رخسار پر خوشی کے آنسو پھیل رہے تھے۔ رئیسہ بیگم نے فراسٹ علی کی تعلیم و تربیت کا حق ادا کر دیا تھا۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کیں اور تصور میں کچھ فاصلے پر کھڑے نواب صاحب علی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیجیے نواب صاحب! ہم نے فراسٹ علی کی پرورش اپنی گود میں کی اور آپ کی خواہش کو ہم نے اپنے دل کی آغوش میں پر دان چڑھایا۔“

اور پھر اچانک گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ رئیسہ بیگم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں نہیں، ہم نے شاید غلط سنا ہے۔“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے امی جان! ہم نے اپنی زندگی کا ساتھی چار برس پہلے جن لیا تھا اور اس نے ہم سے شادی کرنے کے لیے گلکٹر بننے کی شرط عائد کی تھی۔“

”تو کیا فراسٹ! آپ نے ہمارے خواب کو تعبیر نہیں کیا، اپنی محبت کو حاصل کرنے کی شرط کی تکمیل کی ہے؟“

رئیسہ بیگم کا وجود کالج کے برتن کی طرح کڑھی کڑھی ہو رہا تھا۔

”فراسٹ! کاش آپ ہمیں چار سال پہلے ہی اپنے فیصلے کی سولی پر لٹکا دیتے۔“ رئیسہ بیگم کے چہرے پر شدید کرب کے باعث تناؤ سا آ گیا تھا۔ ”آخر وہ ذات شریف کون ہے جسے حاصل کرنے کے لیے آپ چار سال تک پہاڑ بیسی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر بڑھتے رہے۔“

رئیسہ بیگم کی آنکھوں سے حسرت کا ناسور سننے لگا تھا، زندگی بہہ رہی تھی۔ ”امی جان! ہم سہرا باندھ کر لال حویلی جا میں گئے دل کشا کی بیٹی کو اپنانے کے لیے۔“

”فراسٹ.....“

رئیسہ بیگم کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر رئیسہ بیگم دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تمام کر اپنے قدموں میں گر گئی چلی گئی۔

”خدا کے لیے بولتی رہے دل کشا۔ عشقِ ناقص کی حکایت پوری کیجیے ورنہ ہم مر جائیں گے۔“
 ”ہم اپنا عہد بھانا چاہتے ہیں فراست علی۔ ہم اپنے عشقِ ناقص کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔“ اسی دوران کمرے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

فراست علی نے پلٹ کر دیکھا تو ہوہوہو دل کشا کی تصویر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ فراست علی کی آنکھوں میں ایک دم سے جیسے دیے روشن ہو گئے۔ فراست علی نے لڑکی کے سر اُپر نظر ڈالنے کے بعد پُر جھجھک سے دل کشا کو دیکھا۔ ”ہم نے انہی کا تو انتظار کیا ہے دل کشا بیگم۔“ خط ایک نظر کیجئے کے بعد۔“

”دیکھ لیجیے فراست علی! ہماری بیٹی دل رہا ہوہو ہماری تصویر ہے۔ ہم نے اپنی بیٹی کو لکھنؤ کے بڑے تعلیمی ادارے سے تعلیم دلانی ہے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ لال حویلی میں نہیں رکھا تا کہ ہماری شہرت کا سایہ اس کے لیے رسوائی کا داغ نہ بن جائے۔ بس بھی سمجھی ہم نے اتنی جاتی رہی ہے۔“
 فراست علی کی آنکھوں میں زندگی پھل کر بہہ جانے کے لیے بے تاب تھی۔ دھڑکے سے کہا۔

”خط ایک نظر دیکھ لینے کے بعد یہ تصویر بھی ہماری یادوں سے اوجھل نہ ہو سکا۔“

دل ربانے قریب آ کر دل کشا کا تحیف اور کمزور ہاتھ تمام لیا تھا۔ خواب گاہ میں گہرا سکوت تھا۔ فراست علی! دل کشا تو صباحت علی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں۔ آپ دل ربا کو اپنا بیچے کہ اس نے نہ تو کوٹھے پر پرورش پائی ہے اور نہ ہی ہم نے اسے جابل رکھا۔ ہم نے اسے اعلیٰ تعلیم دلانی ہے۔ شاید اس ملاپ سے ہمارا عشق ناقص مکمل ہو جائے۔“

دل کشانے دل ربا کا ہاتھ فراست علی کے ہاتھ میں دے دیا۔

”اور ہاں بیٹے! نواب صباحت علی کی وصیت کے مطابق ان کا جنازہ مشہری بانی کے کوٹھے پر ٹھہرایا گیا تھا۔ ہماری وصیت بھی سن لیجیے۔ ہمارا جنازہ نواب صباحت علی تشکی حویلی کے دروازے پر ضرور ٹھہرایا جائے۔“
 لکھنؤ کی ایک اداس شام تھی۔ لال حویلی سے دل کشا کی میت اٹھائی گئی۔ رکابِ حج کے کوچہ بازار سے ہوتی ہوئی دل کشا کی میت کو نواب صباحت علی مرحوم کی حویلی کے سامنے ڈراویر ٹھہرایا گیا۔

ایک عرصے تا تمام گہری ہوتی ہوئی شام میں مکمل ہو گیا تھا۔

سے..... ہم تو آپ کے عکس کے دیوانے ہوئے تھے..... پہلی بار اس محفل میں ہم نے ہوہوہو آپ کا عکس دیکھا تھا۔“
 ”کیا.....؟“ اس بار دل کشا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”اوہ..... تو قدرت کو بھی وہی منظور تھا جو ہم نے سوچا تھا۔“

”کیا مطلب..... آپ نے کیا سوچا تھا اور قدرت کو کیا منظور تھا.....؟“ فراست علی کی آنکھوں میں اس بار نمایاں طور پر الجھن نظر آرہی تھی۔ ”ہم تو سمجھتے تھے شاید آپ ہمارے دل کا حال جان چکی ہیں۔“

”حال تو ہم تمہارے والد محترم صباحت تشد کا بھی جان چکے تھے اور اسی لیے ہم ان سے دور بھی ہو گئے تھے کہ ہم ان کے قاتل نہ تھے اور اسی لیے ہم نے آپ سے بھی اسی لیے عہد کیا تھا تا کہ آپ اپنا خواب پانے کی جستجو میں کلکٹر بن کر ہمارے صباحت تشد کی خواہش پوری کر سکیں۔“

”آپ کے صباحت تشد؟ دل کشا! آپ ہمارے والد نواب صباحت علی تشد کو کیسے جانتی ہیں؟ دل کشا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ فراست علی کے دل و دماغ میں سوالات کی آغوشیں چل رہی تھیں۔

”فراست علی! بیٹے، ہم نے آج تک اپنے عشق ناقص کا دکھ کی اور کوئی سنایا لیکن یہ دکھ آپ کو سنا ضروری ہے۔“

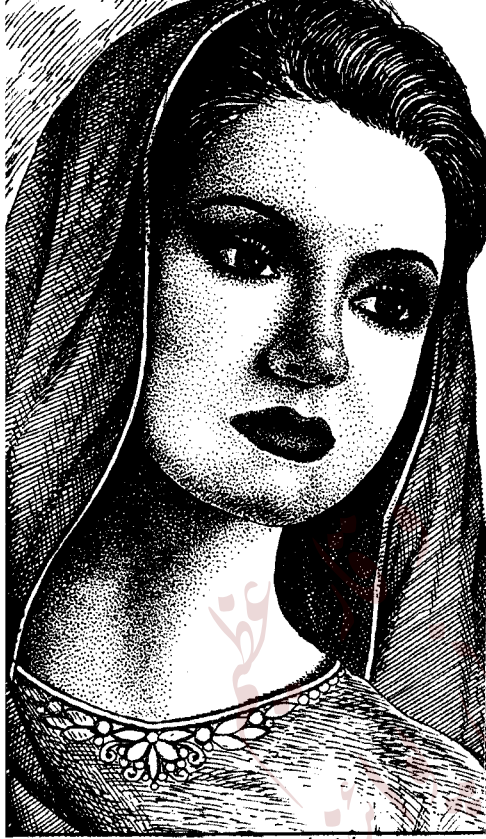
فراست علی کی آنکھوں سے زندگی بہہ رہی تھی اور چہرہ سراپا سوال بنا ہوا تھا۔ ”بیٹے فراست علی! ہم نے اور نواب صباحت علی نے ایک دوسرے سے عشق کیا تھا لیکن تقدیر کا شتم یہ تھا کہ ہم نے مشہری بانی کی گود میں ایک کوٹھے پر پرورش پائی تھی اور صباحت علی نواب زادے تھے۔ پھر وہی ہوا جو لکھنؤ کی تہذیب میں ہوتا آیا ہے۔ نواب صباحت علی کے خاندان والوں نے ان کی شادی رئیسہ بیگم سے کر ڈالی کہ کہیں کوٹھے پر بیٹھنے والی دل کشا ان کی بہو نہ بن جائے۔“

دل کشا کی آنسوؤں میں زندگی آواز دہی ہوئے ہوتے معدوم ہونے لگی۔ شاید سانسوں کی ڈوری اٹھنے لگی تھی۔

”اس کے بعد کیا ہوا دل کشا! خدا کے لیے کہیے۔“
 فراست کا دل سینے کے اطراف میں سرچک رہا تھا۔

”پھر..... مشہری بانی نے ایک دن خاموشی سے ایک دولت مند رئیس کے ساتھ ہماری شادی کر کے اس کوٹھے سے رخصت کر دیا۔ خدا نے نواب صباحت علی کو ایک بیٹا دے کر عمر بھر کی تنہائی دے دی اور ادھر ہمیں بھی خدا نے ایک بیٹی عطا کر کے زندگی بھر کے لیے لال حویلی کے زندان میں قید تنہائی دے دی۔“

دل کشا کی سانسیں اب اکھڑنے لگی تھیں۔



✽ محمد نصیر شہیر اسامہ سیال..... سکھر
بہت جدا ہے اوروں سے میرے درد کی کیفیت
رخم کا کوئی نشان نہیں درد کی کوئی انتہا نہیں
✽ ماہین فاطمہ..... حجرہ شاہ مقیم
دشت احساس کی حدت بھی قیامت ہے ندیم
کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھالے رکھنا
✽ داؤد اشفاق..... حجرہ شاہ مقیم
مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آئے ہیں اکثر دعاؤں میں

✽ ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مقیم
بکھر گئی ہے نگاہوں کی روشنی ورنہ
نظر نہ آئے وہ، اتنا تو فاصلہ بھی نہیں
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... قصور شفی
اک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
شع جس کی آبد پر جان دے دے مجھ کو کر
وہ چٹکا جمل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

✽ وزیر محمد خان..... محل ہزارہ
زبان خاموش ہو جائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجب موسم گزرتا ہے
✽ شامکہ سلمان..... کورنگی، کراچی
احساس نہ اخلاق محبت نہ تعلق
اس دور کے انسان ہیں پتھر کے مجسمے

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
تو نے الفاظ کی تاثیر کو پرکھا ہی نہیں
نرم لہجے سے تو پتھر بھی پکھل جاتے ہیں

✽ الم کمال..... حیدر آباد
اے دوست میرے طرف محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تجھم بنی ہوئی
✽ ادلیس احمد خان..... ناظم آباد کراچی
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جمل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
✽ میمونہ اصغر..... گلستان جوہر، کراچی
بدن میں سانس لیتی ہے
مکھنیں پوشیدہ ریتی ہے
محبت مر نہیں سکتی
کہنیں خوابیدہ ریتی ہے

✽ زرین آفریدی..... حیدر آباد
تو بھی نہ مل سکا ہمیں، عمر بھی رانگاں مگی
تجھ سے تو خیر عشق تھا، خود سے بڑے گلے رہے

❖ اوشاراٹھی مٹھی، سندھ

ہم محبتوں کے فقیر ہیں صاحب
حشق کے دارالامان میں رہتے ہیں
❖ شاہ حسن لاہور کینٹ

دھڑکن کو اس کی یاد سے تحریک مل رہی ہے
چاہت اگر سزا ہے تو پھر ٹھیک مل رہی ہے
❖ محمد شہباز اکرم نوٹی پاکستان شریف
یہ جو صین، یہ جو شین، یہ جو قاف کرتا ہے
یہ لاحق جس کو ہو جائے اسے برباد کرتا ہے
❖ محمد آذین رضوان کراچی

ہم اپنی مرض کے بندے ہیں ہم اپنی طرز کے انسان ہیں
جو زیست مرا سہا یہ تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے
ہم ہلکے بھی کب ہلکے ہیں توجیت کے بھی کب ہیتا ہے
کچھ مان ترا بھی رکھنا تھا ہیں جیت کے بازی ہادی ہے
❖ محمد قدرت اللہ نیازی خاندوال

میرا وجود بھی کسی صحرا سے کم نہ تھا
اس کی سپردگی میں بھی وحشت بلا کی تھی
❖ فضا شاہ ماڈل ٹاؤن

منایا نہ گیا مجھ سے اس بار
اس کی ناراضگی میں آباد کوئی اور تھا
❖ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس
گھٹا کافیش ہے ارض وطن میں جاری و ساری
بہار رنگ و بو ہے دامن فطرت کی گل کاری
❖ شیزا کاشان کراچی

گھر کی دیرانی تو میرا ساتھ دینے سے رہی
میں کھلونے لے بھی آؤں گا اگر بازار سے
خواہش تعمیر اندیشوں کی زد میں آگئی
بے گھری کی رسم چل نکلی درود دیوار سے
❖ زہیر احمد کراچی

میں پانی اور آگ سے اک مٹی کی خاطر لڑتا تھا
اور یہ دونوں عالم کھیل تماشا دیکھنے والے تھے
❖ شفیق حسین نیو کراچی

پہلے دنیا میرے قاتل سے ملائے گی تجھے
پھر مجھے تیرے بہانے سے بلائے جائے گی

❖ جاوید اختر رانا پاکستان شریف

یہ سلوٹس نہیں ہیں جنہیں کی اٹھان پر
لے لے نفوش چھوڑ گئے ہیں چٹان پر
❖ اشفاق شاہین لاہور

ہجر کی مسافت میں خواب تک نہیں آتے
بارشوں کے موسم میں دھوپ کم نکلتی ہے
❖ محمد زریان سلطان اردو بازار کراچی
ہم پیار محبت والے ہیں اور امن بھی ہم کو پیارا ہے
یہ نیرے کیوں لہراتے ہو یہ جگ ہے کیوں ٹکواروں کی
حالات تھے اچھے اچھے سے خیر عجیب بھی چہروں پر
کردار تھے ایک ہی جیسے ہم سنتے کہا ہے زاروں کی
❖ طارق ظہیر تحصیل نور پور رحل

اپنے دروازے پہ دستک دوں گا تیرے نام کی
خود سے ملنے کا یہی اک راستہ رہ جائے گا
❖ محمد صفدر معاویہ خاندوال

یہ کیا کر انجمن ذات ہی میں روشن ہو
تجسبی تو شیخ ہواؤں کے روبرو کی جائے
❖ ناہید یوسف اسلام آباد

ہر اک قدم پہ بچھے ہیں سحر کے اندیشے
یہ حیرتی کا سفر ختم ہو تو سولیس گئے
❖ اسد خان ماسکو

آئینے سے پونہ تیری آنکھ گرگ جائے گی
دیکھنا پھر تجھ کو تیری ہی نظر لگ جائے گی
آج بھی آئے گا تو یا پھر وہی کل کی طرح
پاؤں میں مہندی ترے اے قند گرگ جائے گی
❖ نئی ویل کوئٹہ

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزش غم سے
مکرمز سے نہ اف ہم ٹنگساروں میں ٹکائیں گے
❖ عظیم احمد جھنگ شہ

چمن سے دور رہا اس قدر نفس میرا
کہ چنپی اڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بو
ہوا ہے صورت دیوانہ گل گریباں چاک
چمن میں لائی مباسک کے پیرہن کی بو
❖ صباحر کراچی

کہاں پرواز کی طاقت نہیں ہیں بال و پر ثابت
نفس میں کیا تھنائے رہانی سوچ کر کیجیے

✽ زوہیب احمد ملک..... کراچی

ہنسا ہے تیرے سامنے اس طرح میرا دم
جس طرح آشنا سے کوئی آشنا بنے
✽ نوشہہ گلزار..... بکھر

برا ہو محتسب کا ایک دن میں کر دیے ویراں
وہ جو آباد تھے اس شہر میں میٹانے برسوں سے
✽ امتیاز احمد..... پچالیہ

دے کے اس شوبخ ستار کو ہم اپنا دل
جی میں بچھتائے ہیں اپنے کہ یہ کیا کر بیٹھے
✽ نعیم احمد..... بہاولپور

نہ لیتا مول سورا کوئی بازارِ محبت کا
مگر کچھ جان اپنی بچ کر لیتے تو ہم لیتے
✽ سائرہ نواب..... پشاور

گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہِ غربت میں
ہم آوازِ جس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں
✽ نادیہ ریاض..... پشاور

زندان میں کیا پڑے ہو کہے ہے مجھے جوں
تم چند روز سیرِ بیاباں تو کرو
✽ صباحہ محمد..... غنڈوالیہ

رات بھر گرچہ جلی شمع تو کیا خاک جلی
عاشق سوختہ جاں آٹھ پہر جلتے ہیں
✽ جنید احمد ملک..... گلستانِ جوہر کراچی

اڑتا ہے دل جس وقت کبرو کے سے کرتا ہے
مجھے رہنے دو یا دیر میرے آنسو پونچھے کیوں ہو
✽ مہتاب احمد..... حیدرآباد

کوئی حسرت اے فلک اپنی نگلنے کی نہیں
ساتھ ہی زیرِ زمیں ارماں سارے جائیں گے
✽ منیر شگفتہ..... دھاڑی

تم ہار بیٹھے زندگی ہر اک خوشی کو جیت کر
دعوے تمہارے کیا ہوئے غم کی ہوئیں جو بارشیں

✽ سلیم قادر..... میانوالی رانجھا

اک نئی کہانی سوچیں ہم اور بھولیں گزری باتوں کو
کیوں بچھلاؤں دہرائیں ہم جو قصہ تھا کچھ راتوں کا
✽ شاہد علی..... فیصل آباد

آغاز میں کرتی ہوں سفر دیکھ کے جس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے
✽ شمیمہ ثاقب..... ملتان

رسم وفا ہم نے ہی بھائی اور ہم ہی بدنام ہوئے
حسن و عشق کی اس دنیا میں ہم ایسے دیوانے تھے
✽ عاصمہ سعید..... سرگودھا

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس بچ و تاب میں
✽ عاطف علی..... میرپور خاص

دل ہی تو ہے نہ سنگِ دشتِ درو سے بھرنا آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
✽ وسیم خان..... جٹیوٹ

یہی ہے آزمانا تو سستا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو
✽ اسامہ جنید..... کراچی

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
✽ اسلم احمد..... سکھر

جنوں کی نگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گر ہیاں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
✽ اسماء فیصل..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
✽ سعدیہ ریحان..... انک

تو راز کن نکال ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا تر جہاں ہو جا

مَحْفَلُ شِعْرِ وَسُخْتِ

نام:

پتا:

کوین

برائے

شمارہ

دسمبر

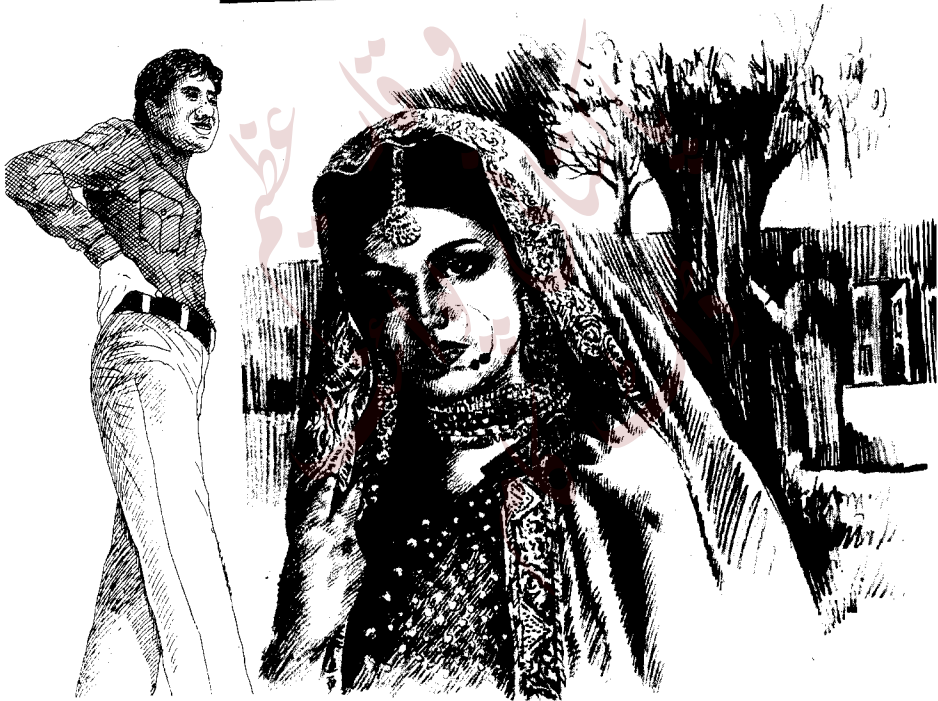
2017

سایہ

محمد الیاس

بچپن کی کچھ یادیں جوان ہونے تک بھی ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوتا ہے ان کا نقش اور تاثر بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی چھانٹوں تلے بینہا زندگی کی کچھ گرہیں کھولنے میں مصروف تھا کہ اچانک جیون کی تہتی دھوپ نے اس پر انکشاف کیا کہ اس کی تلاش اور جستجو لا حاصل سعی کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔

فطرت سے دور ہونے والوں کی تباہی کا منظر نامہ



میں اپنے سے کم و بیش آٹھ دس برس عمر میں بڑی شادی شدہ ہال بچوں والی عورت کی مربیانہ شفقت کو آج تک صبح تناظر میں سمجھ کیوں نہیں پایا۔ وادی میں منصف نازک کی غالب اکثریت کے چہرے اسی طرح دلکش ہوتے ہیں۔ منزہ کارنگ روپ غیر معمولی پرکشش ہی تھی لیکن یککے عصر بھی نہیں تھا۔ پھر اس کا خیال آنے پر انجانی ہی غلش کیوں محسوس ہوتی تھی۔ وہ میری بظنوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھایا کرتی تھی۔ اپنے سر سے اوپر تک اچھالتی اور ہنستے ہوئے دوبارہ تمام کر سیتے سے لگا لیتی۔ میرے گالوں پر بوسہ دیتی۔ مجھے پھول سے تشبیہ دیا کرتی۔ اس نے میرا نام ہی ”پھول“ رکھ

دیا تھا۔ جب میں اسکول جانے لگا اور میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا، تب بھی اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

اماں بڑے شوق سے مجھے اسکول کے لیے تیار کیا کرتیں۔ گھر سے باہر تک مجھے چھوڑنے آتیں۔ ڈیڑھ دو فرلانگ کی ڈھلان اترنے تک اماں مجھے دیکھتی رہتیں۔ اس خوبصورت وادی میں ندی کے پار دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ پچاس سالہ گز اوپر کی طرف چلنا پڑتا جہاں چشمہ پھوٹتا تھا اور قریب ہی مندر کا مینار بھی تھا۔ وہ مجھے آتے ہوئے بلندی پر کھڑی یوں دیکھا کرتی، جیسے میرا انتظار کر رہی ہو۔ میری اماں کو ہاتھ ہلا کر جانے کا اشارہ کر دیتی۔ وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی اترائی میں سطح ہموار پر اسکول تھا، جہاں میں جایا کرتا تھا۔

واپسی پر وہ میری خنجر ہوا کرتی۔ خاطر داری کے لیے کچھ نہ کچھ رکھ چھوڑتی۔ کبھی بھنا تو کبھی مٹی کی میٹھی روٹی یا موسم کے مطابق دستیاب مقامی پھل۔ اماں نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ گھر جلد پہنچوں اور ڈھنگ سے کھانا کھاؤں لیکن مندر کی دل جوئی کی خاطر منہ جھمال لیا کرتا۔ البتہ پانی ضرور پیتا۔ براہ راست چشمے کا پھوٹنا پانی اوک سے پینے کا مزہ آ جاتا۔

ایک مرتبہ اوجھانی سے پھسل جانے پر میری ہتیلیاں چھل گئی تھیں۔ ان دنوں میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مندر ... درود مندی سے میرے ہاتھوں کو یوں دیکھتی رہی، گویا اس کے دل پر چوٹ لگی ہو۔ غم آنکھوں سے مجھے دیکھ گئی۔ وہ گھر سے برتن لانے کو ابھی لیکن میں نے اسے روک لیا اور کہا کہ اپنے ہاتھوں کی اوک سے پانی پلا دو۔ میں آج تک اپنی اس خواہش کی توجہ نہیں کر پایا۔ اس نے بسم اللہ کا ورد شروع کر دیا اور خوش خوش اوک سے پانی پلانے لگی۔ وہ خنجر آج بھی پوری جزئیات سے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ شفاف پانی میں گلابی ریشمی ہاتھوں اور غردہ لگیوں کے ڈوبنے ابھرنے اور میرے لیوں سے مس ہونے کا دلچسپ منظر۔ اس کے بار بار جھنجھنے سے ایک اور سرا رکھ لیا کہ وہ بھرپور جوان ہو چکی ہے۔ وہ بسم اللہ پڑھتی مٹی اور میں پانی پی پی کر اچھر گیا۔ جی بھر گئی نہ بھرا۔

دور پار کا رشتہ دار اور برادری کا خوش اخلاق فرد ہونے کے ناتے صابر حسین مجھے بھی بڑا نند لگا۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں سب سے خوش حال گھرانہ ہمارا ہی تھا۔ جیم بیر صابر اپنی بیوہ بہن اور اس کی اولاد کے ہمراہ ہمارے گھر کے پچھواڑے ذاتی زمین میں بنے کچے کچے دیہاتی طرز کے مکان میں مقیم تھا۔ زمین اتنی بھی نہ تھی کہ چھ افراد پر مشتمل کنبے

کی کفالت آسانی سے کر پاتا اور پھر اس پر دھن سوار تھی کہ بیرون ملک سے ڈیڑھ دو دولت کما کر لائے اور بہت عالی شان کوٹھی بنائے۔ مجھے کیا اعتراض ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر ہو جاتا، اگر اس کی منگنی مندر سے نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے اس پھلے مانس سے بلا وجہی پُر غاش ہو گئی۔ وہ مسقط چلا گیا اور میں بدستور محنت سے پڑھائی کرتا رہا۔

نویں جماعت میں میڈیٹر صاحب نے دس لڑکوں کا انتخاب کیا اور اساتذہ کو ناسک دیا کہ انہیں ابھی سے بورڈ کے امتحانات کی تیاری اس عزم سے کر دوائی جائے کہ کبھی نہیں پس چند ایک ہی اعلیٰ پوزیشن حاصل کر لیں۔ ان لڑکوں کو انجیل گروپ کا نام دیا گیا۔ میں یوں بھی اس گروپ میں نمایاں طالب علم تھا اور شروع سے ہی ہر سالانہ امتحان میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتا آ رہا تھا۔ ہمارے زیادہ تر اساتذہ بڑے محنتی تھے، خصوصاً سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے والے۔ سائنس ٹیچر ماسٹر شریف صاحب نے گروپ کے لڑکوں کو اچھی غذا کی افادیت پر بڑا موثر لیکچر دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہم اپنے اپنے گھر سے، جس حد تک ممکن ہو سکے، اچھے سے اچھا کھانا لایا کریں اور تفریق کے بغیر بیٹھیں خوب ہیر ہو کے کھالیں تاکہ چھٹی کے بعد مزید دو گھنٹے سلی سے پڑھائی کی جاسکے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہو سکے تو آٹلیٹ اور ویسٹی بھی کا پر اٹھالیا کریں۔

ہمارے اردو کے استاد ملک فضل حق خاصے تالائق تھے اور ماسوائے میرے، باقی قریباً تمام لڑکوں کی اس مضمون میں استعداد غیر نسلی بخش تھی۔ ماسٹر صاحب اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے طلبہ بارے میں سختی کیا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم ان سے کسی لفظ کا مطلب پوچھ لیتا اور وہ نہ جانتے ہوتے تو سخت ہا ہو جاتے۔ پٹائی کرنے کے ساتھ ساتھ بولتے جاتے۔ ”الو کے پٹھے، گدھے! کلاس روم میں دھیان سے سبق سنا کرو۔ کتنی بار پہلے بھی اس لفظ کا مطلب سمجھایا ہے۔“ تاہم جاننے کی صورت میں فوراً ہی بڑے شفیق اور مہربان استاد کا روپ دھار لیتے۔ شفقت آمیز لب و لہجے میں سمجھاتے اور آخر میں کہتے۔ ”شاباش! جو نہ تباہو، وہ ضرور پوچھا کرو۔“

ہمارے پچھواڑے صابر حسین نے عجب نمونے کا گھر تعمیر کرایا۔ ایک بڑے سے کمرے کے اوپر کمرہ اور اس پر کشادہ برساتی کا ڈھانچا دیکھ کر یوں گمان گزرتا جیسے کسی ریلوے جنکشن کا تین منزلہ سٹیشن روم ہو، جس کی کھڑکی سے ریلوے الہکار سرنگا لے۔ ریل گاڑی کو سرخ یا سبز چمڑی دکھایا کرتا ہے۔ اس کی چھٹی کم تھی۔ دنوں میں اسٹرپچر کھڑا کیا گیا تھا

اور راتوں رات اندر باہر سے ہڈا ستر کروا کر عجوبہ تیار کر دیا۔
 ہمارے گھر کی عجمی دیوار سے فاصلہ بھی کم تھا اور برساتی پر مشتمل
 گھری منزل غاصی اونچی نکل گئی تھی۔ سفیدی ہوتے ہی اگلے
 روز مزہ کو دہن بنا کر لے آیا۔ زبان زد عام تھا کہ اس کو کنزروہ سے
 مٹائی جمت تھی۔ اعلان کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے ہر
 آسائش مہیا کرے گا۔ سننے میں آیا کہ بڑے خوبصورت کہنے،
 جتنی لباس اور ایسے ایسے تحفے لایا ہے، جو آس پاس کی بستیوں
 کی کوئی بابتا کوشاید ہی نصیب ہوئے ہوں۔

میں دل برداشتہ سا ہوا، شادی کی تقریب میں شرکت نہ
 کرنے کے بہانے تراشا رہا لیکن والدین کو برادری کے رسم
 و رواج کی پاسداری عز پر مبنی، لہذا ان کی سرزنش سے بچنے کی
 خاطر دعوت دینے میں چلا گیا۔ سوچ رکھا تھا کہ جلد ہی اٹھ آؤں
 گا لیکن صابر نے اتنی محبت دی کہ میں حیران رہ گیا۔ آگے
 بڑھ کر خندہ پیشانی سے گلے لگا یا اور بولا۔

”تم واقعی بھول ہو۔ میں بھی آئندہ تمہیں اسی نام سے
 پکارا کروں گا اور ہاں! میں رشتے میں تمہارا ناموں ہوں۔۔۔۔۔“
 دل قریب ہوں تو دور کا رشتہ ہی بزدلیک ہو جاتا ہے۔“

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ اس شخص سے پر خاش رکھنے کا
 کوئی جواز نہیں بننا۔ شاید یہی میرا نصیب ہو، جو آج تک برابر
 بٹا آیا ہے۔ پیار بھرے بوسے اور گلداز بدن کا لمس اور بہت
 ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس پر قدغن نہ لگے۔ ہمارے علاقے
 کی یہ روایت قابل تحسین ہے کہ بزرگ خواتین و حضرات
 اپنے عزیزوں کو اپنی خصوصی شفقت اور محبت سے کبھی محروم
 نہیں کرتے۔

عجوبہ عمارت کی سیدھیاں کچھ زیادہ ہی عجیب طرز کی
 بنائی گئیں۔ بنگلی دیوار سے پہلی ہوئی پینتائیس درجے کا زاویہ
 بنائی اوپر کی منزل تک پہنچیں اور برساتی تک جانے کے لیے
 عجمی دیوار کے ساتھ ساتھ اس زاویے سے اوپر چلی گئیں۔ ہوا
 اور روشنی کے لیے ہر دیوار میں جابجا کھڑکیاں رکھ دیں۔ میں
 اپنے کمرے میں پڑھائی کرتے ہوئے کھڑکی سے گاہے
 بگاہے اس عجوبہ پر نگاہ ڈال لیا کرتا۔ رات کو دیر تک پڑھتے
 ہوئے سناٹے میں دہلی دہلی ہنسی کی آواز اور چوڑیوں کی ٹھنک
 سنائی دے جانے پر ذہن منتشر ہو جاتا۔ گیارہ بجے میری اماں
 نیم گرم دودھ کا پیالہ لے آ جاتی اور اپنی نگرانی میں پیلا کرتی
 بھجوا دیا کرتیں۔ حکم ہوتا کہ سو جاؤں۔

باطنی خوشی کی صوتی علامت ٹھنکناتی ہنسی نفرتی گھنٹیوں
 کی سی اور کالج کی جھنکار سن کر نیند کا فور ہو جایا کرتی۔ ایسے
 موقع پر ماسٹر شریف صاحب کی بتائی ہوئی نیند لانے کی

ترکیب پر عمل کیا کرتا۔ تصور میں دو تین میل پہنچنے والی کے کھلے
 پاٹ کی ترائی میں ہری بھری گھاس چرتی نیکیوں بھینچوں
 گئے روڑ کو نیکیوں سے دیکھنے لگتا۔ یوں لمحے موجود کے حقائق
 سے غافل ہوتے ہی نیند کا غلبہ ہو جاتا۔

چھٹی ختم ہونے پر جس روز صابر حسین صبح گھر سے
 روانہ ہوا، اس کے سر اٹلی اور دھرتے دار بھی رخصت کرنے
 آئے ہوئے تھے۔ وہ گزشتہ روز فردا فردا ہر گھر میں الوداعی
 ملاقات کرنے آیا تو ہمارے ہاں خصوصی طور پر مجھے بلوایا اور
 بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔ انجی میں نے اسکول جانے کی
 تیاری کرتے ہوئے دو تین بار کھڑکی سے چھانک کر دیکھا تھا۔
 اس کو آہوں اور سرکیوں میں الوداع کیا گیا۔ دونوں بھانجے
 سامان اٹھائے لاری پر سوار کرانے سڑک تک ہمراہ گئے،
 جب کہ بیوی اپنے والدین کے ساتھ میکے چلی گئی۔

میں آج تک کچھ نہیں پایا کہ اس روز فضل حق صاحب کو
 زوج کرنے پر کیوں تل گیا۔ وہ غلطیاں پہلے بھی کیا کرتے
 تھے۔ کئی بار میں نے موقع مناسب جانتے ہوئے بڑے سلیقے
 سے ان کی اصلاح بھی کر دی لیکن وہ شاید ایک بُرادن تھا۔ اس
 کی ابتدا ہی آنسوؤں اور آہوں سے ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب
 ”جاں برہوئے“ کا معنی یکسر الٹ رہے تھے۔ ”زندہ نہ
 رہنے“ کے بجائے ”مر جانے“ کے معنوں میں تین بار بڑے
 وثوق سے جملہ دہرایا تو مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ صبح معنی
 بتانے پر قدورے جڑ بڑ ہوئے لیکن سبھل گئے اور خفت مٹانے
 کی غرض سے اوورلائٹنگ کرتے ہوئے بولے۔

”ہاں ہاں! میں بھی کس خیال میں کھو گیا تھا۔“ مجھے
 شاباش دی۔ ابھی نصف چھٹی ہی گزرا تھا کہ ایک عام سا
 محاورہ ”سنی ان سنی کرنا“ کو درمیان ”سنی ان سنی ایک کرنا“ بول
 دیا۔ میں نے پھر توجہ دلائی۔ وہ ہنسنے پھلا کر کہنے لگے۔

”ایک ہی بات ہے، دونوں ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ زیادہ سہر پر
 سوار ہونے کی کوشش نہ کرو، پتی ایچ ڈی صاحب!“

چھٹی ختم ہونے سے چند منٹ پہلے ایک لڑکے نے
 ”گرسنہ چٹم“ کے معنی پوچھ لیے۔ پٹنا سے گئے فوری خیال
 یہی آیا کہ وہی آزمودہ نسخہ آزمائیں گے۔ یعنی ڈانٹ ڈھٹ
 اور پٹائی کے ساتھ لعنت ملامت۔

”الو کے پٹھے، مگرھے! کلاس روم میں دماغ حاضر رکھا
 کرو۔ کئی بار بتا چکا ہوں۔۔۔۔۔“ لیکن شاید دوسرے خفیف ہونے
 پر کمزور پڑ چکے تھے اس لیے نیا فارمولا بروئے کار لائے اور
 بڑے اعتماد سے بولے۔

”بھڑیے کی آنکھوں والے لوگ رسنہ چٹم بھی کہتے ہیں۔“

خوبصورت ہوتی ہوں گی۔

میرے دل میں بڑی منہ زور امنگ بیدار ہوئی کہ ان حنائی ہاتھوں سے پائی بیوں۔ وہ مجھے اپنے منیکے لے جانے کی ضد کرنے لگی تاکہ گرم دودھ میں دیکھی گئی اور اڑا پھینٹ کر پلائے لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے رتی بھر پیاس نہیں تھی۔ اس کے باوجود پیاسا ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پانی پلانے کی التجا کی۔ غالباً اس کو بھی اڑھائی برس قبل کا وہ اوک سے پانی پلانے والا دل آرا منظر یاد آ گیا تھا۔ بسم اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوئے بیٹھ گئی اور مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

تاریخ کے استاد چودھری رحمت الہی صاحب، نصاب سے ہٹ کر بھی بڑے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ سندر کا سارا پانی پی جانے والے یونانی دیوتا کا قصہ انہوں نے ہی سنایا تھا۔ سورج کی کرنوں نے شفاف پانی کو چاندی چاندی کر رکھا تھا اور اس میں ڈوبتے ابھرتے حنائی ہاتھ سے رنگ بکھرتے رہے۔ چوڑیوں کی جھمکنا میں بسم اللہ کا ورد جاری رہا۔ بحر طاری ہو گیا مگر یو مالائی فحشٹی نمود کر نہ آئی۔ اوک خالی ہو جانے پر بھی میں اپنے منہ سے چھوٹے والے اس کے ہاتھ کے کنارے کو ہر بار ہونٹوں سے تادیر میں کیے رکھنے کی فحش خفی سی سستی میں یوں محو ہو گیا کہ وہ میری فحشٹی کی اصل نوعیت کو بھانپ گئی۔ زیر لب مسکرائی اور اوک میں لیے پانی سے میرا چہرہ تر کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ہی جھینپ گئے اور ہنس پڑے، گو کہ دل کا چور دیکھا رہا۔

فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ منظرہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں ہاسٹل میں مقیم تھا۔ جب بھی چھٹی پر گھر آتا، حسب روایت بڑی بوڑھیاں ملنے آ جاتیں۔ انہوں میں لے کر منہ سرچو میں اور ڈھیروں دعا میں دیتیں۔ مرد حضرات بھی اسی خلوص سے ملتے۔ تاہم منظرہ کا رویہ منفرد ہوا کرتا۔ اس عورت کی روح میں واقعی کوئی داوی اماں براجمان تھی یا بلا کی اداکارہ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بہ آواز بلند کہتی۔

”ہمارا پھول آیا ہے، کہاں گیا؟“ میں جھینپتے ہوئے سامنے آ جاتا چونکہ مجھے سب سے زیادہ اسی کا۔۔۔ انتظار ہوتا۔ مسکرا کر سلام کرتا۔ وہ بلا تکلف داوی اماں کا روپ دھار لیتی۔ میں خود کو پوری رضا سے اس کے حوالے کر دیتا۔ بڑی توانا خواہش بیدار ہوتی کہ میں بھی جواباً اسی گرم جوش کا مظاہرہ کروں لیکن نہاں خانے میں کہیں اچانک کھٹکا ہو جانے سے دبا کا بیٹھا چور لرز کر رہ جاتا۔

وہ گرگ کو ”گرس“ سے غلط ملط کر رہے تھے۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ غضب ناک ہو گئے۔ فوراً باہر نکلے اور دو تین منٹ بعد ہی ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی، ڈیڑھ دو انچ چوڑی موٹی سی کھردری چوٹی پھٹی اٹھالائے اور بڑے سرد لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اب مرد کا بچہ بننا اور چیخنا چلنا نہیں۔ ہاتھ سامنے کرو۔ میں آج تمہاری بی بی انچ ڈی نکالوں۔۔۔۔۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ ماسٹر صاحب پوری طاقت سے اور دیوانہ وار مشینی انداز میں دونوں جانب باری باری وار کرنے لگے۔ ابھی چند ضربات ہی لگی تھیں کہ اچانک ہیڈ ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ لڑکے کھڑے ہوئے اور ماسٹر صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ دونوں اساتذہ میں باہم نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ سینئر نے نظروں ہی نظروں میں جوینر کو کیا یہ پیام دیا کہ وہ خاموشی سے چل دیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے زخمی ہاتھوں کو فور سے دیکھا اور دو لڑکوں سے کہا کہ مجھے سائنس لیبارٹری لے جائیں اور دو الگوائیں۔ ساتھ ہی مجھے پھٹی کرنے کا حکم دیا۔ لیپ اسسٹنٹ، اسلم نے دھم اچھی طرح صاف کر کے دوائی لگائی اور دونوں ہاتھوں پر سفید پٹی لپیٹ دی۔ ماسٹر شریف صاحب نے ایک جاہ میں دو تین دواؤں کا کچر بنا کر مجھے پلا یا اور بولے۔ ”یہ دل کو طاقت دینے والی دوا ہے اور ورد بھی کم ہوگا۔۔۔۔۔ جاؤ، شاباش! آرام کرو۔“

واپسی پر میرے دل میں عجیب لائسنسی سی خواہش بیدار ہوئی کہ منظرہ مجھے اس حالت میں دیکھ لے۔ میں چشمے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا چونکہ اسکول میں ابھی چھٹی کی وقت نہیں ہوا لہذا وہ شاید اس طرف نگاہ نہ ڈالے لیکن ابھی چند منٹ ہی انتظار کیا ہوگا کہ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ بیٹوں میں لیے میرے ہاتھ دیکھ کر ہنسی اور لپک کر کھلایوں سے تمام لیا۔ مضطرب ہو کر پوچھنے لگی اور آبدیدہ ہوئی۔ میری پتہ اس کر ظالم استاد کو بددعا میں دیتے ہوئے رونے لگی۔ میں مہبوت سا اس کو دیکھ گیا۔ ذرق برق لباس اور طلائی زیورات پہنے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ گوری کھائیوں میں سخی رنگ برنگی کا کچ کی چوڑیاں ذرا سی حرکت ہونے پر بیچتے لگتیں۔ اس کے ہاتھوں پر رچا چٹا کارنگ اتنا گہرا تھا، گویا تھوڑی دیر پہلے ہی مہندی چھڑائی ہو۔ دو تین مہینوں میں ہی اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے اور وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہوئی تھی۔ میں دیکھتا اور حیران ہو کر سوچتا رہا کہ پرستان کی پریاں آخر اس عورت سے زیادہ اور کیا

میڈیٹل کاج میں مجھے میرٹ پر داخلہ ملا۔ اس عرصے میں صابر حسین تین پارٹی چھٹی پر گھر آسکا۔ اس کی رہائشی عمارت میں توسیع ہوئی رہی۔ سامان آرائش اور آسائش جمع ہوا رہا۔ اولاد میں مزید اضافہ ہوا اور بچوں کی تعداد تین ہو گئی۔ صابر نے پھر وہی عزم دہرایا کہ وہ منترہ کی زندگی میں ٹاندار انقلاب لانا چاہتا ہے۔ کارگوٹی، اور وہ سب کچھ جس کی قضا کی جاسکتی ہے۔ میں سینڈ ایئر میں تھا جب اس نے بتایا کہ وہ تین سال کے لیے لیپیا جا رہا ہے اور بہت سی دولت کما کر لائے گا۔

ہاؤس جاب شروع کرنے سے پہلے چند روزہ فرصت ملے پر گھر پہنچنے ہی اماں نے بڑی افسوس ناک خبر سنائی۔ کہنے لگیں ”منترہ کے لیے دعا کرو۔ بڑی سخت پکڑ ہو گئی ہے۔ اس سہ ماہیہ ہے۔ تمہارے پرچے ہونے والے تھے اس لیے کچھ نہ بتایا۔ کئی مہینوں سے علاج ہو رہا ہے۔ ہفتے دس دن میں ایک بار دورہ ضرور پڑتا ہے۔ بڑا عالم جن چٹ گیا ہے جو کسی طرح پچھتا نہیں چھوڑ رہا۔“

ہوئی رہا تفصیلات سن کر میرا دل ناؤیدہ گرفت میں آگیا۔ کوئی عامل بابا، پیر حکیم محمد کفیل جھاڑ پھینک کر رہا ہے۔ ایک بار چلے گئے تھے کا بڑا بیماری خزانہ نہ وصول کرتا ہے۔ ایک اقسام کے اناج، پانچ خشک میوہ جات اور پانچ ہی گلو ان..... یعنی مٹی یا تیل۔ بار بار خبر دوا کرتا ہے کہ کوئی بھی چیز معوی نہ ہو۔ یعنی اصلی ہونی چاہیے۔ ورنہ عمل انا پڑسکتا ہے۔ اناج مثلاً، گندم، چاول، مٹی، باجرہ، جوار، تل وغیرہ۔ اور دھات میں بادام، کش، اخروٹ، مونگ پھلی، چلتوزے، اور کاراجو۔ جو بھی توفیق ہو۔ تمام کا ہم وزن ہونا شرط ہے، لدار کی قید نہیں، کوئی جس قدر دے سکے۔ بقول پیر حکیم، منترہ ایک بڑا ہی ضدی جن عاشق ہو گیا ہے۔ وہ گزشتہ سردیوں میں گھر کی سب سے اوپر والی چھت پر تنہا لیٹی، دھوپ تاپ لگتی تھی کہ بدن کو پوری طرح ڈھانچنے کا خیال نہ رہا۔ غلام کی نام کا بیوی جن، کوہ قاف کی طرف جا رہا تھا کہ اس رست کے حسن کا لشکارا پڑنے سے چندھیا گیا اور سین اوپر لگا۔ وہ اور آج کا دن، پچھتا نہیں چھوڑ رہا۔ منترہ کی آنکھیں مل اور چہرہ انگارہ ہونے سے شکل ڈراؤنی ہو جاتی ہے۔ جسم بے پناہ طاقت آ جانے سے کئی نئی عورتیں مل کر بھی قابو نہ کر سکتیں۔ اپنے لیے ذکر کا صحنہ استعمال کرتے ہوئے اندہ آواز میں بے لنگان ہوتی ہے، لیکن مہمل جملے کی سی سمجھ لیں آتے۔

اماں سے معلوم ہوا کہ پیر حکیم نے گزشتہ روز جو چلہ کھینچا

تصحیح

دل کے آپریشن کے بعد خاتون کی حالت تشویشناک تھی۔ ان کے شوہر ہیڈ کے قریب پریشان کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا، آپ فکر مند نہ ہوں یہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی کیونکہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔

”کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے۔“ شوہر نے کہا۔

”پورے پینتالیس سال کی ہیں۔“ خاتون کے ہونٹ ذرا ہلے اور سر کوئی سنائی دی..... چالیس سال۔

شاپنگ

بیوی نے اٹھلاتے ہوئے شوہر سے کہا۔ بیٹے کو شاپنگ پر چلیں گے۔ اتوار کو امی کے گھر۔ سوموار کو پارلر، منگل کو ڈنر کرنے جائیں گے، بدھ کو مودی دیکھنے، جمعرات کو پنک پراجائیں گے..... ٹھیک ہے نا۔ شوہر نے تجویز پیش کی..... اور مجھے کو سپر چلیں گے۔

بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ وہ نیوں؟ بھیک مانگنے۔ شوہر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

قابل غور

☆ جب دل کا پتالہ غموں سے بھر جاتا ہے تو یہ غم آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں۔

☆ مشکلات سے گھبرانے والے لوگ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

☆ بزدل لوگوں کی انا نہیں ہوتی۔

☆ جب تک دل و زبان میں تضاد ہو دو عاقل اثر نہیں کرتیں۔

☆ رکاوٹیں عبور کرنا منزل پانے کی نشاندہی ہے۔

☆ ایک مرتبہ ہار کر بیٹھ جانے والا عمر بھر ہارتا رہتا ہے۔

☆ ہم کسی کو وہی کچھ دیتے ہیں جو ہمارے پاس ہو، چاہے وہ محبت ہو یا نفرت۔

(عمرسل: وزیر محمد خان۔ بخل ہزارہ)

ہے، معمول کے نذرانے کے ساتھ کالا بکرا بھی لیا ہے۔ اپنے حالیہ چلنے کے بارے میں بتایا کہ اس خطرناک عمل میں جان بھی جاسکتی تھی۔ آج منزه سکون میں ہے۔ عامل بابا نے پہنچ کر دیا ہے کہ اب بھی اگر غلام موسیٰ جن حرکت سے باز نہ آیا تو اس کی خیر نہیں۔ سختی کرنا بڑے کی لیکن گھر والے پریشان نہ ہوں۔ منزه کی چیخ و پکار سن کر گھبراہٹ میں سمجھ لیں کہ جن کو سزا مل رہی ہے۔

اپنے لوگوں کی سادہ لوحی اور جہالت پر ولی دکھ ہوا۔ شعبہ طب میں ان خرافات پر ماہرین کے تفسیل اور مدلل پیکچر سن رکھے تھے۔ اس کے علاوہ آئے روز اخبارات میں خبریں شائع ہوتیں، جن کے مطابق نام نہاد عامل، متاثر خواہش کے جن ٹکالے کی آڑ میں ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالتے اور بعض شرمناک حرکت بھی کر گزرتے۔ افسوس کہ لوگ نصیحت نہیں پکڑتے۔ ہر بار فریب میں آ جاتے ہیں۔

دو پہر کو کھانے کے بعد چند منٹ کا وقفہ گزارا تھا کہ عقب میں ہڑ بونگ مچنے سے میں چونک اٹھا۔ اماں کتب افسوس ملتے ہوئے بولیں۔ ”پھر دورہ پڑ گیا۔ بے چاری کو نظر کھا گئی۔ چھوٹے چھوٹے مصوم بچے دل گئے ہیں.....“ میں اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکا تھا لیکن اماں کو کچھ بتانے کے بجائے مصمم ارادے سے لٹکا اور پھوڑے چلا آیا۔ اہل خانہ سخت غم زدہ اور سہمے ہوئے نظر آئے۔

منزه کے والدین اور بڑا بھائی بھی موجود تھا۔ وہ خود مجبہ عمارت کے فیلے کمرے میں تھی۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں برآمد ہوئیں کہ کچھ پہلے نہ پڑا۔ دروازے کے باہر فرش پر دیکھتے کوئلوں کی انگلیٹھی کے پاس بیڑھی پر بیٹھا عامل بابا کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی چنگیری میں سرخ گول مرچیں اور کچھ درد رنی جڑی بوٹیوں کا آمیزہ رکھا تھا۔ بابا کے اٹلے ہاتھ پر موٹا لبا ڈنڈا پڑا تھا۔ اس پھر حکیم کے چہرے مہرے سے مینگی اور عجیب طرح کی وحشت لپک رہی تھی۔ ذہن میں فوری خیال آیا کہ اتنا بوڑھا شخص ایک لحاظ سے نیٹرل ہو جاتا ہے۔ لہذا ناگفتنی کے ارتکاب کا خدشہ عموماً نکل جایا کرتا ہے لیکن بغیر نہیں کہ جسمانی تشدد کرنے پر آئے تو حد سے ہی گزر جائے۔

میرے گاؤں کے لوگ وقت سے پہلے ہی مجھے ”ڈاکٹر صاحب“ کہتے لگ گئے تھے۔ میری آمد پر سب نے دلہانہ استقبال کیا تھا اور خواتین پر رقت طاری ہوئی تھی۔ تاہم مردوں نے حوصلہ پکڑا۔ منزه کا بھائی یعقوب، بونج سے تانیک یا حوالدار کے ریک سے ریٹائر ہوا تھا۔ میں نے اس کو الگ کر

کے سمجھایا کہ منزه بیمار ہے اور اس کو فوری طور پر شہر لے جانا چاہیے۔ ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس، جو میرے مہربان استاد بھی ہیں۔ وہ شاید پہلے ہی گوگوگی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہری آئی۔ فوراً باب کے قریب جا کر کمر پھس کرنے لگا۔

عامل بابا نے ایک دم گرج دار آواز میں منتر کے مہل الفاظ دہرائے اور دہاڑ کر بولا۔ ”اویئے یہودی! آج تمہا مقابلہ مسلمان عامل سے ہے۔ تیری خیر نہیں۔ سیدی طرح چلا جا، نہیں تو پچھتاگے۔ تیری تسلیں یاد کریں گی۔“ اس نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور چنگیری میں پڑا تسک کوئلوں پر اٹھ دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور جھپاک سے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بھیڑ لیا۔ وہ بستر پر لیٹی، آنکھیں پھاڑے بڑبڑاتے ہوئے چھت کو گھور رہی تھی۔ سچ طاری ہونے سے جسم اکڑا ہوا تھا۔ میں نے چادر پھیلا کر اس کا بدن ڈھانپ دیا اور پسینے میں تر چہرے پر بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ پیٹا پونچھا اور پیشانی کو سہلاتے ہوئے اگلے مرحلے پر پہنچی چھٹی سی آنکھوں پر پھیلی رکھ دی۔ اس کے بدن میں ہلکی لرزش ہونے لگی اور ہونٹ باہم بھوست ہو گئے۔

مجھے صبح اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنے منٹ کے دورانیے میں منزه کے جسم کی اینٹھن کم ہونا شروع ہوئی اور اس نے اپنا چہرہ سہلاتے ہوئے میرے ہاتھ کی پشت پر اپنی دونوں ہتھیلیاں رکھ دیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے غنودگی آنے سے وہ پرسکون ہو گئی ہے۔ تا دیر جھکے رہنے سے مجھے اپنی کمر میں کچاؤ محسوس ہوا تو اٹلے ہاتھ سے باری باری سہارا دے کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پہلو میں رکھا اور اپنا پیٹا ہاتھ اڑا کر لایا۔

باہر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر عامل بابا جلال میں آ گیا اور بولا۔ ”میرا شکریہ ادا کرو۔ ورنہ جن نے تمہاری گردن مروڑ دینی تھی۔“ میں نے جھک سے کہا۔

”ٹھیک ہے باوادی! بہت شکریہ۔ ویسے میں نے جن کو کوہ قاف اسرائیل کی فلائٹ سے روانہ کر دیا ہے۔ وہ جلد ہی چیچنیا پہنچ جائے گا۔ اس عورت کو معاف کر دیں۔ یہ میڈیکل فنٹ نہیں.....“

مرچوں کی دھوئی سے وہاں کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ بابا نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور دہنگ لب و لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تمہاری میڈیکل یہاں نہیں چلے گی اور چیچنیاں میں حضرت پیرے شاہ غازی، دمڑیاں والی سرکار کا راج ہے۔ وہاں کوئی جن نزدیک بھی نہیں چھک سکتا۔“ میں نے حکمت سے کام لیا۔ چونکہ اپنے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے خوف

وقت بادشاہ اور کائنات کی پرشے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی بل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چائے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رول کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت افسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 8

وقت

حُسام

موت کے کتوئیں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سننی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در با طویل داستان





اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی کھداشت میں پایا۔ علی سلطان نکپاس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مسل جیٹر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹائرمنٹ لین سے ملنے کی ہو چکی تھی۔ وقت بے وقت ریٹائرمنٹ لین اپنی کھوئی ہوئی کواپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اسد علی کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمت رکھی ہوئی تھی اور پچھن سے جو اب تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد دیا برا تاؤ کرتا تھا جو اسے اکل کھاتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں ٹیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی ملتے جلتے رہے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی اکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر دوبارہ شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... ”میرے بچے انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ علی کی عقل کے محسن کو ہوا جو اپنی سی لہذا نیچے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نکپاس کے علاقے میں مکمل طور پر داخلہ لیا۔ ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جو وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکلو میٹر میں پچھلے ڈگری حاصل کر لی تو توت سنے ہنگامے سے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو سائیکلو میٹر لڑکے ڈھکی کی نیت سے ”سرکل اے“ میں محس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ذکیعت علی کے ساتھ موجود سائیکلو میٹر پر نظر رکھنا شروع کر گئے۔ پولیس نے ٹھک کی بنیاد پر علی کو بھی شاپنگ پیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں سائیکلو میٹر ذکیعت کو ٹھک (ایری ڈونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ایک جینسن (نیکپاس) میں تھا جیکب علی سلطان کی رہائش ہے سی (نیکپاس) میں تھی۔ علی ایک علی ہوٹل میں رہتا تھا اور ایک جینسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا رہتا تھا۔ ”وٹی لاؤنچ“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک سپائیکو ڈیزیزہ شادو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں محراب میں علی کے دیر دل پر دست دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وٹی لاؤنچ میں جب لیونا نارڈو نامی ایک سائیکلو میٹر لڑکے اور اس کے حواریوں نے شادو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی کی توجہ میں کود پڑا۔ اس باراداری کو ایک امیر و کبیر اسٹیشن لینی ڈی ڈیٹا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈیٹا کراؤ علی کو کھار کے یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی..... ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔“ اس واقعے کے بعد لیونا نارڈو سے علی کی دوستی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونا نارڈو کے فیصلوں میں گامے سے گامے ملنے لگے۔ لیونا نارڈو نے اپنی تربیت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وٹی لاؤنچ والے ناخوگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھوڑ کر اسے اگلے سلطان کی خدمت کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ ایک روز جب شادو اسٹیشن اسٹور سے گروماری خریدنے کی تیاریوں میں لیونا نارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں بہت زیادہ ہوشیاری اور شادو کو ڈھونڈنا تھا۔ ایک روز جب شادو اسٹیشن اسٹور سے گروماری خریدنے کی تیاریوں میں لیونا نارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کو ہارمیکو، شادو اور لیونا نارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے پیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کوادھ مو کر دیا۔ آئندہ روز چیلو کے قتل کی خبر تک جینسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جینسن میں حریز قیام خفہ کا ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اگلے سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہڈی اسی سپورٹ کار میں لیک جینسن سے ہسپتال پہنچ گیا۔ مگر سب بڑا اسپورٹس میں قاتل کے کڑا ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر تکسٹ باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر تکسٹوں میں ہر مل علی پر چڑھتوں کا ایک نادر و اہوتا بنا۔ ڈیٹا بہت اونچے بل کی مالک ایک پراسرار لینی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو چیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے حکمن سے بال..... علاوہ ازیں ڈیٹا نے نفوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونا نارڈو، شادو کو اغوا کر کے کیو کا شہر ہونا ہے کیا ہے جہاں وہ شادو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جمونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر تکسٹ پھرے ہوئے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو صحت سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسن ہال والے اس بیٹھنے میں ڈیٹا کی سنگت میں گزرنے والے وہ عظیم ہوش رہا بہتر تکسٹ بڑے رنگین، رنگین، برومان پرورد اور دانا قاتل تھیں تھے۔ ڈیٹا کی شخصیت کی سنے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد، ڈیٹا نے اپنے ہی ایکس دو پراسرار شخصیات رینی آئزک بارون لاؤ اور لیمیا اچل باج سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکٹ اور بہت طاقتور موسائی ”اسکل اینڈ بونز“ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے جوان کی تلاش تھی جس کی اس مسلمان اور باپ مبرا تھا۔ انہیں ٹھک تھا کہ علی وہی جوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کینیا پر ویش ہو گئے تھے۔ ڈیٹا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر رضا کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بونز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کرے لیکن علی نے ڈیٹا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹا سے بے نیچے اپنے اگلے کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ اگلے نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیر اور رستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامریک کے پاس پہنچا گیا تھا۔ مرزا عامریک، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجن کی حیثیت سے انہیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے

ہاک کراچی سے یہ رقم آتا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو بالکل کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل اعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تجارتی کی اور پوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے بیٹا سموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایئر پورٹ سے ایک ٹیکسی بکڑا کر اپنے ہوسٹ کی جانب والدہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دریائے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اسے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا ہاتھ لایا اور انہیں گھر لے آیا۔ جب حفیظ کپور نے علی کو سلی خاتون کے بارے میں بتایا تو وہ ہلکے انہیں دیکھنے لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو میں جب اس نے مجھے بتایا کہ میں جس عورت کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آیا ہوں، اس کا نام سلی ہے تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا تھا اور سیل فون میرے ہاتھ سے پھسل کر بیڑ پر جا کر اٹھا۔ ان جذباتی لمحات میں بے ساختہ میں نے عظیم سے "استفسار کیا تھا۔"

"تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟"

یہ ایک غیر ارادی اور بے اختیار سوال تھا جو عظیم کے انکشاف کے رد عمل میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد عظیم سے ہونے والی بات چیت سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے اس اضطراری سوال کے الفاظ اس کی ساعت تک رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے ورنہ وہ مجھ سے میری والدہ کے حوالے سے ضرور پوچھتا چکا ہوتا۔ اس وقت میں نے یہی سوچ کر اطمینان کر لیا تھا کہ عظیم کا اس معاملے کو نہ کریدنا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ نہیں سمجھ سکا کہ سلی دراصل میری ماں ہے.....!

لیکن یہ میری خوش فہمی تھی کہ بیڑ پر بڑے ہوئے سیل فون سے ابھرنے والے میرے سوال کو عظیم سن نہیں پایا تھا۔ یقیناً وہ جان چکا تھا کہ میں جس سلی نامی عورت کی تلاش میں یہاں آیا ہوں، وہ میری ماں ہے اور یہ راہ عظیم نے ہی اپنے پایا کو بتایا ہوگا۔ اس کے بعد حفیظ کپور نے مجھے سر پر اثر دینے کے لیے یہ اہتمام کیا تھا۔ پورا دن مجھ پر یہی ظاہر کیا جاتا رہا کہ عظیم میری ماں..... مطلب یہ کہ سلی صاحبہ کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ درحقیقت عظیم میری ماں کو یہاں لانے کی ہم پر گیا ہوا تھا اور وہ کامیاب ٹوٹا تھا۔ میرے ذہن میں حفیظ کپور کے وہ الفاظ بھی روشن ہو گئے جب کپور صاحب نے سیل فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ "سیدھے اوپر.....!"

ان لمحات میں اور بعد ازاں کپور صاحب اور اکبر کے چچ ہونے والی گفتگو سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ

بڑے کپور صاحب کے الفاظ میری ساعت کے لیے کسی ایسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ میں ان سنسنی خیز لمحات میں اضطرار اور اضطراب کی آخری منازل سے گزر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا جو مجھے کچھ سوچنے اور کچھ سمجھنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ چشم زدن میں سیڑوں استفسارات برساتی سمیوں کے مانند داغ کے لالک گوشوں سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی کیفیت میں انسان یقین اور بے یقینی کے بیچ سوا لہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ حفیظ کپور کے آخری جملے کی گونج مجھے اپنے پورے وجود میں محسوس رہی تھی۔ انہوں نے نہایت ہی شفیق اور مہربان لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔

"اوپر عظیم کے کمرے میں سلی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

حفیظ کپور کی زبان سے اپنی ماں کا نام سن کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ میں نے ابھی تک یہاں کسی شخص کو اپنی والدہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ عظیم اور حفیظ کپور یا دیگر افراد کو صرف یہی معلوم تھا کہ میں کسی سلی نامی عورت کی تلاش میں امریکا سے کراچی آیا ہوں پھر حفیظ کپور نے یہ کیوں کہا۔ "آپ کو میں آپ کی والدہ صاحبہ سے ملوانے لے جا رہا ہوں؟"

اس جملے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ سلی صاحبہ کو میری والدہ کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر کیسے.....؟

اس "کیسے" نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ میں زیادہ دیر تک حیرتوں کے پہاڑ تلے دبائیں رہا۔ میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور میں نے انجمنوں کے ڈانٹ پوریٹ کو اپنے سر سے اتار پھینکا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں بے درپے درپے رونما ہونے والے اہم واقعات ایک کے بعد ایک میرے ذہن میں تازہ ہوئے لگے۔

ادداشت کی اہم میری راہ نمایاں تھی۔ گزشتہ رات عظیم سے

سیدھے اوپر“ کے الفاظ کپور صاحب نے اپنے پوتے عظیم کے لیے استعمال کیے تھے جس نے صحت کے اوپر مختلف پرندے پال رکھے تھے لیکن میرا یہ ناخود بخیر کسی بھول سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ یقیناً یہ وہی لحاظ تھے جب عظیم میری والدہ کو لے کر اس گھر میں پہنچا تھا۔ یقیناً حنیفہ نے ٹیلی فون پر عظیم ہی سے بات کی مگر اسے ”سیدھا اوپر“ جانے کو کہا تھا۔

یہ تمام تر خیالات ہلکے جھپکتے میں میرے ذہن سے گزرے اور یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ حنیفہ کپور نے اپنے اعتماد کے ساتھ مجھ سے وہ ڈیل کیوں کی تھی۔ انہوں نے کسی بیوی باری کے انداز میں مجھ سے یہ سودا کیا تھا کہ..... ”آپ دعا کرو کہ اللہ میری آزمائش کو ختم کر کے مجھے دوبارہ سرسبز و شاداب بنا دے۔ اس کے بدلے میں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آج کی تاریخ میں آپ کو ایک ایسی ہستی سے ملواؤں گا جس کی تلاش میں آپ امریکا سے یہاں آئے ہو۔“

حنیفہ کپور نے مجھے سر پرانز دینے کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ بڑا کلاس کا ڈراما کیا جا رہا تھا اور اب اس ڈرامے کا کلائمیکس آ گیا تھا۔ میں یک ٹک کپور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”آپ رگ کیوں گئے۔ آئیں میرے ساتھ.....“ اسی لمحے عظیم اٹھ کر ہماری جانب بڑھا۔ ”بابا! آپ بیٹھیں۔“ اس نے حنیفہ کپور سے کہا۔ ”میں اسد کو لے کر اوپر جاتا ہوں۔“

عظیم کی طرف سے اکھڑے اور جھڑے رہنے والے حنیفہ کپور نے اس موقع پر عظیم کی پیشکش کے جواب میں کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور بڑے رسان سے بولے۔

”ہاں شیک ہے۔ تم دونوں اوپر جاؤ۔“

”آؤ برو۔“ عظیم نے میرے بازو پر ہاتھ مار تے ہوئے کہا۔ ”آپ کی مراد پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“ میں گردن جھکا کر چپ چاپ اس کے ساتھ ہویا۔

عالی شان ریٹنگ والے صاف شفاف ذہن پر عظیم کے پہلو میں چلتے ہوئے میں نے قدرے شکی لہجے میں کہا۔

”آج دوپہر سے اب تک آپ لوگوں نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔ مجھے بڑے کپور صاحب سے کوئی گلہ نہیں لیکن تم تو میرے دوست ہو۔ تم نے مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟“

”تم کوئی مصلحت.....!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیسی مصلحت؟“ ”جب وقت آئے گا تو بتا دوں گا۔“ وہ لہجے کی سنجیدگی اور برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”مگر تمہیں پتا چلے گا کہ آج دوپہر سے نہیں بلکہ گزشتہ روز نصف شب سے لے کر اب تک میں نے تم سے بہت ساری باتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے حنیفہ لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا مگر پہلے اپنی والدہ سے ملاقات کرو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں انہیں جلدی واپس چھوڑنے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ یہاں لایا ہوں۔“

”اوہ..... تو کیا تم انہیں واپس بھی چھوڑ لے جاؤ گے؟“

”ہاں..... یہ ان کی خواہش ہے۔“ اس نے کہا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ میں نے ابھمن زدہ لہجے میں خود کلامی کی۔

”سب سمجھ میں آ جائے گا برو۔“ عظیم نے پرمعنی انداز میں کہا۔

ہم بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ مگر کا یہ حصہ بھی نیٹ کلین اور اعلیٰ طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ میری معلومات کے مطابق، بالائی منزل پر عظیم اپنی فیملی کے ساتھ آباد تھا۔ اس کی بیوی مہر النساء دینیوں کے ساتھ ان دنوں امریکا یا تیار پور گئی ہوئی تھی۔ ایک بیٹی اور بیٹا عظیم کے پاس تھے اور یہ دونوں بچے اس وقت زیریں منزل پر اپنی دادی پھوپھیوں کے ساتھ تھے۔ پھوپھیوں کے بچوں کے ساتھ ان کی خوب جتنی تھی۔ علی، اس کی بیوی اور بڑے کپور صاحب زیریں منزل پر قیام پزیر تھے۔ عظیم کی والدہ سعیدہ خاتون کے ساتھ جوڑوں کے مسائل تھے اور دونوں ٹھنڈے تو بالکل کام نہیں کرتے تھے لہذا وہ چلی منزل کی ہور کوڑھ گئی تھیں۔

عظیم نے ایک کمرے کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسد! تمہاری والدہ اس کمرے کے اندر موجود ہیں۔ تم ان سے ملاقات کرو۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔“

بات کے اختتام پر وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں نیچے ڈائننگ میں بابا کے پاس جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تمہارا کھانا اور پتی بیج دوں گا۔“

آج تم ڈراما اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ کرو گے.....“

میں نے عظیم سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ایسی بات

نیچے ہوتی ہے۔ میری جنت، میری ماں اس وقت میری نگاہ کے سامنے تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک مسئلے سے اٹھ کر لڑی ہوئی تھیں۔ چٹکھات تک ہم دونوں بت بنے، سات کھڑے ایک دوسرے کو نکلتے چلے گئے۔ اس ”دلچسپ“ دکان میں بڑا دلہانا نہ تھا۔ جذبات کی شدت نے دونوں کی زبانوں پر قفل ڈال دیے تھے۔ ہمارے پاس کہنے کے لیے اتنا زیادہ تھا کہ الفاظ کے بوجھ سے ہماری سوچ کی کمر جبک گئی تھی۔ ہم ایک بہ ایک ازلی ابدی گونگے بن گئے تھے۔ ٹھنڈے ٹھار جنت نظیر بیڑوم میں پن ڈراپ خاموشی کا راج تھا۔ صرف ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ وقت گویا ایک مقام پر ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ ہمارے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا مگر زمین ہمارے پاؤں پر گئی تھی اور ہمارے پاؤں جنتبش نا آشنا ہو گئے تھے۔

معلوم نہیں، ہم کتنی دیر تک خاموش نظروں سے ایک دوسرے کے چہرے کا طواف کرتے رہے۔ ماں کی آنکھوں سے شائستگی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ بے شک! انہوں نے اپنے لبث جگر کو پہچان لیا تھا۔ میری نگاہ بھی ہر ہر زاویے سے یقین کامل کی کیفیت سے گزر چکی تھی۔ ہم دونوں نے احساسات کے اڑن ٹکڑے پر سوار ہو کر انیس برس کا فاصلہ انیس سیکنڈ میں طے کر لیا تھا۔

قبل اس کے کہ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا، ماں کے ہونٹوں میں خفیف سی جنتبش ہوئی پھر وہ دونوں بازو اٹھ کر کے اضطرابی انداز میں آگے بڑھیں۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

”میرے بچے.....!“

ماں کی پکار پر میں بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ میرے قدموں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں کمان سے نکلے ہوئے تیروں کے مانند ایک دوسرے کے سینے میں پیوست ہو چکے تھے۔

یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا جب میں بہ قافی ہوش و حواس شعوری حالت میں ماستا کی زماہٹ اور گرماہٹ سے آشنا ہو رہا تھا۔ میں ان لمحات کے کیف کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایک روح پرور خوشبو سانسوں کے راستے میرے اندر اتر رہی تھی اور میرے تن بدن کو سرشار کر رہی تھی۔ میں انبساط کی آخری منازل سے گزر رہا تھا۔ کائنات کی ہر شے ہمارے ملن کی خوشی میں احتراما ساکت ہوئی تھی۔ گویا وقت ختم کیا تھا۔

فہم کہ میرے پاس سوالات کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں سوالات جھانسنے میں مصروف تھے لیکن عظیم کے موڈ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سربست وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا لہذا میں نے اس سٹی میں وقت برباد نہیں کیا اور اس دروازے کی سمت بڑھ گیا جس کے پیچھے وہ عظیم ہستی موجود تھی جس نے مجھے جنم دیا تھا لیکن ماں کی آغوش کی نرمی اور گرمی میرے نصیب میں نہیں تھی۔ کاتب تقدیر نے ماں کے بچے کے بیچ طویل جدائی رقم کر دی تھی۔ میں کم و بیش ایک سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ اسی کم عمر کے بچے کو کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں تھا۔ میں نے برسوں پہلے اپنی زندگی کا ابتدائی ایک سال ماں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس ایک سال کا ایک لمحہ بھی میری یادداشت کے کسی کونے کھدے میں محفوظ نہیں تھا۔ میں اپنی ماں کی فصل سے آشنا نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔

اس یقین کا ایک خاص سبب تھا۔ بروکلین (نیویارک) میں مرزا عمر بیگ سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں انہی کے ایما پر امریکا سے پاکستان آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلے انیس سالوں میں اٹکل علی سلطان کا بے بہ گاہے میری تصویریں انہیں بھیجتے رہتے تھے۔ بیگ صاحب مذکورہ تصاویر کو ان ایڈریس پر پوسٹ کر دیا کرتے تھے جہاں سے ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ انہیں رقم بھیجی جاتی تھی۔ اگرچہ رقم بھیجنے والوں کے نام اور پتے وقت گزرنے کے ساتھ بدلتے رہتے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ تمام کی تمام مذہبی سہمی تو اتنی تصاویر ضرور میری ماں کے پاس پہنچ گئی تھیں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتیں۔ علاوہ ازیں، قدرت نے ماں کے اندر ایک خاص نوعیت کا اثبات نصب کیا ہوتا ہے۔ اس عظیم ہستی کو اپنے جگر گوشوں کی جان پہچان کے لیے کسی حیلے و سلیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماستا کی فریکوئنسی ایک خود کار نظام کے تحت اپنی اولاد کو شناخت کر لیتی ہے۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس دس میں میرے ذہن سے گزرے اور میں دھڑکنے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے کا اندرونی ماحول بخ بستہ تھا۔ کمرے کا اے سی بڑی عمدگی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے گویا بہشت ارضی میں قدم رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے، جنت ماں کے قدموں کے

معاذ حق ہوا تو ماں نے بے درغ میرا چہرہ چوما۔ میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسے دیے۔ میں پہلی بار اس نوعیت کی محبت سے آشنا ہو رہا تھا۔ اس پیار میں بڑی لذت اور چاشنی تھی۔ میں اس اپنائیت اور خلوص کے ڈانکتے سے ابھی تک ناواقف تھا۔ ان لمحات میں، میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ مجھے اپنے بخت پر بے پناہ فخر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

جب ہم جذبات کے منہ زور طوفان سے باہر نکلے تو قوت گویائی بحال ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے نہایت ہی احترام سے استفسار کیا۔

”ماں! آپ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں میرے لعل!“ وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”تم کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک نہیں ہوں.....“

”تھیں کیا ہوا ہے میرے لعل؟“ وہ تڑپ کر بولیں۔

”ہوا تو کچھ نہیں۔“ میں نے معصومیت بھرے لہجے

میں کہا۔

”پھر تم نے کیوں کہا کہ ٹھیک نہیں ہو؟“

”بس..... ویسے ہی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں..... مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ وہ

ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ ”تم اچانک پاکستان کیوں آئے ہو؟ کیا تمہارے کیرئیر فیکر کو اس بات کی خبر ہے کہ تم اس وقت پاکستان میں ہو؟ اس نے تمہیں آنے کی اجازت کیوں دی؟.....؟“

انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔ میرے پاس ان کے ہر سوال کا جواب موجود تھا لیکن مجھے اس بات پر تشویش محسوس ہو رہی تھی کہ وہ پاکستان میں میری آمد پر اس قدر پریشان کیوں ہو رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھیں مگر اس خوشی کے پیچھے وہ مجھے بے انتہا فکر مند بھی دکھائی دے رہی تھیں اور یہ بات ان کے سوالات سے بھی ہو رہی تھی کہ وہ پاکستان میں میری اچانک آمد پر یوگلا کر رہ گئی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کسی مشکل میں تھیں۔ ماں کی مشکل کے بارے میں سوچ کر میں بے چین ہو گیا۔

”میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“ میں نے

غٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے آپ

میری ایک بات کا جواب دیں.....“

”کون سی بات؟“ انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”آپ نے ایک طویل عرصے تک مجھے اپنی محبت

سے محروم کیوں رکھا؟“ میں نے کسی معصوم بچے کے انداز میں پوچھا۔ ”اور آپ نے ملاقات کے لیے مجھے اپنے گھر کیا جنمیں بلایا.....؟ آپ عظیم کے ساتھ یہاں کیوں چلی آئیں؟“

”تم نے بہت ہی نازک اور خطرناک سوالات کیے ہیں میرے لعل۔“ وہ دھکی لہجے میں بولیں۔ ”ان کے جھاپ ایک دو جھلوں میں نہیں دیے جاسکتے۔ اس کے لیے تمہیں میری زندگی کی مکمل داستان سننا ہوگی۔ تب جا کر تمہاری دل ہوگی۔“

”میں اپنی آخری سانس تک آپ کی چٹا سننے کو تیار ہوں۔“ میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ”آپ کا اندازہ نہیں کہ میں اپنے والدین سے ملنے کے لیے کتنا تیار ہوں، ان کی صورت دیکھنے کے لیے کتنا ترسا ہوں۔ میں نے ہوش سنبالنے سے لے کر اب تک کا وقت آپ لوگوں کی یاد میں کس اذیت سے گزارا ہے، اس کا آپ تصور رکھیں نہیں کر سکتیں.....!“

”مجھے بے غولی اندازہ ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔ ”جب آپ کو ہر بات کا اندازہ ہے تو پھر ایک طویل عرصے تک مجھے خود سے دور کیوں رکھا؟“ میں نے شکامی لہجے میں کہا۔ ”یہ تو چند دن پہلے اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے باپ کو کئی دکن نے مل کر ڈالا تھا اور آپ نے ایک سال کی عمر میں مجھے کسی ٹیلی کے ساتھ امریکا روانہ کر دیا تھا۔ پھر آپ میری پرورش اور نگہداشت کے لیے میرے کیرئیر فیکر کو ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھیجتی رہتی تھیں.....“

”یہ ساری باتیں تمہیں اسی کیرئیر فیکر نے بتائی ہیں؟“

انہوں نے چونک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”ہمارا

مطلب ہے، بیگ صاحب نے.....؟“

”جی بالکل!“ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”بیگ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ ٹھکی

آميز لہجے میں بولیں۔ ”مجھے ان سے اسی کوتاہی کی امیہ

نہیں تھی۔“

میرا دماغ محو کر رہ گیا۔ ماں بیگ صاحب کے اس

عمل کو کسی کوتاہی سے تعبیر کر رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا

کہ اس میں کوتاہی والی کون سی بات ہے؟ یہی سوال میں

نے ماں سے کیا۔

”اگر بیگ صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں

بتا دیا تو اس میں ان کی کیا غلطی ہے؟“

”میں نے جاوید واسطی نامی ایک شخص کے توسط سے

تمہیں امریکا بھجوا دیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔ ”جاوید واسطی



دلچسپ دو لکھ انگریزوں سے سچا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ

پاکینہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط دار ناول

سیما رضا ردا کا نئی ناول ہم کو عبث بدنام کیا اختتامی مراحل میں

اسما قادری کی ایک نہایت شاندار تحریر..... بد صورت

ہما بیگ، نیلم احمد بشیر اور صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں

نگہت سیما کا خوب صورت اندازِ بیاں..... پر لطف ناول صیدِ ضیافت کی صورت

دینی مطلوبات پر مبنی پر عقیدت مضامین

ماضی کی ادا کارہ دیبا کی

ہونہار فنکارہ صاحبزادی مدیحہ رضوی

سے دل پزیر ملاقات

سحر ساجد کی اچھوتی تحریر..... عنان گیر مکمل ناول کی صورت

اس کی حلاوت

عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،

ہاجرہ ریحان و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ سو کئی شاعری خوش ذائقہ تراکیب ہمارے نگاروں کی بہت کچھ صرف آپ جیسے پُر ذوق پڑھنے والوں کے لیے

کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے تمہیں مرزا عا مر بیگ کے حوالے کیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو بڑی سختی سے یہ تاکید کر دی تھی کہ جب تک میں گرین سکلن ندوں، انہوں نے تمہیں پاکستان نہیں بھیجتا۔ بیگ صاحب کی کوتاہی یہ ہے کہ مجھے کانوں کان خبر نہیں اور تم چپ چاپ امریکا سے پاکستان آ گئے ہو.....!“

”بیگ صاحب کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں..... ایسی کیا آفت ٹوٹ پڑی تھی؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں مستشرق ہو گئے۔

میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ جب مسلسل چھ ماہ تک ان کی طرف سے رقم موصول نہیں ہوئی تو بیگ صاحب پریشان ہو گئے۔ انہیں شک ہوا کہ آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہیں ورنہ گزشتہ انیس سال میں ایک بار بھی آپ کی طرف سے ایسی غیر ذمے داری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ بیگ صاحب کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ رابطہ کر کے آپ کی خیریت دریافت کرتے۔ بالآخر بیگ صاحب اور انکل سلطان نے مل کر یہی فیصلہ کیا کہ اس صورت حال میں مجھے فوراً پاکستان یعنی آپ کے پاس چلے جانا چاہیے۔ وہ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔

”کیا؟“ میں نے بے ساختہ کہا۔
”میں تو ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ بیگ صاحب کو ایک مخصوص رقم بھجوا رہی ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”میرے پاس تو رقم بھیجے کی رسیدیں بھی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیگ صاحب کو پچھلے چھ ماہ سے رقم نہ ملی ہو.....؟“

”بیگ صاحب جھوٹ کیوں بولیں گے!“ میں نے کہا۔
”میں بیگ صاحب کو جھوٹا نہیں کہہ رہی ہوں۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”لگتا ہے، میرا کوئی ملازم گمراہ کر رہا ہے۔ رقم اپنی جیب میں ڈال کر مجھے نکلی رسیدیں بھجوا رہا ہے۔“

”کوئی نکلی رسیدیں کیسے بنا سکتا ہے؟“ میں نے ایک نکتہ اٹھا دیا۔ ”اور وہ بھی کسی انٹرنیشنل منی ٹرانسفر کمپنی کی.....!“
”میرے لعل اس ملک میں ہر قسم کے ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولیں۔ ”یہاں کسی نکلی رسید

سے لے کر امریکا، کینیڈا کے ویزے کے حصول تک کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ خیر.....“ لکھائی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
”میں ان تمام بندوں کی خبر لیتی ہوں جن کے توسط سے پچھلے چھ ماہ میں، میں نے عا مر بیگ کو رقم بھیجی ہیں۔ جب چور پکڑا جائے گا تو پھر میں اس بد معاش کو جیل میں بٹھ کر اڑوں گی۔ پھر اس کیسے کو پتا چلے گا کہ بے ایمانی کیسے کرتے ہیں!“

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی!“ میں نے ایک اہم لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”آپ بے ایمانی کرنے والے شخص کو کسی قسم کی کوئی سزا نہیں دلوا رہیں گی۔“ میں نے نفوس انداز میں کہا۔

”مگر کیوں؟“ ان کی حیرت دو چند ہو گئی۔
”اس لیے کہ میں اس بے ایمان شخص کا احسان مند ہوں۔“ میں نے گہری تنبیہ کی ہے۔

”احسان مند..... تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“
”اگر وہ شخص بے ایمانی نہ کرتا تو آج میں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں اس شخص کا بے حد شکر گزار ہوں جس کی غلطی نے مجھے میری ماں سے ملوایا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس بے ایمان شخص کو معاف کر دیں۔“

وہ بڑی گہری نظر سے مجھے گھورنے لگیں۔ جب چھ لمحات تک وہ کچھ نہیں بولیں اور جذب کے عالم میں مجھے جلی رہیں تو میں نے حندذب لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں.....؟“
”بالکل اپنے باپ حیدر علی کی کاپی ہوں۔“ انہوں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”دل بڑا، دماغ کا بڑا، عالی ظرف، درگزر اور معاف کر دینے والا.....“

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔
”آجائیں۔“

دروازہ کھلا اور ملازمین کھانے کی دوڑے اٹھائے اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں ماں کے قریب ہی ایک شاندار میز پر خورد و نوش کا اچھا خاصا سامان پہلے سے موجود تھا۔ یہ وہ افطاری تھی جو میری ماں کے لیے بیڑ روم میں بھجوائی گئی تھی اور اب ڈنر کے لوازمات لائے جا رہے تھے۔ مجھے ذرا سی بھی بھوک نہیں تھی۔ ایک تو حنفیہ کچر

”تمہارے باپ حیدر علی کی بعض لوگوں سے دشمنی تھی۔“ وہ غصہ سے ہونے لگے میں بتانے لگیں۔ ”وہ لوگ اس دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے تمہارے باپ کی جان لے لی۔ جب تمہارے باپ کا قتل ہوا، تم میرے پیٹ میں تھے۔ حیدر علی کی موت کے چھ ماہ بعد تم اس دنیا میں آئے تھے۔ میں نے ایک سال تک کس طرح تمہاری پرورش کی، یہ ہی جانتی ہوں۔ تمہاری سلامتی اور حفاظت کی خاطر ہی میں نے تمہیں امریکا بھجوا دیا تھا۔ یہاں قدم قدم پر تمہاری جان کو خطرہ ہے اور.....“

”یہ ساری باتیں مجھے بھی معلوم ہیں ماں۔“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری جان کی پروا نہ کریں۔ میں اپنی اور آپ کی حفاظت کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جو میلی نظر سے میری ماں کی طرف دیکھے گا، میں اس کی آنکھیں نکال لوں گا.....“ لکھائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے ابھی اپنے ساتھ گھر لے کر چلیں۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔“

”مجھے معلوم ہے میرے لعل۔“ انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور نشوونما کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”تم اس قابل ہو گئے ہو کہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو تو اسے دانتوں پینا آجائے۔ تم میرے ایک ایک دکھ کا مداوا کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ مجھے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے لیکن.....“ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لکھائی توقف کیا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔

”لیکن سردست میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔“

تم اسے میری مجبوری سمجھ لیا حالات کی تم غلطی.....“

”ماں! مجبوری کا ذکر آپ نے پہلے بھی کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسی کون سی مجبوری ہے جو آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتیں؟“

”جب تم میرے حالات سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لو گے تو میری مجبوری تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔“

وہ غصہ سے ہونے لگے میں بولیں۔

”میں آپ کے حالات سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ہی تو آپ کے ساتھ جانے کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے اصرار ہی لگے میں کہا۔ ”جب تک میں آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کی پتا نہیں سنوں گا، مجھے آپ کی زندگی

صاحب نے ضد کر کے مجھے تین بندوں کی خوراک کھلا دی تھی اور اس پر ماں سے ہونے والی ملاقات کی توقعی نے میرے قلب و جگر کو مسرت و شادمانی سے نہال کر رکھا تھا۔ کچھ مٹی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے ملازماؤں کے کام میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا اور خاموشی سے ان کی کارروائی کو دیکھتا رہا۔ جب وہ کھانا چھینے کے بعد بیڈروم سے رخصت ہو گئیں تو میں نے کہا۔

”آج میں اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔“

”اگرچہ مجھے ذرا سی بھی طلب نہیں۔“ ماں نے کہا۔

لہن میں اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔ اس کے ہاتھ سے کھانا کی اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔“

کھانے کے دوران میں، میں نے ایک بار پھر ماں سے سوال کیا۔ ”آپ نے ملاقات کے لیے مجھے اپنے گھر کیوں نہیں بلایا؟ آپ غنیمت کے ساتھ یہاں کیوں چلی آئیں؟“

”میں جہاں رہتی ہوں تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے میرے بچے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ”کیوں؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ”آپ کے گھر

میں ایسی کیا بات ہے کہ میرا وہاں جانا مناسب نہیں؟ ماں کے گھر جانے کے لیے ایک بیٹے کے راستے میں ایسی کون سی رکاوٹ ہو سکتی ہے؟“

”رکاوٹ کوئی نہیں۔“ وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ”حالات کی بعض ایسی مجبوریوں ہیں کہ تمہارا وہاں جانا اور میرے ساتھ رہنا فی الحال شیک نہیں۔“

”میں یہی تو جانتا چاہتا ہوں ماں.....! میں نے نیم احتیاجی انداز میں کہا۔ ”آپ مجھے بھی تو بتائیں کہ حالات کی

ایسی کون سی مجبوریوں ہیں؟“

”میرے لعل! میری مجبوریوں آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ وہ قدرے بے بسی سے بولیں۔

میری زندگی بڑی عجیب و غریب ہے۔ میں نے اب تک اگر کہیں خود سے دور رکھا ہوا ہے تو اس میں کئی مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور انہی مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتی۔ میں فوری طور پر کوئی رسک نہیں لے سکتی۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں!“ میں بھونچکا نظر سے انہیں دیکھنے لگا۔ ”تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ

آپ کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کی داستان سننا ہوگی..... تو سنا میں اپنی داستان۔“

میں ہرین گوش ہوں۔“

کے حالات سے آگاہی حاصل نہیں ہوگی۔“

”میری داستان غم سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔“ وہ سپاٹ انداز میں بولیں۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر میں آپ کے پاس نہیں بیٹھوں گا یا آپ میرے ساتھ نہیں بیٹھیں گی تو میں آپ کی زندگی کے شیب و فراز کے بارے میں کیسے جان سکوں گا؟“

”میں نے اس کا بندوبست کر رکھا ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

میں الجھ کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”کیا بندوبست ماں؟“

”ڈائری.....!“ وہ مکمل لہجے میں بولیں۔ ”میں نے ایک ڈائری میں اپنی داستان حیات رقم کر رکھی ہے۔ میں مذکورہ ڈائری عظیم کے ہاتھ تمہارے لیے بھیج رہی ہوں۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ رات میں اس ڈائری کا مطالعہ کرو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں اس سندرہ کیا کرنا ہے.....“

”کیا مطلب!“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کس چیز کا فیصلہ کرنا ہے؟“

”یہ کہ.....“ وہ جڑبڑہوتے ہوئے بولیں۔ ”تمہیں میرے ساتھ رہنا چاہیے یا نہیں۔“

”کیوں.....؟“ میں نے شہم احتجاجی انداز میں کہا۔

”اس ڈائری میں ایسا کیا خطرناک راز چھپا ہوا ہے؟“

”جس طرح ہر سکے کے دورخ ہوتے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”اسی طرح

انسان کی زندگی بھی دھوپ اور چھاؤں سے عبارت ہے، خوشی اور غم کا مرتع ہے، اذیت اور راحت کا سسٹم ہے، ہمارا درجیت کا کھیل ہے اور..... اور..... نیکی اور بدی کا ملاپ ہے۔ ممکن

ہے، میری زندگی کی کہانی کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد تم میرے ساتھ رہنا پسند نہ کرو۔“

”ایسا بھی نہیں ہو سکتا ماں!“ میں نے ان کی بات پوری

ہونے سے پہلے ہی قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ آپ اچھی ہیں یا بری۔ میں صرف یہ جانتا ہوں

کہ آپ میری ماں ہیں اور ماں اپنی اولاد کے لیے کسی بھی طور، کسی بھی حال میں بری نہیں ہوتی۔ میں ہر صورت میں اور ہر

قیمت پر آپ کے ساتھ آپ کے سامنے میں رہنا چاہوں گا اور یہ فرض محال.....“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا

پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر یہاں پاکستان میں ہمارا ایک ساتھ رہنا ممکن نہ ہو تو میں آپ کو امریکا لے جاؤں گا پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکے گی۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے میرے بچے۔“ وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”تم آج رات میں میری ڈائری کو پوری توجہ سے پڑھ لو۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں بھی ان کی تقلید میں کھڑا ہو گیا۔ یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ اب رخصت ہوں گی۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیڈروم سے باہر نکل آئے۔ عظیم کی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم تینوں بالائی منزل سے زیریں منزل پر پہنچے۔ اس دوران میں ہمارے بیچ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہم خاموشی سے چلتے ہوئے گھر کے کھن میں نکل آئے۔ عظیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”برو! آپ باہر جا کر پاپا کے ساتھ بیٹھو۔ میں میڈم کو ان کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔“

میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

ماں، عظیم کے ساتھ سیاہ ٹوپوٹا کرولا کی جانب بڑھ گئیں۔ اس دوران میں اکبر نے ہنگلے کا گیت ڈاکروا دیا تھا۔

مذکورہ ہنگلے میں آمد و شد کے لیے دو ایک جیسے عظیم الشان گیت بنے ہوئے تھے۔ عظیم نے محبتی شست کا دروازہ

کھول کر پہلے ماں کو گاڑی میں بٹھایا پھر دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں چپ چاپ یہ منظر

دیکھتا رہا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور سب خرامی سے چلتے ہوئے ہنگلے سے نکل گئی۔ میں ہنگلے کے بیرونی حصے میں دیوار کے

ساتھ بنی پھولوں والی کیاریوں کی طرف بڑھ گیا جہاں حنیف کو صاحب اپنے دوست مقبول بمبئی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ایک کرسی سنبھال لی اور یکے بعد دیگرے

ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا فتح صاحب چلے گئے؟“

”ہاں۔ وہ تو گئے۔“ کو صاحب نے جواب دیا۔

”اور شکر کرو کہ تم سے ملے بغیر ہی وہ چلے گئے۔ خیر.....“

انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک تہقید لگایا پھر مجھ سے

پوچھا۔ ”تم سناؤ، ماں سے ملاقات کیسی رہی؟“

کیا۔ ”انکل! تمہوڑی دیر پہلے آپ نے یہ کیوں کہا کہ..... میں شکر کروں کہ شیخ صاحب مجھے ملے بغیر ہی چلے گئے؟“

”شیخ صاحب خامسے رنگین مزاج انسان ہیں۔“ انہوں نے ممتی خیر انداز میں بتایا۔ ”تم نے اپنی زندگی میں شامل تین عورتوں کا ذکر کیا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ سلیٹی صاحبہ اور تھمارے بیچ رشتے کے بارے میں تو میں نے انہیں بتادیا تھا۔ وہ باقی دو عورتوں یعنی شارد اور ڈیلینا کے حوالے سے تم سے تعمیلی ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ ایک وہ جو تھمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور دوسری وہ جو تمہیں اپنے ہاتھ میں کرنے کی تنگ دود میں مصروف ہے۔ تم میری بات سمجھ گئے ہونا.....؟“

”جی..... اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب ہم سب افطار سے پہلے ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کریڈ کریڈ کر ان عورتوں کے بارے میں پوچھتا چاہتے تھے مگر اسی وقت اذان ہو گئی اور شیخ صاحب کو مجھ سے سوال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر مقبول بھٹی نے کہا۔ ”سامیں! مجھے اجازت دیں۔“ اس کا مقابلہ حفظ کچھ کر رہا تھا۔ ”گھر جا کر تروانچ پڑھوں گا اور پھر کچھ آرام کروں گا۔ سحری میں بھی اٹھتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بھائی! میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ حفظ کچھ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عظیم واپس آ جائے تو میں آپ کو اس کے ساتھ روانہ کرتا ہوں۔“

”حفظ بھائی! تکلف کی ضرورت نہیں۔“ بھٹی نے بڑی رمان سے کہا۔ ”میں رکشا میں چلا جاؤں گا۔“

”آپ رکشا میں چلے آئے یہی کافی ہے۔“ حفظ کچھ نے بڑی اپناہٹ سے کہا۔ ”نمہریں، میں آپ کے لیے کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔ عظیم کے آسرے پر بیٹھا نہیں جاسکتا۔“ پھر بات کے اختتام پر انہوں نے بہ آواز بلند اپنے گھر کیلے ملازم کو پکارا۔

”اکبر! بادشاہ.....!“

اکبر اور اس کا بیٹا اصغر حفظ کچھ کی خدمات پر مامور تھے۔ ان دونوں کا تعلق اندرون سندھ سے تھا تاہم وہ کل وقتی ملازم تھے اور ہنگلے کے پہلو میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں قیام پزیر تھے۔ وہ ایک دو ماہ کے بعد باری باری ہفتہ دس دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ حفظ کچھ اکبر کو عموماً اکبر بادشاہ اور اصغر کو ڈاکٹر صاحب کہہ کر

بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ ملاقات انتہائی نامکمل اور تشدد ری۔“

ان لمحات میں میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ میں اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک طرف ماں سے ملنے کی بے پناہ خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی تو دوسری جانب ماں کے پراسرار رویے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہ الفاظ دیکر اس ملاقات کے نتیجے میں، میں کافی حد تک مایوس ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ بہت کچھ میری توقعات کے برعکس پیش آیا تھا۔ خیر، میں ماں سے ملاقات کے بعد ڈسٹر ب ہو گیا تھا۔ دل کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اگر دماغ کا بوجھ قدرے کم ہوا تھا تو دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ طبیعت میں بے چینی اور مزاج میں بے قراری در آئی تھی۔

”مایوسی گناہ ہے میری جان۔“ کچھ صاحب نے اپناہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم نے کبھی کنوئیں کی بورنگ ہوتے دیکھی ہے؟“

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”جب پانی کے حصول کے لیے زمین میں کنواں کھودا جاتا ہے یعنی بورنگ کی جاتی ہے تو پہلے سوکھی مٹی نکلتی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”اس کے بعد نم مٹی، پھر گیلی مٹی، پھر گار، پھر فیلا پانی، پھر صاف مگر کھار پانی اور سب سے آخر میں صاف و شفاف میٹھا پانی۔ اسی پانی کے حصول کے لیے یہ سارا کٹ اٹھایا جاتا ہے یعنی گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔“ لمبائی توقف کر کے انہوں نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”انسان کی زندگی کے معاملات بھی اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وقت انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزارتا ہے۔ زندگی قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتی ہے۔ جو لوگ مشکل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں، کامیابی ان کے لیے فرشِ راہ بن جاتی ہے۔ آج اپنی والدہ سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ کل دوسری ملاقات ہوگی پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلے گا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ رفتہ رفتہ گزرتے وقت کے ساتھ تمہاری عقلی ختم ہو جائے گی۔ آج جو کچھ حاصل ہوا، اس پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ کل تمہیں آج سے بھی زیادہ نوازے گا۔“

”ان شاء اللہ.....!“ میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے استفسار

لکارتا تھا۔ اصغر کو ڈاکٹر کہنے کی وجہ تسمیہ تھی کہ کپور صاحب گودوا کھلانے کی ذمہ داری اصرغی تھی۔

اگلے ہی لمحے اکبر وہاں حاضر ہو گیا۔ کپور صاحب نے اس سے کہا کہ علی بھائی کو بلاؤ۔ تھوڑی دیر میں گول منول علی کپور ہمارے سامنے موجود تھا۔

”علی! تم ہاکی گاڑی میں بھٹی صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔“ حفیظ کپور نے بیٹے کو ہدایات دیں۔

”جی پاپا۔“ علی نے فرماں برداری سے کہا۔

”تم انکیلے نہیں جانا۔“ کپور صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے تاکید کی لہجہ میں کہا۔ ”بھائی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ دلوں گپ شپ کرتے ہوئے واپس آ جانا۔“

”بھائی!“ سے کپور صاحب کی مراد یقیناً میں ہی تھا۔ علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے پاپا۔“

علی کپور کی ہمشیرہ ہما کپور کی واپس سو فٹ میں ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ مقبول بھٹی کی رہائش گلستان جوہر میں تھی۔ علی نے ان سے پوچھا۔

”آپ اپنے ہی گھر جائیں گے یا اپنی بیٹی کے گھر جانا ہے؟“

”علی بھائی! میں اپنے گھر جاؤں گا۔“ بھٹی صاحب نے جواب دیا۔

دوران سفر میں علی نے مجھے بتایا کہ بھٹی صاحب کی بیٹی بھی گلستان جوہری میں رہتی تھی اور بھٹی صاحب ان کے گھر سے واپسی پر انٹر بیٹی کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔

”علی بھائی!.....!“ بھٹی صاحب نے لفظ ”علی“ کو ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے کہا۔ ”عظیم بھائی کا دوست بہت زبردست انسان ہے۔“

مقبول بھٹی ان لمحات میں میری تعریف کر رہا تھا۔ میں نے اس مختصر سی ملاقات میں بھٹی صاحب کو بہت گہرا اور بہت ”کرنی والا“ محسوس کیا تھا۔ میرے مختاط انداز سے کے مطابق، وہ بے پناہ روحانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس کا وجدان بہت متحرک تھا۔ اس نے میرے بارے میں بڑے درست انداز سے لگائے تھے اور میں درحقیقت اس کی بتائی ہوئی باتوں کو ”اندازے“ کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے پاس یقیناً پراسرار قوتیں تھیں۔ میری معلومات کے مطابق، بعض لوگوں کے خیال میں بھٹی صاحب موکلات سے کام لیتے تھے اور کچھ کا ماننا یہ تھا کہ ان کے قبے میں جنات ہیں۔ بہر حال، یہ بات طے تھی کہ وہ ایک باکمال انسان تھے۔

”بھٹی صاحب آپ کی تعریف کر رہے ہیں بھائی۔“ علی نے مجھ سے کہا۔

علی اس وقت گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے برابر میں پینجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بھٹی صاحب گاڑی کی مقبلی نشست پر براجمان تھے۔ میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے علی سے کہا۔

”اگر بھٹی صاحب میری تعریف کر رہے ہیں تو ان سے کہیں کہ میرے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ بتائیں!.....!“

میں نے یہ فرمائش خلاف مزاج کی تھی۔ میں اپنے بارے میں جاننے کے حوالے سے کسی سے سوال کرنے کا عادی نہیں تھا لیکن اپنی والدہ سے مختصر سی ملاقات کے بعد میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا، ان میں میرا یہ فعل اضطرابی سے زیادہ اضطرابی تھا۔ پچھلے دو کھینے میں پیش آنے والے واقعات نے مجھے ذہنی طور پر بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا اور میرا یہ استفسار ہی ذہنی کیفیت کا نتیجہ تھا۔

”سائیں! یہ تو ہمیں بھی پتا ہے کہ اسد بھائی زبردست انسان ہیں۔“ علی نے ڈرائیو تک پر تو جرح کو گزرتے دیکھتے ہوئے مقبول بھٹی سے کہا۔ ”آپ ڈرا بھائی کے مستقبل کے بارے میں بتائیں۔“

”سائیں! ہر چیز کا علم صرف اللہ کو ہے۔“ بھٹی صاحب نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔ ”میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا گہرا تعلق ہے ان میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور بے ساختہ میں نے گردن موڑ کر عقی نشست پر براجمان مقبول بھٹی کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“

”سائیں! میں اللہ کا بندہ ہوں۔“ وہ سادہ سے لہجہ میں بولا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔“

بھٹی صاحب کے معصومانہ انکشاف نے میرے اندر سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ یہ کوئی سرسری یا معمولی بات نہیں تھی۔ افکار سے پہلے انہوں نے ”سی ایس ڈی“ کا ذکر کر کے مجھے درط حیرت میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے اپنی بات کی وضاحت میں یہ بھی بتایا تھا کہ میری زندگی میں جن تین عورتوں کا زیادہ عمل دخل ہے، ان کے نام سی، ایس اور ڈی سے شروع ہوتے ہیں۔ بھٹی صاحب کی یہ بات صد

تھی تو پھر شارو کو امریکا میں ہونا چاہیے تھا لیکن میری معلومات کے مطابق، شارو لیونارڈو کی کھڑی میں کیوبا کے شہر ہوانا میں بھی جہاں سے اسے بہماز کے شہر مانسوپانچیا جانے والا تھا۔

ان لمحات میں میرا ذہن بری طرح چکر اکر رہ گیا تھا۔ ایک ہل کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ عین ممکن ہے، ڈیلفینا نے مجھ سے دروغ گوئی کی ہو۔ مطلب یہ کہ شارو کو امریکا ہی میں کہیں رکھا گیا ہو لیکن مجھ سے اپنی بات منوانے کے لیے ڈیلفینا نے یہ سارا ناک کیا ہو۔ ڈیلفینا اچھی طرح جانتی تھی کہ شارو میری دوست ہے۔ میں اس کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان دنوں لیونارڈو سے میری اچھی خاصی مصامت چل رہی تھی۔ ایک جینکس کی ایک سنٹان سڑک پر ڈیلفینا سے پہلی بار میرا سامنا ہوا تھا۔ میں اس وقت لیونارڈو کے خنڈوں سے نبرد آزما تھا اور شارو بھی اپنے گنار سمیت میرے ساتھ تھی۔ ڈیلفینا کی آمد پر وہ لوگ وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا..... ممکن ہے، شارو کو ڈیلفینا ہی نے کہیں غائب کروا دیا ہو اور اس کے انخواس کا معاملہ لیونارڈو کے کھاتے میں ڈال کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی ہو۔ ڈیلفینا عرف ڈیلفی اپنی بارسونج ہسپانوی دوشیزہ تھی کہ وہ نامکن کو ممکن بنانا جانتی تھی۔ میں نے اس کی اپروچ کے نظارے پوسٹن اور ڈیس میں دیکھے تھے۔ وہ یہودیوں کی ایک سیکرٹ سوسائٹی کی ممبر تھی۔ وہ مجھے بھی ”اسکل اینڈ یوز“ نامی اس سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی تھی مگر میں نے پریمنٹن ہالو والے بنگلے میں بڑی بے دردی سے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ ڈیلفی کے غرور اور اتنا پر ایک کاری ضرب تھی۔ اس کی پشت پر نہایت ہی طاقتور افراد تھے۔ میں نے اس کی عمدہ کارکردگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ جس یہودی لالابی سے تعلق رکھتی تھی، وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی شخص کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے.....!

میں نے پریمنٹن ہالو والے بنگلے پر ڈیلفینا کی معیت میں جو بہتر کھینے گزارے تھے، اس عرصے کے ایک ایک منٹ سے مجھے یہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر میرا چچا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے مجھ پر اچھا خاصا وقت الویٹ کیا تھا اور مجھے زیر بار کرنے کے لیے اس نے مجھے قتل کے ایک کس میں سے اس طرح نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے مچھ کر بال کو نکالا جاتا ہے۔ ایک جینکس والے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے بچن میں لیونارڈو کا ایک آدمی پھلو

فیدر دست بھی یعنی ”سی“ سے شارو، ”ایس“ سے سلٹی اور ”ڈی“ سے ڈیلفینا۔ میری معلومات کے مطابق، ڈیلفینا امریکا میں تھی، شارو کو لیونارڈو نامی خنڈے نے ایک جینکس (ٹیکساس) سے انخواس کر کے ہوانا (کیوبا) پہنچا دیا تھا اور ایس (سلٹی) کی تلاش میں، میں امریکا سے پاکستان آیا تھا اور چند منٹ پہلے میری والدہ صاحبہ سے ملاقات بھی ہو گئی تھی اور اب..... بمبئی صاحب فرما رہے تھے کہ ان تین عورتوں میں سے دو اس وقت پاکستان میں موجود ہیں مگر شارو اور ڈیلفینا میں سے کون؟

یہ سوال میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں پوچھے بنانہ رہا۔ ”بمبئی صاحب! یہ میں بھی جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے ہیں اور یہ کہ اللہ آپ سے راضی بھی ہے جیسی اس نے آپ کو یہ علم بھی عطا کر رکھا ہے۔ حضرت! میں اپنی ماں سلٹی سے ملاقات کر چکا ہوں۔ اب آپ مالک کے حکم سے یہ فرمایے کہ شارو اور ڈیلفینا میں سے دوسری کون اس وقت پاکستان میں موجود ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”لیکن.....“

انہوں نے جملہ ادھر اچھوڑا تو میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”لیکن کیا؟“

”وہ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی ہے، تمہاری بہت جلد اس سے ملاقات ہوگی۔“ بمبئی صاحب نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”نہیں..... کراچی میں.....“

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ شارو کو تو لیونارڈو نے ہوانا پہنچا دیا تھا۔ پریمنٹن ہالو (ڈیس) والے بنگلے میں ڈیلفینا نے مجھے شارو کے کیوبا اور ہوانا والے ویڈیو کلیپس بھی دکھائے تھے۔ اس بات کا امکان صفر کے برابر تھا کہ شارو، لیونارڈو کی قید سے آزاد ہو کر کراچی پہنچ گئی ہو۔ تو کیا..... ڈیلفینا میرے تعاقب میں یہاں آئی تھی.....؟

بمبئی صاحب کے الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے تھے..... ”اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا تعلق ہے ان میں سے دو اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔“

میں ڈیلفینا کو پریمنٹن ہالو میں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بمبئی صاحب کی بیان کردہ تیسری عورت ڈیلفینا تھی تو پھر دوسری عورت یعنی شارو کو پاکستان میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ بمبئی صاحب نے تیسری عورت کی موجودگی امریکا میں بتائی تھی اور اگر ڈیلفینا میرے تعاقب میں امریکا سے پاکستان آئی

میرے ہاتھوں بری طرح بیٹے کے بعد جہنم واصل ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں لیک پیکنس سے نکل آیا تھا۔ پوسٹن کاٹھ کر میں نے ڈیلفینا سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس نے اس کمال سے میری مدد کی کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ ڈیلفینا کے ہی ایما پر میں پوسٹن سے ڈیس پہنچا تھا اور پھر ڈیلفینا کی موجودگی میں، پریسٹن ہالو والے بیگلے پر ایک نیوز لیٹن نے مجھے دو طرہ حریت میں ڈال دیا تھا۔ خبر کے مطابق، پولیس نے چیلو کے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔ مذکورہ قاتل کا نام ایلیندر تھا۔ مزے کے بات یہ تھی کہ ایلیندر روئے پولیس کی تحویل میں چیلو کے قاتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ ڈیلفینا نے مجھے قاتل کے اس کیس سے نکلنے کے لیے یہ ڈراما کیسے رچایا ہوگا، اس سے اس کی طاقت اور رسائی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا.....!

میں نے مقبول بمبئی کو اس حوالے سے کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی مقام پر انک کر رہ گئی تھی۔ وہ میرے ہر سوال کے جواب میں کہہ دیتا۔ ”سائیکس! میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا.....“

افطار سے پہلے ہمارے چچ جو گفتگو ہوئی تھی، اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ میرے بارے میں بمبئی صاحب کی پیش گوئیاں اور انکشافات بڑے سنسنی خیز اور حیران کن تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ کہیں مقبول بمبئی بھی کسی سیکرٹ سوسائٹی سے وابستہ تو نہیں تھا؟

اگرچہ یہ ایک عجیب و غریب سوال تھا لیکن اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ بس، کوئی کرنے والا ہو چاہیے.....!

☆☆☆

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی، یعنی اتیس جون، اتوار کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں خالی ذہن کے ساتھ بیڈروم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس ”ٹہل قدمی“ کا سبب وہ بے چینی اور بے قراری تھی جو ماں کی ڈائری پڑھنے کے بعد میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ نیلی جلد والی وہ ڈائری اپنے وجود میں خوفناک طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ میری ماں کی زندگی کی مختصر چٹا تھی۔ ماں نے مذکورہ ڈائری میں خود پر ٹوٹنے والی قیامتوں کو رقم کیا تھا۔ خاص طور پر میرے باپ کے قتل کے بعد ماں کو جن نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس کی تفصیل ڈائری میں درج تھی اور یہ ڈائری ماں نے خصوصاً میرے لیے ہی تیار کی تھی تاکہ میں ان کی زندگی

کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہو جاؤں۔ وہ حالات ایسے نہیں تھے کہ ایک ماں اپنے جوان بیٹے کے روبرو بیٹھ کر بیان کرتی۔ ایسے واقعات کو سنانے کے لیے لوہے کا دل اور سننے کے لیے پتھر کا دماغ چاہیے ہوتا ہے۔ میری ماں کے پاس آہنی دل تھا اور نہ میرے پاس چٹائی دماغ لہذا ماں نے ہم دونوں کی آسانی کے لیے الفاظ کا سہارا لیا تھا۔ یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔

میں نے اس ڈائری کی تحریر کو ایک بار شروع کیا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ میں جوں جوں اپنی ماں کی داستان حیات کی گہرائی میں اترا چلا گیا، توں توں میرا دماغ سن اور حواس معطل ہوتے چلے گئے اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں خالی الذہن ہو کر رہ گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور دماغ پرستانے نے قبضہ جمالیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں زندہ نہ رہا ہوں۔ ماں کی پر آلام کہانی پڑھ کر میرا کلیجہ پھٹ گیا، وہ دماغ کے پر نچے اڑ گئے ہوں اور حرکت قلب بند ہو گئی ہو..... میں زندگی سے بہت دور موت کی وادی میں چلا گیا ہوں۔

میں کافی دیر تک اسی اذیت ناک کیفیت میں رہا پھر خالی ذہن کے ساتھ بیڈروم میں ٹھٹھا شروع کر دیا تھا۔

میرے والد صاحب حیدر علی کی کچھ لوگوں سے دشمنی تھی۔ والد کراچی کے ایک معروف بزنس مین تھے اور میرے والدین کے پاس مالک کا دیا سب کچھ تھا۔ میری پیدائش سے چھ ماہ پہلے میرے باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میری ماں نے در در کی ٹھوکریں کھائیں اور خود کو دشمنوں کی نگاہ سے چھپا کر مجھے جہنم دیا۔ میری حفاظت کی خاطر ایک سال کی عمر میں مجھے کراچی سے نیویارک بھیج دیا گیا۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں دشمنوں کے شر سے محفوظ اور ان کی دست برد سے دور رہوں۔ یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوا اور اس مشن میں مرزا عاغر بیگ، جاوید واسطی اور انکل علی سلطان نے بھی بہت اہم کردار ادا کیے۔

ماں نے اپنی داستان کے آخر میں تفصیلاً بتایا تھا کہ کن خوفناک اور نامساعد حالات میں میرے والدین کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد دشمنوں نے میرے والدین کا جینا عذاب کر دیا تھا۔ اس بیان کے بعد ماں نے اس ڈائری میں میرے والد کے دشمنوں کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ میں ان معلومات کی روشنی میں بہ آسانی اپنے باپ کے قاتلوں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ ماں نے مجھے دشمنوں سے بچا کر محفوظ قافلے پر پہنچا دیا

تھا لیکن وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ عیار اور طاقتور دشمنوں نے اسے تباہ و برباد کر کے ایک ایسا گھناؤنا کام کرنے پر مجبور کروایا تھا جسے بیان کرنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ میری ماں حالات اور وقت کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔ وہ ہتھیار چھوڑ کر حالات کے دھارے میں کسی کو سکے پتے کے مانند بہنے پر مجبور ہو گئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے طاقت اور اختیار حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے دشمنوں سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے دو چیزوں کا انتظار تھا۔ نمبر ایک، وہ خود کو بے پناہ طاقتور اور با اختیار بنانا چاہتی تھی۔ نمبر دو، وہ میری تعلیم کے عمل ہونے تک خاموش بیٹھی تھی۔ وہ ایک خاص وقت پر مجھے پاکستان بلا نا چاہتی تھی اور اس کے مطابق، میں وقت سے پہلے یہاں چلا آیا تھا اور میری آمد نے ماں کو بھلا کر رکھ دیا تھا۔

ماں کے ذہن میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا کون سا منصوبہ تھا، اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ماں نے اس حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈائری سے بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ ماں کے ذہن ہی میں تھا۔ میری اچانک یہاں آمد پر وہ جس طرح پریشان ہو گئی تھی، اس سے میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ میرے یہاں آنے سے ان کی پلاننگ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

اس وقت میری ماں کراچی کی ایک صاحب ثروت اور با اثر عورت تھی۔ اس کی رہائش ڈیفنس سوسائٹی کے علاقے زمرہ میں، ایک عالی شان بنگلے میں بھی اور وہ..... میڈم سہلی کہلاتی تھیں!

ماں پر گزرنے والی قیامتوں کا احوال پڑھ کر میرا دماغ آگ کا گولہ بن گیا تھا۔ ایک آنٹی اذیت میرے رگ دے میں سرایت کر گئی تھی اور مجھے اپنے جسم و جان کی ہلاکت خیز طوفان کی زد پر محسوس ہوتے تھے۔ ڈائری کے آخر میں ماں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھا تھا۔

”میرے بچے! میری خواہش ہے کہ تم پہلی فرصت میں واپس امریکا چلے جاؤ۔ ابھی تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں جب مناسب سمجھوں گی تو تمہیں بلا دوں گی۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو۔ مجھے خود اوقات دو۔ میں چند چیزیں ٹھیک کر لوں۔ پھر ہم مستقل ساتھ رہیں گے۔ امید ہے، کوئی سوال کیے بغیر تم فوراً میرے مشورے پر عمل کرو گے۔“

ماں کا ہر حکم سر آکھوں پر لیکن میں ان کے بارے

میں جتنا کچھ جان چکا تھا، ان حالات میں، میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ڈائری کی آخری سطور سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ انہوں نے تازہ تازہ رقم کی تھی۔ ڈائری کا چوتھا ہی بھر حصہ خالی تھا یعنی میں اگر اچانک پاکستان نہ آ جاتا تو ان خالی صفحات پر ماں نے اور بھی بہت کچھ تحریر کرنا تھا۔ ماں کو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جان کر مجھے دلی دکھ ہوا تھا۔ کاش..... یہ سب نہ ہوا ہوتا! ایک عزت دار عورت سہلی حیدر علی کو ”میڈم سہلی“ بننے تک بن اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا تھا، کاش وہ سانحات وقوع پذیر نہ ہوئے ہوتے..... کاش.....!

وقت بہت ظالم ہے۔ یہ اپنی مخصوص رفتار اور منفرد مزاج کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ کسی کے لیے اپنے مزاج اور رفتار میں تبدیلی نہیں لاتا۔ اسے کسی کی خوشی یا غم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ سفاک وقت انسانوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستانیں رقم کرتا رواں دواں رہتا ہے۔ گزرا ہوا وقت اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ بیٹے ہوئے ماہ و سال کو کوئی تہدیل نہیں کر سکتا.....!

ماں کی مجبوری، بے بسی اور لا چاری نے اسے عجیب مقام پر لاکھڑا کیا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ حالات کی تڑوی سچائی کو تسلیم کر لیا جائے۔ ماں کی پتا کو پڑھ کر میرے وجود میں ایک زہریلی سی گل گل گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں ماں کے ماضی کو تہدیل نہیں کر سکتا تھا لیکن میری ماں کو یہاں تک پہنچانے میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا، میں انہیں ضرور کیفر کردار تک پہنچا سکتا تھا اور..... لازمی مجھے یہ کرنا تھا۔ میری ماں کی بربادی کے ذمے دار میرے ہاتھوں سے بنائے نہیں جاتے تھے۔ مجھے ان غلط لوگوں کے سروں کے اوپر سے آسمان کو ہٹانا تھا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کو کھینچ لینا تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا..... اس کردار پر کہیں انہیں جائے امان نہیں ملے گی۔ میں ان پر عرصہ حیات تک کردوں گا..... ان شاء اللہ!

میں ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے بیڈ روم کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی سمت ٹپ رہا تھا۔ کمرے کا انرکنڈیشنر بڑی بیک خرابی سے چل رہا تھا۔ اندرونی ماحول ایک دم چل تھا لیکن میرے وجود میں ایک قیامت برپا تھی۔ میرا تن بدن جہمی شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ دیکھتے ہوئے دل

”چلو، چھت پر چل کر بیٹھے ہیں۔“ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ”اس ڈائری میں ایسا کیا ہے جس نے تمہاری یہ حالت بنادی ہے؟“

”وہ ڈائری کسی ایٹم بم سے کم نہیں۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔ ”اس وقت میرے تن من کی وہی حالت زار ہے جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تھی۔“

”اوکے..... مگر یہ بتاؤ، اس ڈائری کے اندر لکھا کیا ہے؟“ وہ قدرے اصراری انداز میں مستفسر ہوا۔

”کیا دونوں بچے سو گئے ہیں؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”دو گھنٹے پہلے عظیم اور طیبہ نے اپنی ماں مہر النساء اور دونوں بہنوں.....

..... سے بات کی تھی۔ اس وقت وہ دونوں گہری نیند کے مڑے لوٹ رہے ہیں۔“ لمحائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔

”اسدا! تم نے بتایا نہیں، اس ڈائری کے اندر تمہاری والدہ نے کیا تحریر کر رکھا ہے؟“

ہم باتیں کرتے ہوئے پٹکے کی چھت پر پہنچ گئے۔ عظیم کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ چھت کے ایک حصے میں مختلف پرندوں کے کنگ

سائز بکھرے بنے ہوئے تھے۔ عظیم کے بیٹے عظیم کو پرندے پالنے کا شوق تھا۔ پرندوں کے علاوہ عظیم نے گھر میں خرگوش

اور بلیاں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ چھت کے سامنے والے حصے میں تین چار کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں اور مذکورہ کرسیوں

سے چند قدموں کی دوری پر پانی والی ٹینکی بنی ہوئی تھی۔ چھت پر پہنچ کر میں نے چند گہری سانسیں لیں پھر ہم

آٹنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عظیم کی سوال پر نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اب کی بار وہ زبان سے کچھ نہیں بولا

تاہم اس کی خاموش نگاہ مجھ سے مسلسل یہ پوچھ رہی تھی کہ نیلی جلد والی ڈائری میں ایسا کیا میں نے پڑھ لیا ہے جس کے

بعد انکڑی شد آ رام وہ بیڈروم میں میرا دم گھٹنے لگا تھا.....؟

میں نے اسے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ میں نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا پھر عظیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غصے لہجے میں بتایا۔

”عظیم! میری ماں نے اس ڈائری میں اپنی زندگی کی کہانی تحریر کر رکھی ہے۔ وہ کہانی جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایک عزت دار شریف عورت کو وقت

اور سکتے ہوئے دماغ نے ایک ہنگامی فیصلہ سنا دیا۔ یہ دونوں شاذ و نادر ہی کسی ایک نقطے پر اتفاق کرتے ہیں اور جب یہ متفق ہو جاتے ہیں تو پھر بڑے زبردست نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دل و دماغ کی باہمی مشاورت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی ماں کے پاس جانا چاہیے اور بہت سے امور پر ان سے مکمل کربات کرنا چاہیے۔“

اس فیصلے کے بعد میں بیڈروم سے نکل آیا پھر میرے قدم خود بہ خود عظیم والے بیڈروم کی جانب بڑھ گئے۔ اس

وقت ایک بچی ایسا شخص تھا جو مجھے میری ماں کے پاس پہنچا سکتا تھا۔ عظیم اپنے دو بچوں عظیم اور طیبہ کے ساتھ ماسٹر

بیڈروم میں موجود تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہوگا۔ میری یادداشت میں عظیم کی بتائی ہوئی یہ بات محفوظ تھی کہ

رمضان کے مہینے میں وہ رات بھر جاگتا ہے اور سحری کے بعد سوتا ہے۔ میں نے عظیم والے بیڈروم کے دروازے پر

دسک دی اور ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں عظیم کھڑا دکھائی دیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت

بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”برو! آخریت تو ہے نا.....؟“

”آخر گھریت ہوتی تو تمہیں رات کے آخری پہر ڈسٹرب نہ کرتا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ساٹ آواز میں کہا۔

”کیا ہوا برو.....؟“ اس کی حیرت توشیش میں بدل گئی۔ ”مجھے بتاؤ، آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”بیڈروم کے اندر میرا دم گھٹ رہا تھا۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مکمل نفاذ میں سانس

لینے کو بچی چاہ رہا تھا اس لیے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔“

”اوہ.....!“ وہ اپنے بیڈروم سے باہر نکلتے ہوئے بولا پھر دروازہ بند کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ”کیا تمہارے

والے بیڈروم کا اسے سی ٹیک سے کام نہیں کر رہا؟“

”اے سی اپنی جگہ زبردست کونٹک کر رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر دم گھٹنے کا سبب؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”نیلی جلد والی وہ ڈائری جو ماں نے تمہارے ہاتھ میرے لیے بھیجی تھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس ڈائری کی تحریر نے میرے دل و دماغ میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا ہے۔“

تو میں پوچھے بتانہ رہ سکا۔ ”ایسا کیا ہو گیا تھا کہ..... سب کچھ ختم ہو گیا؟“

”مہر النساء سے میری شادی ہو گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”شادی کے بعد میں نے خود کو بالکل بدل ڈالا تھا۔ ہر قسم کی آوارگی کو ترک کر کے میں صرف اور صرف مہر النساء کا ہو کر رہ گیا تھا اور آج تک اسی کا ہوں لیکن اس وقاداری کا صلہ مجھے یہ ملا کہ میں نہ تو پاپا کی نظر میں ایک اچھا انسان ہوں اور نہ ہی مہر النساء آکھیں بند کر کے مجھ پر بھروسہ کرتی ہے۔ اسے شک ہے کہ میں اب بھی لڑکیوں اور عورتوں کے چکر میں رہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مہر النساء کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ پاپا نے اس کے سامنے مجھے جیسا بنا کر پیش کیا ہے وہ میرے بارے میں ویسا سوچنے پر مجبور ہے۔ اپنی باؤ، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے پچھلے بارہ سال میں کبھی مہر النساء سے بے وفائی نہیں کی۔ میں صرف اپنے ضمیر اور اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ باقی کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے، اس کی مجھے پروا نہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”اگر لوگوں کی ساری پروا ہم ہی کر لیں گے تو پھر وہ بے چارے کیا کریں گے؟ کچھ کام دوسروں کے کرنے کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہئیں۔“

میرے اس تبصرے پر عظیم نے کچھ کہا نہیں، خاموشی نظر سے مجھ دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اپنے پہلے والے سوال کو دوسرے زاویے سے اس کے سامنے رکھا۔

”اگر تمہارا بھی میڈم سلٹی کے بیٹکے پر جانا نہیں ہوا تو پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ تم میری ماں کو ان کے گھر سے لے کر آئے تھے اور انہیں ڈراپ کرنے بھی گئے تھے؟“

”اس بارے میں تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔“ عظیم نے کہا۔ ”تم نے مجھے جو چالیس نمبر چیک کرنے کے لیے دیے تھے ان میں سے ایک فون نمبر زناکت شاہ کا نکل آیا تھا۔ زناکت شاہ سے میری اچھی جان پہچان ہے اور یہ جان پہچان ہمارے ایک مشترکہ دوست سبیل کے توسط سے تھی۔ زناکت شاہ میڈم سلٹی یعنی تمہاری والدہ کے پاس ملازم تھا جو دو ماہ پہلے ملازمت چھوڑ کر متحدہ عرب امارات کی ریاست راس الخیمہ جا چکا ہے۔ میں نے اپنے جس دوست سبیل کا ذکر کیا ہے، اس کا میڈم سلٹی کے یہاں آنا جانا تھا۔ میں نے سلٹی صاحبہ کا ایڈریس سبیل ہی سے حاصل کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری بات میری سمجھ میں آئی اور اس امر کا بھی مجھے یقین ہے کہ تم کسی قسم کی غلط بیانی سے کام

کی گردش اور حالات کی ستم ظریفی نے کس طرح ”میڈم سلٹی“ بنا دیا ہے۔“

”اوہ.....!“ اس نے متاسفانہ انداز میں کہا اور مجھ سے نگاہ چرانے لگا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سرسراٹی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”عظیم! تم میری ماں کو کب سے جانتے ہو؟“

”کل رات سے.....“ وہ جڑبڑھتے ہوئے بولا۔

”جب ہمارے بیچ فون پر بات ہو رہی تھی۔ تمہیں اس ہستی تک پہنچنا تھا جس کی تلاش میں تم امریکا سے پاکستان آئے ہو۔ میں نے جب تم سے پوچھا کہ کیا تمہاری مطلوبہ ہستی کوئی خاتون ہے اور کیا اس کا نام سلٹی ہے؟ تو جواب میں تم نے مجھ سے استفسار کیا تھا..... تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟“

”ہاں..... یہ ساری گفتگو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ اس وقت تم نے مجھ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ تم میرے حوالے سے بہت کچھ جان چکے ہو.....“ لہذا تو توقف کر کے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”عظیم! میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتا۔“

”اسد! تم میرے دوست ہو۔“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور مجھے دوستی نبھانا آتا ہے۔“

پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو.....!“

”تم میڈم سلٹی کو کب سے جانتے ہو؟“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”لگ بھگ دو سال سے۔“

”کیا بھی تمہارا وہاں میڈم سلٹی کے بیٹکے پر جانا بھی ہوا؟“

”کبھی نہیں۔“ وہ لبی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”سچ کہہ رہے۔“

”صد فیصد سچ!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی زمانے میں بہت رنگین طبع اور کلنڈر ہوا کرتا تھا۔ میرا سرکل بہت وسیع تھا۔ دوست مجھے ”بلے بلوائے“ کہتے تھے۔ میں حسین تیلوں کے تعاقب میں مگر مگر گھومتا رہتا تھا۔ اپنی سن پسند لڑکی کے حصول کے لیے مجھے کبھی خوار نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ میرے دوست مجھے شکر کہا کرتے تھے پھر ایک دن سب ختم ہو گیا.....“

اس نے ایک غٹھنی سانس پر بات ادھوری چھوڑی

چنانچہ اس ملاقات کے لیے ہمارے گھر کا انتخاب کیا گیا۔
”ہوں.....“ میں نے ایک بوچھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”برو! جہیں اپنے ذہن پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”جب تم میرے دوست ہو تو تمہاری ماں، میری ماں ہے۔ تمہاری ماں کی عفت، میری ماں کی عفت ہے۔ میرا گھر، تمہارا گھر ہے۔ ہم دونوں کی خوشیاں اور غم مشترک ہیں۔ تم مجھے زندگی کے ہر قدم پر اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے۔ ہماری دوستی چند روزہ نہیں، یہ زندگی بھر کا رشتہ ہے۔ یہ ہماری آخری سانسوں تک کا ناتا ہے.....“

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں بازو داکر کے کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی عظیم نے بھی کرسی چھوڑ دی اور وارنٹسلی سے آگے بڑھ کر میرے سینے سے لگ گیا۔ میں نے شدت جذبات سے اسے اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

اس معاملے میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ ہماری زبانیں خاموش تھیں، صرف دل دھڑک رہے تھے۔ دل کو کچھ کہنے کے لیے زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی زبان ہوتی ہے جو جذبات کی ترجمان ہوتی ہے، دوستی کی پہچان ہوتی ہے، عزتوں کی نگہبان ہوتی ہے۔ یہ الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی، سروں کا تاج اور دروحوں کی معراج ہوتی ہے۔

ہم جدا ہو کر دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تو مجھے اپنے دل کے بوجھ میں کافی حد تک کمی محسوس ہوئی۔ عظیم کی بے لوث محبت اور خلوص نے میرے ذہنی خلفشار کو خالص کر دیا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں عظیم کو نیلی جلد والی ڈائری کے مندرجات سے آگاہ کر دیا۔

اس نے نہایت ہی توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

”لو ایٹو..... برو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ”تم اپنے والدین کے دشمنوں سے نشینے کے لیے جو بھی منصوبہ بندی کرو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ جہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”میں گھر مند نہیں ہوں عظیم۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”مجھے بورا قہین ہے کہ مالک سب ٹھیک کر دے گا لیکن.....“
”لیکن کیا برادر؟“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”میں ماں کی ڈائری میں درج آخری الفاظ سے الجھ کر رہ گیا ہوں۔“ میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔

نہیں لے رہے ہو۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس معاملے کا ایک زاویہ میرے ذہن کو الجھا رہا ہے۔“

”کون سا زاویہ؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
”جب جہیں سبیل کے توسط سے میری ماں کی رہائش گاہ کا پتا چل گیا تھا تو پھر یہ سارا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے گہری تنقید کی سے استفسار کیا۔ ”تم مجھے اپنے ساتھ لے کر زمرہ والے ہینکے پر جا سکتے تھے..... مجھے پورا دن سسٹن میں رکھ کر میری ماں کو یہاں لانے میں کون سی منطق یا مصلحت پنہاں تھی؟“

”تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے اور میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔“ وہ منہ پر ہونے لہجے میں بولا۔

”جب تمہاری زبانی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ جہیں جن خاتون کی تلاش ہے، وہ وہی میڈم سلٹی ہیں جو زمرہ والے ہینکے پر ہوتی ہیں تو مجھے یہ اچھا محسوس نہیں ہوا کہ میں جہیں ڈائریکٹ وہاں لے کر جاؤں کیونکہ یہ بات بھی میرے علم میں آ چکی تھی کہ میڈم سلٹی تمہاری والدہ ہیں.....“ لگائی تو تھک کر کے اس نے ایک بوچھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اسد! تم میرے دوست ہو۔ میں نے دل و جان سے جہیں اپنا سچا دوست مانا ہے لہذا تمہاری ماں کی عزت و تکریم مجھ پر ایسے ہی لازم ہے جیسے میں اپنی ماں کی کرتا ہوں۔ میری نظر میں سلٹی صاحبہ اور سیدہ سلطانہ میں کوئی فرق نہیں اسی لیے جب مجھے تمہارے اور سلٹی صاحبہ کے رشتے کے بارے میں پتا چلا تو میں نے تمہیں وہاں لے جانے کے بجائے اپنے گھر پر اس ملاقات کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تمہارا معاملہ پاپا کے سامنے رکھا تو انہوں نے بھی میری تجویز کی تائید کر دی۔ اس طرح میں سلٹی صاحبہ کو تم سے ملوانے کے لیے اپنے گھر لے آیا۔“

”تم نے میرا معاملہ اپنے پاپا کے سامنے رکھا..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے ایک نازک سوال کیا۔

”دیکھو اسد! پاپا میرے بارے میں چاہے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں انہیں ایک دانا وینا تجربہ کار انسان سمجھتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لہذا میں نے ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ میں نے پاپا کو تمہارے اور سلٹی صاحبہ کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے تجویز کیا کہ جہیں سلٹی صاحبہ کے گھر لے کر جانا اور اس ماحول سے روشناس کرانا ٹھیک نہیں ہوگا

”ان الفاظ میں ایسا کیا ہے برو.....؟“

”ماں نے اپنی داستانِ حیات کے آخر میں مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں پہلی فرصت میں واپس امریکا چلا جاؤں۔“ میں نے عظیم کو بتایا۔ ”ان کے الفاظ میں ایک خاص قسم کا حکم پایا جاتا ہے۔“

”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ ماں کے پیشِ نظر میرا تحفظ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے وہ مجھے خود سے فی الحال دور رکھنا چاہتی ہیں لیکن ماں کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے بعد اب میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ انہیں تنہا یہاں چھوڑ کر واپس امریکا چلا جاؤں۔ لہذا میرا فیصلہ یہی ہے کہ جب تک میں اپنی ماں کو اس مقام تک پہنچانے والوں کو ہر تناک انجام تک نہ دھکیل دوں، ماں سے دور جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا.....؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال بھی ہوں۔ تم نے ڈائری میں درج جن آخری الفاظ کا ذکر کیا ہے، ایسی ہی بات سہلی صاحبہ نے مجھ سے بھی کی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جب میں انہیں گھر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو انہوں نے تاکیداً مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں کسی طرح سمجھا بجا کر واپس امریکا بھیج دوں۔“ عظیم نے بتایا۔

”ہوں.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”لیکن میں کسی بھی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گا۔ میرے پیشِ نظر اس وقت دو مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول سے مل میں کسی تیسرے کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”کون سے دو مقاصد؟“ عظیم نے استفسار کیا۔

”نمبر ایک..... مجھے پہلی فرصت میں ماں کو گناہ کی اس دلدل سے نکالنا ہے۔“ میں نے پُر عزم انداز میں کہا۔

”نمبر دو..... اس دلدل میں ان تمام افراد کو غرق کرنا ہے جو میرے باپ کے قاتل اور میری ماں کی بربادی کے ذمے دار ہیں۔“

”ان میں سے نمبر ایک کام فوری طور پر کرنے کا ہے۔“ عظیم نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”سہلی صاحبہ کو سروسٹ اس گناہ کو منظر سے غائب ہو جانا چاہیے۔ کام نمبر دو کے بارے میں اس کے بعد منصوبہ بندی کی جاسکتی

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لوبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لوبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لوبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگو لیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسٹی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

ہے۔ میں کل کسی وقت پاپا سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ وہ ٹٹلی صاحبہ کی رہائش کی تبدیلی یعنی ان کی گمان زندگی کی شروعات کے لیے کوئی بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔“

”تم بالکل ٹھیک انداز میں سوچ رہے ہو عظیم۔“

میں نے کہا۔ ”میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کا آئیڈیا ہے لیکن میں کل کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں برو؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تم کل کسی وقت اپنے پاپا کو اعتماد میں لے کر اس البتہ پر بات کرنے کا ارادہ رکھتے ہو اور میں ابھی..... اسی وقت اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ماں کو اس بات پر راضی کرنا ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے سیٹ اپ سے من موز کر کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو جائیں۔ وہ اپنے کسی بھی تعلق دار سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ کسی کو کچھ بتانے کو کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔ اس دوران میں، میں اپنے اور اپنے والدین کے دشمنوں سے منٹ لوں گا اور ماں کے یہاں سے امریکا شفٹ ہونے کا بندوبست بھی کر لوں گا۔“

”گلد آئیڈیا۔“ وہ سر اٹھنے والے انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ”کیا تمہاری والدہ اس بات کے لیے راضی ہو جائیں گی؟“

”مجھے خود پر پورا بھروسہ ہے کہ میں انہیں اس کام پر آمادہ کر لوں گا۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”تو ٹھیک ہے.....“ عظیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ہم اس سلسلے میں کل کسی وقت تمہاری والدہ سے ملاقات کرتے ہیں۔“

”کل نہیں، آج!“ میں نے غصے سے لہجہ میں کہا۔

”ابھی اور اسی وقت.....!“

”ادک!“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”دلیش کو۔“

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے چھت سے نیچے اتر آئے۔ عظیم نے اس بیڈروم کے اندر جھانک کر دیکھا جہاں عظیم اور طبعی سکون نیند سو رہے تھے پھر وہ مجھے ساتھ لے کر بیٹکے کے کون میں پہنچ گیا۔ بیٹکے کے سامنے والے حصے میں دونوں کونوں پر دو عظیم الشان منقش چوبلی گیٹ بنے ہوئے تھے۔ دونوں گیٹ سے بیٹکے کے اندر دنی میں تک ایک مختصر ڈرائیوے تھا۔ یہ دونوں ڈرائیوے گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اس وقت ایک ڈرائیوے

یعنی پارکنگ خالی نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وٹر پارک کی جاتی تھی۔ مذکورہ گاڑی اس وقت ملینیک کے پاس تھی۔ دوسرے ڈرائیوے پر سیاہ ٹویوٹا کرولا موجود تھی۔ دونوں ڈرائیوے کے بیچ میں ماربل کے فرش والا ایک کشادہ حصہ تھا جہاں پر حلیطہ پور صاحب کی مخصوص چارپائی بھی رہتی تھی۔ وہ دونوں جانب کیے لگائے اسی چارپائی پر فردوس ہوا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے آنے والے افراد کی بھی اکثر و بیشتر اسی فرش پر سٹنگ ہوا کرتی تھی۔ آپ سٹنگ سے مراد کوئی فرش نشست نہیں سمجھ لیجیے گا۔ ملاقاتیوں کے لیے پلاسٹک اور کٹڑی کی درجن بھر کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے پتا چلتا تھا کہ بیٹے میں ایک مرتبہ، عمو ایک ایڈ پر پور صاحب اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے اسی مقام پر ڈنکا اہتمام کیا کرتے تھے۔

مقام پر ڈنکا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ”کیا تم پاپا کو اپنی رودادگی کے بارے میں بتاؤ گے؟“

”نہیں!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پاپا اس وقت گہری نیند میں ہوں گے لہذا انہیں جگانا اور کچھ بتانا مناسب نہیں ہوگا بلکہ ہم کسی کو کچھ بتانے بغیر ہی یہاں سے رخصت ہوں گے۔“

”جب یہاں گاڑی موجود نہیں ہوگی تو گھر والوں کو تشویش ہو سکتی ہے۔“ میں نے ایک نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی کو غائب پا کر بیٹکے کے بالائی حصے کا رخ کیا جائے گا اور وہاں ہم دونوں بھی غیر موجود ہوں گے۔ ہماری غیر حاضری گھر والوں کو پریشانی میں مبتلا کر سکتی ہے۔“

”تمہاری تشویش اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔“ وہ بڑی رسان سے بولا پھر پورا گیٹ دا کرنے کے بجائے مین گیٹ کے اندر پہنچے ہوئے مٹی ڈور کو کھولتے ہوئے بتانے لگا۔ ”لیکن ہم گاڑی لے کر نہیں جا رہے اس لیے کسی کو ہمارے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس وقت تمام گھر والے سو رہے ہیں۔ ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہم واپس لوٹ آئیں گے۔ ہماری آمد دجامد کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔“

”کیا مزہم کا علاقہ یہاں سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے جو ہم گاڑی نہیں لے کر جا رہے؟“ میں نے متذہب لہجے میں دریافت کیا۔ ”تم جب ماں کو چھوڑنے گئے تھے تو کافی دیر کے بعد واپس آئے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علاقہ یہاں سے خاصے قاصطے پر ہے.....!“

میننگ میں، تم دونوں کے بیچ جو بھی ملے ہوگا اس کی روشنی میں آئندہ لاکھ عمل ترتیب دیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تمہارا آئینہ یازہ بدست ہے لہذا میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے صاف کوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ماں سے اپنی بات منوائے بغیر وہاں سے اٹھوں گا نہیں اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس مقدمہ کے حصول کے لیے مجھے ابھی خاصی محنت کرنا پڑے گی جس میں وقت تو لگے گا۔“

”یہ اہم میننگ ماں بیٹے کے بیچ ہی میں ہو تو اچھا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے سبجے میں بولا۔ ”میرا وہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے عظیم! تم واپس گھر آ کر یہاں کے معاملات کو دیکھنا اور میں وہاں کی سچویشن کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”جب ہم دونوں اپنے اپنے حصوں کا کام نٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر فون پر رابطہ کر کے ملاقات کی سبیل نکال لیں گے۔“

”اوکے..... ڈن!“ وہ محسوس لہجے میں بولا۔

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اور ٹیکسی نے ہمیں ڈی ایچ اے کے قلعہ میں واقع زمرہ کے پوسٹ علاقے میں پہنچا دیا۔ عظیم نے ٹیکسی ڈرائیور کی راہ نمائی کی اور چند لمحات کے بعد ہم اس پینکے کے سامنے پہنچ گئے جہاں میری ماں رہائش پذیر تھیں۔

پینکے کا گیٹ بند تھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اس وقت کسی بھی گھر کا داخلی دروازہ بند ہی ہونا چاہیے تھا۔ عظیم نے مجھ سے کہا۔

”اسدا! تم جا کر پینکے کی ڈور تیل بجاؤ۔ میں ادھر ٹیکسی ہی میں بیٹھا ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوگی تو میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے باہر آ گیا۔ مذکورہ پینکا: ”سر تا پا“ سفید تھا۔ پینکے کی دیدہ زیبی اور دل کشی اپنی جگہ اہمیت کی حامل تو تھی ہی لیکن اس کے برف کے مانند سفید رنگ نے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ تاریک رات میں وہ سفید پینکا کی خواب محل کا منظر پیش کرتا تھا۔ یہ دل فریب نظارہ دیکھنے والے کی آنکھوں کو سمور، دماغ کو تھوڑا دل کو سمور کر دیتا تھا۔

میں جیسے ہی پینکے کے گیٹ کی جانب بڑھا اور ڈور تیل بجانے کے لیے ہاتھ کو بٹن کی سمت بڑھایا، ایک رعب دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ”زمرہ کا علاقہ یہاں سے خاصا دور ہے اور ہم وہاں بذریعہ ٹیکسی جائیں گے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”کیا رات کے اس پہر ہمیں کوئی ٹیکسی آسانی سے مل جائے گی؟“

”امید ہے، مل جائے گی۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”ٹیکسی نہیں تو رکشا ضرور مل جائے گا۔ یہاں نزدیک ایک جگہ رکشا اور ٹیکسی کھڑے رہتے ہیں۔“

انسان کی نیت صاف، ارادہ نیک، عزم پختہ اور کوشش مثبت ہو تو ناممکن کو ممکن بننے میں وقت نہیں لگتا۔ ہم اپنی اسٹریٹ سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر پہنچے، ہمیں سامنے سے ایک یلو کیب مل گئی۔

☆☆☆

وہ رات کا آخری پہر تھا اس لیے سڑک بالکل خالی تھی۔ ون میں یہ روڈ ٹریفک کے ازدحام کے باعث ایک ہنگامی کیفیت کی نماز دکھائی دیتی تھی لیکن اس وقت تاحدنگاہ کوئی گاڑی نظر آ رہی تھی لہذا ہماری یلو کیب سڑک پر اس طرح رواں دواں تھی جیسے کوئی تیز رفتار موٹر بوٹ سمندر کے سینے پر پھسلتی چلی جا رہی ہو۔

عظیم نے رسٹ وای پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”برو! اس وقت تین بجتے والے ہیں۔ لگ بھگ پندرہ منٹ میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اگر تم اتفاق کر دو تو.....!“

”کیا تجویز ہے؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اتفاق یا اختلاف کرنے کا فیصلہ تو تجویز سننے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔“

”انتہائے سحر لگ بھگ سوا چار بجے ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ میڈم سلی کو آدھ کرنے کے لیے تمہیں وہاں اچھا خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ اگر میں تمہیں وہاں پہنچا کر اسی ٹیکسی میں واپس آ جاؤں تو کیسا رہے گا؟ اس طرح تم ان سے پوری سلی سے بات بھی کر لو گے اور میں سحری کے وقت سے پہلے گھر واپس بھی آ جاؤں گا لہذا گھر والوں کو ہمارے منصوبے کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکھا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”بعد ازاں جب تم اس اہم میننگ سے فارغ ہو جاؤ گے تو مجھے فون کر دینا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔ اس

”آپ کون ہو اور اس وقت یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ میری نگاہ نے اس سوالیہ آواز کا تعاقب کیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آواز پینکے کے اندرونی حصے میں گیٹ کے قریب بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں سے آئی تھی۔ یقیناً یہ مینی روم کسی گاڑی یا چوکیدار کے کمرے میں تھا جو اس پینکے کی حفاظت پر مامور تھا لیکن اس دوران میں، میں نے میکا کی انداز میں ڈور تیل کا بن دبا دیا تھا۔ پینکے کے اندرونی حصے میں کھنی بج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس شخص کا چہرہ بھی نظر آ گیا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے استفسار کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود کھڑکی کے راستے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”بھائی! کیا مسئلہ ہے؟ تم کون ہو اور کس سے ملنے آئے ہو؟“

اس کے استفسارات میں درشتی پائی جاتی تھی۔ ایک سیکورٹی گاڑی کو کچھ معنوں میں ایسا ہی دنگ ہونا چاہیے تھا۔ میں اس کے نزدیک چلا گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

”میرا نام اسد علی ہے اور میں میڈم سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”میڈم اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔ آپ کل دن میں کسی وقت آنا۔“ ”مجھے ابھی اور اسی وقت سہلی صاحبہ سے ملنا ہے۔“ میں نے مزید لہجے میں کہا۔ ”مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔“ ”کام ضروری ہو یا غیر ضروری لیکن میڈم اس وقت سو رہی ہیں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ”اور میں کسی بھی قیمت پر انہیں اٹھا نہیں سکتا۔“

”تم جا کر انہیں بتاؤ کہ اسد علی آیا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وہ میرا نام سنتے ہی بیدار ہو جائیں گی۔“

میں نے دانت اسے یہ نہیں کہا تھا کہ سہلی صاحبہ سے ان کا بیٹا ملنے آیا ہے۔ میں اس راز کو ماں کی اجازت بغیر کسی اجنبی پر نہیں کھول سکتا تھا۔ سیکورٹی گاڑی اس سے مس نہ ہوا۔ وہ مجھے اندر جانے کی اجازت دینے کو قطعاً آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے عظیم نے صورت حال کو بھانپ لیا اور ٹیکسی سے نکل کر میرے قریب آ گیا۔

عظیم کو دیکھ کر سیکورٹی گاڑی کے چہرے پر ششامانی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے عظیم کو

سلام بھی کیا۔ عظیم نے سیکورٹی گاڑی سے کہا۔

”اسد صاحب کو میڈم سے ملو۔ یہ بہت دور سے آئے ہیں۔ ان کا فوری طور پر میڈم سے ملنا بہت ضروری ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن میڈم اس وقت اپنے بیڈ روم میں سو رہی ہیں۔“ سیکورٹی گاڑی نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ ”جب سے آپ انہیں چھوڑ کر گئے ہیں وہ اپنے بیڈ روم میں بند ہیں۔ انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ آج وہ دیر تک سوئیں گی لہذا انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”میں تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گا۔“ عظیم نے گاڑی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم ایک کام کرو۔ اسد صاحب کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا دو۔ میڈم جب بھی بیدار ہوں، تم ان سے اسد صاحب کی ملاقات کروا دیتا۔“

”آپ اسد صاحب کی گارنٹی لیتے ہیں.....؟“ گاڑی نے حذب و انداز میں عظیم سے استفسار کیا۔ جواب میں عظیم نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے؟“

”جی صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جب میڈم آپ کے ساتھ، آپ کی گاڑی میں پینکے سے باہر جاسکتی ہیں تو آپ میرے لیے قابل اعتماد ہیں۔“ ”اگر میں تمہارے لیے قابل اعتماد ہوں تو بس پھر تم میری بات کو مان لو۔“ عظیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسد صاحب تمہاری میڈم کی نظر میں مجھ سے بھی زیادہ قابل بھروسہ ہیں۔ میں میڈم کو انہی سے ملوانے کے لیے یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اس ملاقات میں کچھ چیزیں طے ہونا باقی رہ گئی تھیں جو فوری طور پر ڈسکس ہونا بہت ضروری ہیں۔“

”میں سمجھ گیا جناب۔“ سیکورٹی گاڑی نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اسد صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتا ہوں۔ اگر میڈم خود ہی بیدار ہوئیں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں صبح تک میڈم کے کھٹے کا انتظار کرنا ہوگا۔“ ”اوکے..... ٹھیک ہے۔“ عظیم نے سیکورٹی گاڑی سے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیٹ آف لک..... میں جاگ رہا ہوں۔ اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو مجھے فون کر لینا۔“

”شیور!“ میں نے کہا۔ عظیم مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہوا تو

ایک گبرو جوان تھا۔ جب ماں نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر مجھے خود سے دور کیا اس وقت میں سوچنے بجھنے کی باقاعدہ اور شعوری صلاحیت سے مالا مال نہیں تھا۔ ایک سال کے بچے کی بھلا کیا سوچ ہوگی لیکن اب میں عاقل، بالغ اور جوان ہو چکا تھا اور ہر قسم کے حالات کی سنگینی اور نزاکت کو گہرائی تک بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا میں صرف اور صرف اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری ماں نے اس دوران میں بہت زیادہ تکلیف اور اذیت اٹھائی تھی۔ میرے باپ کے قتل کے بعد تو دشمنوں نے ماں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ یہ ماں کی ہمت تھی کہ وہ اب تک زندہ تھیں۔ وہ نہ صرف زندہ تھیں بلکہ انہوں نے خود کو معاشرے میں خاصا مضبوط اور باسرخ بھی بنالیا تھا۔

ماں کی مضبوطی اور بااختیاری کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں چھتا کے سے کوئی چیز ٹوٹ ہی گئی۔ اس چھتا کے کی آواز صرف میرے احساس نے سنی تھی اور اس ٹوٹنے والی چیز کی ٹھیکل کرچیوں نے میرے احساس کی ساعت کو لہو لہو کر دیا تھا۔ میں حساس دل کا مالک ایک حقیقت پسند انسان ہوں لہذا میں اس تلخ حقیقت سے نگاہ چرانہیں سکتا تھا کہ ماں کو اتنا بااثر اور مضبوط بننے کے لیے کیسی کیسی شرمناک قربانیاں دینا پڑی تھیں۔ انہوں نے دشمنوں سے بچا کر مجھے ایک محفوظ مقام تک تو پہنچا دیا تھا لیکن وہ اپنی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ ذلیل اور کینے دشمنوں نے اس مجبور عورت کو اپنی طاقت اور اثر رسوخ کے تل پر، ایک ایسی گھاؤنی راہ پر چلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا جس کی پہلی اور آخری منزل تباہی و بربادی ہی ہے۔ میری ماں لاچار اور بے بسی کے عالم میں وقت اور حالات کے دھارے میں بہتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی۔

زمانہ سب سے بڑا استاد، زندگی سب سے بڑی راہ نما اور دنیا سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمانے، زندگی اور دنیا نے ماں کو بہت کچھ سکھایا تھا لیکن بس.....!

میں یک لخت صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میری ایک اضطرابی حرکت تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں جھنجھکی ہوئی تھیں اور پورے وجود میں ایک خوفناک طوفان چٹکھاڑ رہا تھا۔ ماں کی زندگی میں در آنے والی اذیتوں نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خوفناک طوفان مجھے ریزہ ریزہ کر دے گا..... میں

میں سکیورٹی گارڈ کی معیت میں پتکے کے اندر داخل ہو گیا۔ ماں کا بنگلا چٹنا عالی شان باہر سے نظر آتا تھا، اس سے کہیں زیادہ دل کش وہ اندر سے تھا۔ پتکے کی اندرونی عمارت بھی ایک دم سفید تھی اور مین گیٹ سے لے کر رہائشی حصے تک ایک کشادہ گرا سی لان تھا۔ اس رہائش گاہ کو کدکھ کر ذہن میں ”وہائٹ ہاؤس“ کے الفاظ ابھرتے تھے یعنی دودھ میں نہایا ہوا نڈے کے مانند ایک خوب صورت اور دیدہ زیب گھر جسے کسی اعلیٰ ذوق کے مالک شخص نے بڑے چاؤ سے تعمیر کرایا ہو۔

پتکے کے مین گیٹ سے ڈرائنگ روم تک کے سفر کے دوران میں مجھے سکیورٹی گارڈ..... کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اس شخص کا نام جشید تھا اور وہ ایک طویل عرصے سے سکیورٹی صاحبہ کے پاس ملازمت کر رہا تھا۔ جشید سکیورٹی گارڈ پر چوکیدار والی مخصوص یونیفارم میں ملبوس تھا اور جب وہ مجھے ڈرائنگ روم تک چھوڑنے آ رہا تھا تو ایک دم چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنی گن کو بھی بڑی مستعدی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔

جشید مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا تو میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک سچا سچا روايتی ڈرائنگ روم تھا جہاں پر کم و بیش بہ یک وقت تین افراد کے بیٹھنے کے لیے جتنی صوفے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر کسی معروف آرٹسٹ کے فن پارے آویزاں کیے گئے تھے۔ ان بیننگلز میں بڑی معنویت چھپی ہوئی تھی۔ میں کافی دیر تک ان مصوری کے شاہ کاروں کے مشاہدے میں مگن رہا۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ماں کے پتکے کے اندر داخلے کے سلسلے میں عظیم نے میری بہت مدد کی تھی۔ جشید، عظیم کا صورت آشنا تھا کیونکہ آج شام میں ماں عظیم کی گاڑی میں یہاں سے رخصت ہوئی تھیں اور عظیم ہی پھر انہیں واپس بھی چھوڑنے آیا تھا لہذا عظیم، جشید کی نظر میں ایک قابل بھروسہ شخص تھا۔ اسی وجہ سے جشید نے عظیم کی سفارش پر مجھے پتکے کے اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میں اس وقت اپنی ماں کے گھر میں بیٹھا تھا۔ وہ ماں جیسے انیس سال کے بعد آج پہلی مرتبہ میں نے دیکھا تھا۔ جب میں ایک سال کا تھا تو حالات کے جبر اور وقت کی سفاکی نے مجھے ماں سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری سلامتی اور حفاظت کی خاطر ماں نے مجھے ایک سال کی عمر میں کراچی سے نیویارک بھیج دیا تھا۔ اب میں تیس سال کا

فضائے بسیط میں بکھر کر بے نام و نشان ہو جاؤں گا۔
وقت نے میری ماں کے خلاف بڑی خوفناک چال چلی تھی۔ اس شاطر کی چالیں ایسی ہی خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ یہ بادشاہ ہے، با اختیار ہے۔ کائنات کی ہر شے پر اسے قدرت حاصل ہے۔ یہ مرضی کا مالک ہے اور من مانی کرنے کے لیے ہر لمحہ آزاد ہے۔ اس کی صوابدید ہے کہ یہ جب چاہے، جس کی زندگی میں زہر بھر دے یا امرت۔ اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

ان لمحات میں، میں ایک دوسرے زاویے سے بھی سوچ رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت کی طاقت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہے لیکن اس کی گردش بھی بے معنی نہیں۔ یہ حالات کو کبھی سازگار اور کبھی ناسازگار بنا کر انسان کو کچھ سمجھانے اور سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان وقت کے اشاروں کو سمجھنے لگے اور اس کی منشا سے سبق سیکھنے لگے تو پھر کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں رہتا۔ ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا مداوا ممکن ہو جاتا ہے۔

ان انتہائی جذباتی ساعتوں میں، میں نے دل کی گہرائیوں سے عزم کیا کہ میں اپنی ماں کے ہر درد کی دوا بن جاؤں گا، ان کے ہر دکھ کا مداوا کر کے رہوں گا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے یقیناً ان معاشرتی ناسوروں کے خلاف سیاسی بلائی ہوئی دیوار بننا تھا جنہوں نے میری ماں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں میرے بدترین انتقام سے بچا نہیں سکتی تھی..... کبھی نہیں، کسی بھی قیمت پر نہیں!

اس پُر عزم فیصلے کے بعد مجھے اپنے وجود میں ایک اطمینان سا ارتعاش محسوس ہوا۔ دل پُر سکون اور دماغ شانت ہو گیا تھا۔ میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے جشید ڈرائنگ روم میں نمودار ہوا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بظہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”صاحب! میڈم نے آپ کو بلایا ہے۔“

”کیا سلسلی صاحبہ بیدار ہو گئی ہیں.....؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”جی صاحب!“ جشید نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ابھی انہوں نے مجھے انتظار کا پرم بتایا ہے کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے جس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے، اسے ان کے پاس لے آؤں۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور

اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جشید سے پوچھا۔ ”کیا تم نے میڈم میری آمد کی اطلاع دے دی تھی؟“

”نہیں.....“ اس نے گردن کوئی میں جنبش دی۔

”پھر..... پھر انہیں کیسے پتا چلا؟“ میرے سوال میں حیرت چھپی تھی۔

”انہوں نے آپ کو کیکرے میں دیکھ لیا ہوگا۔“ اس نے بتایا۔

”کیکرے میں.....“ میں چونک اٹھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”اس ہنگلے کے کیکٹ پر اور ہنگلے کے عقی حصے میں کیکرے لگے ہوئے ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ان کیکروں کا کنٹرول میڈم کے پیڈروم میں ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے سی سی ٹی وی کیکرے؟“

”جی جی..... وہی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سلسلی صاحبہ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“ میں نے اس کے ساتھ ہنگلے کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔“

”جناب! میں تو میڈم کا ملازم ہوں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”میڈم رات کو جب باہر سے واپس آئی تھیں تو انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا، اب وہ اپنے کمرے میں آرام کریں گی لہذا انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ جشید نے مجھ سے کہا۔ ”یہ میڈم کا پیڈروم ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کو یہیں تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ آپ دروازے پر دستک دے کر اندر چا سکتے ہیں۔“

میرا دل دھڑک اٹھا۔ ماں سے ملاقات کا تصور ہی بڑا سنسنی خیز اور فرحت بخش تھا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ چند گھنٹے پہلے میں عظیم کے گھر میں ان سے پہلی ملاقات کر چکا تھا لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری نگاہ پہلی مرتبہ ان کا دیدار کرنے والی ہو۔ شاید یہ احساس اس تڑپ کا رد عمل تھا جو برسوں سے میرے دل و دماغ میں رہتی بسی تھی۔ اپنے والدین سے محرومی کے خیال نے میری یادداشت میں سیرا کر رکھا تھا۔ انسان سالہا سال سے جس چیز سے دور رہا ہو جب پھر برسوں بعد وہ چیز اس کے سامنے آجائے تو جاکتی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا۔ ان لمحات میں

گا وہ ان کے علاوہ دیکھنے والوں کے لیے بھی باعثِ عبرت ہوگا، لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا.....“

”کیا وعدہ؟“ انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”جب میں آپ سے پچھڑا اس وقت میری عمر صرف

ایک سال تھی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

”آج میں تیس سال کا ہو چکا ہوں۔“ بانیس ڈمبر کو میرا برتھ

ڈے ہوگا۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ ان انیس سالوں

میں آپ کی زندگی میں جو جو شیخ و اہانتا پیش آئے، ہم ان

پر بھی بات نہیں کریں گے۔ آپ آج بھی میرے لیے ایک

عظیم ماں ہیں..... پاک دامن اور عفت مآب۔ قابلِ

احترام ماما کا خزانہ۔“

”میں خود بھی ان زہریلی یادوں کو دہرا کر اپنے

دکھوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ اذیت بھرے لہجے

میں یوں۔ ”میرے نصیب میں جو کچھ تھا وہ ہو کر رہا.....“

”یہ ٹھیک ہے کہ انسان اپنے نصیب سے لڑ نہیں

سکتا۔“ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”اب بھی وہی ہوگا جو ہمارے نصیب میں رقم ہے لیکن یہ پہلے

سے کافی مختف ہوگا۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو میرے بچے؟“ وہ چونکا

انداز میں مجھے دیکھنے لگیں۔

”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا مالک زبردست

انصاف کرنے والا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے کہا۔ ”اس مالک نے آپ کو اور مجھے بن

آزماٹوں سے گزارا ہے، اس کے پیچھے اس کا کوئی خاص

مقصد پوشیدہ ہے۔ انسان مالک کی مصلحتوں، منطوق اور

محکموں کو سمجھ نہیں پاتا لیکن میں ایک بات بڑی وضاحت

کے ساتھ سمجھ چکا ہوں۔“

میں سانس ہوار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو وہاں

نے پوچھا۔ ”کون سی بات میرے بچے؟“

”اس ہنگامے میں یہ آپ کی آخری رات ہے۔“ میں

نے غصوں انداز میں کہا۔ ”کل میں آپ کو کہیں اور شفٹ

کردوں گا اور جب تک ایسا ہو نہیں جاتا، میں سائے کی

طرح آپ کے ساتھ لگا رہوں گا۔ آپ مجھے کہیں جانے کو

نہیں کہیں گی..... بس۔“

”میں خود بھی اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں اور

اسے خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ دھکی لہجے میں یوں۔ ”مگر

یہ کام پتلی پر سرسوں جمانے کے مترادف نہیں ہے۔ مجھے

اس سیٹ اپ سے نکلنے کے لیے کچھ وقت ملے گا۔“

میرے ذہن کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔

”تم جاؤ۔“ میں نے جشید کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”میں میڈم سے خود ہی ملاقات کر لوں گا۔ تمہارا وہاں

گیٹ پر موجود رہ کر ڈیوٹی دینا زیادہ ضروری ہے۔“

وہ میرے حکم کی تعمیل میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ

داہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنی ماں کے پڑروم کے اندر تھا۔

ماں نے جی بھر کر مجھے پیار کیا۔ عظیم کے گھر میں بھی

انہوں نے مجھ پر اپنی محبت بھجوا کر کی تھی لیکن تب میں اور

اب میں بہت فرق تھا۔ وقت، مقام اور ماحول سے انسان

کے جذبات کے اظہار میں کافی فرق آ جاتا ہے۔ عظیم کا گھر

ماں کے لیے پرایا گھر تھا اور اس وقت وہ اپنے ذاتی ہنگامے

میں تھیں۔ وہ زیادہ اعتماد، تحفظ اور دواہانہ پن سے اپنے

جذبات کی تسکین کر سکتی تھیں اور میرے ذہن و دل کی

کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

جب ہم نابل انداز میں گفتگو کرنے کے قابل ہوئے

تو میں نے کہا۔ ”ماں! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“

”ہاں!“ انہوں نے سر کو اٹھاتی جنبش دی اور زیر لب

مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”مجھے تمہارا انتظار تھا اس لیے سونے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

”میرا انتظار.....“ میں نے حیرت بھری نظر سے انہیں

دیکھا۔ ”لیکن آپ تو عظیم کے گھر سے جس انداز میں رخصت

ہوئی تھیں اور ڈائری کے آخری الفاظ میں آپ نے جس طرح

مجھے فی الفور واپس امریکا چلے جانے کی ہدایت کی تھی، اس

سب کے بعد میرے انتظار کا جواز پائی کہاں رہتا تھا؟“

”ہر چیز کا جواز ہر وقت باقی رہتا ہے میرے لعل۔“

وہ بڑے دلار سے یوں پھر میری آنکھوں میں بہت دور

تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے باپ کی ٹروڈ کا لی ہو۔ ایک

دم ضدی اور معاملے کی دیکھنے دیکھنے کے لیے سرگرم۔ مجھے

یقین تھا کہ تم میری ڈائری کو پڑھنے کے بعد فوری طور پر

ادھر کا رخ کر دو گے اس لیے میں تمہارے انتظار میں جاگ

رہی تھی۔ تم اس وقت تک سکون سے بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے

جب تک اس معاملے کو کسی منطقی انجام تک نہ پہنچا دو۔“

”میرے بارے میں آپ کا اندازہ بالکل درست

ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ کی داستان حیات پوری توجہ سے پڑھ لی

ہے اور اپنے دشمنوں کو یادداشت کے خانے میں محفوظ

کر لیا ہے۔ میں ان شیطانوں کے ساتھ جو بھی سلوک کروں

دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ کی پراپرٹی کی اس وقت کیا ویلیو ہوگی۔“ میں نے سوال کیا۔ ”وہ پراپرٹی جو آپ کے نام پر ہے؟“
 ”کم از کم پندرہ کروڑ روپے اس بنگلے کی قیمت ہوگی۔“ انہوں نے بتایا۔
 ”کڈ؟“ میں نے تسلی بخش انداز میں کہا اور پوچھا۔
 ”بینک بیلنس کی کیا پوزیشن ہے؟“
 ”میرا موجودہ بینکس چچاس لاکھ سے اوپر ہی ہوگا۔“
 ”اور گاڑی؟“

”وہ بھی تیس لاکھ کے آس پاس ہے۔“
 ”بس تو آپ کی طرف سے معاملہ ایک دم زبردست ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بس تو پھر کیا مشکل ہے جب آپ تمام تر تقاضے پورے کرنے کے قائل ہیں تو آپ آرام سے امریکا جاسکتی ہیں۔“
 ”میں آج ہی اکل علی سلطان سے بات کر کے تمام ضروری کاغذات منگوا لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ کام آپ کے کرنے کے ہیں۔“
 ”مجھے کون سے کام کرنا ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”نمبر ایک۔ اپنے بینک سے پچھلے چھ ماہ کی ”بینک اسٹیٹ منٹ“ نکالوائیں جس کا کلوزنگ بینکس تیس لاکھ سے زیادہ کا ہونا چاہیے۔“
 ”یہ کام ہو جائے گا۔“ وہ یقینی لہجے میں بولیں۔
 ”کلوزنگ بینکس چچاس لاکھ سے اوپر ہی ہوگا۔“

”دیری کڈ۔“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔ ”نمبر دو۔ کسی بھی لوٹری ٹکٹ کے پاس جاکر آپ بنگلے اور گاڑی کی اڈونشپ کا اپنی ڈیوٹ بنوائیں جس میں ان دونوں چیزوں کی مالیت کا ذکر بھی ہو۔ اسٹیپ پیپر پر بنے ہوئے اس اپنی ڈیوٹ میں آپ اپنی جیولری اور دیگر قیمتی چیزوں کی مالیت کا بھی اندراج کروا سکتی ہیں۔“
 ”یہ کام بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔“ ماں نے کہا۔ ”کل دن میں ہو جائے گا۔“

”اس کے علاوہ آپ اپنے دو سال کے ٹیکس ریٹرنز اور این ٹی این کارڈ کی کاپی بھی کروالیں۔“
 ”اور کچھ.....؟“ ماں نے محبت پاش سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”بس اور کچھ نہیں۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”باقی کے سارے کام میں عظیم کی مدد سے نٹالوں گا۔ آج کل اس کی مسز ونجیوں کے ساتھ امریکا

”ماں! آپ نے مجھے جنم دیا ہے۔ آپ مجھ سے بڑی ہیں، مجھ سے زیادہ سمجھدار اور ذہانت شاس ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ ہنگامی نوعیت کے فیصلے یا تو فی الفور کیے جاسکتے ہیں اور یا پھر بھی بھی نہیں کیے جاسکتے۔ میں آپ کے معاملے کو ناممکن سے پہلے ممکن بنانا چاہتا ہوں۔ آنے والی رات آپ اس خلاعت بھرے ماحول میں نہیں گزاریں گی۔ میں آپ کے لیے کسی محفوظ اور پاکیزہ رہائش کا بندوبست کر دوں گا۔ ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں آپ کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں ہوگا۔ کوئی آپ سے رابطہ نہیں کر سیکے گا۔“

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھیں۔ ”آخر تم کرنا چاہتے ہو؟“
 ”میں آپ کو اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”یہ کیسے ممکن ہے میرے بچے؟“ وہ بے یقینی سے بولیں۔
 ”آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔
 ”آپ نے اس پاسپورٹ پر ٹریول بھی کیا ہوگا؟“
 ”ہاں۔ میں کئی بار دعویٰ جا چکی ہوں۔“ انہوں نے بتایا۔
 ”اس کے علاوہ اور کہیں ٹریول کیا ہے؟“
 ”ایک مرتبہ ملائیشیا اور دو دفعہ تھائی لینڈ بھی گئی ہوں۔“ انہوں نے جواب دیا۔
 ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”اب میں آپ کے امریکا کے ویزا کے لیے آن لائن اپلائی کر رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر آپ کو امریکا کا ویزا مل جائے گا۔“

”کیا امریکا کا ویزا حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہے.....“ انہوں نے ابھمن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ”تم ویزا کی بات کر رہے ہونا؟“
 ”جی ماں! میں ویزا کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس دنیا میں کوئی بھی کام آسانی سے نہیں ہوتا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ امریکا کے ویزا کے لیے جو بھی بنیادی تقاضے ہیں وہ میں آپ کے لیے آسانی سے پورے کروا سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے صد فیصد یقین ہے کہ آپ کو ویزا مل جائے گا۔“

”مثلاً وہ بنیادی تقاضے کیا ہیں؟“ انہوں نے گہری

”گوئی گئی ہوئی ہے۔“
 ”عظیم مجھے کافی سمجھدار اور مخلص لگا ہے۔“ ماں نے
 تعریفی انداز میں کہا۔ ”ابھی تو توڑی دیر پہلے وہ تمہیں یہاں
 چھوڑنے بھی آیا تھا۔ میں نے کسرے کی آنکھ سے اسی کی
 دی اسکرین پر دیکھا تھا۔“

”عظیم اور اس کی پوری فیملی بہت ملنسار اور ہمدرد
 لوگ ہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
 کہا۔ ”میں اس کے باپ حفیظ کپور سے بھی ملا ہوں۔ بہت
 ہی دنگ اور اونچی چوٹی والا انسان ہے۔“

”مجھے بھی شام میں ان کے گھر جا کر اچھا لگا تھا۔“ ماں
 نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ ہندو کیونٹی سے ہیں۔ ان کے نام
 کے ساتھ ”کپور“ لگا ہوا ہے اس لیے پوچھ رہی ہوں!۔۔۔۔۔!“

میں نے ماں کو اس فیملی کے بارے میں اپنی معلومات
 کے مطابق، نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں بتانے کے بعد
 کہا۔ ”تین چار سئیں پہلے ان کے آباؤ اجداد ہندو ہوا کرتے
 تھے پھر جب ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو یہ
 لوگ مسلمان ہو گئے۔ آزادی کے بعد یہ لوگ سرکودھا میں
 آباد ہوئے تھے پھر کاروبار کے سلسلے میں کراچی چلے آئے مگر
 فیملی کا سرخیم انہوں نے چھوڑا نہیں۔ ان کے خاندان کے
 تمام افراد کے نام کے ساتھ ”کپور“ لگا ہوا ہے۔ حفیظ کپور
 صاحب کراچی کے بہت بڑے اپورٹرز ہیں۔“

”جہاڑی یہ خوش قسمت ہے کہ یہاں پہنچے ہی جنہیں
 اچھے اور مخلص لوگوں کا ساتھ مل گیا۔“ پوری بات سننے کے
 بعد ماں نے کہا۔
 ”وہ اس لیے کہ یہاں میری آمد کا مقصد نیک تھا۔“
 میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”انسان کی نیت صاف
 ہو تو مالک ضرور اس کی مدد کرتا ہے۔ دیکھ لیں، میں نے کتنی
 آسانی سے آپ کو تلاش کر لیا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو میرے لعل!“ وہ گہری غنجدگی
 سے بولیں۔ ”اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ اب تم تھوڑا
 آرام کرو۔“

”ابھی میرا کام مکمل نہیں ہوا ماں۔“ میں نے کہا۔
 ”پہلے کام، پھر آرام۔“

”اب کیا کرنا باقی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”دوا اہم کام ابھی بنانا ہیں۔“ میں نے سوچ میں
 ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اکل علی سلطان کو فون کر کے
 تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنا ہے اور عظیم سے کہہ کر
 آپ کی رہائش کا کوئی محفوظ اور مضبوط بندوبست کرنا ہے۔“

”یہ سچ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے جذبات کو پوری
 طرح محسوس نہیں کر سکتی اور ماں کی ماما کا تو انداز ہی بڑا
 منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے
 بے حد فکر مند ہوتی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے شوہر کو کوہنچل
 کے لیے کہا تھا۔“

”یہ سچ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے جذبات کو پوری
 طرح محسوس نہیں کر سکتی اور ماں کی ماما کا تو انداز ہی بڑا
 منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے
 بے حد فکر مند ہوتی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے شوہر کو کوہنچل
 کے لیے کہا تھا۔“

”یہ سچ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے جذبات کو پوری
 طرح محسوس نہیں کر سکتی اور ماں کی ماما کا تو انداز ہی بڑا
 منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے
 بے حد فکر مند ہوتی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے شوہر کو کوہنچل
 کے لیے کہا تھا۔“

”یہ سچ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے جذبات کو پوری
 طرح محسوس نہیں کر سکتی اور ماں کی ماما کا تو انداز ہی بڑا
 منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے
 بے حد فکر مند ہوتی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے شوہر کو کوہنچل
 کے لیے کہا تھا۔“

ہو، اپنی زندگی کی قیمتی چیزیں لٹا چکا ہو، اس نے در در کی ٹھوکریں کھائی ہوں، اذیت، ناک و ناک اور کرب ناک راتیں اس کا مقدر ٹھہری ہوں تو ایسی ماں کی حساسیت اور تحفظات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کے دوسرے، اندیشے اور خدشے لاحقہ دوہو جاتے ہیں۔ میں ماں کی ذہنی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میں ان کی متاع عزیز، ان کی واحد امید تھا۔ وہ اس قیمتی اثاثے کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھیں اسی لیے میری حفاظت کے حوالے سے بے پناہ فکر مند تھیں۔

”ماں جی! میں کوئی تنہا مٹا کمزور سا بچہ نہیں جو دشمن مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ میں نے ان کے خطرات میں گھرے ہوئے دل و دماغ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کیمیوں سے نشنہ اور انہیں عبرت تک انجام سے دوچار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی اور آپ کی حفاظت کرنا بخوبی جانتا ہوں۔“

”نہیں.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔ ”میں تمہیں کسی بھی قسم کی جتنی آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”اگر میں ان ذلیل لوگوں کو ضرور عبرت نہیں بناؤں گا تو آپ کا انتقام کیسے پورا ہوگا ماں.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنی ماں کے مجرموں کو ایسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“

”تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا میرے لعل!“ وہ اصراری لہجے میں بولیں۔

”کون سا حکم؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”تم مجھے مل گئے ہو تو میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔ ”تم بھی دشمنوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ کا غضب خود ہی ان درندوں سے حساب کتاب کر لے گا۔“

”اوکے.....!“ میں نے ماں کی خواہش کے سامنے سپرد ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی بات مانتے ہوئے دشمنوں سے انتقام کے خیال کو دل سے نکال رہا ہوں۔ اس کے بدلے میں آپ کو بھی میری ایک بات ماننا ہوگی.....!“

”ایک نہیں، میں تمہاری دس باتیں مانوں گی میری جان۔“ وہ جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں کسی بھی قیمت پر تمہیں کھونا یا تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں دیکھ سکتی۔ میرا دل پہلے ہی چٹختی ہو چکا ہے۔ اگر تمہارا ایک بال بھی بیکا ہوگا تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی خواہش کا پورا احترام کروں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ بھی مجھ سے وعدہ کریں کہ میں آپ کو پاکستان سے امریکا پہنچانے کے سلسلے میں جو بھی اقدام کروں گا، آپ کسی بھی مرحلے پر میری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گی۔ اگر آپ نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تو ایک ماہ سے پہلے امریکا میں ہوں گے اور انشاء اللہ عید ہم وہیں پر منا سکیں گے۔ پھر ساری زندگی ہم وہیں رہیں گے۔“

”انشاء اللہ!“ وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولیں پھر کہا۔

”میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری کوششوں کے راستے میں حائل نہیں ہوں گی لیکن چند ضروری معاملات کو نمٹانا بہت ضروری ہے۔“

”مثلاً کون سے معاملات؟“ میں نے پوچھا۔

”میں وزٹ ویزا کے لیے اہلائی کروں گی تو ایک خاص مدت کے بعد تو مجھے واپس پاکستان آنا پڑے گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”پھر ہم ساری زندگی ایک ساتھ امریکا میں کیسے رہ سکیں گے؟“

”آپ نے بہت اہم سوال کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر مجھے امید ہے کہ آپ کو پانچ سال کے لیے ملٹی پل وزٹ ویزا جاری کر دیا جائے گا جو کہ عام طور پر ان دنوں دیا جا رہا ہے۔“

”تو کیا ان پانچ سالوں میں مجھے ہر چھ ماہ کے بعد پاکستان آنا ہوگا؟“ ماں کے چہرے پر ابھن نمودار ہوئی۔

”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب.....!“ اگر میں چھ ماہ سے زیادہ عرصے تک وہاں رکوں گی تو یہ اور اسے کہلائے گا جو کہ یقیناً غیر قانونی ہوگا۔“

میں نے بتایا۔ ”میں نے وہاں پہنچنے ہی آپ کا اسٹیم اہلائی کر دینا ہے۔“

”اسٹیم..... یعنی سیاسی پناہ؟“ وہ تیز لہجے میں بولیں۔

”ہاں۔“ پولیٹیکل اسٹیم کو سیاسی پناہ ہی کہا جاتا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”بس یہ ثابت کرنا ہوگا کہ پاکستان میں آپ کی جان کو شدید نوعیت کا خطرہ ہے اس لیے آپ یونائیٹڈ اسٹیشن آف امریکا میں سیاسی پناہ لے رہی ہیں۔“

”لیکن یہ کس طرح ثابت کیا جائے گا۔“ وہ حذب بذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟“

”ارے یار..... میں کینیڈا کے ویزا کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں کینیڈا کے ویزا کے لیے ایلائی کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے ایک دو دوست بھی رہتے ہیں۔ جب میں امریکا گیا تھا تو میں نے کینیڈا میں ان کے پاس جانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ مجھے امریکا سے کینیڈا کا ویزا نہیں مل سکا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ملک پاکستان سے ہی کینیڈا کا ویزا لے کر آنا پڑے گا۔“

”بالکل!“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”دنیا میں ستائیس ملک ایسے ہیں جو پاکستانیوں کو آن اریوول انٹری دے دیتے ہیں۔ باقی تمام ملکوں کی سر کے لیے آپ کو پاکستان ہی سے ویزا لینا پڑتا ہے۔“ میں نے ذوقی انداز میں کہا۔ ”تم اپنے کسی کینیڈین دوست سے الوی ٹیشن منگوا لو۔ باقی کا پروکس میں تمہیں بتا دوں گا۔ کینیڈا کے وزٹ ویزا کے لیے الوی ٹیشن بہت ضروری ہے۔“

”اوکے..... یہ بتاؤ، جہاز اڑا کر کہاں سے آیا میں تمہیں لینے آؤں؟“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”میں یہیں پر ایک بھر پور ٹینڈ لینا چاہتا ہوں۔ تم سے کل ہی دن میں کسی وقت ملاقات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے بردو! اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے کہا۔

میں نے بھی جواباً اپنا ہاتھ بھرے انداز میں کہا۔

”شیور..... اور تم بھی۔“

ہمارے بیچ سیلر اربط موقوف ہوا تو ماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں مل کر ایک ریکورڈنگ ایجنسی کھول لو۔ تمہارا یہ کام خوب چلے گا۔“

”میرا یہ کام کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں لیکن میں اس ذکر کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے گہری نظر سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ابھمن زدہ لہجے میں مستفہر ہوئیں۔ ”تم کس ذکر کے شکر گزار ہو؟“

”ریکورڈنگ ایجنسی والے کام کے ذکر کا۔“

”میں سمجھی نہیں!“ ان کی ابھمن میں حیرت درآئی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس ذکر نے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جو نکمہ دی ہے۔“

وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیں۔ ”انہیں خوش دیکھ کر میں بھی مسرت سے کھل اٹھا ہوں۔“

”ماں! اتھوڑی دیر پہلے میں نے دو ضروری کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان میں سے ایک کام تو خود ہی ہو گیا

”مطلب یہ کہ اسلیم والا کام آسانی سے ہو جائے گا؟“ ماں نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔

”جی ماں۔ ایک سو ایک فیصد ہو جائے گا۔“ میں نے ہرے یقین کے ساتھ کہا۔ ”پھر آپ کا کس تو دیے بھی جیونڈ ہے۔ پاکستان میں آپ کے دشمنوں کی کئی نہیں۔ آپ کا شوہر اسی دشمن کی بیعت چڑھ گیا۔ دیکھ بڑی مہارت سے آپ کا کس تیار کر کے فائل کرے گا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سارے مراحل طے ہوتے چلے جائیں گے۔“

”گڈ!“ ماں کے چہرے پر خوشی جھلنے لگی۔ ”کیا اسلیم فائل ہو جانے کے بعد میری امریکا میں موجودگی قانونی حیثیت اختیار کر جائے گی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی، بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے بتایا۔

”یہ کام ہو جائے گا مگر مرحلہ وار اور اس میں اچھا فاصلہ وقت لگے گا۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب عظیم تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو.....“

”برو! کیا پوچھتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ میں نے جواب دیا۔

”ماں میری بات ماننے کے لیے راضی ہوئی ہیں۔ اب تم صبح اس سلسلے میں پایا ہے۔“

”میں جلد از جلد ماں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہو جائے گا یار، یقین نہ لو۔“ وہ بڑی اپناہت سے بولا۔ ”تم پاکستان کے جس شہر میں کہو گے تمہاری والدہ جس شہر میں رہنا پسند کریں، ہم ان کی یہ حفاظت رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔“

”تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں..... بولو۔“

”میں ماں کو امریکا کا وزٹ ویزا ایلائی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے عظیم کو بتایا۔ ”اس سلسلے میں ان کا آن لائن لارم تم ہی بھرتا ہے۔“

”فکر نہ کرو بردو..... میں یہ کام کروں گا، انشاء اللہ!“

”اس نے کہا پھر پوچھا۔ ”برو! یہ کینیڈا کا کیا حساب ہے؟“

عظیم نے اچانک امریکا سے کینیڈا میں چھلانگ لادی جسی لہذا میں نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں، تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟“

یعنی مجھے عظیم سے بات کرنا تھی اور اس کی کال آگئی۔ اب دوسرا کام یہ ہے کہ مجھے انکل علی سلطان سے بات کرنا ہے تاکہ آپ کے ویزا کے حصول کے لیے ضروری ڈاکیومنٹس منگوا سکوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ کام بھی کر ہی ڈالو۔“

میں نے اپنے سیل فون سے انکل سلطان کا نمبر ملایا۔ اس وقت کراچی میں اتوار آتیس جون صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ ٹیکس اس کراچی سے تیرہ ہزار سات سو کلومیٹر مغرب میں واقع ہے اور دونوں مقامات کے معیاری وقت میں پورے دس گھنٹے کا فاصلہ ہے یعنی ٹیکس اس کا وقت کراچی کے مقابلے میں دس گھنٹے پیچھے ہے لہذا اس وقت بے سنی (ٹیکس اس) میں ہفتہ اٹھائیس جون شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔

دوسری جانب کھنٹی جاری تھی لیکن میری کال ریسپو نہیں کی گئی۔ میں نے دو تین مرتبہ ٹرائی کیا پھر سیل فون کو ایک طرف رکھ دیا۔ ماں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”انکل فون انڈینڈ نہیں کر رہے۔“ میں نے بتایا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔“ وہ عام سے لہجے میں بولیں۔ ”کل بات کر لیتا ان سے، ابھی تمہیں فوری طور پر سوجانا چاہیے۔ تمہاری آنکھوں میں بے پناہ نیند بھری ہوئی ہے۔ ایک طویل اور بھرپور نیند لے لو گے تو ہشاش بشاش ہو جاؤ گے۔“

ماں کا مشورہ انتہائی معقول اور موقع محل کے عین مطابق تھا۔ میں نے ان کے مشورے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ ان لمحات میں، میں خود بھی نیند کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

ماں نے مجھے اپنے بیڈ روم کے برابر والے بیڈ روم میں پہنچادیا اور کہا۔ ”یہاں آرام سے تم اپنی نیند پوری کر سکتے ہو۔ جب تک خود آکھ نہ کھلے، اٹھنے کی کوشش نہیں کرنا۔“

”جی ماں۔“ میں نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“

کچھ تو وہ بیڈ نہایت ہی دبیز اور آرام دہ تھا اور کچھ میں بھی کافی دیر کا جاگنا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد ماں سے ہونے والی ملاقات نے میرے دل و دماغ کو پرسکون کر دیا تھا لہذا میں بستر پر گرتے ہی نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ آج سونے سے پہلے مجھے اپنے دماغ کو مخصوص

ہدایات دینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ یہ میری ہمیشہ عادت رہی تھی کہ میں سونے سے قبل آٹو سیشن (خود تہنیتی) کے ذریعے اپنے دماغ کو ایک خاص وقت تک سونے کی ہدایت کیا کرتا تھا اور یہ بھی کہ اس مقررہ وقت بیداری سے پہلے اگر میری جائے آرام پر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گی تو فوج ہو یا کسی حوالے سے میری جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو وقت مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ کھل جائے۔ لیکن آج اس اقدامات اور تحفظات کی ضرورت نہیں تھی۔

اس وقت میں اپنی ماں کے سامنے میں سو رہا تھا۔ کسی بھی بچے کے لیے اس کی ماں کا سایہ سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے اور اس کے لیے بچے کی عمر بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بچہ ایک ماہ کا بھی ہو سکتا ہے، ایک سال کا بھی اور بیس سال کا بھی۔ مالک ہر بچے پر اس کی ماں کا سایہ سلامت رکھے!.....

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو دو پہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے ایک طویل، بھرپور انگڑائی لے کر بستر چھوڑ دیا اور فریش اپ ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ایک دم تروتازہ ہو چکا تھا۔

علی الصباح سونے سے پہلے میں نے اپنے سیل فون کو سائیلنٹ موڈ پر سیٹ کر دیا تھا لہذا اس دوران میں میرے سیل فون پر جو بھی کالز اور ٹیکسٹ میسج آئے ہوں گے، ان کی جھجھکیں نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے چیک کرنے کے لیے سیل فون اٹھالیا۔

عظیم کی تین کالز اور ایک ٹیکسٹ میسج لگا ہوا تھا اور ان رابطوں کا وقت ایک بجے کے اریب قریب کا تھا۔ گویا لگ بھگ ایک گھنٹہ پہلے اس نے مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ٹیکسٹ میسج کھول کر پڑھا۔ عظیم نے لکھا تھا۔ ”برو! لگتا ہے، خوب جی بھر کر سو رہے ہو اسی لیے میری کال انڈینڈ نہیں کر رہے۔ اپنی ہاؤ، جب بھی آنکھ کھلے، مجھ سے رابطہ کرنا۔“

میں نے عظیم کو کال کی۔ تیسری کھنٹی پر اس نے فون انڈینڈ کر لیا اور میری ”ہیلو“ کے جواب میں اس نے کہا۔

”ہاں بھائی! نیند پوری ہو گئی؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سب سے پہلے تمہیں کال کر رہا ہوں۔“

”گھڑا! وہ سراسر اپنے والے انداز میں بولا۔ ”برو! پاپا سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صورت حال سے

عجاری کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس



انسان اور دیوتا 450/-

پہلی سامراج کے مہم جوئی کی مدد میں پانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہِ گمراہی اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیوارِ حرم تک - 300/-

تاریخی بینٹن پرنٹس گیلری کے مالک ایچ بی فرسٹ سجاد

آخری چٹان 450/-

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ حیات جو تاریخوں کے سبیلِ رواں کے لیے ایک چٹانِ ثابت ہوا

سوسال بعد 225/-

گاندھی کی ان مہا تہذیب، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولی تصویر

سفید جزیرہ 325/-

بحرالکابل کے کسی ماحظوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-

انڈس میں مسلمانوں کے تعیب خروزی کہانی

معظم علی 475/-

لار کا بیگ کی اسلام دشمنی، جہنم کی کھال کی آزادی و حیات کے ایک شاہکار معرکہ علی داستانِ حیات

خاک اور خون 550/-

سکس، خوجی انسانیت، قیامت خیز ماسٹر، تعظیم برصغیر کے شہرِ حرم داستانِ خوجا

کلیسا اور آگ 450/-

فروری جی کی عمارتی، مسلمان سپہ سالاروں کی تعداد، سقوطِ فرات اور دانش میں مسلمانوں کی گھٹ کی داستان

قافلہ حجاز 599/-

راہِ حق کے سفرِ فرد کی ایک پیدل داستان

محمد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ بیری تاریخی داستان، جس کے سبب اور حکمتِ ملی نے مسلمانوں پر کھینچ ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-

1965ء کی جنگ کے بہن پرنٹس میں خوں اور برصغیر کے سامراجی مزاحم کی گھٹ کی داستان، جینوں پر کھڑا پڑی

اور تو کارٹوٹ کئی 550/-

شیرِ مسور (نچھ سلطان شہید) کی داستانِ حیات، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہل اور احمقہ اور اہلِ ایمان کے مزاحم داستان کی یاد تازہ کر دی

گشہ قافلہ 500/-

اگر بڑی اسلام دشمنی، جینے کی مہدی اور کادی اور مسکوں کی مصمم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی راہِ خیمہ کی داستان

داستانِ مجاہد 300/-

غوجیل کے پوراج واپس دہرائے نا جوں مہاراجوں کی مد سے دوسو تہذیبوں کے ساتھ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی فوج، جہلی، ماسٹر، سندھ کی حرکتِ کارا داستان

پروسی و درخت 450/-

اسلام دشمنی، پرتی، عدالت اور مسکوں کے خروزی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام ممکنات مدد کو پال کر کے سے بھی کر پڑے تھیں

یوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلم و صغیر کی تاریک راتوں میں امید کی تھیں بلکہ نہالے کے ہاتھ پائی کی داستان

الہی معرکہ 550/-

جس نے مسلمانوں کی ہاری آئی تھی وہ مسلمانوں کے قدموں میں گر پڑے اور کھانہ کھانے کے سبب کیلئے تھیں۔ سلطان کا جاکوٹا اور اس نے جواب دیا میں بہت خوش

نومہری رات کے مسافر 475/-

پہلی مسلمانوں کی آخری لکھت، فرات کی جانی مسلمانوں کے عورتوں اور جوانوں کی دلت

لکھت کی تلاش 300/-

پہلی لکھت، پورے کے مالوں کیلئے خیر، پہلی لکھت کی اعلیٰ و دروہائی، قدس و طہیوں

لکھت کی تلاش 300/-

پہلی لکھت کی اعلیٰ و دروہائی، قدس و طہیوں

لکھت کی تلاش 300/-

پہلی لکھت کی اعلیٰ و دروہائی، قدس و طہیوں

لکھت کی تلاش 300/-

پہلی لکھت کی اعلیٰ و دروہائی، قدس و طہیوں

سبق آموز کتب سلسلہ دورنگی طباعت اور تصویریری خاکوں سے مزین



165/- اقوال حضرت علی الرضی

165/- اقوال آئمہ کرام

195/- حکایات گلستانِ سعدی

140/- اقوال شمسِ سعدی

180/- حکایاتِ رومی

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایاتِ بوستانِ سعدی

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

180/- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات



اردولفت (جامع ترین)

پہلی لکھت کی اعلیٰ و دروہائی، قدس و طہیوں

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو

آگاہ کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب انتظام ہو جائے گا۔“
 ”ٹھیکس گاڈ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔“
 ”پاپا نے تمہیں آج افطار کے بعد گھر پر بلایا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”وہ تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”بالکل..... کیوں نہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”تم آٹھ اور نو بجے کے بیچ ریڈی رہنا۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں لینے آؤں گا۔“
 ”اوکے برادر! میں تمہیں تیار ملوں گا۔“ میں نے جواباً کہا۔
 ہم نے ایک دوسرے کو ”اللہ حافظ“ کہہ کر سیلوں پر رابطہ موقوف کر دیا۔

اس وقت مجھے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں بیڈ روم سے باہر نکل آیا تاکہ دیکھ سکوں، ماں کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ آج میں روزہ نہیں رکھ سکا تھا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

چمکی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی نماز روزے کا پابند انسان نہیں تھا۔ بس، جب بھی دل کا بوجھ حد سے تجاوز کر جاتا تو میں مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اس کے سامنے چند منٹ کے لیے سجدہ ریز ہونے سے من کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور گزشتہ روز میں نے جو روزہ رکھا تھا وہ ایک خاص نوعیت کی منت کا حامل تھا۔ میری یہ منت ماں سے ملاقات کی صورت میں پوری ہوئی تھی۔

ماں مجھے بچن میں مل گئیں۔ وہ کوئنگ میں مصروف تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بے حد شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”آئیامیرا شہزادہ.....!“

”جی ماں۔“ میں نے بچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نے گھر میں کچن سنبھالنے کے لیے کوئی میڈ نہیں رکھی؟“

”میرے پاس ایک نہایت ہی تجربہ کار باورچی ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”لیکن وہ سٹڈے کو چھٹی کرتا ہے تاہم بیٹے کی شام کو وہ مختلف قسم کے کھانے پکا کر رکھ جاتا ہے تاکہ سٹڈے کو مجھے کوئی دشواری نہ ہو۔ اس وقت بھی گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ میں تو بس کھانے کو لائن اپ

کر رہی ہوں.....“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوئیں پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

”میں کافی دیر سے اٹھی ہوئی ہوں۔ جب تم بیدار ہوئے تو مجھے پتا چل گیا تھا اس لیے تمہاری خاطر تواضع کے بندوبست میں مصروف ہو گئی۔“

”یہ تو آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”اس وقت مجھے شدید نوعیت کی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

”میں صدقے جاؤں میرے لعل.....!“ وہ مامتا بھرے لہجے میں بولیں۔ ”تم ڈانٹنگ روم میں جا کر بیٹھو۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔“

”اس کام میں، میں بھی آپ کی مدد کروں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک جوان بیٹے کی موجودگی میں سارا کام اکیلی ماں ہی کیوں کرے گی؟“

”اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔“ وہ وارفتگی کے عالم میں بولیں۔ ”اور تمہاری عمر دراز کرے.....!“

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ماں بیٹا ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ کھانے کے دوران میں ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ماں نے کہا۔ ”علی! تم نے میرے ذمے جو دو کام لگائے تھے، وہ آج ممکن نہیں ہیں کیونکہ آج سٹڈے ہے لہذا وہ کام کل ہی پایہ تکمیل تک پہنچ پائیں گے۔“

میں نے ماں سے یہ سوال نہیں کیا کہ..... کون سے دو کام؟ کیونکہ مذکورہ دونوں کام میرے ذہن میں تازہ تھے۔ میں نے ماں سے کہا تھا کہ انہیں پچھلے چھ ماہ کی پیکنگ اسٹٹ منٹ حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کئی نوٹری پیکنگ سے بچنے، گاڑی اور جیولری کی ملکیت اور مالیت کا ایلی ڈیوٹ جونا ہے۔ یہ دونوں کام یقیناً آج نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے فرماں برداری سے کہا۔

”کوئی بات نہیں ماں۔ آپ یہ کام سٹڈے کو کر لیجے گا۔“ پھر میں نے انہیں عظیم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے پوچھا۔ ”تم شام کو عظیم کے ساتھ جاؤ گے تو کیا رات کو وہیں روکے یا واپس آؤ گے؟“

”اس بارے میں، میں نے ابھی تک سوچا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس بات کا فیصلہ وہاں کی سچویشن کو دیکھنے کے بعد کروں گا۔ ویسے میری خواہش تو یہی ہے کہ واپس آپ کے پاس آؤں۔“

”میری بچی کبھی ممتا ہے۔“ وہ غمبھرے ہوئے لہجے

لہا بولیں۔

نے بتایا۔ ”میرے ایک دشمن نے اسے اغوا کر لیا تھا۔“
 ”کون تھی وہ؟“ انہوں نے اضطرابی لہجے میں
 سوال کیا۔ ”اس کا نام کیا تھا؟“
 ”شارو.....!“ میں نے جذبات سے مطلوب آواز
 میں جواب دیا۔

”شارو!“ ماں نے دہرایا۔ ”بہت ہی خوب صورت
 نام ہے۔“

”شارو ہسپانوی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی
 ہیں، خوب صورت پھول۔“ میں نے وضاحت کرتے
 ہوئے بتایا۔ ”شارو اپنے نام کی طرح انتہائی دل کش اور
 حسین و جمیل تھی۔ اس کا تعلق برازیل کے شہر ریو ڈی جیرو
 سے تھا۔ وہ گنار بھانے کی ماہر تھی۔“

”میرے بچے! تمہاری ٹریڈر میں “تھی“ کا بہت
 عمل دخل نظر آتا ہے۔“ ماں نے تعویذ کا اظہار کرتے
 ہوئے کہا۔ ”کہیں خدا خواستہ.....“

”نہیں!“ میں نے ماں کی بات پوری ہونے سے
 پہلے ہی وحشت بھرے لہجے میں کہا۔ ”شارو زندہ ہے مگر
 ایک دشمن نے شارو کو مجھ سے دور کر دیا ہے..... بہت
 دور.....“

”مجھے اپنے اس دشمن کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ
 کسمپور انداز میں بولیں۔ ”میں شارو کے اغوا کا قصہ بھی سننا
 چاہتی ہوں۔“

جواب میں، میں نے ماں کو شارو سے اپنی دوستی،
 لیونارڈو سے اپنی دشمنی اور شارو کے اغوا کی تفصیلی روداد
 سنادی۔ پوری بات سننے کے بعد ماں نے کہا۔
 ”چھوٹی سی عمر میں تم نے کسی خطرناک دشمنی پال لی
 ہے میرے لعل!“

”ماں! میں نے کہیں کسی سیانے کا ایک قول پڑھا
 تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ کے آس
 پاس کوئی آپ کی بات کی مخالفت کرنے والا نہ ہو یعنی کوئی
 ایک بھی آپ کا دشمن نہ ہو تو سمجھ لیں کہ آپ کوئی اچھے انسان
 نہیں ہیں۔ جس شخص سے ہر کوئی خوش ہو، اس کے منافق
 ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لعل!“ ماں نے تصدیقی
 انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ہمارے درمیان تھوڑی
 دیر تک شارو پر بات ہوتی رہی پھر موضوع گفتگو اگلے علی
 سلطان کی طرف مڑ گیا۔ ماں اس محسن و مہربانی شخص کے
 بارے میں زیادہ سے زیادہ جانا چاہتی تھی جو میری پرورش

”جب ہم دونوں کی آرزو ایک جیسی ہے تو پھر وہی
 جیسا ہم چاہتے ہیں۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔
 ”ہر قیمت پر واپس آپ کے پاس آؤں گا۔“
 ”ان شاء اللہ.....!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔

ہم کھانے سے ششپے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے
 اور ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ ماں
 میری تعلیم، تربیت اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں مختلف
 اہمیت کے سوال کرنے لگیں۔ جواب میں، میں مختصر مگر جامع
 انداز میں انہیں اپنی زندگی کے اہم واقعات سے آگاہ
 کرتے لگا۔ وہ گہری دلچسپی اور توجہ سے میری بات سن رہی
 تھیں۔ جب میں سب کچھ بیان کر چکا تو انہوں نے کہا۔

”امریکا میں معاشرتی ماحول بہت آزاد ہے۔
 تمہاری تو بہت سی گرل فرینڈز تھیں ہوں گی.....؟“
 ماں کے اس سوال پر میں بے ساختہ مسکرا اٹھا اور کہا۔
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے ماں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ چھپڑنے والے انداز
 میں بولیں۔

”ان کاموں کی کبھی مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔“ میں
 لے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”تم کہیں..... مجھ سے کچھ..... چھپانے کی کوشش تو
 لیں کر رہے۔“ وہ شک زدہ نظر سے مجھے ٹٹولتے ہوئے
 لگیں۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میں رشتے میں تمہاری ماں ہوں لیکن
 تم مجھے ایک دوست سمجھ کر کچ بچ بتاؤ۔“

”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں اپنی ماں کو ضرور
 بتا دیتا۔“ میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”مطلب کوئی عشق کا قصہ نہیں، کوئی محبت کی کہانی نہیں؟“
 ”بہت سہولت سے کہنے کی ہم میں مصروف نظر آتی تھیں۔“

میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”اپنی زندگی میں
 ہمارے کچھ بھی نہیں ہے ماں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔“

”لڑکیوں سے دوستیاں تو ہوں گی.....؟“
 ”لڑکیوں نہیں، لڑکی!“ میں نے کہا۔ ”ایک لڑکی

ہے میری بڑی گہری دوستی تھی۔“

بات کے اختتام پر میرے لہجے میں اداسی در آئی۔
 اں نے میرے چہرے کے تاثرات کو بھانپ لیا اور

لہجے سے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔
 ”دوستی تھی..... کا کیا مطلب ہے لعل؟“

”وہ لڑکی اب مجھ سے بہت دور جا چکی ہے۔“ میں

گئی۔ انہوں نے نگینہ کے ریمارکس پر کوئی تبصرہ کرنے کا بجائے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”اور سناؤ، کام کیسا چل رہا ہے؟“

”میڈم! آپ کو تو پتا ہی ہے، رمضان کے مہینے میں کام آدھا بھی نہیں رہ جاتا۔“ وہ آرزو لہجے میں بولی۔

”بس دال دلیا چل رہا ہے۔ آپ سنا لیں؟“

”بس ہم بھی بیٹھے ہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔“ ماں نے کہا۔

”میڈم! مجھے معلوم ہے، آپ کے ہاں تو پھر رمضان آف ہوتا ہے۔“ وہ آنکھوں کو عجیب سے انداز میں

حرکت دیتے ہوئے بولی پھر میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ نے مجھے اپنے ان عزیز کی کس

خدمت کے سلسلے میں بلایا ہے؟“

”ارے نہیں۔“ ماں نے جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ان کی خدمت کے لیے تو میں اکیلی ہی کالی

ہوں۔ تمہیں میں نے ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔“

”آپ حکم کریں میڈم!“ وہ ہمتن گوش ہو گئی۔

آگنی نگینہ اور ماں کے درمیان ہونے والی مکالمہ اگرچہ مجھے اچھا خاصا ڈسٹرب کر رہی تھی لیکن ماں کا حکم تو

اس لیے میں وہاں بیٹھنے پر مجبور تھا۔ اگر ماں نے مجھے تاکہ نہ کی ہوتی تو میں کب کا اٹھ کر جا چکا ہوتا۔ ماں نے آگنی نگینہ

کی بات کے جواب میں کہا۔

”میں رمضان کے آخری عشرے میں عمرے کا جاری ہوں اور دو اپنی عید کے بعد ہی ہوں۔“

”مبارک ہو میڈم۔“ وہ خوشی سے دیدے پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے۔“

”اس عمرے کے تمام تر انتظامات رقیق صاحب لے کے ہیں۔“ ماں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”عمرے کے علاوہ..... تمام ایام میں جدہ میں انہی کے پاس قیام کروں گی۔“

ماں نے نگینہ سے میرا تعارف ”رفیق“ نامی شخص کی حیثیت سے کرایا تو میں نے ماں کی تعذیق میں سرکواٹھال

جینش دی۔

”ویسے تو میرا عید کے فوراً بعد دو اپنی کا ارادہ ہے لگن دیر بھی ہو سکتی ہے۔“ ماں نے اپنے مقصد کی طرف آگے

ہوئے کہا۔ ”تمہیں میں نے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اس دوران میں میری بچیاں تمہارے ہاتھ کے نیچے رہیں گی۔

ان کے تمام معاملات کو تم خود کنٹرول کرو گی۔ ویسے تو سارا سیٹ اپ بنا ہوا ہے لیکن تمہیں پتا ہے، کسی تجربہ کار کی کوئی

اور تعلیم و تربیت میں کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ میں نے ماں کو انکل علی سلطان، ان کی بیوی ریٹا میگڈالین اور ان کی بیٹی لٹنی کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔

ہمارے مابین گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ نگینہ نامی ایک عورت ماں سے ملنے آگئی۔ جسید نے اس کے آنے کے بارے میں ماں کو بتایا تھا۔ میں نے مذکورہ عورت کی آمد کا سنا تو وہاں سے اٹھ کر بیڈروم کی طرف جانے لگا تاکہ

ماں آرام سے تنہا ہی میں نگینہ سے بات کر سکے۔

ماں نے مجھے روک لیا اور کہا۔ ”علی! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں نے نگینہ سے چند ضروری باتیں کرنے کے لیے اسے

یہاں بلایا ہے اور یہ تمام گفتگو میں تمہاری موجودگی میں کرنا چاہتی ہوں۔“

میں دوبارہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے نگینہ آگئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ماں اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑی نہیں ہوئیں بلکہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دوستانہ انداز میں کہا۔

”آؤ نگینہ..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی..... آؤ، بیٹھو۔“

”میڈم! آپ بلائیں اور میں نہ آؤں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”دیکھ لیں، میں حاضر ہو گئی ہوں۔“

ڈرائنگ روم کی نشست سنبھالنے سے پہلے نگینہ آگئی نے ایک خاص انداز میں مجھے سلام بھی کیا تھا۔ اس عورت کے انداز و اطوار نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی مگر اس نے خود کو بچپن کیس کا دکھائی دینے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں، وہ عورت مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔

نگینہ نے ماں سے میرے بارے میں استفسار کیا۔

”میڈم! آپ نے اس نوجوان کا تعارف نہیں کرایا۔ کیا یہ آپ کے مہمان ہیں؟“

”ہاں..... ایسا ہی سمجھ لو۔“ ماں نے گول مول جواب دیا۔ ”یہ میرے ایک عزیز ہیں۔ ادھر جدہ میں ہوتے ہیں۔“

”ماشاء اللہ!“ وہ تو مصیبت نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”اللہ کے گھر کے قریب سے آئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی انہیں دیکھ کر۔ اللہ انہیں بری نظر سے بچائے۔ بہت بینڈم اور اسارٹ ہیں۔“

آگنی نگینہ نے آخری جملہ بڑے متنی خیر انداز میں ادا کیا تھا۔ ماں کے ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ پھیل

گرائی بھی چاہیے ہوتی ہے۔ تمہارے سوا مجھے اور کوئی قابل
مہر و سافر نہیں آ رہا۔“

”میڈم! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے جو آپ مجھ پر
اس قدر اعتماد کر رہی ہیں۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں
بولی۔ ”آپ ایک ماہ کے بعد واپس آئیں یا ایک سال تک
وہاں قیام کریں، ان شاء اللہ۔۔۔۔۔ میں آپ کو شکایت کا
موقع نہیں دوں گی۔ ویسے تو آپ کا سسٹم ہی اتنا آرگنائز
ہے کہ نہ تو مجھے کوئی دشواری ہوئی اور نہ ہی آپ کی پانچ
بچیوں کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”میں شلا، آرزو، روہی، مینا اور عرش کو بھی اچھی
طرح سمجھا دوں گی۔“ ماں نے بڑی رساں سے کہا۔ ”اور
جانے سے پہلے تم لوگوں کی رو برو ملاقات بھی کروادوں گی۔“
”ٹھیک ہے میڈم! آپ بے فکر ہو کر میرے پر
جائیں۔“ آنتی گلینڈ پُر اعتماد لہجے میں بولی۔ ”میں سب
منجبال لوں گی۔“

گلینڈ مزید چند منٹ وہاں بیٹھی پھر رخصت ہو گئی۔
اس کے جانے کے بعد میں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے
قدرے کھٹی آ میز لہجے میں پوچھا۔

”یہ سب کیا تھاں؟۔۔۔۔۔؟“
”ایک تلخ حقیقت۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولیں۔
”ایک کڑوی چٹائی۔“

”لیکن کیا یہ سب میرے سامنے کرنا ضروری تھا؟“
میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے ضروری سمجھا اس لیے کیا۔“ وہ ایک
ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ”تم سے ملنے کے بعد
میں نے اس لائن کو ترک کر دیا ہے۔ اس لائن پر رہتے
ہوئے اگر میں تمہارے سامنے اس قسم کی میٹنگ کرتی تو پھر
یہ تمہارے لیے تکلیف کا باعث اور میرے لیے وجہ
عمامت ہوتا۔ میں اندر سے تبدیل ہو گئی ہوں مگر میرے
سامنے مشکل لوگ تو تبدیل نہیں ہوئے۔ میں ان پانچ بچیوں
کی سرپرست ہوں۔ مجھے اپنی راہ پکڑنے سے پہلے ان کا
کوئی نہ کوئی بندوبست تو لازمی کرنا ہے نا۔۔۔۔۔۔“ کھاتی توقف
کر کے انہوں نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر فلسفیانہ
انداز میں کہا۔

”کوئی مسافر بس روڈ پر چلتے چلتے جب اچانک
غراب ہو جاتی ہے تو بس کا ڈرائیور ان پانچ بچوں کو بے یار و
مددگار نہیں چھوڑتا۔ اخلاقی تقاضے نبھاتے ہوئے وہ پیچھے
سے آنے والی بس کو روکتا ہے اور اپنے مسافروں کو اس بس

پر سوار کراتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہی ہوں میرے بچے۔
تم اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔ سچائی کا سامنا کرنے سے
انسان کی ہنگ نہیں ہوتی بلکہ ایسے تجربات اسے باہر سے
توانا اور اندر سے مضبوط کرتے ہیں۔ کیا سمجھے!“
”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ماں۔“ میں
نے اعتراض حقیقت کرتے ہوئے کہا۔ ”واقعی، جب آپ
نے اس گھناؤنی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے تو پھر ان چھوٹی مٹی
چیزوں کو دھسکس کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایک
بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔۔۔!“

”کون سی بات؟“ انہوں نے پوچھا۔
”آپ نے اپنی بچیوں کا ذکر کرتے ہوئے پانچ
فیملو روہی، شلا، آرزو، مینا اور عرش کے نام گوائے تھے مگر
اس پتکے میں مجھے ان میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دی۔ کیا
وہ لوگ کہیں گئی ہوئی ہیں؟“

”اس پتکے میں صرف میں رہتی ہوں۔“ انہوں نے
جواب دیا۔ ”وہ پانچوں بچیاں یہاں قریب ہی ایک
دوسرے پتکے میں رہتی ہیں جہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے
اپنے اپنے شعبے کے ماہرین موجود ہیں جو ان کے کھانے
پینے، سونے جانے کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انہیں کب
مساج کرانا ہے، کب اسٹیم باٹھ لینا ہے، کس وقت کون سی
ایکسرساز کرنا ہے، ان تمام امور کا باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل بنا
ہوا ہے۔ اس پتکے پر ان کے لیے ایک مربوط نظام بنا ہوا
ہے تاکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور وہ فٹنس فری لائف
کو نبھائے کر سکیں۔“

یہ سب بتاتے ہوئے ماں کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی
تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد
ہر قسم کے سو دو زیاں سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کاش! ان
پانچ بچیوں کے دل و دماغ میں بھی کوئی انقلاب برپا
ہو جائے۔ وہ بھی برائی کی راہ کو ترک کر کے سیدھے
راستے پر آ جائیں۔۔۔۔۔!“

”میرے بچے! ایسا سوچنا اور کسی بگڑے ہوئے
انسان کے لیے اس نوعیت کی دعا کرنا یقیناً ایک الجھا حمل
ہے۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔ ”لیکن نیکی کی راہ
اختیار کرنے کے لیے انسان کو از خود کوشش کرنا پڑتی ہے،
ایک کڑے فیصلے پر پہنچنے کے بعد سنگین حالات کا مقابلہ
کرنے کے لیے مندر و موطا فلوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے
رہنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے

چند لمحات کی خاموشی اختیار کرنے کے بعد بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں اضافہ کیا۔

”علی! میرے بچکر..... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ پانچوں بچیاں کیسی شانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی ”ڈیوٹی“ بیرون ملک ہوتی ہے۔ وہ ہفتے میں صرف دو مرتبہ باہر جاتی ہیں اور وہاں ایک رات گزارنے کے بعد اگلی صبح واپس آ جاتی ہیں۔ باقی پانچ دن عیش و آرام کرتی ہیں۔ وہ اس لکڑی لائف کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”میں تو ایک بات جانتا ہوں ماں.....“ میں نے سمجھ کر انداز میں کہا۔ ”جب تک مالک کی طرف سے توفیق نہ ہو، انسان نیکی اور بھلائی کی طرف آ ہی نہیں سکتا۔ جب مالک کو منظور ہوگا تو ان بچپوں کے دل میں بھی کوئی صالح خیال ڈال دے گا پھر خود بہ خود ان کی دنیا بدل جائے گی۔“

”میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔ ”اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ انہیں نیک ہدایت دے۔“

”آمین.....!“ میں نے صدقہ دل سے کہا۔

”کل میں تمہیں ایک آدمی سے ملواؤں گی۔“ ماں نے غصے سے بولے۔ ”اس کا نام نادر شاہ ہے۔ یہ شخص میرا سچا خیر خواہ ہے۔ نادر شاہ نے نئی نازک مواقع پر میری بے لوث مدد کی ہے۔ اس سے مل کر تمہیں بہت خوشی محسوس ہوگی۔“

”ٹھیک ہے ماں! میں نادر شاہ سے ضرور ملاقات کروں گا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر درست و اوج پر نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کیا۔ ”میرا خیال ہے انکل سلطان بیدار ہو چکے ہوں گے۔ مجھے ان سے بات کرنا چاہیے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ ماں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ بے سٹی (یکس) میں یہ صبح سات بجے کا وقت تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے انکل سلطان کا نمبر ملا یا۔

دوسری جانب کھنٹی بجنے لگی پھر یہ کھنٹی جتن چلی گئی مگر انکل نے کال انیڈ نہیں کی۔ آج صبح سونے سے پہلے بھی میں نے انہیں فون کیا تھا لیکن انہوں نے میری کال پک نہیں کی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں انکل سلطان کو

فون کروں اور وہ میرا فون نہ اٹھائیں۔

ان دنوں انکل کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے لیے فکر مند ہو گیا۔ میرے چہرے سے جھٹکے والی تشویش کو ماں نے نوٹ کر لیا۔

”کیا ہوا علی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”انکل فون انیڈ نہیں کر رہے۔“ میں نے پریٹل کے عالم میں کہا۔ ”مالک خیر کرے.....!“

”اللہ خیر کرے گا میرے لعل۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔ ”تم ایک کام کرو۔“

میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کون سا کام؟“

”تم نیو یارک میں مرزا عامریگ کو فون کرو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”ابھی صورت حال واضح ہو جائے گی۔“

ماں کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اگلے ہی لمحے میں لے عامریگ کو فون لگا دیا۔ عامر انکل بروکلین (نیو یارک) میں رہتے تھے۔ میں پاکستان آنے سے پہلے ان سے ایک ملاقات کر چکا تھا۔ میرا پاکستان آ کر اپنی ماں کی خیر خبر لینا بھی انہی کا آئیڈیا تھا۔

دوسری جانب کال ریسیو کر لی گئی پھر ایک مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”ہیلو! بیٹا جی، کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں بیگ صاحب۔“ میں نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”لیکن انکل سلطان کل سے میرا فون انیڈ نہیں کر رہے۔ میں ان کے لیے بہت فکر مند ہوں۔“

”اوہ.....“ انہوں نے ایک پوچھ سانس خارج کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔ ”کیا تم علی سلطان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؟“

”نہیں.....“ میں نے لکت زدہ انداز میں کہا پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا ہوا..... انہیں؟“

”علی سلطان کی ڈیوٹی سمجھ ہو گئی ہے.....!“ بیگ صاحب نے میری سماعت میں دھماکا کیا۔

میں سنائے میں آ گیا۔

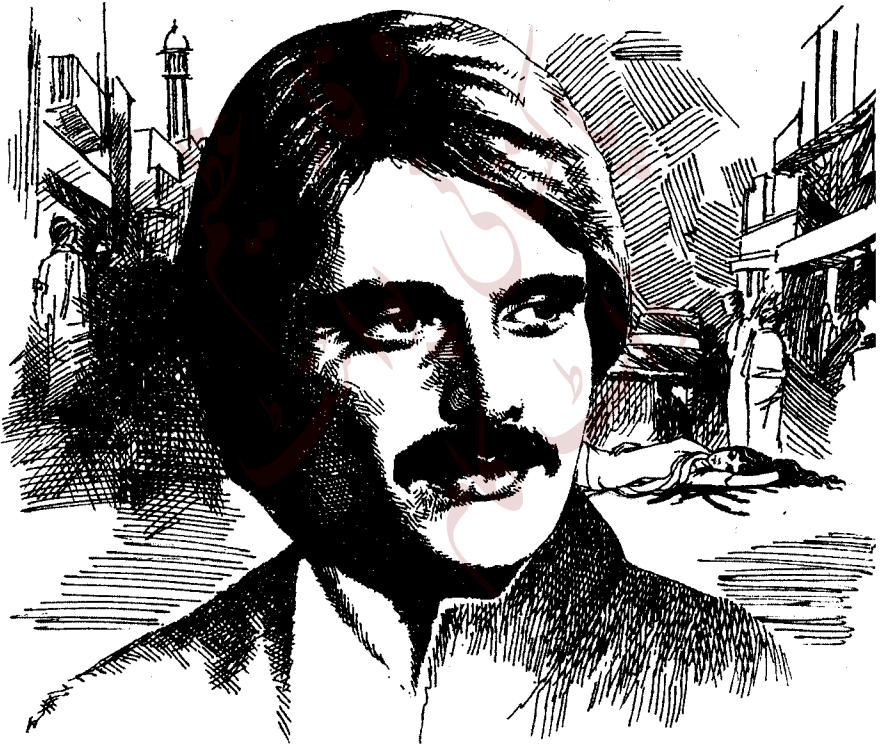
امیدگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاں۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھم گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

زندگی اداس ہے

ڈاکٹر شیر شاہ سید

محبت کی کسک میں جینے والے جانتے ہیں کہ کس اذیت میں وقت گزارتے ہیں... ایسا عشق جس میں محبوب کی ہنسی میں جلتی رنگ بجھ لگیں اور آنسو دل میں درد کی لہر پیدا کر دیں جبکہ... اس پر محبوب زندگی سے دور بھی ہو جائے تو اس میں تعجب نہیں کہ ہر جانب لہو برستا دکھائی دے... اس کی زندگی میں پھیلی اداسی بھی بے سبب نہیں تھی۔

خلاقیت عمل سے گزرنے والی ایک ماں کے دل کا خون ناک ڈر



”یہ آوازیں میرے کان میں آتی ہیں رفیق، میں کیا کروں۔“ سیانے میرے ہاتھوں کو زور سے پکڑ کر دبا دبا اور آنسو بھری بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم کوٹھے کی پیداوار ہو۔“
 ”کوٹھے کی پیداوار ہو..... طوائف ہو، طوائف ہوں۔“
 ”گندی..... نیچہ.....“
 ”طوائف ہو، بازاری ہو۔“

جائیں گے، اس سے نہیں، ایسی ہی بھولی بھالی سی ہے وہ۔“
ای نے بڑے پیار سے کہا تھا۔

ای اور باجی کے ہاں کرنے کے بعد میرا نہ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بہت ہی شوق سے ہم دونوں کی شادی ہوگئی اور شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد جب ہم دونوں مری سے ہوتے ہوئے اور اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں اس کے ویزا کے لیے درخواست جمع کر کے واپس کراچی پہنچے تو میں نے ڈان اخبار میں اشتہار دیکھ کر ایک درخواست امریکن آئل کمپنی میں ڈال دی۔ اس کمپنی نے کراچی میں آفس کھولا تھا اور اندرون سندھ تیل کے لیے کھدائی کا کام شروع کیا تھا۔

ان لوگوں نے کراچی میں ہی مجھے اتنی زیادہ تنخواہ کی پیشکش کر دی کہ میں نے امریکا واپس جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ امی کی نظروں میں سیما کی قدر بڑھ گئی، ان کا خیال تھا کہ سیما نے مجھے قائل کیا ہے کہ میں کراچی چھوڑ کر نہ جاؤں ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو فوراً ہی امریکا روانہ ہو جاتی ہیں۔ جتنی جلدی سسرال کے کانتولی منڈوں سے نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔ شاید بات صحیح بھی تھی۔ بائبل کی اس پروفیسر میں امریکا جانے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی، اس نے مجھے بے پناہ چاہا اور میں بھی اسے بے انتہا پوجتا رہا تھا۔

چار سال تو بس دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے تھے، کبھی کراچی، کبھی ملائیشیا۔ کمپنی کے چکروں میں مجھ ان جگہوں پر جانا پڑتا اور سیما میرے ساتھ ہوتی۔ امریکا میں آٹھ سال گزار کر میں نے اتنی عیاشی نہیں کی جو مرے میں نے سیما کے ساتھ اٹھائے۔

امریکا میں تو پڑھائی تھی پھر کام اور مزید کام، اپنی حیثیت منوانے کے شوق میں کام ہی کام۔ جب میں نے ماسٹرز کر لیا تو پھر یہ لگن کہ بہت جلد اتنا کام کروں کہ کبھی بے روزگار ہونے کی نوبت نہ آئے اور ہوا بھی یہی۔ ماسٹرز کے بعد دو سال میں نے صرف کام کیا اور صرف ڈائریکٹرز کے جس کے نتیجے میں آئی ٹی کی مارکیٹ میں میری ساکھ بڑی اور جو شاید مجھے سلی کون ویلی میں ہی ملتی۔

شروع کے دو سال تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال بچوں کی ضرورت نہیں ہے اور بعد کے دو سال گزرنے کے بعد ہم نے سوچنا ہی شروع کیا تھا کہ کسی گائیکا کولو جسٹ کے پاس جائیں، حمل کے لیے کچھ علاج کرائیں کہ وہ حاملہ ہوگئی۔ ہم دونوں کا دل مجموعہ مجموعہ اٹھا۔۔۔۔۔

اس کے نو مہینے کے ایک ایک دن کا حساب میرے

میں نے اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پیار سے سمجھایا کہ نہیں سیما سب بکواس ہے، بے کاری باتیں ہیں کچھ بھی نہیں ہے محض وہم ہے تمہارا۔۔۔۔۔ کوئی کیوں کہے گا ایسی باتیں۔۔۔۔۔ گندی باتیں، تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔

کاش یہ سب کچھ وہم ہوتا، محض وہم ہی ہوتا، ایک بڑا خواب ہوتا مگر یہ سب کچھ وہم نہیں تھا، بڑا خواب نہیں تھا، میری بے پروائی تھی، میری لامعلومی تھی اور میری جہالت تھی۔ ٹر میں کرتا بھی کیا۔ نہیں، میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔

میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ماہر تھا، کمپیوٹر کی دنیا میں میرا نام تھا۔ انٹرنیٹ پر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا۔ لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے مجھے تلاش کرتے تھے۔ میں ان کے کمپیوٹر کے ایسے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کر لیتا جو کوئی بھی نہیں حل کر سکتا تھا۔ میں کمپیوٹر کے مسائل دیکھتا رہا، میری سیما اپنے مسئلوں میں الجھتی رہی۔ میں کمپنیوں کے، لوگوں کے، کارپوریشن کے، ملٹی نیشنل کے ہارڈ ڈسک کے اندر محسوس کر انہیں سیدھا کرتا رہا، میری سیما کی روح اپنے جہنم میں جلتی رہی۔ میں بہت کچھ کر سکتا تھا، نہیں کر سکا۔ یہ کیا زندگی ہے، کیسا جیون ہے، میں کدھر آ گیا ہوں۔۔۔۔۔ کیا کر بیٹھا ہوں اپنے ساتھ۔۔۔۔۔ سیما کے ساتھ۔

وہ میری زندگی میں ایک خوشبو کی طرح آئی، پھر اس نے آہستہ آہستہ میرے چاروں طرف خوشبوؤں اور خوشیوں کی برسات کر دی۔ اس نے سب کچھ بدل دیا میرا۔ میں نیا نیا امریکا سے آئی ٹی میں ماسٹرز کر کے آیا تھا، سوچا تو نہیں تھا کہ پاکستان میں رہوں گا۔ خیال تھا کہ شادی کروں گا، کچھ مہینے خوب گھوموں گا، سوات، چترال، کونڈ، کشمیر۔ کافی جمع شدہ اثاثہ تھا میرے پاس، پھر اس دوران بیوی کے ویزا وغیرہ کا مسئلہ ہو جائے تو پھر دوبارہ امریکا چلا جاؤں گا۔ سلی کون ویلی میں میرے لیے نوکریوں کی کمی نہیں تھی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ امی کو سہا مل گئی، کراچی یونیورسٹی سے بائبل میں ماسٹرز کیا تھا اس نے اور عبداللہ کالج میں بی بی سی پبلیشر اپائنٹ ہوئی تھی۔ میری بھانجی بھی عبداللہ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے میری بہن کے سامنے میڈم سیما کی تعریفوں کے پل باندھ دیے، پھر باجی اور امی دونوں ہی عبداللہ کالج جا کر مل آئیں اس سے۔

میری تو کوئی خاص پسند نہیں تھی، میں نے بس اتنی سی فرمائش کی تھی کہ امی! جب اساتذہ چلے تو لوگ ڈرنے جائیں۔ ”جب تو ساتھ چلے گا اس کے، تو لوگ تجھ سے ڈر

پاس ہے۔ کب الٹیاں شروع ہوئیں..... کب سیما نے اپنے پیٹ میں بچے کی حرکت محسوس کی، سب کچھ ایک خواب کی طرح میرے دماغ میں محفوظ ہے۔

آج بھی اپنے کمرے میں آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوں تو آہستہ آہستہ سب کچھ دھیرے دھیرے ذہن کے پردے پر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سیما کے حمل کے ساتھ میں بھی گائنا کولو جسٹ بننا چاہتا تھا۔ کچھ مجھ میں آتا اور کچھ سمجھ سے باہر ہوتا، پھر سیما کی گائنا کولو جسٹ سے ہر طرح کے سوالات کرتا، جو جواب وہ دیتی اس سے زیادہ تو مجھے انٹرنیٹ سے پتا رہتا تھا لیکن پھر بھی نہ جانے ایک خواہش ہی ہوتی کہ یہ بھی پوچھ لوں وہ بھی پوچھ لوں..... اپنی ہی محبت بھی سیما سے مجھے۔ نوٹ کر چاہا تھا اسے اور اگر بس چلتا تو شاید کسی سیف میں احتیاط سے تالے میں بند کر کے رکھتا ہے۔

سولہویں مہینے کے آخر میں جب اس کا الٹرا ساؤنڈ ہوا تو ہمیں پتا لگ گیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ میری پیاری بیٹی۔ میں نے فوراً ہی کہہ دیا تھا کہ بانو نام ہوگا اس کا، مجھے پرانے نام پسند تھے۔ میری ایک خالہ جنہوں نے بچپن میں مجھے بہت پیار کیا تھا ان کا نام بھی بانو تھا۔ وہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے دوران جانے کیسے موت کا شکار ہوئی تھیں۔ ان کا پیار بھرا، مہربان چہرہ میرے ذہن کے کسی کونے میں آج بھی محفوظ تھا۔ سیما نے کہا تھا کہ نہیں یہ کنول ہوگی، ہماری کنول۔ بانو تو بہت پرانا نام ہے۔ ہم دونوں ہنس دیے تھے۔ اچھا تو تم اسے کنول کہنا، میں اسے بانو پکاروں گا۔ گھر میں وہ کنول ہوگی اسکول میں بانو۔ آخر وہ دو نام بھی تو ہوتے ہیں لوگوں کے۔ ہم دونوں پھر ہنس دیے اور پھر روز ہی ہنسنے رہے۔

ہمارے گھر میں ہر وقت ہی آنے والے مہمان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے پنگ پڑے بن رہے تھے، اس کے کمرے میں کھلونے جمع ہو رہے تھے۔ پروفیسر صاحبہ نے یہ بھی حساب لگایا کہ اسے کب کس نرسری میں جانا ہوگا، کس اسکول میں پڑھتا ہے، مجھ سے اور اس سے پوچھتے بغیر سیما نے اسے ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

”ہماری کنول ڈاکٹر بنے گی۔“ اس نے مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے بھائی ڈاکٹر کیوں، وکیل کیوں نہیں؟ اور کمپیوٹر انجینئر بننے میں کیا برائی ہے۔“ میں نے مذاق میں اس سے اختلاف کیا۔

”نہیں، میں نے کہہ دیا بس وہ ڈاکٹر بنے گی، صرف ڈاکٹر اور اچھی گائنا کولو جسٹ، جو مریضوں کے ہر سوال کا جواب دے گی، انہیں ٹالے گی نہیں، صرف پیسے نہیں کمائے گی بلکہ انسانیت بھی اس کے دل میں ہوگی۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”وہ تو شکیں ہے لیکن بانو سے بھی پوچھا ہے تم نے آخر وہ کیا بننا چاہتی ہے، شاید وہ ڈاکٹر بننے سے منع کر دے۔ شاید اسے خون وغیرہ اچھا ہی نہ لگے، ارے بابا، بانو سے پوچھ لو تو۔“ میں نے اسے چھیڑا تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ بانو نہیں کنول، اور دوسری بات یہ کہ بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا ڈاکٹر بننے میں۔ پوچھ بھی لیں گے وہ منع تو ہڈی کرے گی۔ آخر میری بیٹی ہے کیوں نہیں ماننے کی میری بات۔“ اس نے اور زیادہ سنجیدگی سے کہا تھا۔

”کنول نہیں بانو۔“ میں نے ہنس کر کہا تھا۔

”بانو نہیں کنول۔“

”بانو، بانو، بانو۔“ میں نے نکیے اس کی طرف پھینکتے ہوئے ہنسنے سے زور سے کہا۔ ”وہ نکیے سے بچنے کے لیے جی ٹی سی اور ساتھ ہی پیچ مار کر اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی۔

”ارے کچھ ہو گیا ہے دیکھو بے تحاشا پانی جا رہا ہے۔“ میں فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ بچی کے گرد لپٹی ہوئی نمبرین پھٹ گئی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ لیبر شروع ہونے والا ہے۔ انٹرنیٹ پر بہت اچھی سی تصویر بنی ہوئی تھی اس پورے عمل کی۔ وہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے یک بیک آگیا۔ اب فوراً ہی اسپتال جانا ہوگا، ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا۔ اب آڈیشن ہفتے ہو گئے ہیں۔ کسی بھی وقت درد شروع ہو سکتے ہیں فوراً ہی اسپتال آنا ہوگا۔ دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ ماں اور بچے دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے، میں نے جلدی سے ای کو بتایا اور اسی وقت اسے گاڑی میں لے کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔

باجی اور ان کی بیٹی بھی اسپتال آ گئے تھے۔ چھ گھنٹے کے اندر ہی اندر ہماری کنول پیدا ہو گئی۔ کسی آپریشن اور کٹ کے بغیر بالکل نارمل..... سات پونڈ کی ننھی سی گلاب کی کلی۔ اسے اٹھا کر میں نے چوما، اس کے گالوں کو ماتھے کو، اپنے گالوں پر لگایا، اسے سینے سے لگا کر دل چاہا کہ اسے بھی دل میں سالوں، میرے آنسو نکل آئے۔ سیما کی آنکھوں میں بھی جل، ندی کی طرح چھلک رہا تھا۔

تین دن وہ اسپتال میں رہی۔ خاندان کا ہر ہر فرد اسے دیکھنے آیا۔ مٹھائیاں، کیک، پھول روزانہ مجھے اسپتال

بے گھر لانے پڑتے تھے۔ کس قدر خوش تھے سب لوگ، وہ تھی کی گڑیا پورے خاندان کا مرکز نگاہ بن کر رہ گئی تھی۔

گھر آکر بھی سب کچھ ٹھیک تھا، سہا خطرے سے باہر نکل چکی تھی۔ گھر میں ایک چھوٹی سی بچی آگئی۔ میں دوبارہ اپنے رویوں کے کاموں میں لگ گیا۔ سہا کے کس کی وجہ سے میں نے اپنے بہت سے دورے منسوخ کر دیے تھے۔ سب لوگوں کو اس ڈیپوری کا انتظار تھا۔ مجھے فوری طور پر سنگاپور جانا تھا جس کے لیے میں نے اپنی آبادی کا اکتھار کر دیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو سہا کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ کنول اس کی گود میں تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔

ایک ایک یہ کیا ہو گیا ہے۔ میں فوراً ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا سہا، خیر تو ہے؟ کنول تو ابھی ہے نا؟ کیوں رو رہی ہو؟“

اس نے اپنا سر میرے کانوں سے لگا دیا۔ ”نہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس رونا سا آگیا تھا یونہی بیٹھے بیٹھے۔“ اس نے آنکھوں سے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری بھی میں اس کے ساتھ بیٹھا رہا، یوں رہا، ہنسا رہا اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔

”مجھے پرسوں سنگاپور جانا ہے سہا اور اب کی دفعہ اکیلے جانا ہوگا۔ کچھ کام کر گیا ہے وہاں پر۔ چلا جاؤں نا..... جانا تو ہوگا۔“

”ہاں ضرور جائیں گی تو ہیں یہاں پر۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پانچ دن سنگاپور میں بہت معروف گزرے۔ میں روزانہ، تین چار مرتبہ فون کر کے پوچھتا۔ سہا سے باتیں کرتا، کنول کا رونا سنا، جیسے ہی کام ختم ہوا میں پہلی فلائٹ پکڑ کر واپس آگیا۔

مجھے سب کچھ ٹھیک ہی لگا۔ رات گئے تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے پھر نیند آگئی۔ پھر نہ جانے رات کے کس لمحے میں میری آنکھ کھل گئی، سہا بستر پر نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ ہاتھ دروم میں ہو مگر جب کافی وقت نکل گیا تو میں نے اٹھ کر دیکھا ہاتھ دروم میں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازہ کھول کر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ سہا بیڑیوں پر بیٹھی رو رہی ہے۔

بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے جیسے موم پھل پھل کر بہہ رہا ہو۔ میں بے قرار ہو گیا۔

”کیا ہو گیا سہا..... کیوں رو رہی ہو؟ خدا کی پناہ! سارا اکتھار ادھ پٹا آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔ میری جان کیا ہو گیا ہے تم کو.....“ میں نے اسے لپٹا لیا۔

”نہ جانے کیا ہو گیا ہے رشتے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا ہے مجھے۔ نہ کھانا، نہ گھر، نہ بیوی، نہ دوست، نہ رشتے دار، کیوں ایسی ہو گئی ہوں میں۔ بس دل کرتا ہے بیٹھ کر روتی رہوں، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہوں۔ کچھ ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“

”چلو کمرے میں چلو۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پیار سے کہا اور اسے سہارا دے کر کمرے میں لے کر آیا، بستر پر لٹایا اور چادر اوڑھا کر کہا سو جاؤ..... بہت دیر تک آہستہ آہستہ میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کھنکھی کرتا رہا پھر وہ گہری نیند سو گئی۔

صبح اٹھ کر میں آفس چلا گیا جہاں سے میں نے امی کو فون کر کے کہا کہ سہا کا خیال رکھیں نہ جانے کیوں کچھ پریشان سی ہے۔

”ارے بھی متھن ہوتی ہے تو مہینے کی متھن، کچھ ہو جائے گا سب کچھ۔“ امی نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی..... دوپہر کے بعد میں نے تین دلف بات کی تھی اس سے۔ اس کی آواز ٹھیک تھی مگر وہ شاید بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی آواز میں تو محاسن ہوتی تھی ہمیشہ کشش کی طرح۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ کیا ہو گیا ہے میری سہا کو۔ میں ذرا جلد ہی گھر آگیا۔ اسے زور دے کر تیار کر آیا تھا، امی نے منع بھی کیا مگر میں نے کہا نہیں امی تھوڑا باہر کا چکر لگاؤں گا تو اچھا ہوگا، گھر میں بیٹھا بیٹھا آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

ہم نے کھنکھن میں سمندر کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کی۔ لہروں کے قریب بیٹھ کر انہیں گھننے کی کوشش کی، اس کا ہاتھ تمام کر اور بچی کو گود میں لے کر تھوڑی دیر تک ٹھٹھٹے رہے، پھر زمرہ میں ایک چائیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ وہ میرے ساتھ تھی، بات بھی کر رہی تھی مگر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ میں نے اسے لپٹے سناٹے، کچھ امریکا کے وہ قصے جنہیں وہ بار بار سن کر بستی تھی مگر اب وہ رپانس نہیں تھا، ایک باری ہوئی مسکراہٹ۔ ایک دھیمپاں جیسے ٹیوب لائٹ کے سامنے کوئی لائٹن جل رہی ہو۔

گھر پہنچ کر اس نے کنول کو دودھ پلایا اور اپنے سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے سوال کیا۔ ”آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے ہیں رشتے؟“

کے چہرے پر غصہ کی دیرانی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہوں۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکائی، چہرے پر تاثر بھی بدلا پھر وہ زور زور سے بولی تھی۔ ”نہیں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے، میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک ہوں رفیق۔ بس یہ کنول ٹھوڑا زیادہ روٹی تھی آج بہت ڈانٹا ہے اسے میں نے، اب ٹھیک ہے دیکھو سو رہی ہے آرام سے۔“ میں نے بچی کو پیار کیا۔

”سیما تم نے کھانا نہیں کھایا آج۔ اگر کھاؤ گی نہیں تو طاقت کہاں سے آئے گی۔“

”ہاں میں کھانا کھاؤں گی رفیق۔“ اس نے آہستہ سے کہا تھا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے شروع ہو گئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے چہرے سے لگایا۔ ”مجھے کچھ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ آج میں نے کنول کو، اپنی کنول کو ڈانٹا ہے۔۔۔۔۔ کل ماروں گی خدا یا۔ اپنے بچے کو بھی کوئی ڈانٹتا ہے، اتنے جھوٹے بچے کو کوئی مارتا ہے۔“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح سے اس کے آنسوؤں کو روکوں، اس کے رونے کو روکوں۔۔۔۔۔ میں کھڑا تسلیاں دیتا رہا اور وہ روٹی رہی۔۔۔۔۔ منجھے سے باجی کی آواز آئی تو اس کا رونہ بند ہوا تھا۔

اس رات بھی میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔۔۔۔۔ میں نے نیند کی گولی دی تاکہ اسے نیند آجائے۔ تمام رات میری آنکھیں کھلتی بند ہوتی رہیں، نہ میں سویا نہ جاگا، صبح سیما کو سویا ہی چھوڑ کر آفس چلا گیا۔

شام کو ڈاکٹر صاحبہ سے ملا تو انہوں نے کہا کہ ہاں بچی ہونے کے بعد ٹھوڑا بہت ڈپریشن ہوتا ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے بالکل فکر مت کریں۔ ٹھیک ہو جائے گی آپ کی بیوی۔ ایسا بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جب چھ مہینے ہو جائیں گے آپ کے گھر، میں دیکھ لوں گی۔ بس ذرا توجہ دیں۔ وقت دیں اسے، اصل میں شوہروں کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔

پندرہ سو روپے میں مجھے دینے کا کوئی افسوس نہیں ہے، افسوس تو یہ ہے کہ کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وقت دیں اسے۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ وقت تو انہوں نے نہیں دیا، میری بات نہیں سنی، نہ یہ سمجھا کہ میں اس کی ویران آنکھوں کے بارے میں کیا بتا رہا ہوں، نہ یہ سمجھے گی کوشش کی کہ وہ اپنی چند ہفتوں کی بچی کو ڈانٹ رہی ہے مار رہی ہے، وقت تو انہوں نے دینا تھا، وقت مجھ سے مانگ رہی ہیں۔ ارے میں تو جان دے دوں گا۔۔۔۔۔ بغیر کسی فکس

”یہ کیسا سوال ہے سیما، تم سے نفرت کا میں سوچ بھی نہیں سکتا ہوں، کیوں کروں گا نفرت۔ تم میری بیوی میری دوست ہو، میرے جنم جنم کی ساتھی، میرے خوابوں کی شہزادی، میری بالوں کی ماں، میری کنول کی امی، جیسی بات کر رہی ہوں۔“ میں نے ایک سانس میں طویل جواب دے دیا تھا۔

”نہیں بچہ کہیں؟ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہے۔“ میں جھنجھلا سا گیا، کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ نہیں میں اس سے نفرت نہیں کرتا ہوں، محبت ہے مجھے اس سے، بے شمار محبت ہے بلکہ میں پجاری ہوں اس کا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ دھیرے دھیرے اپنی انگلیوں سے اسے سہلاتی رہی، ایسا لگا جیسے آنسوؤں کو روک نہیں پاری ہے پھر بولی۔ ”نہ جانے کیوں ایک ہول سا اظہار ہے میرے دل میں۔ ایسا لگتا ہے سب کچھ خالی ہے۔ یہ دل، یہ دماغ، میری روح، میرا جسم۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے کیوں لے آئی ہوں اس تکی کی جان کو اس دنیا میں۔ کیا ہے اس دنیا میں۔ غم، پریشانی، دکھ، نامقام، حشریں، گولیاں، ایکسیڈنٹ، موت۔۔۔۔۔ خدا یا۔۔۔۔۔ کیسے گزرے گی زندگی۔“

میں ساتھ لیٹا رہا پھر جانے کب ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ دوسرے دن میں نے سیما کی گائنا کولوٹھ کو فون کیا۔ بڑی مشکل سے وہ ٹی ٹی میں، کہنے لگیں۔ ”میں فون پر مشورے نہیں دیتی ہوں۔ آج تو وقت نہیں ہے۔ کل آجائے گا تو بات سن لوں گی۔ نائل ڈیلیوری کے بعد کیا ایرجی ہو گئی، گھبراہٹ مت، کل ملیے گا۔ شام کو 6 بجے میرے صدارت والے کلینک میں۔ کل میں زحرمہ پر نہیں پہنچتی ہوں۔“

میں گھر آیا تو امی بھی مجھے ٹھوڑی پریشان سی لگی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ دن بھر میں کچھ خاص نہیں کھایا ہے سیما نے۔ کوشش کے باوجود کچھ بات نہیں کی ہے اس نے۔ جب بھی کمرے میں گئی ہوں وہ کمرے میں خاموش بیٹھی نہ جانے دیوار پر کیا مچتی رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ باجی سے بھی بات کی ہے انہوں نے، وہ ایک تعویذ لے کر آرہی ہیں۔ باجی کی نند کو بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا تو شاہ بابا سے تعویذ لے کر باندھا اور وہ صبح ہو گئی تھی۔ بیٹا اللہ خیر کرے گا۔ انہوں نے پیار سے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا، میں کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سیما اسٹول پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ اس

کے۔ کاش یہ سب کچھ میں کہہ سکتا۔

اس رات اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے کانوں میں آوازیں آتی ہیں کہ وہ بدکردار ہے، طوائف ہے، پیچھے ہے، گندی ہے، کوئی بار بار بولتا ہے اس کے کانوں میں۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنی کنول کو کوئی نقصان پہنچا دوں گی، کچھ بد رفتی۔ اس کا خیال رکھنا وہ ہماری بچی ہے، تمہاری بیٹی ہے۔“ وہ بار بار ایک بات کو دہرا رہی تھی۔

اس کے بازوؤں میں تعویذ بندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے کی دشت سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے آج تک انفسوس ہے، سخت انفسوس کہ سارے حمل کے دوران ایک ایک دن میں اعزیت کھول کر ماں اور بچے کے متعلق پڑھتا رہا، سمجھتا رہا، لیکن نہ جانے کیوں، حمل کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں، میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس جاہل اور لالچی گائیکا کو جو جسٹ سے ملا جسے نارل ڈیلوری اور سیزیرین سیکشن سے آگے شاید کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے اسے سمجھا یا کہ نہیں سہا کوئی ماں اپنے بچے کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ تم ٹھیک ہو یہ صرف بے کاری آوازیں ہیں، اب تو باقی ہے یہ تعویذ بھی پہنا دیا ہے، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کل سے چھٹی لے لوں گا۔ تمہارے ساتھ رہوں گا مگر نہ کرو۔

”ہاں تم کل سے آفس مت جانا۔ میرے ساتھ رہنا، ہماری بچی کے ساتھ۔ کبھی کبھی میرا دل کہتا ہے کہ اس بچی کو مجھ سے نقصان پہنچے گا مگر میں اسے نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ میں خود مر جاؤں گی رفیق لیکن اسے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ تم گھبراؤ مت۔ اپنا خیال رکھنا، میری بچی کا خیال رکھنا۔“ وہ بار بار اپنے الفاظ کو دہراتی رہی۔ کبھی کنول کو چومتی تھی۔ کبھی مجھے گلے لگاتی تھی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرا دل جیسے کوئی کتر کتر کر چھٹک رہا ہو۔ میں نے اسے نیند کی دوا دی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی تھی، میرے بازوؤں کے نیچے پر سر لگائے، نہ جانے دیواروں پر کیا لکھی رہی تھی۔

دوسرے دن اسے سوتا چھوڑ کر آفس گیا تھا کہ وہاں جا کر ایک درخواست لکھنا اور بتانا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے نہیں آسکوں گا۔ وہاں بھی کمپنی کے کٹری فیجبر نے میرے لیے اپنے ایک دوست سائیکا ٹرسٹ کو فون کر کے سہا کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ

وقت دیں اسے۔ حمل کے بعد ڈپریشن کی شکایت ہوتی ہے جو خود بخود وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ وقت ان کے پاس بھی نہیں تھا، میں ان سے اسی وقت نہیں مل سکا، انہوں نے چار دن کے بعد شام کو بلایا تھا کہ سہا کو لے کر آؤں۔

میں گھر آیا تو وہ ابھی بھی سو رہی تھی، کنول کو امی جان نے باہر کا دودھ شروع کر دیا تھا اور وہ اپنے ہتھوڑے میں جھولنے کا مزہ لے رہی تھی۔

دوپہر کو ہم نے ساتھ کھانا کھایا، شام کو پھر ایسا لگا جیسے سہا سخت پریشان ہو رہی ہے۔ اس کے چہرے پر جیسے کسی نے کوئی ماسک چڑھا دیا ہو۔ سوچتی ہوئی، دور تک دیکھتی ہوئی، ویران ویران سی آنکھیں۔

اس نے ایک دفعہ بھی کنول کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ مجھے بار بار ایسا لگتا جیسے وہ من ہی من میں دیرے دیرے رو رہی ہو۔

سونے سے پہلے اس نے مجھ سے پھر کہا۔ ”وہ مجھے بلا رہے ہیں اپنے پاس، ان کی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمہیں، بچی کو اس گھر کو چھوڑ دوں۔ کیوں بلا رہے ہیں وہ مجھے؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے سمجھاتا رہا کہ کوئی نہیں بلا رہا ہے تمہیں۔ تم یہاں رہو گی میرے پاس ہمیشہ ہمیشہ۔

مگر وہ ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہی میرے پاس، دو دن کے بعد میں ایک ضروری دستخط کرنے آفس گیا اور جب واپس پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بیڈ روم میں بستر پر کرسی رکھ کر اپنے دوپٹے کو پیچھے سے باندھ کر گلے میں پھندا ڈال کر خود کشی کر لی تھی۔ دروازہ توڑ کر ہی ہم لوگ اس کی لاش باہر نکال سکے تھے۔ سر ہانے خط رکھا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے میں اپنی بچی کی جان لے لوں گی۔ بار بار کوئی مجھے کہتا ہے کہ میں اسے ختم کر دوں۔ میں اسے کیسے ختم کر سکتی ہوں۔ مگر مجھے اپنا اعتبار بھی نہیں ہے کہ کب کیا کر بنوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں خود ہی چلی جاؤں۔ میری زندگی کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھنا رفیق اور میری بچی کا بھی۔“

خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اب میرے سامنے ایک اداس اور اجازت زندگی پڑی تھی۔

دوپہر کی دھوپ میں آنکھیں میچتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”کیا بینک نے تمہارا چیک باؤنس کر دیا ہے؟ کیا تمہارے گھر پر کوئی درخت گر گیا ہے؟ نیٹ فلکس نے تمہارا سبسکرپشن کنسل کر دیا ہے؟“

”ارنی کیفے کے پاس میرے پسندیدہ ڈونٹس ختم ہو چکے ہیں۔“

”میں جانتی تھی کہ معاملہ کچھ سیریس ہے.....“

ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرانس ویلخان کو اپنی بیٹی لوسی ارنیز کیفے کے باہر ایک شیج پر بیٹھی ہوئی ملی۔ لوسی نے اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر لٹکائی ہوئی تھیں اور اپنی بیس بال کی سیاہ ٹوپی اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھی جس پر ”شیرف“ جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔

”تم قدرے پڑمردہ دکھائی دے رہی ہو۔“

فرانس نے کہا۔

لوسی نے نظریں اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور

پیمبلی کے مانند حرفوں میں بند..... نقب زنی کی انوکھی واردات

بعض اوقات سامنے کی چیز بھی انسانی آنکھ دیکھ نہیں پاتی اور نہ ہی عقل پہچان سکتی ہے... اسی کو عقل پر پردہ پڑنا کہتے ہیں۔ وہ نقیب بھی اتنا ہی دیدہ دلیر تھا کہ سامنے کے سامنے بازی کھیل گیا اور قانون کے رکھوالے سمجھ ہی نہ پائے۔

دیدہ دلیر

سلیم انور



فرانسس نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”بائی داوے تمہارا سیل فون کہاں ہے؟“
 ”میری کتنی کار میں..... کیوں؟“
 ”جسمی تو اس کی کھنٹی بجے جا رہی ہے۔ تمہارے ڈپٹی نے مجھے فون کیا تھا اور مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں تلاش کروں۔“
 ”کس لیے؟“

”وہاں ڈولن روڈ پر نقب زنی کی ایک واردات ہوئی ہے۔“ فرانسس نے بتایا۔
 شیرف لوسی شیخ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور دھوپ کی عینک لگائی۔ ”کیا اس واردات کے لیے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہوگی؟“
 ”کیوں؟“

”میں ڈوٹس کے ساتھ زیادہ بہتر طریقے سے سوچ بچار کر سکتی ہوں۔“
 ”فکرمٹ کرو۔“ فرانسس نے کہا۔ ”سوچ بچار کا کام میں کر لوں گی۔“

☆☆☆

شیرف کے دفتر میں واپس پہنچ کر ڈپٹی میلون نے انہیں واردات کی مکمل تفصیل سے آگاہ کر دیا۔
 ”آج صبح سویرے ٹی بیکنگرو نامی ایک لڑکا لیو کریک برج کے نیچے چھٹی کا شکار کر رہا تھا تو اسے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھاڑی کے کنارے سے چاروں ہاتھ بیروں کے بل رینگتا ہوا جب اوپر پڑھائی پر پہنچا تو وہاں اسے برج کے مغرب میں سوگنز کے فاصلے پر ایک نئی سیاہ رنگ کی پک اپ دکھائی دی جو ایک ٹروٹکس ویزر ہاؤس کے عقب میں پارک تھی۔ جب ٹی بیکنگرو دیکھ رہا تھا تو سویت شرٹ جینز میں ملبوس ایک شخص جس نے کاؤڈائے بیٹ پہنا ہوا تھا، عمارت کی عقی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اندر باہر آ جا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر سے ہماری بصری کیمے لٹھا کر اس سیاہ پک اپ میں لوڈ کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس شخص نے پک اپ اسٹارٹ کی تو گواہ ٹی دیک کر چھپ گیا اور وہ پک اپ اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر سے برج پار کر گئی۔ جب ٹی نے یہاں فون کر دیا۔ میں نے فوراً ہی ویزر ہاؤس کے مالک کو فون کیا اور پھر جلد ہی اس نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ ٹی ہزارڈ ایلز مالیت کا سامان چوری ہو گیا ہے۔“
 ”یعنی گواہ ٹی اب کہاں ہے؟“

”وہ اپنے گھر پر ہے۔ وہ اسٹریٹنگرو کا بیٹا ہے۔ اسے جانتی ہوتا؟ اس نے کہا ہے کہ اگر ہم اس کے بیٹے سے

مزید سوالات کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اس کے پاس آ سکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال سے وہ مجھے وہ سب کچھ بتا چکا ہے، جو وہ جانتا ہے۔“

”کیا اس نے بتایا کہ اس نے ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا؟“
 ”نہیں۔ پہلی مرتبہ تو فاصلہ بہت تھا پھر جب پک اپ اس کے سامنے سے گزری تو اس کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ان کی رنگت سیاہ تھی۔ البتہ اس پک اپ پر ذاتی لائسنس ٹیگ لگا ہوا ہے۔ جیسے کر لوگ ذاتی نمود کے لیے پلیٹ لگا لیتے ہیں۔ ٹی نے اس ٹیگ پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے ڈپٹی میلون نے ایک نوٹ پیڑ اٹھایا اور اس پر لکھا ہوا نمبر پڑھنے لگا۔ ”ایس اے بی ای آر ٹیو ایچ۔“

”سپر ٹوتھ۔“ (S.A.B.E.R.2.T.H) لوسی نے تئوریوں چڑھاتے ہوئے دہرایا۔

”ٹیگ پلیٹ پر سبکی لکھا ہوا تھا۔“
 لوسی اپنی میز کے کنارے پر بیٹھ گئی اور ڈپٹی میلون کی جانب دیکھنے لگی۔ ”یہ کوئی لڑکا ہوگا..... ہے نا؟“
 اس سے قبل کہ میلون کوئی جواب دیتا، فرانسس نے کپیوٹر کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ”کیوں نہ ہم یہ نمبر کپیوٹر پر چیک کر لیں تاکہ پتا چل جائے کہ یہ نمبر کس کے نام رجسٹرڈ ہے۔ کیا ہم آج ہفتے کو چھٹی کے دن بھی یہ چیک کر سکتے ہیں؟“
 ”یقیناً، کر سکتے ہیں۔“ میلون نے کہا۔ ”لیکن اس سے ہمیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔“

”وہ کیوں؟“
 ”اس لیے کہ ٹی نے جو پلیٹ دیکھی تھی، وہ پک اپ کے سامنے کے حصے پر لگی ہوئی تھی اور اس پر وہی نمبر لکھا ہوا تھا جو میں نے ابھی پڑھ کر سنایا تھا۔ وہ عقب میں لگی ہوئی پلیٹ کا نمبر نہیں تھا اور ٹی نے بتایا ہے کہ وہ جس جگہ کھڑا ہوا تھا تو اس نے پک اپ کو برج پر سے گزرتے ہوئے پیچھے کی جانب سے نہیں دیکھا تھا۔“

”اور یہ کہ اس ریاست میں لائسنس پلیٹ صرف عقب میں لگائی جاتی ہے۔“ لوسی نے کہا۔ ”رجسٹریشن نمبر کی پلیٹ ہمیشہ عقب میں ہوتی ہے۔“
 ڈپٹی میلون نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ”سامنے لگی ہوئی ٹیگ پلیٹ وہ کوئی بھی ہو سکتی ہے جو آپ چاہتے ہیں..... مثال کے طور پر اسکول کا لوگو، کارڈیئر شپ پلیٹ، کسی برادری یا گروہ سے متعلق کوئی مونو گرام..... یا کچھ

شیرف لوسی میز کے کنارے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک لمبی آہ بھری۔

”یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اوکے میرا خیال ہے کہ تم اس علاقے میں چلے جاؤ اور وہاں کے رہائشیوں سے معلومات حاصل کرو۔“ میلون! میں کمپیوٹر پر بیٹھ رہی ہوں اور ہاں۔ تم گھر چلی جاؤ!“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ فرانسس نے قدرے غراتے ہوئے کہا۔ ”خبر جاذب میلون! میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“

☆☆☆

چار گھنٹے بعد وہ تینوں ایک بار پھر یکجا ہو گئے۔ ان تینوں میں سے کسی ایک نے بھی ابھی کچ نہیں کیا تھا۔ ڈپٹی میلون اور فرانسس کی علاقے کے دورے کے دوران وہاں کے رہائشیوں سے بات چیت بے سود ثابت ہوئی تھی اور انہیں کسی سے بھی ایسا جواب نہیں مل سکا تھا جو ان کی تحقیقات میں مددگار ثابت ہو سکتا۔

البتہ موٹر وے کی ڈیوار ٹرنٹ سے چیک کرنے پر شیرف لوسی کو یہ پتا چلا کہ نئے ماڈل کی تین سیاہ پک اپ اس علاقے کے رہائشی مالکان کے ناموں پر رجسٹرڈ ہیں جو یہ تھے۔

کلیئر ٹس لیتھم، عمر بیالیس سال، چیف وپسٹر، عمر چھیانوہ سال اور اسٹیشن ایریجی جو نیوز عمر اڑتالیس سال۔

شیرف لوسی نے فون پر یہ معلومات اپنے ڈپٹی میلون کو فراہم کر دی تھیں جو اس وقت اس علاقے میں موجود تھا۔ اس نے فرانسس کے ساتھ مل کر ان تینوں کے انٹرویو لیے تھے۔

”کلیئر ٹس لیتھم ایک انٹینک ڈیڑھے جس کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔“ ڈپٹی میلون نے اپنی نوٹ بک میں سے شیرف لوسی کو پڑھتے ہوئے سنایا۔ ”جیف وپسٹر ایک ریٹائرڈ پروڈیوسر ہے جس کا تعلق ویش ول سے ہے اور اسٹیفن ایریجی جو نیوز ایک رائٹر ہے جو ٹیری ہاٹ، انڈیانا سے منتقل ہو کر یہاں آیا ہے۔“ میلون نے سر اٹھاتے ہوئے کہا اور مزید بولا۔ ”پروڈیوسر کا کہنا ہے کہ لیتھم سفر بہت کرتا ہے۔

میرے خیال سے چوری شدہ مال کو کھانے لگانے کے لیے اسے رابطوں کی ضرورت پڑتی ہوگی اور پروڈیوسر کی فیڈبیکٹر انکس ہے۔“

”ویل، کسی کو بھی حراست میں لینے کے لیے ہمارے پاس اس سے کہیں زیادہ معلومات ہونی چاہئیں۔“

اس موقع پر ایک اور ڈپٹی ٹیک وٹن ایک ہاتھ میں پکٹے کاغذ کی ٹیلی پکڑے کرے میں داخل ہوا۔

اور۔۔۔ اسی لیے انہیں اب بھی نمودار نکش کی پلیٹ کہا جاتا ہے جو ذاتی پسند کی ہوتی ہیں اور ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ہمیں اس سیاہ پک اپ کا اصلی پلیٹ نمبر معلوم نہیں ہے۔“

”اس کے باوجود وہ عقیقی پلیٹ تھی یا سانسے کی پلیٹ، یہ چکانہ حرکت لگتی ہے۔“ لوسی نے دوبارہ کہا۔ ”کوئی بھی اپنی گاڑی پر سیر نہیں کرتا، کیوں لکھنا چاہے گا جبکہ اس لفظ کا کوئی مطلب بھی نہیں ہے؟“

”اور جب پتا چل جائے گا تو تمہیں یقیناً حیرت ہوگی۔“ فرانسس نے کہا۔

پھر ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میلون جو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اپنی آنکھیں ملنے لگا اور بولا۔ ”ہمارے پاس ایک کام کی معلومات ہو سکتی ہے۔“ ”وہ کیا؟“

”ڈولن روڈ زیر تعمیر ہے اور ویز ہاؤس سے دو میل مغرب کی سمت جا کر بلاک ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اور ٹی نے بتایا ہے کہ اس نے کھڑکی کا شیش ٹوٹنے کی آواز سنی تھی کہ پندرہ منٹ پر کسی بھی اور پک اپ کو ساڑھے چھ بجے کے عین بعد جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک دہی کھڑی پہن رکھی تھی اور وہ وقت کے بارے میں بالکل پریقین تھا۔“

”تو پھر؟“

”اس کا کہنا تھا کہ وہ برج پر چھ بجے سے پہلے سورج نکلنے کے بعد سے چمکی کا شکار کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اور اس دوران برج پر سے کوئی بھی نہیں گزرا تھا اور چونکہ ایک برج ہی اس علاقے میں جانے یا وہاں سے نکلنے کا واحد راستہ ہے اور ٹی نے ویز ہاؤس کی جانب جاتے ہوئے پک اپ کو برج پر سے گزرتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔“

”تو پھر یہ پک اپ یقیناً مخالف سمت سے آئی ہوگی۔“ شیرف لوسی نے کہا۔

”درست! اس جانب سے جدر سڑک کا کام ہو رہا ہے۔“

”تو پھر چور برج کے مغرب کی جانب دو میل کے کلوے میں کب گھر رہتا ہے۔“ فرانسس نے خیال ظاہر کیا۔

”غالباً۔“

”لیکن ٹی نے پک اپ کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ لوڈ ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ اور مشرق کی سمت جاری تھی۔“ لوسی نے کہا۔ ”مغرب کی سمت نہیں۔“

ڈپٹی میلون نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”غالباً اس جانب جہاں چوری کا مال آسانی سے بچھا جاسکتا ہے۔“

”کیا یہ ڈنٹس ہیں؟“ لوسی نے اس سے پوچھا۔
 ”بالکل تازہ ہیں۔ ارنیز ہی سے لایا ہوں۔“
 ”مجھے ان ہی کی طلب تھی۔“ لوسی نے اپنی انگلیاں

سے ہمیں کس طرح مدد مل سکتی ہے؟ لیٹیم متجاری باشندہ ہے۔
 ویسٹر ٹینیسی میں پروان چڑھا ہے اور ایئر فوجی انڈیانا میں
 پلا بڑھا ہے۔“

”فلاظ کی جراثیم۔“ فرانس نے کہا۔ ”میں کہتی
 تو یوں کہتی کہ مسٹر ایئر نیٹھی کی پرورش انڈیانا میں ہوئی ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“

فرانس نے دانت نکال دیے۔ ”مجھے یقین نہیں کہ
 وہ پروان چڑھ چکا ہے۔ ابھی اس کے اندر بچہ پائی ہے۔“
 ”پہیلیاں مت بھجواؤ، محل کربا ت کرو، ماں۔“ لوسی
 نے زچ ہو کر کہا۔

فرانس نے وہ نوٹ پیڑ اٹھایا جو وہ ہاتھ میں
 پکڑے ہوئے تھی اور ان کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔
 ”لگتا ہے کہ تم دونوں بحری دور کے انسان مائل تاریخ کے دور
 کی فلمیں بہت زیادہ دیکھتے رہے ہو۔ SABER2TH
 کا مطلب قطعی طور پر مختلف ہو سکتا ہے۔“
 ”جیسے کہ.....؟“

”SABER2، ایس ایئر فوجی جو نیوز کا مخفف
 ہو سکتا ہے۔“ فرانس نے الفاظ کی جانب اشارہ کرتے
 ہوئے کہا۔ ”اور TH سے مراد.....“

”ٹیری ہاٹ ہے۔“ میلون نے بات مکمل کر دی۔
 اس کی آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔

فرانس کے ہونٹوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ
 ابھر آئی۔ ”بالکل درست۔“

لوسی ایک لمحے کے لیے خاموش رہی اور اس بات پر
 غور کرنے لگی پھر بولی۔ ”کیا اسے حراست میں لینے کے
 لیے یہ کافی ہے؟“

”اسے تفتیش کے لیے حراست میں لینے کے لیے یہی
 کافی ہے۔ یہی ہمارا مطلوبہ شخص ہے۔“

شیرف اور ڈیٹی شیرف دونوں دروازے کی جانب
 چل پڑے۔ ”یہاں سے، ہم اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں
 لے رہے ہیں، ماں۔“ لوسی نے پلٹتے ہوئے فرانس سے
 کہا۔ ”اب تم گھر جاسکتی ہو۔“

”نہیں۔“ فرانس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں
 بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ میں اس دیدہ دلیر چر کو
 دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اور پھر وہ تینوں اسٹینن ایئر فوجی جو نیوز کو حراست میں
 لینے کے لیے اس کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

لہراتے ہوئے کہا۔
 اپنی زیک نے وہ تھیلی لوسی کو تھما دی۔ لوسی نے تھیلی
 میں سے ایک ڈونٹ نکالتے ہوئے ڈیٹی کا شکریہ ادا کیا اور
 اسے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔
 ”سو تم نے تمام تینوں سیاہ پک ایس ڈونٹ نکالی
 ہیں؟“ شیرف لوسی نے ڈونٹ منہ میں چباتے ہوئے کہا۔
 ”تم نے انہیں خود دیکھا ہے؟“

میلون نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنے اپنے
 ڈرائیو میں پارک کھڑی تھیں۔ ان کے اندر کوئی سامان
 موجود نہیں تھا اور نہ ہی کوئی نمائشی پلیٹ سامنے کی جانب لگی
 ہوئی تھی۔“ میلون نے قدرے توقف کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ
 ڈرائیور نے ٹی کو دیکھا ہو کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اس
 لیے اس نے اند میں وہ نمائشی پلیٹ اتار دی ہو۔“

”یا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک اپ ابھی تک واپس ہی نہ
 آئی ہو۔ وہ شرق کی سمت گئی تھی..... اور ہو سکتا ہے ابھی تک
 گئی ہوگی۔“

”اٹا ہے کہ ایسا ہی ہو۔“
 ہر ایک اپنے اپنے طور پر سوچ میں پڑ گیا۔

”لہذا کسی پڑوسی کو یاد ہے کہ اس نے کسی کو دیکھا ہو
 جس نے اپنی پک اپ پر ”سبر ٹوٹھ“ کا ٹیک لگا رکھا تھا؟“
 شیرف لوسی نے پوچھا۔

”ملان اور فرانس دونوں نے ایک ساتھ ٹی میں سر ہلا دیے۔
 اچانک فرانس جس نے بے دھیانی میں ڈیک
 SABER2TH لکھا ہوا تھا، چمکتے ہوئے

بولی۔ ”میں سمجھ گئی!“
 ”کیا سمجھ گئی؟“ لوسی نے پوچھا۔

”سبر اخیال ہے میں جان گئی کہ وہ پک اپ کون سی تھی!“
 ”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“
 ”میں اس بارے میں پُر یقین تو نہیں ہوں..... لیکن

وہ ہائیں اس کو نمائشی پلیٹ کے ساتھ منسلک کر رہی ہیں۔“
 ”کیا دو باتیں؟“

”اس کا نام اور اس کا وہ ٹاؤن جہاں وہ پیدا ہوا
 تھا۔“ فرانس نے جواب دیا۔

”جائے پیدائش؟“ شیرف لوسی اور اس کا ڈیٹی
 میلون سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ”اس

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جہان سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

السلام
علیہ

حضرت یوسف

رضوانہ صاحبہ

چوتھا حصہ



سب بھائیوں نے یہی طے کیا کہ اس وقت اس بحث کو نہ چھیڑا جائے۔ ہو سکتا ہے قتل ختم ہو جائے۔ ہمیں اتنا جی ضرورت ہی نہ پڑے۔
بستی کے اور لوگ بھی اتنا جی لینے کے لیے مصر گئے ہوئے تھے جواب لوٹ کر آرہے تھے۔ ان کی زبانی بھی حاکم مصر کی تعریفیں سنی جا رہی تھیں۔ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ حاکم اتنا فرارغ دل ہے کہ

اناج بھی دیا اور قیمت میں ادا کی ہوئی رقم بھی واپس کر دی لیکن وہ اکیلے میں بیٹھ کر اس پر غور ضرور کرتے تھے۔
 ”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے ہمیں دوبارہ بلانے کے لیے یہ جال پھینکا ہو؟“ شمعون نے کہا۔

”اسے ہم بھائیوں کی ذات میں کیا دلچسپی ہے جبکہ وہ ہمیں جاسوس بنی فرار دے چکا تھا۔“ یہودا نے پوچھا۔
 ”شاید اس لیے کہ ہم بنیامین کو لے کر پھنچیں۔“ شمعون نے کہا۔

”سوال یہ ہے کہ وہ بنیامین کو بلانے پر کیوں بھند ہوا؟“
 ”کہیں وہ کوئی ایسا شخص تو نہیں جو ہمارے پچھلے تمام واقعات کو جانتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ہم بہت خطرے میں پھنس گئے ہیں۔“ رادین نے اظہار کیا جو خاصی دیر سے چپ بیٹھا تھا۔

”تم کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ یوسف تھا۔“ شمعون پھر بولا۔
 ”میں اتنا بےوقوف نہیں ہوں۔ اگر وہ یوسف ہوتا تو ہمیں پہچان چکا ہوتا اور جو کچھ ہم اس کے ساتھ کر چکے ہیں اس کے بدلے میں وہ ہماری پوٹیاں کر کے چیلوں کو کھلا چکا ہوتا۔“

”ہم مصر میں اتنے دن رہ کر آ گئے۔ ہم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ اگر یوسف ہوتا تو ہم اسے نام ہی سے پہچان چکے ہوتے۔“

”میں نے پوچھا تھا کسی سے۔“ لادی نے دخل دیا ”اس شخص نے مجھے اس کا نام ”غضب فتح“ بتایا تھا۔“
 (فرعون نے توریت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کا نام ”غضب فتح“ رکھ دیا تھا)۔

”وقت کے ساتھ انسان کی شکل بدل جاتی ہے۔ نام تو وہی رہتا ہے۔“ شمعون نے بے پروائی سے کہا۔
 ”تم لوگ یہ بحث لے کر بیٹھے ہی کیوں ہو؟“ رادین نے انہیں ٹوکا۔ ”کہاں مصر کا حاکم، کہاں ہمارا ناکارہ بھائی یوسف۔ اگر وہ مصر گیا بھی ہوگا تو غلام بن کر کسی گھر کا سودا سلف لاتا پھر رہا ہوگا یا مر کھپ گیا ہوگا۔ تم حاکم مصر سے یوسف کو کیوں ملارہے ہو؟“

”میں پھر بھی سوال کروں گا۔“ شمعون نے کہا۔ ”وہ ہم میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا تمہارے باپ ابھی زندہ ہیں؟“

”شاید اس لیے پوچھا ہو کہ وہ اپنے حصے کا اناج لینے کیوں نہیں آئے۔“
 ”کسی اور سے تو پوچھ نہیں پوچھا۔ ہم ہی سے کیوں پوچھا؟“

”مصر کا جادو بہت مشہور ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے جادو کے زور پر ہمارے دلوں کا حال جان لیا ہو۔ ہم یہ سوچ کر بھی تو گئے تھے کہ یوسف کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے سرائے میں دو ایک لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ بہت دن پہلے کوئی غلام یہاں فروخت ہونے آیا تھا؟ ہر جگہ سے یہی جواب ملا تھا کہ غلام تو یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ کیا خبر تم کس کی بات کر رہے ہو اور کیا خبر وہ کس شہر میں بیچا گیا ہو۔ ہمارے دلوں کا حال جان کر ہی وہ ہمیں جاسوس کہہ رہا ہوگا۔“

”لادی! تم ہمیشہ بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔ وہ حاکم ہے کوئی جادو گر نہیں۔ یہ مصری لوگ ہم کھانیوں سے جلتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ بعد میں نرم بھی پڑ گیا تھا اسی لیے اس نے رقم بھی واپس کر دی۔ اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا ہوگا۔ اس وقت تو یہ طے کر دکھا کہ اگر ہمیں اگلی مرتبہ جانا پڑا تو بنیامین کو کیسے لے کر جائیں گے۔“

”اس کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ اس وقت خاموش ہو جاؤ۔ اگر نقطہ نے طول پکڑا تو پھر کوشش کر کے دیکھ لیں گے ورنہ ہم کہہ دیں گے کہ ہم جو اناج لا لیں گے اس میں سے کسی کو کچھ نہیں دیں گے۔“

نقطہ تھا کہ روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ زمین کا سینہ جھٹنے لگا تھا۔ کہتیاں دیران ہو گئی تھیں۔ اب یہ لگر بھی دامن گیر ہوتی جا رہی تھی کہ دیر لگا لگی تو کہیں مصر میں بھی غلہ ختم نہ ہو جائے۔ جو کچھ مصر سے لائے تھے، اب وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ تمام بیٹے ایک مرتبہ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے آئے۔

”اناج ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں اناج خریدنے کے لیے ایک مرتبہ پھر مصر کا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔“
 ”تو جاؤ میں نے تمہیں کب روکا ہے۔“

”صرف ہمیں جانا ہوتا تو جا کر آ بھی چکے ہوتے۔ وہاں کے حاکم نے تو یہ کہا ہے کہ تم میرا منہ نہ دیکھو گے جب تک تمہارا بھائی تمہارے ساتھ نہ ہو اور تم اسے ہمارے ساتھ جانے نہیں دیتے۔ اگر تم ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دو تو ہم جا سکیں

گے اور تمہارے لیے اناج مول لائیں گے ورنہ ہم نہیں جائیں گے۔“
یہوداہ نے بھی نہایت لجاجت سے کہا۔ ”ہمارے بال بچوں کا تو خیال کرو۔ وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ بنیامین کی ضمانت میں لیتا ہوں۔ اگر یہ نہ آئے تو اسے میرے ہاتھ سے واپس مانگنا۔“
”اس شریف آدمی نے رقم بھی واپس کر دی تھی۔ اگر ہم واپس نہ گئے تو وہ ہمیں چور سمجھے گا۔ ہمیں جا کر اس کی وہ رقم بھی اسے واپس کرنی ہے۔“ رادین نے ایک اور دلیل پیش کی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کچھ دیر سر جھکائے کچھ سوچتے رہے پھر جیسے ہاتھ نہیں نے انہیں کچھ سکھا دیا۔ آیات الہامی ان کے قلب پر ظاہر ہوئیں۔

”بنیامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کر لو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ تمہارے لیے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کر دیے جائیں، ہم ضرور ضرور اس کو تیرے پاس جمع سلامت لوٹائیں گے۔“
تمام بیٹوں نے مشتق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”یہ جو کچھ وہ شخص اسباب ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد ہم سب کو اپنے اس معاملے کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا۔ ”ہم نے جو قول و قرار کیا اس پر اللہ نگہبان ہے۔“
حضرت یعقوب علیہ السلام بغیر تھے۔ وہ وہی کرتے تھے جس کا حکم ہوتا تھا۔ اللہ ان کا امتحان لے رہا تھا۔ پہلی مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی انہوں نے اللہ کے حکم سے بھائیوں کے ساتھ بھیجا تھا اور اب اللہ کا حکم ہوا تو بنیامین کو بھیجنے پر بھی تیار ہو گئے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ اس بیٹے کے ذریعے ہی یوسف کا سراغ مل جائے گا۔
جب تمام بیٹے چلنے کی تیاری کر رہے تھے اور بنیامین بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نصیحت کی۔

”دیکھو سب ایک ہی دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہے۔ فرماں روا ہی تو مصرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے۔“

علمائے تفسیر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ پہلی مرتبہ ان بھائیوں کا اچھی طرح استقبال کیا تھا۔ ان پر جاسوسی کا الزام لگایا ضرور تھا لیکن اس بھائی سے انہیں یقین دن اپنے پاس ٹھہرایا بھی تھا تا کہ گھر کے حالات معلوم کر سکیں۔ لوگوں کو تو یہ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ یہ کوئی خاص لوگ ہیں جو حاکم مصر کے مہمان بنے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اب یہ نہیں چاہتے تھے کہ تمام بھائی ایک ساتھ مصر میں داخل ہوں اور لوگ ان سے حسد کرنے لگیں اور آزار پہنچانے کی کوشش کریں۔

تو ریت کو بنیاد بنا کر بعض مفسرین نے اس نصیحت کا سبب یہ بتایا ہے کہ چونکہ برادران یوسف پر جاسوسی کا الزام لگایا چاچکا تھا لہذا حضرت یعقوب علیہ السلام نے سوچا کہ اگر گیارہ فوجانہ کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہو جائیں۔

”پھر جب مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا تو یہ احتیاط ان کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کے جی میں جو اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ صاحب علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بڑی نصیحتوں اور حاکم مصر کے لیے تحائف دے کر بیٹوں کو رخصت کیا۔ ان بھائیوں کو اپنی بہادری اور دلادوری پر بڑا ناز تھا۔ وہ بنیامین کو لے کر چلے لیکن گھر سے نکلنے ہی انہوں نے طے کر لیا تھا کہ مصر تک پہنچنے سے اتنا ناستا گئے کہ خون کے آنسو رو دے گا۔ ہمارا باپ اسے ہمارے ساتھ بیٹھنے تک نہیں دیتا تھا، اب موقع ملا ہے تو اگلے پچھلے سب حساب چکا دیں گے۔

جب کنعان سے باہر نکل آئے تو ان بھائیوں نے طنز اور طعنوں کے تیر برسانے شروع کر دیے۔

”ہاں بھئی، اپنے باپ کے لاڈ لے۔ تجھے ہمارے ساتھ چلنا کیسا لگ رہا ہے؟“

”تم بھی کوئی غیر تو نہیں، میرے بھائی ہو۔“

”تم بھائی مجھو لیکن ابا جان ہمیں غیری سمجھتے ہیں۔ اگر نہ سمجھتے تو ہمارے مقابلے میں تجھے اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ بیٹے تو

ان کے صرف دو ہیں۔ ایک یوسف تھا ایک تم ہو اور اتفاق سے تم اب ہماری ٹمٹی میں ہو۔“

”ابا جان نے مجھے تم پر بھروسہ کر کے تمہارے ساتھ بھیجا ہے اور تم یہ سلوک کر رہے ہو۔“

”مصر جا رہے ہو ذرا اپنے بھائی یوسف کو تلاش کرنا۔ نہ جانے کہاں غلامی کر رہا ہوگا۔“

”اس کا ذکر مت کرو۔ دیکھتے نہیں یوسف کے غم میں ابا جان کی کیا حالت ہو گئی ہے۔“

”ایسا نہ ہو، اب انہیں تمہارا غم بھی لگ جائے۔“

یہ بنیامین کو کھلی دھمکی تھی لیکن انہوں نے مصر پہنچنے تک بنیامین کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بس زبانی تنگ کرتے رہے، یہی ان کا مقصد بھی تھا۔ مصر کے قریب پہنچ کر وہ ایک سرائے میں ٹھہر گئے تاکہ ایک دن آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر شہر میں داخل ہوں۔ بنیامین یہاں تک ان کے ساتھ تھا۔ رات میں بھائیوں نے ایک نئی شرارت سوچ لی۔

”صبح ہمیں شہر میں داخل ہونا ہے۔“

”ہم نہایت سعادت مند اولاد ہیں۔ باپ کی نصیحت کبھی نہیں ٹالتے۔“ ایک بھائی نے مسخکہ اڑانے والے انداز میں

کہا۔ ”ابا جان نے کہا تھا تمام بھائی مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ ہم یہی کریں گے۔ شہر کے پانچ دروازے ہیں

اور ہم دس ہیں۔ دو دو کر کے ہر دروازے سے داخل ہو جائیں گے۔“

”تم بھول رہے ہو اور دین۔ ہم دس نہیں کیا رہے ہیں۔ بنیامین کو کیوں بھول گئے؟“

”اچھا تو تم اسے بھی گمن سمجھ رہے ہو۔ بھائی تو ہم دس ہی ہیں۔ وہ تو یوسف کا بھائی ہے۔ اگر آج یوسف زندہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ کسی دروازے سے داخل ہوتا۔ ہم اسے اتنی رعایت دیتے ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد کسی بھی دروازے سے داخل ہو جائے۔“

”اگر یہ واپس کھان چلا گیا؟“

”تو ہم کہہ دیں گے کہ یہ بھاگ کر آ گیا۔“

”اس کے بغیر حاکم مصر ہمیں اتنا ج دے دے گا؟ کیا ہم چھوٹے نہیں پڑ جائیں گے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر نہیں

آئے اور یہودہ جو ابا جان سے وعدہ کر کے آیا تھا اس کا کیا ہوگا؟“

ان بھائیوں نے اتنی بحث کے باوجود بنیامین کو سرائے میں چھوڑا اور خود دو دروازوں کے پانچوں دروازوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔

وہ اس شہر میں پہلے بھی آچکے تھے لہذا راستوں کا علم تھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہو کر سب اسی سرائے میں پہنچ جائیں جہاں پہلی مرتبہ آ کر ٹھہرے تھے۔ پھر جس دن غلہ تقسیم ہو سب ایک ساتھ حاکم مصر کے سامنے نہ جائیں بلکہ دو دو کر کے اپنا حصہ لینے جائیں۔ اس طرح حاکم کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ یہ وہی بھائی ہیں جن سے چھوٹے بھائی کو لانے کے لیے کہا تھا۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حاکم دراصل یوسف ہے جو انہیں ایک ایک کر کے اچھی طرح پہچانتا ہے۔

بنیامین سرائے میں بیٹھا رہ گیا اور تمام بھائی مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔ بنیامین کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا لیکن جب اسے اندازہ ہوا کہ بھائی جا چکے ہیں تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ یہاں کوئی اس کی زبان سمجھنے والا بھی نہیں تھا۔ سرائے چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ سرائے کا گراہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ سواریاں بھی اس کے بھائی اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ وہ اسی پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ ایک شخص سرائے میں داخل ہوا اور اس کے سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر غائب پڑی ہوئی تھی۔ بنیامین کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ شخص عبرانی زبان میں بات کر رہا تھا۔

”اے لڑکے! تو پریشان کیوں ہے؟“

”میرے بھائی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“

”تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“

”جہاں میرے بھائی ہیں، مجھے وہاں پہنچا دو۔“

”کمال ہے! تمہارے بھائی تمہیں چھوڑ کر چلے گئے اور تم پھر بھی ان کے پاس جانے کی خواہش کر رہے ہو۔“

”میں یہاں اناج لینے آئے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ نہیں گیا تو انہیں اناج کم ملے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دیتا ہوں جہاں تمہارے بھائی گئے ہیں۔ غریب میں تم سے پھر ملاقات کروں گا۔“

بنیامین یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ ملاقات کیوں کر دے اور وہ شخص دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی دو آدمی اندر آئے، یہ بھی اس سے اس کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ایک دروازے سے داخل ہو کر ایک سرانے کے سامنے پہنچ گئے۔

”اندر چلے جاؤ۔ تمہارے بھائی تمہیں مل جائیں گے۔“

بنیامین جیسے ہی اندر گیا، اس کی ملاقات اپنے بھائیوں سے ہو گئی۔ وہ سادہ لوح انہیں دیکھتے ہی بڑے بھائی سے پلٹ گیا۔ اس کا نام رادین تھا۔

وہ تمام بھائی اسے دیکھ کر حیران ہوئے لیکن یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے جان بوجھ کر چھوڑ آئے تھے بلکہ خوش ہوئے اور اس سے پوچھنے لگے۔

”تو ہماری غفلت سے وہیں رہ گیا تھا پھر تو یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ دروازے سے داخل ہونے کے لیے تو پیسے دینے پڑتے ہیں۔ تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“

بنیامین نے تمام واقعہ بے کم و کاست سنا دیا۔ یہ واقعہ سن کر تمام بھائی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ بنیامین ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

”اس کا مطلب ہے ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔ کسی کو معلوم تھا کہ بنیامین کو ہم چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم یہاں آ کر کس سرانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ شخص کون ہے جسے بنیامین کی اتنی فکر ہے اور ہمارے بارے میں اتنی معلومات رکھتا ہے؟“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یوسف ہمارے آس پاس کہیں موجود ہو؟“

”کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہمیں معلوم ہے یوسف کو بھیڑنے نے نہیں کھایا تھا۔ ہم نے خود اسطعمی تاجروں کے ہاتھوں اس کا سودا کیا تھا۔ وہ تاجر اسے یقیناً مصر لے کر آئے ہوں گے اور کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ جب وہ زندہ ہے تو ہمارے آس پاس بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہمارا بوڑھا ہمارے ٹھیک ہی کہتا ہے کہ اس نے یوسف کو یہاں دیکھا ہے۔“

”وہ یہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ یوسف کو کسی جرم میں قید ہو گئی تھی۔“

”تو کیا وہ ہمیشہ قید میں رہے گا؟ ہو سکتا ہے قید سے رہائی مل گئی ہو اور اب وہ چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا ہو۔“

”یہ سب ہمارا دوسم ہے۔ اگر اسے رہائی مل گئی ہو تو ہوتی بلکہ... میں تو کہتا ہوں اگر وہ زندہ ہوتا تو کتنا ضرور آتا۔ وہ بھلا باپ سے دور کیسے رہ سکتا ہے۔“

”ہمارے خوف نے اسے آنے نہیں دیا ہوگا۔“

”بمحال وہ کوئی بھی ہے، ہماری نگرانی ضرور کر رہا ہے۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ جلد سے جلد اناج خریدو اور چلے کا سامان کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بنیامین ہی کو ہمارے خلاف کر دے۔“

دو دن ٹھہرنے کے بعد اعلان ہوا کہ آج اناج تقسیم کیا جائے گا۔ ان میں سے دو بھائیوں نے کہا آج ہم حاکم مصر کے سامنے جاتے ہیں اور اپنے حصے کا غلہ لے کر آتے ہیں۔ اسی طرح باری باری جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں پہچان گیا تو بنیامین کو لے جائیں گے ورنہ اسے سنبھل رہے دیں گے۔ مگر جا کر کہہ دیں گے کہ حاکم نے بنیامین کے حصے کا اناج نہیں دیا۔

ان بھائیوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ وہ بنیامین سے حسد کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ حاکم ہمیں اس کے ساتھ اعزاز

سے پیش آئے۔ یہ خیال انہیں اس لیے تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خدا کے بنیامین کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔ جب وہ دونوں بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گئے تو انہوں نے پہچان لیا جبکہ یہ بھائی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ ایک ساتھ نہیں جائیں گے تو حاکم (حضرت یوسف علیہ السلام) انہیں پہچان نہیں سکے گا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر اسندہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ نہ لائے تو مجھے ختمہ مت دکھانا۔“ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں سامنے دیکھ کر کہا۔

”ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ سرائے میں ہمارے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔“

”پھر تم اکیلے کیوں آ گئے؟“

”ہمارے باپ نے ہم سے چلتے وقت کہا تھا، ہم مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں اور ایک ساتھ آپ کے سامنے نہ آئیں۔ دیکھنے والے حسد کریں گے اور دشمنی اختیار کریں گے۔ اپنی باری پر ہمارا چھوٹا بھائی بھی آپ کے پاس اپنا حصہ لینے آئے گا۔“

”تمہیں اس وقت تک اناج نہیں ملے گا جب تک تم ایک ساتھ نہیں آ جاتے۔ تم جاؤ اور سب مل کر میرے پاس آؤ۔“

ان دونوں کو اناج نہیں ملا اور یہ واپس آ گئے۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ بنیامین کو اپنے ساتھ لے کر جائیں۔

سب ایک جتنے کی صورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پہنچ گئے اور غلہ خریدنے کے طالب ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوچھا جسے ان بھائیوں نے سب سے پیچھے کھڑا کیا ہوا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بلانے پر اسے سامنے لانا پڑا۔

حضرت یوسف علیہ السلام پر جو گزری سو گزری۔ انہوں نے اپنی کیفیت چھپانے کے لیے منہ دوسری جانب کر لیا اور نو کروں کو حکم دیا کہ ان سب کو شاہی مہمان خانے میں لے جا کر ٹھہراؤ اور ان کی دعوت کا اہتمام کرو۔

نوکر یہ جاننے سے قاصر تھے کہ ان لوگوں میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ انہیں مہمان خانے میں ٹھہرایا جا رہا ہے لیکن حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ ان بھائیوں کو مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

اس صورت حال پر برادران یوسف بھی کچھ کم حیران نہیں تھے۔ ان میں سے بعض کا تو یہ خیال تھا کہ انہیں جاسوس سمجھ لیا گیا ہے اور انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔

انھیں یہ خیال تھا کہ حاکم مصر کے پردے میں خود یوسف ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ حاکم مصر نے اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈالی ہوئی تھی۔ ہم صرف اس کی آنکھیں دیکھ سکتے تھے۔

دوسرے بھائیوں نے اس کا مذاق اڑایا۔

”یوسف کا خوف تمہارا اچھا کر رہا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یوسف مصر میں ہوا اور زندہ ہو لیکن مصر کا حاکم بن کر فرعون کی نیابت کر رہا ہے، یہ کوئی پاگل ہی سوچ سکتا ہے۔“

انہیں جلد ہی نوکروں کی زبانی معلوم ہو گیا کہ حاکم مصر اکثر نقاب ڈالے رہتا ہے، یہ کوئی اس موقع پر منحصر نہیں۔

”ہو سکتا ہے اس کے چہرے پر کوئی ایسا نشان ہو جسے چھپانے کے لیے وہ نقاب ڈال لیتا ہو۔“

”اس کا چہرہ اگر بگڑا ہوا ہے تو نقاب ہر وقت ڈالنی چاہیے جبکہ نوکر کہتا ہے اکثر ڈال لیتے ہیں یعنی کبھی نہیں بھی ڈالتے۔“

یاد ہے، جب پچھلی مرتبہ آئے تھے تو اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔

”ہاں، یاد تو آ رہا ہے۔“

”پھر اس سے ہماری کیا رشتہ داری ہے کہ اس نے ہمیں دعوت پر روکا ہے؟“

”شاید ہمیں دعوت کے بہانے قید کر لیا گیا ہے۔“

”ہم نے کیا جرم کیا ہے جو حاکم ہمیں قید کرے گا؟“

”وہ نقدی جو پہلی دفعہ ہمارے بوروں میں رکھ کر واپس کر دی گئی تھی اس کے سبب سے ہم کو قید کر دیا ہے تاکہ اسے ہمارے خلاف بہانہ مل جائے اور وہ ہم پر حملہ کر کے ہمیں اپنا غلام بنا لے اور ہمارے جانور چھین لے۔“

یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سب مل کر مہمان خانے کے منتظم کے پاس پہنچے اور اس سے اپنی چہا بیان کی۔

”جناب! ہم پہلے بھی یہاں اناج مول لینے آئے تھے۔ جب ہم نے گھر جا کر بوروں کو کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم نے جو نقدی قیمت کے طور پر ادا کی تھی، وہ پوری کی پوری ہمارے بوروں میں رکھی ہوئی ہے۔ ہمیں خبر نہیں کہ یہ نقدی کس نے ہمارے بوروں میں رکھ دی تھی۔ ہم وہ نقدی ساتھ لے کر آئے ہیں۔“

”مجھے اس رقم سے کیا سروکار۔“ منتقم نے کہا۔ ”حاکم نے اعلان کیا ہے کہ وہ دو پہر کا کھانا تمہارے ساتھ کھائے گا۔ جب وہ آئے تو یہ رقم اس کو لوٹا دینا۔ وہ چاہے تو رکھ لے چاہے تو پھیر دے۔“

سب بھائی بایوس ہو کر سٹ گئے اور یوسف علیہ السلام کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ دو پہر کو دروازہ یادہ وقت گزر گیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام تشریف لائے۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ ان کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس سے ان کے بھائیوں کو پہچان لینا چاہیے تھا کہ ایسا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا کس کو ملتا تھا لیکن قدرت نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ ان کی شناخت ہو۔ بھائیوں میں سے کوئی بھی انہیں نہ پہچان سکا۔

تمام بھائی منتقم کی ہدایت کے مطابق بوروں سے نکلنے والی نقدی ان کے حضور لے گئے اور گھنٹوں کے بل جبکہ کر ان کے حضور پیش کر دی۔

”یہ کیا ہے؟“

”حضور! جب ہم پہلے آئے تھے اور اناج خریدا تھا تو یہ رقم ادا کی تھی لیکن آپ کے کارندوں میں سے شاید کسی نے یہ نقدی غلطی سے ہمارے بوروں میں رکھ دی تھی۔ اگر ہم اسے رکھ لیتے تو یہ بددیا بنتی ہوتی، سو ہم اسے واپس لے آئے ہیں۔ اسے قبول کیجیے۔“

”مجھے تو تمہاری دی ہوئی نقدی مل چکی۔ اب یہ خدا نے دوبارہ دے دی ہے تو اسے تم ہی رکھو۔“

”جو اناج ہم آج خریدیں گے اس کے لیے بھی رقم لائے ہیں۔“

”جب اناج ملے گا، اس وقت رقم ادا کر دینا۔ اس وقت تو یہ بتاؤ تمہارا بوڑھا باپ جس کا تم نے ذکر کیا تھا اچھا تو ہے۔ کیا وہ اب تک جیتا ہے؟“

”تیرا خادم اور ہمارا باپ خیریت سے ہے اور اب تک جیتا ہے۔“ بھائیوں نے جواب دیا۔

پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ دسترخوان بچھا لیں۔ ملازموں کو پہلے ہی تاکید کر دی گئی تھی۔ نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ سارے بھائیوں کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پانچ ایسی نشستوں پر دسوں بھائی بیٹھ گئے۔ بنیامین تمہارہ گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے اجازت لی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ بنیامین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیں۔ بھائیوں نے اجازت دی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔

بھائیوں کے لیے یہ منظر بھی حیران کن بلکہ ناقابل یقین تھا۔ مصر کے لوگ عبرانیوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور یہاں یہ عالم تھا کہ کوئی عام مصری نہیں بلکہ حاکم مصر اپنے کھانے میں بنیامین کو شریک کر رہا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے کھانا نکال کر دے رہا تھا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں کہہ سکے تھے لیکن بعد میں خلوت میں انہوں نے اس بات پر بہت باتیں بتائی تھیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سب کے رہنے کے لیے الگ الگ مکان دے دیے کہ کچھ دن یہاں رہیں اور پھر تفریق کے بعد اپنے ملک کو جائیں بنیامین کو یہاں بھی امتیازی درجہ دیا گیا۔ اس کے لیے اپنے محل میں اپنے کمرے سے ملحق کمرے کا انتخاب کیا۔

یہ دوسرا موقع تھا جب بنیامین کے بھائی اس سے بے حد حد کرنے لگے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اس کے بھائیوں سے جدا کر دیا تو انہیں یہ موقع مل گیا کہ اپنی حقیقت اپنے بھائی پر ظاہر کر دیں اور برسوں سے رکے ہوئے آنسو اپنی آنکھوں سے بہا دیں۔ مگر کے حالات بھی اس سے پوچھیں کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ جو کچھ بھائیوں نے انہیں بتایا ہے، وہی سچ ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کے پاس گئے۔ ”کیا تم ہی ان لوگوں کے چھوٹے بھائی ہو جس کو انہوں نے لانے کا

وعدہ کیا تھا؟“

”ہاں، وہ میں ہی ہوں۔“

”ان لوگوں کا تمہارے ساتھ کیا سلوک ہے؟“

”بڑے بھائی ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”اور تمہارے والد؟“

”ان کا اپنے بیٹے یوسف کی کشمگی کے بعد برا حال ہے۔ وہ اس کے غم میں اتنا روئے ہیں کہ ان کی بیٹائی بھی چلی گئی ہے۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ بالکل نئی اطلاع تھی۔ ان کے بھائیوں نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ باپ کی حالت کا سن کر آپ کو بے حد صدمہ ہوا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آگے بڑھ کر بنیامین کو گلے سے لگا لیا اور بڑی دیر تک روتے رہے۔

بنیامین کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ ایک غیر آدمی کو اس کے والد کا اتنا دکھ کیوں ہے۔

”بنیامین، کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟“

”آپ حاکم مصر ہیں۔“

”اس کے علاوہ؟“

”مجھے یہ شک ہو رہا ہے کہ سرائے میں میری مدد کے لیے آپ ہی آئے تھے۔“

”اس کے علاوہ کیا جانتا ہے؟“

”مصر کے حاکم، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کیا یہ بھی نہیں جانتا کہ میں ہی تیرا کشندہ بھائی یوسف ہوں؟ خدا کا مجھ سے وعدہ تھا۔ اس نے مجھے خزانے دے دیے اور سب کو میرا مطیع بنا دیا۔“

”میرے بھائی تو کہتے ہیں یوسف کو بھیڑیا کہا گیا تھا پھر تم یوسف کیسے ہو سکتے ہو؟“

”وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے بھیڑیا اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ مجھے ان شقی القلب بھائیوں نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا مگر اللہ نے مجھے زندہ رکھا۔“

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس داستان کا ایک ایک لفظ بنیامین کو سنایا جو اب تک ان پر گزری تھی۔

اب تو عجیب حال تھا۔ بنیامین ان سے لپٹ کر ہلک ہلک کر رہا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اسے تسلیاں دے رہے تھے۔

”اب تو ایسا کرنا کہ بھائیوں کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ تجھے راستے ہی میں مار ڈالیں گے۔ اس راز کی حفاظت کرنا۔ دیکھو اللہ آگے کیا کرتا ہے۔“

وہ بنیامین کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے لیکن سخت مضطرب تھے۔ انہوں نے ایک ایسا راز بنیامین کے سپرد کر دیا تھا کہ اگر اس کی زبان سے نکل جاتا تو بھائیوں کے ہاتھوں اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ بنیامین نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائیوں کا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں۔ باپ بوڑھے بھی ہیں اور ناپتا بھی۔ وہ بنیامین کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ اگر میں اسے یہیں روک لوں اور اپنی حفاظت میں رکھوں تو کتنا اچھا ہو۔ پھر کسی مناسب وقت پر والد کو بھی یہیں بلا لوں گا۔

یہ ان کی خواہش ہو سکتی تھی لیکن مصری قانون کے مطابق کسی غیر مصری کو بغیر کسی مقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگے جس کا سہارا لے کر بنیامین کو مصر میں روک لیں۔ پھر وجہ کے ذریعے وہ ترکیب انہیں بتادی گئی۔

”یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کے لیے۔ وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بنیامین کو اس بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے۔ ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں۔ اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔“ (سورۃ یوسف)۔

آپ ایک مرتبہ پھر بنیامین کے پاس گئے اور اس سے بھائیوں کے سلوک کی بابت دریافت کرنے لگے۔ اس مرتبہ بنیامین نے تمام باتیں سچ سچ بتادیں۔

”تمام بھائی مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ آپ کے گم ہو جانے کے بعد میں ہی ان کی آنکھوں کا تار مارہ کیا ہوں۔ بھائیوں کو میری یہ قدر و منزلت گوارا نہیں۔ وہ ہر وقت طنز و طعنے کے تیرے برساتے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ کی طرح میرا بھی برا حال نہ کریں۔“

”اگر میں تیری حفاظت کی خاطر تجھے یہیں روک لوں..... بھائیوں کے ساتھ نہ جانے دوں؟“

”ابا جان، میری جدائی برداشت نہیں کر سکیں گے۔“

”تو ان کی فکر مت کر۔ میں انہیں کسی طرح باخبر کر دوں گا کہ میں زندہ ہوں اور تو میرے پاس ہے۔ پھر جو اللہ کو منظور ہو۔“

”میرے لیے تو یہ خوشی کی بات ہوگی کہ میں تمہاری خدمت کروں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خفیہ تدبیر سے اسے آگاہ کر دیا جو آپ اسے روکنے کے لیے کرنے والے تھے۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو اپنے پاس بلایا تاکہ انہیں رخصت کریں اور منتظم کو حکم دیا کہ ان آدمیوں کے پوروں میں جتنا اناج وہ لے جائیں بھر دے۔

جب بورے بھرے جا چکے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خفیہ تدبیر پر عمل کیا اور اپنا چاندی کا پیالہ جس میں وہ پانی پیتے تھے خاموشی سے بنیامین کے بورے میں رکھ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی اس وقت محل کے اس حصے میں بیٹھے ہوئے تھے جس کی دیواروں اور چھتوں پر کسی ماہر مصور نے تصویری مناظر کندہ کیے تھے۔ ذرا غور کیا تو کھلا کہ ان مناظر میں خود ان کی کہانی کو واضح کیا گیا ہے۔ کچان میں برسوں پہلے ”دو تین“ کے مقام پر جو کچھ پیش آیا تھا، ابی کے خاکے یہاں کچھ ہوئے تھے۔ چہرے اجنبی تھے لیکن کہانی وہی تھی۔ ان تصویروں کے دس کردار تھے۔ گیارہ عموں وہ شخص تھا جسے ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ یہ شخص یقیناً حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔

ایک تصویر میں ان کی قمیص اتاری جا رہی تھی۔ دوسری میں انہیں دھکے دے کر کنوئیں کی طرف لے جایا جا رہا تھا پھر انہیں کنوئیں میں اتارنے کا منظر تھا۔ اس کے بعد سارے بھائیوں کو جشمناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ایک تصویر میں اسماعیلی تاجروں کو آتو دکھایا گیا تھا۔ پھر ایک شخص کنوئیں پر آتا ہے اور اس کے ڈول میں بیٹھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کنوئیں سے باہر آتے ہیں۔ غرض تمام مناظر کی دستاویزی ثبوت کی طرح سامنے تھے۔ بھائیوں کو اپنے مظالم کا ایک ایک لمحہ یاد آتا جا رہا تھا۔ ان کے کروت ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ ضرورت سے زیادہ غلے کی خوشی اچانک کا فور ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا۔ دوسرے نے تیرے کو کہنی ماری۔ سب کی آنکھیں خوف اور دہشت سے چمک اٹھیں۔

”خیریت تو یہ ہے کہ ان تصویروں میں چہرے ہمارے نہیں ہیں۔ اگر حاکم مصر کو یہ معلوم ہو جا تا کہ اس کہانی کے تمام کردار اس وقت اس کے مہمان ہیں تو سوچ کیا ہوتا۔“ رادین نے بڑی عقل مندی کی بات کی۔

”حاکم مصر نے یہ تصویر بنوائی کس سے ہے اور مصور کو ان واقعات کا علم کیسے ہو گیا جو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ مصور کا جھیل ہے یا وہ ان واقعات کا عینی شاہد تھا؟“

”ہو سکتا ہے اسماعیلی تاجروں کے قافلے میں کوئی مصور بھی ہو اور اس کی رسائی فرعون یا حکام کے دربار تک ہو گئی ہو۔ اس سے محل کی آرائش کے لیے تصویریں بنانے کو کہا گیا ہو اور اس نے اس کہانی کو رنگوں اور برش کے ذریعے بیان کر دیا ہو۔ حاکم مصر کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ واقعات حقیقی ہیں۔ اگر مصور نے کچھ بتایا بھی ہو گا تو ہمارے چہرے ان تصویروں میں نہیں ہیں۔“

یہ لوگ بظاہر مطمئن ہو گئے تھے لیکن بنیامین کا کان انان کے دلوں میں شدت سے کھلنے لگا۔

”بنیامین تو اسی محل میں ہے۔ اس نے بھی یہ تصویریں دیکھی ہوں گی۔ اگر اس نے گھر پہنچ کر ابا جان کو بتایا تو ہمارا جھوٹ کھل جائے گا۔ ہم تو یہ کہہ چکے ہیں کہ یوسف کو بھیڑیا لے گیا۔“

ایک مرتبہ پھر بنیامین کے خلاف ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔
 ”بنیامین اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یوسف کی کہانی ایک بار پھر دہرائی جاسکتی ہے۔ بنیامین کو گھر تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔“

”اگر ہم بنیامین کو گھر لے کر نہیں گئے تو اباجان اس مرتبہ ہمیں قطعی معاف نہیں کریں گے۔“

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو بنیامین کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلو۔ ہم راستے میں اسے قتل کر کے کہیں پھینک دیں گے اور دوتے پیٹنے گھر پہنچ جائیں گے۔“

تمام بھائیوں نے یک زبان ہو کر بنیامین کو قتل کرنے کی منظوری دے دی۔ اس فیصلے میں حسد کا وہ جذبہ بھی شامل تھا جو بنیامین کی پذیرائی سے ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

جب بوروں میں اناج بھر دیا گیا تو یہ تمام بھائی جن میں بنیامین بھی شامل تھا، کھانا جانے کے لیے رخصت ہوئے۔ سب بھائی نہایت خوش تھے کہ حاکم مصر نے اعزاز بھی بخشا اور اناج بھی اتنی وافر مقدار میں دے دیا کہ شاید تیسری بار نہ آنا پڑے۔ وہ خوش خوش اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ سرگوشیوں میں یہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے کہ بنیامین کو کہاں اور کس وقت ٹھکانے لگاتا ہے۔

ابھی وہ شہر کے دروازے کے پاس پہنچے تھے اور دروازہ پار نہیں کیا تھا کہ انہیں آوازیں سنائی دیں۔ کوئی انہیں پکار رہا تھا اور چیخ کر انہیں رکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

”کھانا کے قافلے والو! راک جاؤ۔ خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔“

ان آوازوں پر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاہی گھڑسوار سر پٹ دوڑتے آ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر ان سواروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

”ہمیں کیوں روکا گیا ہے جبکہ تمام لوگ اس دروازے سے باہر جا رہے ہیں۔“

”سب لوگوں کو اس لیے جانے دیا جا رہا ہے کہ یہ چور نہیں ہیں جبکہ تم نے چوری کی ہے۔ وہ تو بروقت راز مکمل کیا اور نہ تم تو چلے ہی گئے تھے۔“

”تمہیں ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہم چور نہیں ہیں۔“

”اسان خرا مو شو! ہمارے مالک نے تمہیں اپنا سہمان بنایا، شاہی دسترخوان پر بٹھایا، تمہیں عزت دی اور تم نے یہ صلہ دیا کہ قیمتی شاہی پیالہ چوری کر کے لے آئے۔“

”اے بزدل سپاہیو! ہودہ نہ آگے بڑھ کر انہیں لٹکاؤ۔“ ہم پر چوری کا الزام مت لگاؤ۔ ہمارا باپ پیغمبر ہے اور ہم بہادر ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم لوگوں کی چیزیں چراتے پھریں۔“

”شاہی دسترخوان پر تم ہی تھے۔ تمہارے بعد کوئی نہیں آیا۔ پیالہ تم ہی میں سے کسی نے چھپایا ہوگا۔“

”ہم یہ بے ہودہ الزام برداشت نہیں کر سکتے۔“

”ہر چور جی کہتا ہے۔ تمہارے انکار سے کیا ہوتا ہے۔“

”بات تو بے غیری کی ہے لیکن ہم پھر بھی تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم ہماری تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر لو۔ ہم نے چوری نہیں کی تو پھر ہمیں ڈر کیوں لگے۔“

”تمہیں ہمارے ساتھ شاہی محل واپس جانا ہوگا۔ تلاشی حاکم کے سامنے لی جائے گی تاکہ پیالہ برآمد ہو تو فیصلہ بھی اسی وقت سنایا جاسکے۔“

”جو کچھ کرنا ہے ہمیں کر لو۔ جب ہم نے چوری کی ہی نہیں تو وہاں جا کر بھی کیا نکل آئے گا۔“

شاہی کارندے انہیں واپس لے جانے کے لیے تیار کر رہے تھے جبکہ وہ واپس جانے کو تیار نہیں تھے۔ بالآخر تمام بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا اور واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ سب شاہی محل تک واپس آ گئے۔ حضرت یوسف موجود تھے۔

”ان لوگوں نے قبول کیا؟“

”یہ سب انکار کر رہے ہیں۔“

اس موقع پر یہود وہ آگے بڑھا۔ بڑا تو راہ بین تھا لیکن ہر موقع پر یہود وہ بکدان کی راہنمائی کرتا تھا۔
 ”حاکم مصر کو معلوم ہو کہ ہم اپنی دیانت داری کا ثبوت کئی مرتبہ دے چکے ہیں۔ جب بھائی مرتبہ آئے تھے تو غلطی سے
 نقدی وہاں سے لے کر آئے اور آپ کو وہاں کرنی چاہی۔ کیا یہ ہماری دیانت داری نہیں تھی؟ اسی طرح جب ہم اپنے چھوٹے
 بھائی کا حصہ بھی آپ سے لے کر گئے تو آپ نے شاید یہ سمجھا کہ ہم آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہمارا کوئی چھوٹا بھائی نہیں
 لیکن ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم سچ ہیں۔ اس مرتبہ آئے تو بنیامین کو ساتھ لے کر آئے۔ اس کے بعد بھی ہم پر چوری کا الزام
 لگایا جا رہا ہے۔ ہم نے اگر پیالہ چرایا ہوتا تو ہم اتنے سچے ہیں کہ خود قبول کر لیتے۔ اگر پھر بھی کسی کو شک ہے تو ہمارے سامان
 کی تلاشی لے لی جائے۔“

”اگر وہ پیالہ تم میں سے کسی کے سامان سے نکلا تو اپنی سزا خود تجویز کرو۔ اس شخص کو کیا سزا دی جائے؟“
 ”جناب! اگر ہم میں سے کوئی چور ثابت ہو گیا تو ہمارے قانون کے مطابق وہ ایک سال تک آپ کی غلامی میں
 رہے گا۔“

”مصری قانون تو یہ ہے کہ چور کا سامان ضبط کر کے اسے غلام بن کر دیا جائے لیکن ہم وہی سزا دیں گے جو تم نے ابھی
 بیان کی۔“ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اور کارندوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے سامان کی تلاشی لی جائے۔
 سب سے پہلے یہود کے سامان کی تلاشی لی گئی کیونکہ وہی آگے بڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کے سامان سے کچھ برآمد
 نہیں ہوا۔ پھر شمعون آگے بڑھا۔ وہ بھی چور نہیں نکلا۔

اب تمام بھائی کارندوں کا مذاق اڑاتے جا رہے تھے اور اپنے پورے کھلواتے جا رہے تھے۔
 ”ہم پیغمبر زادے ہیں۔ نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ چور ہیں۔ اپنے حاکم سے بھی کہہ دو کہ وہ ہمارا وقت برباد کر رہا ہے۔
 ہمیں جانے دے، اسی میں بھلائی ہے۔“
 دسوں بھائیوں کی تلاشی لی جا چکی تھی۔ اب صرف بنیامین باقی رہ گیا تھا۔ تمام بھائیوں کے ہونٹوں پر قاتحانہ مسکراہٹ
 تھی کہ ان کی جان تو چھوٹی۔

بنیامین کے سامان کی تلاشی لی گئی تو خلاف توقع یہ پیالہ اس کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ کارندے زور زور سے چیخنے
 لگے۔ ”پیالہ مل گیا..... پیالہ مل گیا۔“
 حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں سے کہا۔

”تم تو کہتے تھے پیالہ تم لوگوں کے پاس نہیں۔ اب یہ دیکھ لو تمہارے ہی بھائی کے پاس سے نکلا۔ ممکن ہے یہ تمہاری
 رضامندی سے رکھا گیا ہو۔“

یہ بھائی اس وقت بھی اپنی شقاوت قلبی سے باز نہیں آئے اور بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔
 ”بنیامین نے چوری کی تو ہمیں کوئی تعجب نہیں کیونکہ اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔“ حضرت یوسف
 علیہ السلام نے یہ سن کر بھی ضبط سے کام لیا اور راز قاش نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں ہی یوسف ہوں۔ میں نے تو کبھی کوئی چوری
 نہیں کی بلکہ ان کو مخاطب کرتے ہوئے کسی اور طرح ان کو سزائے دی۔

”ابھی تو تم لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگ بھی چوری کے قریب تک نہیں گئے یا اب غیر حاضری میں اپنے بھائی پر چوری
 کا الزام لگا رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے۔“

بنیامین کو چونکہ پہلے بتادیا گیا تھا اس لیے اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہیں تھی۔
 ”اب تم بتاؤ تمہارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ اسے مصری قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ اس کا سامان ضبط کر کے غلام بن کر دیا جائے۔“
 ”یہ تو اب ممکن نہیں کیونکہ تم لوگ پہلے ہی سزا تجویز کر چکے ہو۔ اس کا فیصلہ تو کنعانی قانون کے مطابق ہو گا یعنی اسے
 ایک سال کے لیے ہماری غلامی کرنی ہوگی۔“

”اگر آپ کو کوئی کرنا ہے تو ہم میں سے کسی بھائی کو روک لیجیے مگر بنیامین کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے۔“ یہود نے
 جھوڑی دی۔

”اللہ مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ میں ظالم نہیں، انصاف کرنے والا ہوں۔ جس نے چوری کی ہے سزا تو اسی کو ملے گی۔ میں یہ ظلم کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کے بدلے کسی اور کو روک لوں۔“

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے صاف انکار کر دیا تو راہین آگے بڑھا اور خوشامد کرنے لگا۔

”اے میرے خداوند! ذرا اپنے خادم کو اجازت دے کہ اپنے خداوند کے کان میں ایک بات کہے اور تیرا غضب تیرے خادم پر نہ پھڑکے کیونکہ تو فرعون کے مانند ہے۔“

”تو کیا کہنا چاہتا ہے، کہہ کر۔“

”میرے خداوند نے اپنے خادموں سے سوال کیا تھا کہ تمہارا باپ یا تمہارا بھائی ہے؟ اور ہم نے اپنے خداوند سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بوڑھا باپ ہے اور اس کے بڑے بچے کا سہارا چھوٹا لڑکا بھی ہے اور اس کا بھائی مر گیا ہے اور وہ اپنی ماں کا ایک ہی رہ گیا ہے، سو اس کا باپ اس پر جان دیتا ہے۔ تب تو نے اپنے خادموں سے کہا کہ اسے میرے پاس لے کر آؤ کہ میں اسے دیکھوں۔ ہم نے اپنے خداوند کو بتایا کہ وہ لڑکا اپنے باپ کو چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اگر وہ اپنے باپ کو چھوڑے تو اس کا باپ مرجائے گا پھر تو نے اپنے خادموں سے کہا کہ جب تک تمہارا چھوٹا بھائی تمہارے ساتھ نہ آئے تو پھر تم میرا منہ نہ دیکھو گے۔“

”اور یوں ہوا کہ جب ہم اپنے باپ کے پاس جو تیرا خادم ہے، پہنچے تو ہم نے اپنے خداوند کی باتیں اس سے کہیں۔ ہمارے باپ نے کہا پھر جا کر ہمارے لیے اناج مول لاؤ۔ ہم نے کہا ہم نہیں جاسکتے۔ اگر ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ ہو تو ہم جا سکتے ہیں اور تیرے خادم یعنی میرے باپ نے ہم سے کہا تم جانتے ہو کہ میری بیوی کے مجھ سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک تو مجھے چھوڑ ہی گیا اور میں نے خیال کیا کہ وہ ضرور چھاڑ ڈالا گیا ہوگا اور میں نے اسے اس وقت سے پھر نہیں دیکھا۔ اگر تم اس کو بھی میرے پاس سے لے جاؤ اور اس پر کوئی آفت آ پڑے تو تم میرے سفید بالوں کو قبر میں اتار دو گے۔ اب اگر میں اپنے باپ کے پاس جاؤں اور یہ لڑکا ہمارے ساتھ نہ ہو تو چونکہ اس کی جان اس لڑکے کی جان کے ساتھ وابستہ ہے، یہ دیکھ کر کہ لڑکا نہیں آیا وہ مرجائے گا۔ میں اپنے باپ کے سامنے اس لڑکے کا ضامن بھی ہو چکا ہوں۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اگر میں اسے تیرے پاس واپس نہ پہنچا دوں تو میں ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کا گناہ گار ٹھہر گا۔ اس لیے تو مجھے اجازت دے کہ میں اس لڑکے کے بدلے آپ کا غلام ہو کر وہ جاؤں اور یہ لڑکا اپنے بھائیوں کے ساتھ چلا جائے۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی ہو چکی تھی کہ یہ بھائی راستے میں بنیامین کو ضرور نقصان پہنچائیں گے اس لیے راہین کی ایسی پُر اثر تقریر کے بعد بھی آپ نے ان کی دلیل کو قبول نہیں کیا۔

”مجھے یہ قبول نہیں۔ جس نے چوری کی ہے غلامی وہی کرے گا۔ ایک سال بعد بے شک اسے آکر لے جانا۔“

”افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم بنیامین کو لیے بغیر کھان واپس نہیں جاسکتے۔“

”مجھے اس سے غرض نہیں۔ تم مصر میں رہو یا کھان واپس چلے جاؤ۔ بنیامین میرا قیدی ہے، تم اب اس کے متعلق مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس صاف جواب نے سب کو مایوس کر دیا۔ ان کے تو سارے منسوبے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ بنیامین کو بھی یوسف علیہ السلام کی طرح راستے سے ہٹا دیں گے لیکن اب بنیامین کو مصر ہی میں رکنا پڑ رہا تھا۔ اس موقع پر بھائیوں کے درمیان نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ بھائی اس لیے بنیامین کو ساتھ لے جانے پر زور دے رہے تھے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ بنیامین کو واپس لے کر آئیں گے۔ اب ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنیامین کی گمشدگی کا مڑوہ سنا دیں۔ دوسرے کچھ بھائی اس لیے بغض تھے کہ وہ بنیامین کو راستے سے ہٹانے کے درپے تھے۔ مقاصد جدا جدا تھے لیکن اس پر سب متحد تھے کہ بنیامین کو واپس لے کر جائیں گے۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

انسان سادہ پویا شاطر... ہر ایک خوبی کی کوئی نہ کوئی
حد ہوتی ہے اور یہاں تو حسد کی ہی انتہا ہو گئی... جب
چوروں کو پزگئے مور تو گناہ بے لذت والا محاورہ سچا ثابت
ہو گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاطرانہ چال چلنے والوں کا
دلچسپ تھکون۔

ناحق کو نلکے کی دلالی میں کالے ہاتھ کرنے والوں کی بے بسی

شاطر

شا کر لطیف



”ایک اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگرد کو
مارے داؤ سکھلائے مگر ایک آخری داؤ ہمیشہ اپنے پاس بچا
گورکھے تاکہ بغاوت کی صورت میں اپنے شاگرد کو شکست
اے سکے مگر میں نے تو اس اصول کے برخلاف جنہیں اپنے
مارے داؤ سکھادیے ہیں۔“ میں نے اپنے سامنے بیٹھے
ہوئے بروک سے کہا۔
”شاید آپ کی بات درست ہو۔“ بروک نے جواب
دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا آپ سے

بغاوت کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ ایک وفادار شاگرد کے طور پر ہی پائیں گے۔“

میں نے فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا ماضی اس بات کا گواہ تھا۔ وہ پچھلے دو سال سے میرے ساتھ کام کر رہا تھا مگر اس نے بھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی، ابھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ میری نظروں میں ناقابل اعتبار ٹھہرتا۔ ویسے میں نے بھی اسے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ کام کے بعد جتنا بھی مال حاصل ہوتا، میں اسے ہمیشہ برابر کا حصہ دیتا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان چند برسوں میں ہم کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی وفاداری کا اصل امتحان بھی ہوتا جب ہم کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں کامیاب ہو جاتے۔ بظاہر معصوم اور سادہ نظر آنے والے بروک کو وقت کے چھیڑوں نے بہت عیار و مکار بنا دیا تھا۔

میرا نام راجر ہے، میں ایک پیشہ ور ڈکیت و چور ہوں اور برسوں سے یہی کام کر رہا ہوں۔ شادی کا صحیح ہی نہیں پایا تھا اس لیے سر پر اپنے علاوہ کسی کی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ میں طویل عرصے سے اکیلا ہی وارداتیں سرانجام دے رہا تھا مگر پچھرو سال پہلے میری ملاقات بروک سے ہوئی۔ وہ بیس پائیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے ابھی حال ہی میں جرم کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس میں اپنے مقصد کو پالینے کا جذبہ اور جوش تھا۔ میں ایک منجھا ہوا اور تجربہ کار کرمثل تھا جبکہ بروک میرے مقابلے میں بالکل اناڑی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ جوشیلا نوجوان جلد ہی یا تو پکڑا جائے گا یا پھر پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا کیونکہ کسی بھی جرم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جوش کی نہیں، ہوش کی اور ٹھوس پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ جوشیلا پن بھی کسی انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ یہ نوجوان مجھے پسند آیا تھا، اس میں کچھ کمر کرنے کا جنون تھا۔ یہ دلیر اور بہادر بھی تھا، بس کام کے معاملے میں ابھی اناڑی تھا۔ اسے مجھ جیسے کسی مجھے ہونے استاد کی ضرورت تھی جو اس کی اچھے طریقے سے تربیت کر سکتا۔ بروک ایک ایسا ہیرو تھا جسے قہوڑی سی ترش خراش کی ضرورت تھی۔

میں نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ میں نے اسے اپنے مقابل کو زیر کرنے کے تمام کرسکھائے۔ اسلحہ کا استعمال سکھایا۔ مخبر زنی کی تربیت دی اور ہر قسم کے سیف

اور تالے کھولنے کا ماہر بنا دیا۔ وہ میرے ساتھ پچھلے دو سال سے کام کر رہا تھا اور اب وہ بھی میری طرح ایک منجھا ہوا جرم پیشہ بن چکا تھا۔

ہم دونوں امریکا کے شہر میامی کے رہائشی تھے اور علیحدہ علیحدہ فلیٹس میں رہتے تھے۔ عام حالات میں ہماری آپس میں ملاقات بھی کم ہی ہوتی تھی۔ ہم دونوں اب صرف اس وقت اکٹھے ہوتے تھے جب ہمیں کسی واردات کو سرالہام دینے کے متعلق آپس میں صلح مشورہ کرنا ہوتا تھا اور آج میں نے بروک کو اسی سلسلے میں اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ ان دونوں حکومت کی جانب سے جرائم کی روک تھام کے لیے اچھالی سخت اقدامات کیے جا رہے تھے۔ پورے شہر میں جگہ جگہ پولیس کی نفری تعینات کی گئی تھی۔ کوئی بھی واردات سرالہام دینے سے پہلے ہمیں سو مرتبہ سوچنا پڑتا تھا، ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا تھا۔

بروک ابھی جوان تھا، اس کے سامنے ایک لمبی زندگی بڑی تھی مگر میں پچاس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ حال ہی میں شوگر کے مرض میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ صحت پہلے بھی کوئی خاص قابل رکھ نہیں تھی اور شوگر کے اس مرض کے بعد تو جلدی سے گرتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے متنبہ بھی کر رہی تھی کہ میں اب پہلے کی طرح اپنی جسمانی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ آنے والے وقتوں میں مجھے کام کی کٹھن آرام کی ضرورت تھی۔ اب میرے لیے کوئی ایسا ہاتھ مارا ناگزیر ہو چکا تھا جس میں میرے پاس اتنی رقم آجانی کہ مجھے باقی عمر کوئی کام نہ کرنا پڑے۔

میں اس وقت بروک کے سامنے بیٹھا، اس سے اسی سلسلے میں بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے ایک میگزین رکھا ہوا تھا جس میں ایک سابقہ امریکی ماڈل کی ایک تصاویر اور انٹرویو شائع ہوا تھا، مار تھانا می یہ لڑکی کسی دور میں ایک مشہور ماڈل تھی مگر اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ کر گمنا بیوں کے اندجیروں میں گم ہو چکی تھی اور اب ایک طویل عرصے بعد اس کی تصاویر اور انٹرویو کی جلدیے کی زد میں بنے تھے مگر میری توجہ کا اصل مرکز وہ ماڈل نہیں تھی بلکہ اس کے گلے میں موجود ایک بیش قیمت ہیروں کا نیپکس تھا۔ اس نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ یہ نیپکس اسے اس کے مرحوم شوہر نے تحفے میں دیا تھا۔ اس کی موجودہ قیمت کم از کم ایک لاکھ ڈالرز تھی۔ جلدیے نے اس نیپکس کی بھی ایک تصویر علیحدہ سے شائع کی تھی۔ یہ سفید رنگ کے ہیروں کا ایک خوبصورت نیپکس تھا اور اس کا ڈیزائن امریکا میں بہت

گیا جاتا تھا۔

دولت مند بننے کا ایک موقع دیا ہے، اس چانس سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔

”مارتھا کے بیٹکے میں سی سی ٹی وی کمرے بھی موجود ہو سکتے ہیں۔“ بروک نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

”مجھے وہاں کمرے نظر نہیں آئے۔“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر کمرے ہمارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہم ان سے بچنے کے لیے چہرے پر ماسک کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ کمرے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم اس کام کے بارے میں ذہنی طور پر کچھ ٹھیکو ہو۔“ شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لیے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہا۔“

”تو پھر مجھ پر بھروسہ رکھو۔“ میں نے تھپی لہجے میں کہا۔ ”یقین کرو اس شخص سے حاصل ہونے والی رقم سے ہماری زندگی بہت سہل اور آسان ہو جائے گی اور باقی کی زندگی ہمیں کوئی اور واردات کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی نہ بھی پکڑے جا سکیں۔ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ میں تو خیر بڑھاپے کی دلچیز پر قدم رکھ چکا ہوں، اپنی زندگی کی جوانی بھی انجوائے کر چکا ہوں مگر تمہاری جوانی جیل میں برباد ہو جائے گی۔ میری بات مان لو، ایک ہی بار میں کوئی بڑا ہاتھ مارنا اب ہمارے لیے ناگزیر ہو چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے!“ اس نے ایک گہری سانس لیے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی۔ ”مگر یہ ہماری آخری واردات ہوگی۔ میں اب اس کام کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد میں اس شہر کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا، کسی ایسی جگہ جہاں میرے ماضی کا سایہ بھی نہ چٹکے۔ میں اب شادی کر کے خطرات کی دنیا سے دور ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“

”تم اپنی زندگی کے تمام فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔“ میں نے اسے رضامند ہوتے دیکھ کر دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر پرسکون زندگی کے لیے بھی پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس شخص کو فروخت کرنے کے بعد حاصل شدہ رقم سے تمہیں حسب معمول پچاس فیصد دینے کا پابند ہوں۔“

پچاس فیصد حصے کا سن کر بروک نے میرے چہرے کی جانب بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر لہجہ بھر کے لیے عجیب سے تاثرات ابھرے جو فوراً ہی معدوم ہو گئے۔ تاہم اس

یہ انٹرویو چند دن پہلے کا تھا اور میں اس وقت تک مارتھا ای اس ماڈل کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس کی اولاد نہیں تھی اور وہ اسی شہر میں اپنے ایک وسیع و عریض گھر میں صرف ایک سیکورٹی گارڈ کے ہمراہ رہتی تھی۔ میں نے اس کے وسیع و عریض بیٹکے کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس شخص کو ٹھوس سی گف دود کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ گئی اس کو فروخت کرنے کی بات تو بلیک مارکیٹ میں اس کی فروخت بھی پھرے جیسے آدمی کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

میں اس وقت بروک کو اپنے پلان کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کچھ معترض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بہت مشکل کام ہے اور ہمیں بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑے گا۔ مارتھا ایک سابقہ مشہور ماڈل تھی، اس کے گھر سے اتنے قیمتی ٹیکس کا مگن پوائنٹ پر چھن جانا کوئی معمولی واقعہ تصور نہ ہوگا۔ پولیس مجرموں کا سراغ لگانے کی پہلی کوشش کرے گی۔ ہم دونوں بھی پولیس کی گرفت میں آجائے آئے تھے اور بروک کا خیال تھا کہ اس بار ہم اپنی دولت سے بڑا ہاتھ مارنے جا رہے ہیں اور کوئی بھی جرائم پیشہ ایسی وقت پولیس کی گرفت میں آتا ہے جب وہ اپنی دولت سے باہر ہو جاتا ہے۔ امریکا جیسے ملک میں کسی کو گن ہائٹ پر لوٹا کسی سنگین جرم سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ ایسا کرنا پھرے اور بروک کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر بروک کا خیال تھا کہ مارتھا کے کیس کو پولیس عام کیس کی طرح ڈیل نہیں کرے گی۔

”آخر تمہیں میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی؟“ نے اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام بظاہر جتنا مشکل نظر آ رہا ہے، اتنا مشکل ہے نہیں۔“ ”اتنا آسان بھی نہیں ہے۔“ اس نے حنفیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اور پھر ہم نے ہمیشہ باہر لوٹا ہے، کسی کے گھر میں داخل ہو کر یہ ہماری پہلی واردات ہوگی۔ ہمیں اس سے بچنا پڑے گا۔“

”میں اس بیٹکے کا اچھی طرح جائزہ لے چکا ہوں۔ یہ ایک ماڈل سے قدرے ہٹ کر واقع ہے اور یہ بات ہمارے دل میں جاتی ہے۔ ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر آسانی سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ گئی اس سیکورٹی گارڈ کی بات اس کا زیادہ تر وقت گیٹ کے پاس موجود سکیورٹی میں گزرتا ہے اس پر قابو پانا بھی زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ قسمت نے ہمیں

”کل دیک اینڈ“ ہے اور بارہا نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ دیک اینڈ وہ ہمیشہ اپنے گھر میں اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں ہی گزارتی ہے۔ ”میں نے جواب دیا۔
 ”اچھی بات ہے۔“ بروک منجھ خیر لہجے میں بولا۔ ”وہ اس بار ہم اس کی یادوں میں مداخلت کرنے جا رہے ہیں۔“
 ”ہاں!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کل ہم اس کی زندگی سے یہ یکسانیت ختم کر دیں گے۔“

”اوکے تو پھر اجازت دیں۔“ بروک نے اٹھنے ہوئے کہا۔ ”میں کل رات نو بجے کے قریب آپ کو پک کر لوں گا۔ ابھی مجھے بھی تیاری کرنا ہے۔ سب سے اہم کام اس وقت یہ ہے کہ کل کی واردات میں استعمال کرنے کے لیے کوئی گاڑی بھی اڑانی ہے۔“

”ہاں.....“ میں نے کھینچی لہجے میں کہا۔ ”مگر گاڑی چوری کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ عام سے مال کی ہوتا کہ فوری طور پر چیک نہ ہو سکے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ بروک نے جواب دیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کر کے فلیٹ کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا جبکہ میں پُر خیال لگا ہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ بروک اس کام کو سرانجام دینے کے لیے رضامند ہو جائے گا۔ اس لیے میں اپنی تیاری پہلے سے ہی کر چکا تھا۔ اب کل اس کام کو منطقی انجام تک پہنچانا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ بروک چوری کی کار کے ہمراہ میرے پاس پہنچ جائے گا۔ کسی کار کو اڑانا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

اگلے دن رات تک میں اپنے گھر پر ہی موجود رہا۔ اب رات کے نو بجتے والے تھے اور بروک کی آمد کا وقت ہو رہا تھا۔ اس وقت میں آرام سے کرسی پر براجمان کافی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس منصوبے کے مضمرات پر غور کر رہا تھا۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب رہتا تو لاکھوں ڈالر کا مالک بن جاتا لیکن ناکامی اور پکڑے چالے کی صورت میں بروک اور مجھے کم از کم چھ سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑ سکتا تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بھی واردات سرانجام دیتے وقت اگر ٹھوس پلاننگ کی جائے اور ہر پہلو کا جائزہ لیا جائے تو پکڑے جانے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ میری نظر سے آج تک جتنے افراد کے پکڑے جانے کے واقعات گزرے تھے، ان کے منصوبے میں ٹھوس پلاننگ کا فقدان تھا۔ بس جذباتی انداز میں جلد بازی سے

کے چہرے پر چند ثانوں کے لیے ابھرنے والے تاثرات بھی مجھے چوکانے کے لیے کافی تھے۔
 مجھ میں ایک خوبی تھی اور وہ یہ کہ میں کسی کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگا لیتا تھا اور مجھے اپنی چہرہ شناسی پر بڑا ناز تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے تھے جیسے اس بار وہ بچا پس فعد سے کچھ زیادہ کا طالب تھا۔ کہیں وہ پورے کا پورا نیکس ہڑپ کرنے کے بارے میں تو پلان نہیں بنا رہا تھا؟ میں نے سوچا۔ اگرچہ اس نے ماضی میں کبھی میرے بھروسے کو نہیں پہنچائی تھی مگر میں جانتا تھا کہ جرم کی دنیا میں اعتبار اور بھروسا جھ میں موجود ریت کی طرح ہوتا ہے جسے جتنا مضبوطی سے پکڑو، وہ اتنا ہی ہاتھ سے پھسلتی چلی جاتی ہے۔ بروک کے چہرے سے بھی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کی نیت میں فتور آ گیا ہو۔ شاید اس لیے کہ اس بار معاملہ پانچ لاکھ ڈالر کا تھا اتنی بڑی رقم کے لیے اس کی تو کیا میری اپنی نیت بھی خراب ہو سکتی تھی۔ بات جو بھی تھی، میں دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس سے محتاط رہوں گا۔

”ٹھیک ہے تو پھر ہم کل رات یہ واردات سرانجام دیں گے۔“ میں نے اسے رضامند ہوتے دیکھ کر کہا۔ ”میں تمام تیاری کر چکا ہوں صرف تمہاری رضامندی درکار تھی۔ میں کل رات تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہارے ذمے اب یہ کام ہے کہ تمہیں کل کوئی گاڑی چوری کرنی ہے اور میرے پاس آنے سے پہلے اس کی نمبر پلیٹ بھی تبدیل کرنی ہے تاکہ فوری طور پر پکڑے جانے کا خطرہ نہ رہے۔ ہم مارٹا کے گھر تک اس گاڑی پر ہی جا رہیں گے اور واردات کے بعد وہاں ہی میں اسے کہیں چھوڑ دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں کار کا بندوبست کر لوں گا۔“ بروک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اپنا ریوالور بھی اپنے پاس رکھنا۔“ میں نے رسائی سے کہا۔ ”ناگزیر حالات کے بغیر ہم کوئی نہیں چلا سکیں گے۔ ہم نے آج تک جہاں بھی واردات کی ہے، ڈرامہ کا کردار ہی کام نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس آخری واردات میں بھی ہمارا ریکارڈ برقرار رہے سکیورٹی گارڈ کو بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم سے تر کیا گیا رو مال بھی اپنے ساتھ لے لیتا۔“

”اوکے! میں سارا بندوبست کر لوں گا مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل مارٹا اپنے گھر پر ہی موجود ہوگی؟“ بروک نے استفسار کیا۔

واردات سرانجام دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں اپنے پلان کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ کہیں کوئی جھول نہیں تھا اس لیے میں کامیابی کے لیے خاصا پُر امید تھا۔

نو بجے مجھے باہر گاڑی کے مخصوص بارن کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ بروک آچکا ہے۔ میں نے اپنا رین کوٹ پہنا اور پھر فلیٹ کو تالا لگا کر باہر نکل آیا۔ بروک نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایک عام ماڈل کی گاڑی ہی اڑائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک پولیس گاڑی کو باقاعدہ روک کر چیک نہ کرتی، ہمارے پکڑے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ میں نے کار کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ بروک نے کار آگے بڑھادی۔

”کار کہاں سے چوری کی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کار میں نے اپنے ہمسایوں کے گیراج سے چوری کی ہے۔“ بروک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ پوری

فیلی اپنی دوسری گاڑی پر پکنک منانے والا سکا مٹی ہوئی ہے۔ اس لیے گاڑی کی فوری چوری سے بھی بے خبر ہے پھر بھی میں نے احتیاط کے طور پر اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی ہے۔“

”اور ریو اور کلورڈ فارم سے ترک کیا گیا رومال؟“ میں نے گاڑی کے بارے میں اس کی وضاحت سے مطمئن ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

”میرے کوٹ کی جیب میں ہیں۔“ اس نے بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

”ہمیں اب پوری طرح محتاط رہنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم گاڑی مار تھا کے ہنگلے سے کچھ دور کھڑی کریں گے اور پھر پیدل چلتے ہوئے ہنگلے کے قریب جائیں گے۔ اگر وہ سیکورٹی گارڈ اپنے کمین کے اندر موجود ہوا تو اس پر قابو پانے میں آسانی رہے گی اور ہم کسی کی نظروں میں بھی نہیں آئیں گے۔ اسے بے ہوش کرنے کا فریضہ تم سرانجام دو گے جبکہ میں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراؤں گا۔ وہ سیکورٹی

”آپ اس معاملے میں تسلی رکھیں۔ میں اسے سنبھالنا موقع بھی نہیں دوں گا۔“ بروک نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”اوکے تو پھر کام کا آغاز کرتے ہیں۔“ میں نے آخری بار اس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ربڑ کے دستانے اور چہرے پر پہننے والا ماسک نکال کر پہننا شروع کر دیا۔ بروک نے بھی میری تقلید کی۔

ہاتھوں میں دستانے اور چہرے پر ماسک پہن کر ہم دونوں تیزی سے گاڑ کے کینن کی جانب بڑھے۔ بروک کینن کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے رین کوٹ کی جیب سے کلورو فارم سے ترکیا ہوا رومال بھی نکال لیا تھا۔

”کیا اندر کوئی ہے؟“ میں نے کینن کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔

”کون ہے؟“ اندر سے ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی اور پھر سکیورٹی گاڑ کینن کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ میرے ماسک زدہ چہرے کو دیکھ کر اسے فوراً ہی خطرے کا احساس ہوا اور اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے کندھے پر لٹکی گن کی طرف بڑھا مگر اسے دیر ہو چکی تھی کیونکہ دیوار کے ساتھ چپکے بروک نے پھرتی سے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے مضبوطی سے رومال والا ہاتھ اس سکیورٹی گاڑ کے منہ پر رکھ دیا۔ اس ناگہانی افتاد پر سکیورٹی گاڑ نے جھکا دے کر اپنے چہرے سے بروک کا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر بروک کی گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ سکیورٹی گاڑ کچھ ہی دیر میں بے ہوش ہو کر بروک کے ہاتھوں میں جمول گیا۔ رومال پر افرقہ مقدار میں کلورو فارم انڈیلا گیا تھا اس لیے اس کا اثر بھی خاصا تیزی سے رونما ہوا تھا۔ بروک اور میں نے سکیورٹی گاڑ کے دھماکے سے بے خبر وجود کو اٹھایا اور کینن کے اندر لاکر دہاں موجود کر سی پرائڈ جسٹ کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ اب وہ چھ سے سات گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ہم اس واردات کا سب سے مشکل مرحلہ کسی کی نظروں میں آنے بغیر طے کر چکے تھے اور اب دوسرا مشکل مرحلہ طے کرنا تھا۔ ہمیں اب مارا تھا کے ہنگلے میں داخل ہو کر اسے اتنی تیزی سے قابو کرنا تھا کہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اور بروک اس مشکل مرحلے کو بھی بخوبی طے کر لیں گے۔

”میرے خیال میں اب اندر داخل ہونا چاہیے۔“ بروک نے رومال اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

گاڑ خاصا مجسم اور نومند ہے اس لیے بہت احتیاط اور تیزی سے اس پر قابو پانا ہوگا۔ اگر اسے سنبھالنے کا موقع مل گیا تو ہم خاصی مشکل صورت حال سے دوچار ہو جائیں گے۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اسے قابو کرنا ہمارے کام کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ ہے۔“

”میں یہ تمام باتیں سمجھتا ہوں۔“ بروک نے غصے سے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اس سکیورٹی گاڑ پر آسانی سے قابو پاؤں گا۔ کلورو فارم کی وجہ سے مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی ورنہ آپ نے مجھے ایسے داؤد بھی سکھائے ہیں کہ میں اس سیال کے بغیر بھی اسے بے ہوش کر سکتا ہوں۔“

”اسی لیے تو میں خود کو ایک اچھا استاد نہیں مانتا۔“ میں نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔ ”کیونکہ اچھا استاد کبھی اپنے شاگرد کو اپنے سارے داؤد نہیں سکھاتا۔“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے بھی اپنے کچھ داؤد بچا کر رکھے ہوں۔“

میں نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ مارا تھا کا ہنگلا اب خاصا قریب آ گیا تھا۔ بروک نے ایک سائڈ پر جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ ہمیں اب پیدل آگے بڑھنا تھا۔ میں اور بروک گاڑی سے باہر نکل آئے جہاں سرد اور خون نچھد کر دینے والی ہوائے ہمارا استقبال کیا۔ آج سردی بھی شاید معمول سے زیادہ تھی مگر اس کا ایک فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور کام کے وقت آس پاس کسی کا نہ ہونا ہمارے لیے اچھا شگون تھا۔

ہم نے مارا تھا کے ہنگلے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اب ہم ہنگلے کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ سکیورٹی گاڑ نظر نہیں آ رہا تھا تاہم اس کے کینن کی تھقی مل رہی تھی۔ شاید سردی کی شدت نے اسے بھی کینن میں گھسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”اب عملی کام کا وقت شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے بروک سے کہا۔ ”تم دبے پاؤں چلتے ہوئے کینن کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں سامنے جا کر اسے آواز دوں گا۔ وہ کینن کا دروازہ کھول کر باہر آئے گا تو اس کی پوری توجہ مجھ پر مرکوز ہوگی اور یہی تمہارا بے لیے بہترین موقع ہوگا۔ مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کلورو فارم والا رومال مضبوطی سے اس کے منہ پر جمانا ہے تاکہ وہ فوری طور پر بے ہوش ہو جائے۔“

پر پہنچ جائیں، ورنہ ہمارا سا راپلان ہی ٹپل ہو جاتا۔ مجھے اب اس بات کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں مار تھا ہماری موجودگی سے باخبر تو نہیں ہو گئی مگر ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میرا یہ غدر شغل غلط ثابت ہو گیا۔

مار تھا بیڈ پر گردن تک لفاف اوڑھے دنیا واپس ہمارے بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں الکل کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی جبکہ بیڈ کے ایک سائڈ پر مشروب کی آدمی خالی بوتل اور دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔

”ہاں چلو۔“ میں نے کہا اور پھر کینن سے باہر نکل آیا۔ بروک بھی میرے ہمراہ تھا تاہم باہر آنے سے پہلے وہ کینن کی لائٹ آف کرنا نہ بھولا۔ کینن کا دروازہ بھی اس نے بند کر دیا تھا۔ اس وقت ہمارے چہروں پر ماسک موجود تھے، ایسی حالت میں کسی کی نظروں میں آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمیں اب جلد از جلد کام فٹنا کر یہاں سے لگنا تھا۔ دھند میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا جس کی وجہ سے حد تک اب خاصی کم ہوتی جا رہی تھی۔ گویا یہ دھند ہمیں کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ فراہم کر رہی تھی۔

ہم دونوں اب گیٹ کے ساتھ موجود دیوار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں اب بڑھاپے میں قدم رکھنے کی وجہ سے خاصا فریب ہو چکا تھا۔ اس دیوار پر چڑھنا میرے بس سے باہر تھا تاہم بروک ابھی بھر پور جوان اور فٹ تھا اس کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ اس نے ایک نظر دیوار کی اونچائی کا جائزہ لیا اور پھر ایک ہی چھلانگ میں اس کے ساتھ دیوار پر مضبوطی سے جم گئے۔ اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور اس کا مہم تیزی سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اندر کودتے ہی اس نے اندر سے بند میں گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا تو میں بھی تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ بروک نے دروازہ دو بارہ بند کر دیا۔ اب ہم مار تھا نامی اس ماڈل کے وسیع و عریض بیٹکے کے صحن میں کھڑے تھے۔ ہم نے صحن عبور کیا تو بیٹکے کا اندرونی کھڑکی کا باہر خوب صورت دروازہ بھی متقلل پایا۔ اس پر مخصوص طرز کا لاک لگا ہوا تھا جسے چابی کی مدد سے دونوں اطراف سے ہٹا لیا گیا کھولا جاسکتا تھا۔ اس لاک کو چابی کے بغیر بھی کھولنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

نقشب زنی میرا پیشہ تھا۔ مختلف قسم کے تالوں کو کھولنا ہمیشہ سے میرا شوق رہا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تار نکالا اور اس لاک کو کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ بروک خاموشی سے میرے پاس کھڑا ہوا تھا۔

آخر کار میری کوشش بار آور ثابت ہوئی اور میں اس لاک کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں میری یہی کوشش رہی کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ باوی انٹھر میں یوں لٹکے ہوئے رہا تھا جیسے یہ گھر نہ ہو کوئی ہوٹل ہو۔ ہم نے دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کوئی کمرہ بھی متقلل نہیں تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ ماڈل ہماری موجودگی سے باخبر ہوئی، ہم اس کے سر

قارئین متوجہ ہوں

پچھا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ سبلی کیسز

سپینس جاسوسی پائیز، گزشت

0301-2454188

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

میں کہا۔

”وہ میکلس تو میں نے بینک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔“ تھپڑ نے مارتھا کے اوسان خطا کر دیے تھے مگر وہ اب بھی حرا سنا نہ روئیا اپناٹے ہوئے تھی اور میکلس کی موجودگی سے انکاری تھی۔

”بکواس بند کرو۔“ بروک نے غراتے ہوئے کہا۔
”تم نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا تھا کہ وہ میکلس ہمیشہ تمہارے پاس موجود رہتا ہے۔ سیدھی طرح بتا دو ورنہ میں اس پستول کی ضربات سے تمہارا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔“
مارتھا نامی وہ ماڈل اب بڑھاپے میں قدم رکھ چکی تھی مگر قریبی تو بہر حال ایک عورت ہی اور عورت اپنے چہرے کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے۔ چہرہ بگاڑنے کی دھمکی اڑ دکھائی۔

”بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔“ مارتھا نے کھست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”وہ میکلس میرے پاس ہی ہے مگر پہلے وعدہ کرو کہ میکلس لینے کے بعد تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔“
”ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“ اس بار میں نے کہا۔ ”ہمیں خواہ مخواہ کسی کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں۔“
”ٹھیک ہے، میں تمہیں میکلس دے دیتی ہوں۔“
کہتے ہوئے اس نے اپنے بچکے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھوں میں ایک جینگا تا ہوا میکلس آ گیا۔

بروک نے میکلس لینا چاہا مگر میں نے پہلے ہی مارتھا کے ہاتھ سے میکلس جھینپتے ہوئے اسے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ میری اس حرکت سے بروک کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات نمایاں ہو گئے تاہم وہ خاموش رہا۔
”بروک! ہمیں اب یہاں سے لکھنا چاہیے۔“ میں نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ بروک نے اپنا رپو ایلور دوبارہ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور پھر جیب سے گھور وقار م سے اٹھ کھڑا ہوا۔
”اٹھنا! فوراً ہی اپنا اثر دکھایا اور مارتھا چل کر بیڈ پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ بھی گاڑ کی طرح چھ سے سات گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔

ہم اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے۔ ہیروں کا وہ چیل میکلس میری جیب میں تھا۔ اب وہاں سے لکھنا ہی بھر تھا۔ میں اور بروک مارتھا کو اسی حالت میں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ مین گیٹ کو کھول کر ہم باہر نکلے تو دھند کی شدت میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے

میں اور بروک اس کے بالکل پاس پہنچ گئے۔ میں نے ایک جھپٹکے سے اس کا کیبل ہٹا دیا مگر شاید وہ ضرورت سے زیادہ نشے میں تھی۔ وہ ذرا سا کسمائی مگر اس کی غیند میں کوئی فرق رونما نہ ہوا اور چہرے پر یکساں اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ وہ شاید نشے میں دھت ہو کر ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

بروک نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر مارتھا کو زور زور سے ہلانا چلانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے اپنا رپو ایلور بھی نکال لیا تھا۔ ہم اب اس کی مزید غیند کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں اب اس سے یہ اگھوانا تھا کہ اس نے اپنا بیٹیکس میکلس کہاں رکھا ہوا ہے۔

بروک کے زوردار انداز میں ہلانے پر مارتھا نے کسل مندانہ انداز میں انگڑائی لی اور پھر اپنی آنکھیں کھول دیں۔
میرا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں خمار کے دورے تیر رہے تھے۔ اسے لاشعور سے شعور کی منزلیں طے کرنے میں چند لمبے لگے۔ شعور میں آتے ہی اس نے مجھے اور بروک کو بے یقینی کے عالم میں دیکھا اور پھر خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہمارے ماسک زدہ چہرے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات عموماً آتے تھے۔

”کون ہو تم اور میرا سیکورٹی گارڈ کہاں ہے؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔

”اسے ہم نے گولی مار دی ہے۔“ بروک نے سرد اور ساٹ آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ ”اور اب ہم تمہیں بھی گولی مار دیں گے۔“

”نہیں نہیں، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ مارتھا ایک ہی دم کی جھمکی میں تھر تھر کانپنے لگی۔ بروک کا گاڑ کو مار دینے کا جھوٹا خاصا موثر ثابت ہوا تھا۔

”ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔“ اس بار میں بولا۔
”بشرطیکہ تم ہمیں اپنا پیرول کا میکلس دے دو۔“

”کون سا میکلس؟“ اس کے معصومانہ جواب پر میرا خون کھول اٹھا جبکہ بروک نے اس کے چہرے پر ایک زوردار چپڑ رسید کر دیا۔ چپڑ خاصا زوردار تھا اور بروک نے مارتھے وقت بے خیال بھی نہ کیا تھا کہ مارتھا صنف نازک کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا منہ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

”سیدھی طرح بتاتی ہو یا تمہارے سر میں بھی تمہارے گاڑ کی طرز کا ایک سوراخ کر دوں۔“ بروک نے اپنا رپو ایلور نکال کر مارتھا کی کپٹی پر رکھتے ہوئے غصیلے لہجے

”یہ تم اچھا نہیں کر رہے، بروک!“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم پر برا مان تھا مگر آج تم نے میرا مان توڑ دیا ہے۔“

”استاد محترم!“ اس نے اپنی عادت کے مطابق میرے لیے استاد محترم کے الفاظ ہی استعمال کیے۔

”یہ جرم کی دینا ہے اور یہاں بھروسہ اور اعتماد محض افسانوی باتیں ہوتی ہیں، بس جس کو جہاں موقع ملا اس نے وہاں فائدہ اٹھالیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس گاڑی کو بھی میں کچھ آگے جاکر چھوڑ دوں گا۔ اس ٹیکس سے حاصل ہونے والی رقم سے میں اپنی ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کاری فرنت سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر گاڑی اشارت کر کے اسے آگے بڑھا لے گیا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا ہوا دیر میں اس کی کار میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دھند کی وجہ سے دیکھنے پر زیادہ دور تک دیکھنا ناممکن نہ تھا۔ بروک جا چکا تھا۔ شاید یہ میری اور اس کی آخری ملاقات تھی۔ وہ ایک نئی منزل کی تلاش میں چلا گیا تھا اور اب مجھے بھی ایک نئی منزل تلاش کرنا تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں موجود بڑے کے دستانے ایک طرف پھینکے اور پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اپنے قلیب پر پہنچ کر میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور پھر قلیب کا لاگت کھول کر اندر آ گیا۔ کم از کم آج کی رات تو یہاں بسر کی جاسکتی تھی تاہم پھر بھی میں نے اپنا ضروری سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ بروک فوری طور پر اس ٹیکس کو فروخت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اس معاملے کے ٹھنڈا... ہونے کا انتظار کرے گا کیونکہ مارچا ایک مشہور ماڈل تھی۔ یہ بات جتنی بھی کہ پولیس پوری تندی سے ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی۔ بہر حال چند دن بعد جب بھی وہ اس ٹیکس کو فروخت کرنے کی کوشش کرتا، اسے اندازہ ہو جاتا کہ اس کے استاد نے اپنے شاگرد کو سارے داؤ بیچ سکھائے تھے مگر ایک آخری داؤ اپنے پاس بھی بچا کر رکھا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ جرم کی دنیا میں بھروسہ، اعتبار محض افسانوی باتیں ہوتی ہیں۔

میں اس ٹیکس کو پہلے ہی بڑے کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ میں اس ٹیکس کی تصویر بھی دیکھ چکا تھا، اس کا ڈیزائن بہت مشہور اور عام تھا اس لیے مجھے اس تصویر کی شکل کا نقل

اس جانب بڑے جدھر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ مارچا کے ہنگے سے کچھ دور ہوتے ہی ہم نے اپنے چہرے پر موجود ماسک اور ہاتھوں میں موجود بڑے کے دستانے اتار کر اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ ابھی تک ہمارا سارا کام منصوبے کے عین مطابق ہی ہوا تھا۔ کچھ دور پیدل مارچ کے بعد ہم اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ قیمت یہ تھی کہ ہمارا پولیس کی کسی مشکئی گاڑی سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ایسی کسی صورت میں پولیس والے اگر ہم سے مشکوک ہو جاتے تو ہمارے لیے خاصے مسائل کھڑے ہو جاتے۔ اس وقت آس پاس کا علاقہ بالکل سناہن و بیابان نظر آ رہا تھا۔ شاید سخت سردی نے یہاں کے باسیوں کو گھروں میں مقید ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے جیسے ہی گاڑی کی فرنت سیٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ایک خلاف توقع بات ہوئی۔ بروک نے ایک تخت اپنا ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والی سفاکی اور بیگانگی نے مجھے بھی ہاتھ اوپر کرنے پر مجبور کر دیا۔

”معاف کرنا دوست! ہمارا مشترکہ سفر یہاں پر تمام ہوا۔ اپنا ریوالور اور ٹیکس جیب سے نکال کر آرام سے گاڑی کے بونٹ پر رکھ دو اور خود چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں پرانے تعلق کا احساس کرتے ہوئے آپ کو زندہ چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر آپ نے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں ایک لمحے کے لیے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“

بروک کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ میں اس کی سفاک طبیعت سے بھی بخوبی آگاہ تھا اس لیے میں نے ملا تامل اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا ریوالور اور ٹیکس کوٹ کی جیب سے نکال کر گاڑی کے بونٹ پر رکھ دیے اور خود چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بروک نے آگے بڑھ کر دونوں چیزوں کو اپنی جیب میں منتقل کر لیا تاہم ایسا کرتے ہوئے بھی وہ مجھ سے غافل نہ تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ریوالور بدستور مجھ پر تان رکھا تھا۔ وہ میرا ہی شاگرد تھا شاید اسی لیے مجھ سے بہت زیادہ محتاط تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں اب خاصا فربہ ہو چکا تھا۔ اس تیز رفتاری سے ایکشن میں نہیں آسکتا تھا جیسا جوانی کے دنوں میں آتا تھا۔ میرے برعکس بروک کو جوان اور پھرتلا تھا۔ میری مزاحمت کی کوئی بھی کوشش مجھے کسی ناقابل حلف نقصان سے دوچار کر سکتی تھی اور پھر مقابلہ بھی برابری کا نہ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مثل تھا جبکہ میں نہبتا تھا۔

میکس ڈھونڈنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ مارکیٹ میں اس ڈیزائن کے نقلی میکس عام دستیاب تھے۔ میں بروک کو ڈان دینے کا پورا پلان بنا چکا تھا۔ جب ہم مارتھا کے گھر واردات کے لیے گئے تھے تو وہ نقلی میکس پہلے سے ہی میرے کوٹ کی جیب میں موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مارتھا نے اپنا میکس ہمارے حوالے کیا تو میں نے بروک سے پہلے ہی اسے چھپ کر اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کر لیا۔

میرا پلان تو یہ تھا کہ جب بروک مجھے فلیٹ پر ڈراپ کرے گا تو میں نقلی میکس اس کے حوالے کرتا اور اس سے کہتا کہ اسے اپنے سیف میں اس معاملے کے ٹھنڈا ہونے تک محفوظ رکھے۔ بروک میکس لے کر مطمئن ہو جاتا اور میں اس دوران اصلی میکس کے ہمراہ کہیں دور نکل جاتا..... ایسی جگہ جہاں بروک مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔

میرے اس پلان میں کچھ تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب بروک نے اچانک مجھ پر یو الورٹان لیا۔ بہر حال میرا پلان اگرچہ کچھ تبدیلی سے دوچار ہوا تھا لیکن کامیاب رہا تھا۔ میں نے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے بروک کو نقلی میکس قصدا دیا تھا۔ اسے آخری وقت تک اس تبدیلی کا احساس نہ ہوسکا اور ہوتا بھی کیسے..... آخر اس کے مقابلے پر اس کا استاد محترم موجود تھا۔ وہ رات میں بڑے پرسکون انداز میں سویا۔ رات بھر ایک پرسکون اور آرام دہ زندگی کے خواب دیکھتا رہا۔ صبح میری آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ میں نے کافی بنائی اور پھر بیڈ کے ساتھ صوفے پر پڑے کوٹ میں سے اصلی میکس نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت خبروں کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ایک سائڈ پر پڑے ریسیوٹ سے ٹی وی آن کر دیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت معروف سابقہ ماڈل کے گھر ہونے والی ڈکیتی کی واردات ہی خبروں کی زینت بنی ہوئی تھی۔

ٹی وی چینل کا ایک نمائندہ مارتھا کا انٹرویو کر رہا تھا۔ مارتھا کے منہ کا ایک حصہ ابھی تک سوجھا ہوا تھا جسے میک اپ سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

”میڈم مارتھا! آپ کو اتنے قیمتی میکس کی چوری کا دکھ تو ہوا ہوگا۔ کیا آپ نے اس کی انشورنس وغیرہ کروا رکھی تھی؟“ چینل کے نمائندے نے مارتھا سے سوال کیا۔

”نہیں، میں نے انشورنس نہیں کروائی ہوئی لیکن مجھے کسی قسم کا بے فوس نہیں ہے کیونکہ میرا میکس بالکل محفوظ ہے۔ میں پولیس کو بھی اپنا بیان ریکارڈ کروا چکی ہوں۔“

”کیا مطلب میڈم؟ کیا آپ کا میکس چوری نہیں ہوا؟ کیا گن پوائنٹ پر ڈاکو آپ سے کچھ ٹکوانے میں ناکام رہے تھے؟“ مارتھا کے جواب نے چینل کے نمائندے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”بہسے بہت سے دوست مجھے مشورہ دے چکے تھے کہ میں اس قیمتی میکس کو بینک لاکر میں رکھوا دوں کیونکہ یہ جرائم پیشہ افراد کے لیے باعث کشش ہے۔ میرے اپنے ذہن میں بھی اس میکس کے چھپ جانے کا خطرہ موجود تھا اس لیے میں نے احتیاط کے طور پر ایک نقلی میکس بھی تیار کر دیا تھا جسے ہمیشہ میں اپنے کپڑے کے نیچے رکھ کر سونتی جبکہ اصلی میکس میں بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ اگرچہ یہ نقلی میکس میں نے اپنے ذہن میں موجود چھپے ہوئے نفسیاتی خوف کی وجہ سے ہی تیار کر دیا تھا لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا یہ خوف ایک دن حقیقت کا روپ دھار جائے گا۔ بہر حال میں نے ڈاکوؤں کے سامنے خوفزدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی اور انہیں ڈان دینے میں بھی کامیاب رہی۔ وہ نقلی میکس لے کر چلے گئے۔ میں اور میرا سیکورٹی گارڈ خوش قسمت ہیں کہ ہماری جان محفوظ رہی۔“

میں نے ریسیوٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ تو گویا میرا میکس بھی نقلی تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ شاطر انسان پورے امریکا میں نہیں ہے۔ مجھے اپنی ذہانت پر فخر تھا۔ جب میں نے بروک کو انتہائی چالاکی سے ڈان دیا تھا تو میرا یہ خیال تھا کہ اسے ابھی بہت کچھ کھینچنے کی ضرورت ہے۔ وہ عیاری و مکاری میں میرے سامنے طفل کتب تھا مگر مارتھا کا انٹرویو دیکھنے کے بعد مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی مجھے بھی بہت کچھ کھینچنے کی ضرورت ہے۔ خاص کر اصلی اور نقلی ہیروں کی پہچان کے بارے میں تو ضرور سمجھنا چاہیے۔ میں اپنی ساری ذہانت اور عیاری کے باوجود ایک عورت سے مار کھا گیا تھا۔ مجھے چہرہ شامی کا بڑا دعوئی تھا۔ بروک کے چہرے سے مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی نیت میں خوراک چکا ہے اور وہ میکس حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرے گا مگر مارتھا نے میرے سامنے اس قدر بھرپور اداکاری کی کہ مجھے آخری وقت تک اندازہ نہ ہوسکا کہ اس حرافہ نے ہمیں نقلی میکس دے دیا ہے۔ میں خود کو بہت بڑا شاطر سمجھتا تھا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ مارتھا نے مجھے اور بروک دونوں کو ہی شکست دے دی تھی۔ اس کھیل کی فاتح کھلاڑی وہی شاطر تھی۔



گھبراؤ

مہتاب خان

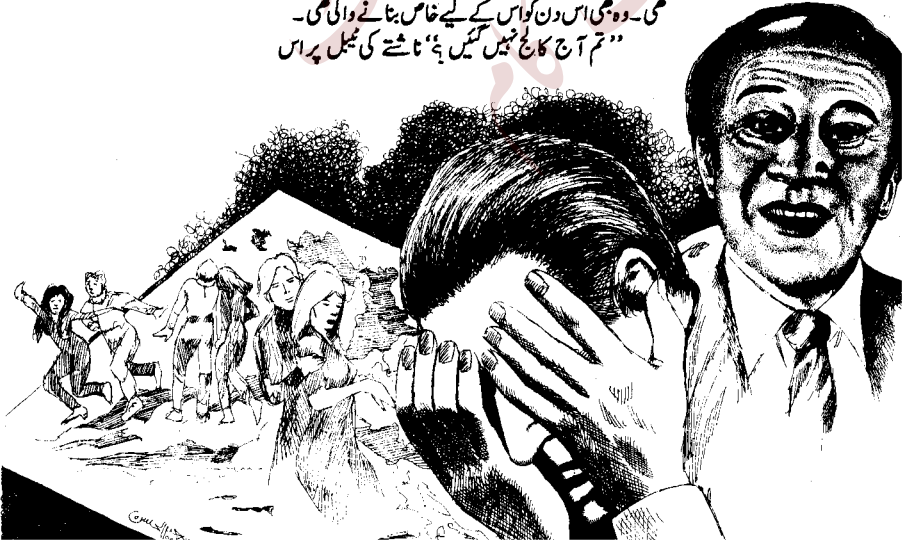
دہرا معیار... دہری شخصیت عارضی طور پر نمایاں مقام تو دے سکتی ہے مگر مستقل سچ کی کسوٹی پر پورا اتر کر ہی انسان پرسکون ہو پاتا ہے۔ جو لوگ معاشرے میں زہر پھیلانے کا باعث بنتے ہیں جب اپنا پائوں اس دائرے میں آتا ہے تو ذلت و رسوائی کا گھیرائو انہیں اتنا مہنگا پڑتا ہے کہ دولت کے انبار بھی اس داغ کو مٹا نہیں پاتے۔

معاشرتی ناسوروں کے دلوں پر لگے گھاؤ کا پرکھنا

اسموکی ہائس نامی یہ ریٹورنٹ شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ اس ریٹورنٹ میں نوجوان اور شوقین خواتین و حضرات کے لیے شیشا بار بھی موجود تھا۔ گوکہ حکومت کی جانب سے پابندی لگ چکی تھی مگر اس کے باوجود جرائم پیشہ افراد یہ زہر عام میں پھیلا رہے ہیں۔

اس ریٹورنٹ سے ملحق چند کمرے بھی تھے جہاں بے راہ روجڑوں کو تنہائی فراہم کی جاتی تھی۔ اس قسم کے ریٹورنٹ شہر کے پوش علاقوں میں قائم تھے۔

وہ بھی ایک عام سادہ تھا مگر لائبر کو بہت خاص لگ رہا تھا، اسی لیے اس نے رات کو ہی اپنی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اس نے اپنا سب سے خوب صورت لباس منتخب کیا تھا۔ دوسری جانب نقد پر اس کی تیاریاں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی اس دن کو اس کے لیے خاص بنانے والی تھی۔
”تم آج کالج نہیں گئیں؟“ ناشتے کی ٹیبل پر اس



آرڈر دیا ہوا مشروب پی رہی تھی اور شہروز اس کے قریب بیٹھا اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ اگلا سہ لینا بھول گئی اور کان باہر کی جانب لگا دیے۔

اچھے بھلے پُرسکون ماحول میں یکا یک بہت سے افراد کے تیز تیز چلنے اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کے دھماکے ہونے لگے۔

وہ حیران ہوئی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ لوگ اندر آ رہے تھے تو ریسٹورنٹ کے باہر اس نے کوئی درجن بھر گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس کے باوجود وہاں خاموشی کا راج تھا۔

ریسٹورنٹ سے ملحق ان رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بند دروازوں کے پیچھے کوئی ذی روح موجود نہیں ہے مگر اب اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شہروز کو دیکھا تو اس کی حالت دیکھ کر وہ اور بھی سراسیمہ ہوئی۔ وہ تو صرف حیرت زدہ تھی مگر شہروز تو خوف زدہ تھا۔

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں ابھر آدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے بھاگنے کے لیے راہ تلاش کر رہا ہو۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر لائبہ مزید گھبرا گئی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے شہروز؟ یہ شور کیا ہے؟“
 ”آئی تھک پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔“
 ”پولیس..... مگر وہ یہاں کیوں آئی ہے.....“

بتاؤ..... پولیس یہاں کیوں ہے؟“ ایک پُرا اعتماد، آزاد خیال ادھنے زمانے کی لائبہ رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہاں ایک عام سی لڑکی کھڑی تھی جو اپنے کپکپاتے وجود کے ساتھ زرد چہرہ لیے... شہروز سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔

اور جب شہروز کو موبائل فون استعمال کرنے کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابھی اس نے بیڈ پر اپنا بے پروائی سے پھینکا ہوا سیل فون اٹھا کر اپنے ڈیڑی کی نمبر ملانا چاہا تھا کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔

سامنے چھ سات کرخت صورت پولیس اہلکاروں اور کیسروں سمیت تین چار میڈیا رپورٹرز کو دندناتے ہوئے اندر آتا دیکھ کر لائبہ کی بے ساختہ جھنجھٹیں گل گئیں۔

ایک اہلکار نے لپک کر شہروز کے ہاتھ سے سیل فون چھینا اور دوسرے نے اس کے ہاتھ مروڑ کر پشت سے

کھینچ لی۔ اس نے ڈیڑی سے نظریں ملائے بغیر کہا۔
 ”میں آج کچھ لیٹ جاؤں گی۔ کالج میں فنکشن ہے۔“

”اوہ گاڈ امیری کار تو ور شاپ میں ہے۔ تم کالج کے لیے جاؤ گی اور واپس کیسے آؤ گی؟“ اس کی مٹی نے فرمندی سے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں میرا فنکشن شام تک چلے گا۔ میری کوئی نہ کوئی فرینڈ مجھے واپسی میں ڈراپ کر دے گی اور یہاں سے میں جسکی میں چلی جاؤں گی۔“

”نہیں تم میرے ساتھ چلو۔“ اس کے ڈیڑی نے مٹی انداز میں کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہر وقت ایسے ہی جلدی میں رہتے تھے۔ آج کل ان کا بڑا بڑا روبرو پر تھا بلکہ پچھلے دو تین سالوں سے جب سے شہروز کے ڈیڑی ان کے بڑس پارٹنر بنے تھے یہی حالت تھا۔
 جیسے وہ مٹی کو چھو کر سونا بنا رہے تھے۔

ڈیڑی اسے کالج کے گیٹ پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کالج کے لان میں بیٹھی رہی۔ اسے کس کا انتظار تھا آج کلاسیں اس نے بیک کی تھیں۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد شہروز اسے لینے آ گیا تھا۔

اور جب وہ اسے کسی پارک یا لانگ ڈرائیو پر لے جانے کے بجائے اس کی نائش نامی اس ریسٹورنٹ کے خیمہ تاریک روم میں لے آیا تو یہ اسے کسی ایڈوجر سے کم نہیں لگا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے جو تھوڑی بہت جھجک اسے محسوس ہو رہی تھی وہ راستے میں شہروز کی پُر لطف اور بے شکلائیہ گفتگو نے دور کر دی تھی۔ ویسے بھی شہروز اس کے لیے اجنبی تو نہیں تھا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں شہروز، باہر سب کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھے؟“

”کیونکہ یہاں کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ ماحول بھی پُرسکون ہے۔ ریسٹورنٹ والوں نے ہم جیسوں کے لیے ہی یہ انتظام کیا ہے۔ ہم کچھ دیر یہاں آرام سے بیٹھ کر کب شپ کریں گے پھر نکل جائیں گے، کیوں نہیں ڈرلگ رہا ہے کیا؟“ اس نے مٹی خیر انداز میں پوچھا۔

”نہیں ڈر کیا؟“ لائبہ نے شانے اچکائے۔ وہ اپنے دوسروں کا اظہار کر کے خود کو کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔

انہیں ابھی اس سچے جانے ویل فرینڈ ایگزیکٹویشن روم میں آئے بہ مشکل آدھا کھٹکا زکرا تھا۔ ابھی تو وہ شہروز کا

باندھ دیے۔

طرح ٹھوس دیا گیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے کے خاص آرڈر کی بنا پر ہم نے یہ آپریشن شروع کیا ہے۔ شہر کے پوش علاقوں اور دیگر آبادی میں سے اس قسم کے ریسٹورنٹ ایک طرف ہماری فوجیوں کو مختلف فنون کا عادی بنا رہے ہیں اور دوسری جانب یہ بے راہ روی کا ذریعہ بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہاں جہازوں کو عیاشی کے لیے چند گھنٹوں کے لیے ہزاروں روپے کے عوض پُر آسائش کمرے مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ ریسٹورنٹ نہیں بلکہ عیاشی کے اڈے ہیں۔

”شہریوں کے لیے یہ امر باعث تشویش تھا لیکن وہ ان کے مالکان کے خلاف اس لیے آواز نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ اس گھناؤنے بزنس کے پیچھے ایک مافیا کا ہاتھ تھا۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک بھی ایک اہم شخص ہے جس کے اس جیسے سیکڑوں ریسٹورنٹ شہر میں چل رہے ہیں۔ اس کا نام فی الحال پریس میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔“

پولیس کے اس اعلیٰ افسر نے پریس کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”سراپیک سوال اور۔“ ایک لیڈی رپورٹر انہیں اٹھتے ہوئے دیکھ کر پوچھی۔

”وہ افراد جو لاک اپ میں بند ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”دیکھیں برائی کی اصل جڑ تو یہی ہیں۔ اگر گناہ کرنے والے نہیں ہوں گے تو گناہ کی دعوت دینے والے کہاں جائیں گے۔ ہم ان کے خلاف سخت ایکشن لینے والے ہیں اور ان سب پر قانون کے مطابق کیس چلے گا۔“

”ان میں کچھ کم عمر لڑکیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں دھوکے سے یہاں لایا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے ان کا تعلق باعزت اور شریف گھرانوں سے ہو۔ کیا ان کے ساتھ بھی رعایت نہیں کی جائے گی؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ ان کے والدین کو بلوا کر اور انہیں وارننگ دے کر انہیں ان کے حوالے کر دیا جائے؟“

”دیکھیں بی بی اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم پر رشوت لینے یا سفارش ماننے کا الزام لگانے والے بھی آپ لوگ ہوں گے اور آپ ان کے جہروں پر نہ چائیں۔ یہ ایسی ہی باعزت اور شریف گھرانوں کی ہوتی تو ایسے اڈوں پر نظر نہ آتیں۔ ان کے خلاف سخت کارروائی ہوگی اور کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے گی۔“

”تم جانتے نہیں میں کون ہوں۔ میرے ڈیڈی تم سب کو دیکھ لیں گے۔ چھوڑ دیجئے۔“

تاہم توڑکوں کے جواب میں وہ مسلسل گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔

جب اس کی گالیاں نہیں رکیں تو اہلکار نے کچل پڑا۔ اکتانہ کرتے ہوئے شہرزدے کے پیٹ میں اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ وہ درد سے کراہتا ہوا دھرا ہو گیا۔

”پتا ہے تو کتنا شریف ہے اور کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے جو اس بدنام جگہ عیاشی کرنے آیا ہے۔ یہ تیرے جیسے امیر زادے کے ہی چھ نچلے ہیں۔ ورنہ ہزاروں وصول کرنے والی ایسی ختیاں غریب کے نصیب میں کہاں۔“

اس نے اپنی لال لال آنکھیں دیوار سے لگی گھڑی لائبر پر گاڑتے ہوئے کہا۔

لائبر پوری شدت سے چلا کر اس کے اعزازوں کی تردید کرنا چاہتی تھی کہ وہ، وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ وہ تو شہرزدے کے باپ سے بھی بڑے شخص کی بیٹی ہے مگر اس کی آواز مطلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ شہرزدے مزید مار سے بچنے کے لیے دوبارہ منہ نہیں کھولا تھا۔

پھر دو کانٹیل شہرزدے کو لائبر سے اٹھاتے اور دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ اسی وقت ایک موٹی تازی گرانڈیل لیڈی کا ٹیشیل نے آگے بڑھ کر لائبر کو بالوں سے پکڑا اور بے دردی سے چمکتے ہوئے باہر کی جانب بڑھنے لگی۔

لائبر بری طرح چیخ چلا رہی تھی مگر وہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی قیمتی اپورٹ سیٹل اندر کمرے میں رہ گئی تھی اور برائے نام دوپٹا کہیں دروازے کے قریب گر گیا تھا، اس کے سلیو لیس گورے گورے بازوؤں پر اس لیڈی پولیس کے ناخنوں کی کھر وچیں لگ گئیں۔ جس میں سے خون رس رہا تھا۔ حالانکہ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی مگر اس لیڈی پولیس کی گرفت ہی ایسی دھیشا نہ تھی۔

ان سب کمروں سے مردوں اور عورتوں کو اسی طرح نکالا اور ہاتھ جابجا رہا تھا۔ جو مزاحمت کی کوشش کرتے یا اپنے حوالے دینے کی جسارت کرتے، ان پر کموں اور لاقوں کا بے دریغ استعمال ہو رہا تھا۔

رپورٹر ہر ہر زاویے سے کھٹکھٹ ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے پھر پولیس موہانوں میں انہیں مویشیوں کی

جی رہے تھے۔ اس کی سہیلیاں جب اپنے اپنے دوستوں کا ذکر کرتیں تو اس کا بھی دل چاہتا کہ کوئی اس کا بھی دوست نہ بنے وہ فخر یہ انداز میں اپنی سہیلیوں سے ملوائے۔
وہ ایک خوب صورت اور پُر اعتماد لڑکی تھی مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ اب تک کسی نوجوان سے اس کی دوستی نہیں ہو سکی تھی اور پونہی اس کا سوہواں سال گزر گیا تھا۔

یہ اس کی سترہویں سالگرہ تھی جو اس نے اپنی فریڈز کے اصرار پر ایک ریسٹورنٹ میں سیلبریٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کچلو کی صورت میں پارٹی میں آنے کا آئیڈیا اس کی فریڈز کا تھا اور چونکہ تمام فریڈز اپنے بوائے فریڈز کے معاملے میں خود کفیل تھیں اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا لیکن وہ پریشان تھی۔ ایسے موقع پر وہ خود کو گاؤدی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ پوری پارٹی میں وہ اکیلی تھی۔

اس سے پہلے اس نے اس بات کو بھی اہمیت نہیں دی تھی مگر اس دن پہلی بار اسے کسی دوست کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ پارٹی کے دوران وہ اندر ہی اندر غجالت محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

اس دن اس کے ڈیڑی نے اپنے دوست اور بزنس پارٹنر شیخ صاحب اور ان کی فیملی کو اپنے گھر ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ ان کا بیٹا شہروز بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ عمر میں لائبہ سے چار پانچ سال بڑا تھا اور پانچ سال اسٹڈیز کے لیے لندن میں مقیم رہنے کے بعد حال ہی میں پاکستان واپس آیا تھا۔

وہ شہروز کو کچھ کچھ جیران رہ تھی مگر۔ ان پانچ سالوں میں اس نے خوب قد کاٹھ کھانا کھا تھا۔ شہروز نے بھی بڑی لگاوت بھری نظروں سے لائبہ کو دیکھا تھا۔ اس کی توجہ اور لائبہ کی خوب صورتی کو سراہتی ہوئی نظروں نے اسے یہ احساس دلادیا تھا کہ شہروز اس سے راہ دورم بڑھانا چاہتا ہے۔ شہروز کی وجاہت نے اسے بھی متاثر کیا تھا۔ اس کی پیش قدمی سے وہ دل ہی دل خوش ہو رہی تھی۔ اس کے وجود پر چھائی سردہری کی چادر آہستہ آہستہ سرکنے لگی تھی۔ شہروز چور نظروں سے مسلسل اسے دیکھ رہا تھا اور اس کا یوں دیکھنا اسے سرد کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی سہیلیاں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں۔ اسی وقت اس کی نظریں کچھ دور ایک ٹیبل پر جمنا بیٹھے شہروز پر پڑیں۔ وہ سہیلیوں کی نظر بچا کر ٹیبل سے اٹھی۔ یوں بھی سب اپنے آپ میں مگن تھیں۔
وہ اس کے قریب چلی آئی پھر رکی سلام دعا کے بعد بولی۔
”آج میری بھڑھے ہے۔ میں یہاں اپنی سہیلیوں

ان سب کے والد اور سیل فون پولیس کے قبضے میں تھے۔ وہ منتظر تھی کہ کب اس کے گھر والوں سے رابطہ کیا جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے مئی اور ڈیڑی کی کاری ایکشن کیا ہوگا مگر جو بھی تھا وہ اس صورت حال سے زیادہ خطرناک اور ڈراؤنا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

صحافیوں کے نکلنے ہی کا ردوائی کا آغاز کر دیا گیا تھا اور یہ کارروائی اس کا ردوائی سے قطعاً مختلف تھی جس کا دعویٰ پریس کے سامنے کیا گیا تھا۔

گرفتار ہونے والے آٹھ مردوں میں سے سب سے بگڑی آسانی کو پہلے آگے لایا گیا تھا اور اب اس سے معاملات نمٹائے جا رہے تھے۔ باقی اپنی باری کے منتظر تھے کہ کب انہیں ان کی بدنامی کی قیمت بتائی جائے گی۔ ان میں شہروز بھی شامل تھا۔

لائبہ بھٹے نے فرش پر باقی عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ عورتیں جو اس جیسی نہیں تھیں اور نہ وہ ان جیسی تھیں۔ ان کے لیے شاید یہ لاک اپ اور چھاپا سب معمول کی بات تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی اپنے پچھلے تجربات بیان کر رہی تھیں کہ پچھلی بار کتنے مھینوں بعد لاک اپ سے چھوٹی تھیں اور کس کی سفارش پر۔

وہ کتنا گارنٹیں تھی پھر یہاں کیوں تھی؟ ہاں اس سے ایک غلطی ہوئی تھی مگر اس قسم کی غلطیاں روز درجنوں لڑکیاں دہرائی ہوں گی۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ اس کے اس سوال کا جواب دور کہیں موجود تھا۔

☆☆☆

سترہ سالہ لائبہ شہر کے ٹاپ کلاس کو ایجوکیشن کالج کی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ یہاں زیادہ تر برگر کلاس کے نوجوان ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں اس کی سہیلیاں ہفتے میں ایک دو بار کلاسز بینک کر کے اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کے لیے نکلا کرتی تھیں۔

وقت گزاری..... ہاں ان کے نزدیک یہ وقت گزاری ہی تھی جسے اس کی ہم عمر ٹین ایجر لڑکیاں، پیار، محبت یا رومان کے دلفریب نام یاد کرتی تھیں۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھیں، وہاں بچپن بہت جلد رخصت ہو جاتا ہے۔

کم عمری میں ملنے والی غیر ضروری آسائشیں اس کی وجہ تھیں۔ یہ ٹین ایجر بچے الگ بیڈروم میں میا کردہ کیبل، نیٹ، موبائل فون کی بدولت بھرپور بلوغت کے شب و روز

بیرس روزگار

باپ: میرے چار بچے ہیں۔

”ایک نے PHD کیا ہے، دوسرے نے MBA کیا ہے تیسرے نے MA کیا ہے اور چوتھا چور ہے“

دوست: ”تو چور کو اپنے گھر سے نکالنے کیوں نہیں؟“

باپ: وہی تو کہتا ہے۔

”بانی سب بیرس روزگار ہیں۔“

عقل مندی

ایک آدمی نے چڑیا گھر بنایا اور اس کا ٹکٹ 50 روپے رکھا۔ مگر کوئی نہیں آیا۔ پھر اس آدمی نے ٹکٹ کے 10 روپے پس کر دیے۔ تو پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ پھر اس نے ٹکٹ فری کر دیا۔ اور چڑیا گھر لوگوں سے بھر گیا۔

آدمی نے شیر کا بنجرہ کھول دیا اور باہر نکالنے کا ٹکٹ 200 روپے کا کر دیا۔
(مرسلہ: مجھ شفیق حسین۔ نیو کراچی)

وہاں سب کے ہاٹنے میں کہہ نہیں پاؤں گا۔“ اس کے اس جیلے نے لائبہ کو بے بس کر دیا۔ یہ اس کی جانب سے پہلا واضح اظہار تھا۔ وہ چاروں شانے چت ہو گئی۔
”ٹھیک ہے میں آؤں گی۔“ بالآخر وہ بولی۔
”کل صبح گیارہ بجے میں تمہیں تمہارے کالج کے گیٹ سے پک کر لوں گا۔“

نڈ لائبہ نے پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جائے گا اور نہ شہروز نے بتانا ضروری سمجھا۔ کسی لڑکے سے دوستی کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بھلی باریوں کسی سے چھپ کر ملنے جارہی تھی۔ یہ سب اسے ایڈوجرنگ رہا تھا۔ اس سے ملنے کے تصور سے اس کے جذبات میں ایک ہیجان برپا تھا۔

☆☆☆

آج اس کے لیے دن کا آغاز بہت برا ہوا تھا۔ اس شہر میں اس کے کئی ریسٹورنٹ اور شیشا بار تھے جن میں سے ایک پر چھاپے کی اطلاع اسے صبح ہی مل گئی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ریسٹورنٹس میں رابطہ کر کے انہیں فوراً بند کروا دیا تھا۔

کے ساتھ سلیپر یٹ کر رہی ہوں۔ کیا تم ہمیں جوائن کرو گے؟“ لائبہ نے بغیر کسی تہدید کے اسے انوائٹ کیا۔

شہروز نے ایک نظر لمبی سی ٹیبل کے گرد بیٹھے درجن بھر لڑکے لڑکیوں پر ڈالی اور سارا معاملہ بھانپ گیا۔

”کیا تم اپنی فرینڈز کو یہ بتاؤ گی کہ میں اچانک مدعو کیا جانے والا مہمان ہوں یا میرا تعارف کچھ خاص انداز میں کرواؤ گی؟“ اس نے متقی خیر انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو لائبہ خفیف سی ہو گئی۔

وہ چاہتی تو یہی تھی کہ شہروز جیسی شاندار شخصیت رکھنے والے لڑکے کا تعارف اپنے خاص الحاح دوست کی حیثیت سے کروائے لیکن وہ اس سے کہہ نہیں سکتی۔

”ٹھیک ہے تم اتنے پیارے انوائٹ کر رہی ہو تو میں چلتا ہوں۔ ویسے تم نے مجھے بلایا ہے نا؟“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں سر پر انٹر گیٹ کے طور پر انٹروڈیوس کرواؤں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

وہ شام کی حوالوں سے یادگار تھی۔ وہ اپنی دوستوں کی رکھ رکھاؤ میں غور سے غور کر رہی تھی۔ ان کے شہروز کے لیے کہے گئے توصیفی جملے اسے اپنے لیے سائنس محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چند گھنٹوں کی اس ملاقات میں شہروز کے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس رات سونے سے قبل وہ گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

اگلے تین دن وہ بلا ناغہ کی گھنٹے فون پر باتیں کرتے رہے۔ تیسرے دن شہروز نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور وہ ذرا ہچکچاتی تھی۔ یہ یقیناً اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ اس سے ملنے سے کترامی رہی تھی اور اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“ بالآخر شہروز نے پرانا حربہ آزمایا۔ اعتماد کی کسوٹی لے کر وہ اسے شرمسار کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی شرمندہ سی ہو گئی۔
”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں فون پر ہم بات کرتے لیے ہیں۔“

”صرف بات کرنے سے میری تلی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ شہروز کی آواز سرگوشیوں میں ڈھلی تو لائبہ کے کوعمرول کی دھڑکیں بڑے ترتیب ہو گئیں۔

”ملنا چاہتے ہو تو گھر آ جاؤ۔“ وہ بولی۔
”میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں لائبہ۔“ اکیلے میں اس نے زور دے کر کہا تھا۔ ”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے

”پورے اسٹاف کو چھٹی دے دو کم از کم ایک ہفتے کی“ اور سارا ریکارڈ غائب کر دو..... اور خود بھی جلد از جلد نکل جاؤ اور جب تک میں آرڈر نہ دوں ریٹورنٹ دوبارہ نہیں کھولنا۔“ اس نے اپنے منبر کو ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔ پھر اس نے دوسرے شہروں میں واضح اسی قسم کے دیگر ریٹورنٹ بینکی فون کر کے صورت حال کا جائزہ لیا مگر وہاں حالات قابو میں تھے۔ پھر بھی اس نے منبر کو محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔

وہ دیر تک اپنے اثر و رسوخ رکھنے والے دوستوں سے رابطے میں رہا۔ پولیس نے یہ کارروائی عوام کے مفاد میں نہیں کی تھی بلکہ ان کا مقصد دولت کا حصول تھا یہ بات وہ اگلی طرح جانتا تھا۔

ایک بڑھ گئے سر کھانے کے بعد یہ ہوا کہ پولیس کے اس اعلیٰ افسر نے جو باڈاس پر ڈال تھا وہ معاملہ پچاس لاکھ میں نمٹ گیا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس کا نام ریکارڈ میں نہیں آئے گا۔

”ان کے آگے جب تک بڑی نہ چیکو یہ ملتے نہیں ہیں..... سارا دن برباد کر کے رکھ دیا۔ پچاس لاکھ کا چونا الگ لگا دیا۔ یونہی مانگ لیتے، دے دیتا۔ اس سب ارادے کی کیا ضرورت تھی۔“

وہ اپنے بزنس پارٹنر شیخ صاحب سے ملے دل کے پھولے پھوڑ رہا تھا۔

”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ یہ افسر نیا آیا ہے۔ اس سے معاملہ نمٹا لو مگر تم نے دیر کر دی۔“

کئی کتنوں کی بھاگ دوڑ میں نہ انہیں کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ معاملہ کنٹرول میں ہونے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہوئے تھے۔ وہ اس وقت گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور مل اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”ہاں یار خواخواہ کی پریشانی ہوئی۔ مجھے پہلے ہی میں بندی کر لینی چاہیے تھی۔ چھاپے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ہمارے تمام ریٹورنٹس اور اسونگ بارز میں یہ بات کفرم ہوئی ہے کہ یہاں کوئی مافی کالٹل ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اسی وجہ سے بڑی پارٹیاں بھی بغیر کھٹکے کے یہاں آتی ہیں۔ ہمارا ریکارڈ خراب کر کے رکھ دیا اس پولیس افسر نے۔ میرے ریکورڈز کس قدر کمزور ہو چکے ہوں گے؟“

”دیے دیکھا جائے تو یہ کام ہے بڑا منافع بخش۔ ان چھوٹے چھوٹے ریٹورنٹس سے ہی ہمارے وارے تیارے ہیں۔ ریٹورنٹ کے ایک چھوٹے سے روم کا

کرایہ فائیو اسٹار ہوٹل کے روم کے برابر ہے۔“ شیخ نے اسے داد دی۔

”کیا کریں یا زاولادو کا ایک خوشحال زندگی دینے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“

”دیے وہاں پولیس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ انہیں تم نہیں جانتے۔ وہ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ کہیں ہم تک نہ پہنچ جائیں“ شیخ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اتنا کچا کام نہیں کیا میں نے.....“ ٹریفک سنٹرل پر اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ”پچاس لاکھ رقم نہیں ہے اور جو مرتے انہوں نے بند کردوں سے نکالے ہیں وہ بھی موٹی اسی ہیں۔ ان کی بھی وہ خوب کھال اتاریں گے۔ ایک ایک سے لاکھوں وصول کریں گے۔“

اسی وقت ایک بچہ شمس کا اخبار لیے اس کی سمت کھڑکی پر آیا۔ پہلے اس نے سوچا اسے دھکا کر دے پھر نہ جانے کیا خیال آیا اس نے اس بچے سے اخبار خرید لیا۔

شام کا وہ اخبار جو سارے دن میں ہونے والی ہنگامہ خیز خبروں کو اپنے چٹ بٹے انداز کے ساتھ چھاپ کر مزید سنسنی خیز بنا دیتا تھا۔

فرنٹ پیج پر ان کے ریٹورنٹ کی خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ سرفی پڑھ کر اس نے اخبار شیخ کی جانب بڑھا دیا، سنٹرل کی جی بیز ہو چکی تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”یہ دیکھو صاف لکھا ہے۔ ریٹورنٹ کسی نامعلوم شخص کی ملکیت تھا جس کے مالک کا سراغ لگانے میں پولیس ناکام رہی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہمیشہ ناکام رہے گی۔“ وہ نشاندہی کے لیے اسے خبر پر انگلی رکھ کر دکھانے لگا۔

ایسا کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر سرفی کے نیچے چھپی تصویر پر جم کر رہ گئی۔ تصویر میں ایک مجسمہ عظیم لڈی کا سنجل ایک نوعمر لڑکی کو بالوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ لڑکی کے قریب ہی شہر دس جگہ کھڑا تھا۔ ان دونوں کے چہرے تصویر میں بے حد واضح تھے۔ نیچے درج تھا ہوٹل کی آڑ میں کھلے بدکاری کے اڈے سے گرفتاری جانے والی ایک ”قاہش“ اور اس کا ”ساحی“ پولیس کی تحویل میں۔ وہ اس کی اگلی بیٹی لائبریری۔

ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں یہ تصویر ان کے بچوں کی تھی۔



دیوقامت

محمد اسرار خان

معاشرہ چاہے مشرقی ہو یا مغربی... دوستی، دشمنی، لالچ اور مفاد کے فارمولے تقریباً ایک ہی جیسے ہوتے ہیں... اس ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی اسے حرص و طمع نے ایک ایسا تماشا کرنے پر مجبور کر دیا کہ دیوقامت جسامت اور منفرد شخصیت ہونے کے باوجود وہ دنیا کی نظر میں مردہ بن کر رہ گیا کیونکہ اپسا کرنا ضروری تھا۔

دراشت کے اصولوں پر پورا اترنے کے لیے
ایک بے اصول انسان کا قصہ

بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اخبار کا صفحہ پلٹ دیا۔ کرسی کو لات مار کر ایک طرف پھینکا اور اخبار اتنی قوت سے پکڑ لیا کہ اس کی اگلیوں سے اخبار میں سوراخ بن گئے۔
کیلی فورنیا میں چمکتے ہوئے سورج کی وجہ سے اس کا

وہ نرم اور خوش رنگ کے دیوان پر لیٹا پڑے مزے سے اخبار میں مجھے ہوئے لطفے پڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہنس پڑتا اور اس کی گہری نیلی آنکھیں کچھ زیادہ چمکتی لگتی لیکن پھر اچانک ہی میٹرن کو ایسا لگا، جیسے وہ کسی ڈیپ فریز میں

کہ اگر چاہ بھی گرم تھا لیکن وہ خود بالکل سرد ہو چکا تھا۔
اخبار میں بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مختلف
رنگوں کی روشنائی سے نئی خبریں اور تصویریں اخبار میں
شائع کی گئی تھیں اور ایک تصویر کسی مرسیڈیز کار کی بھی تھی
جو گارڈ کے آہنی پل سے ٹکرا کر تباہ ہو چکی تھی۔ کار کی
حالت عجیب تھی۔

پھلا پھیا پل کے ایک چنگے میں جمول رہا تھا اور خود
کار بلیک کے سہارے کھڑی تھی، جیسے ہوا کے کسی زوردار
ہولے کے بعد رہا یا میں گر جائے گی۔

پیٹرن کے لیے کار کی تباہی میں کوئی خاص بات
نہیں تھی، اس کے لیے سب سے اہم بات وہ ڈرائیور تھا
جو کار کے ساتھ ہی مر چکا تھا۔ مرسیڈیز کا ایک دروازہ
اپنے کھڑے ہوئے قلابوں سمیت ڈرائیور کی نشست
میں دھنسا گیا تھا اور ڈرائیور ٹوٹے ہوئے اسٹیرنگ وھیل
پر اوڑھ جا پڑا تھا۔

تصویر میں پیٹرن کو ڈرائیور کا چہرہ صاف نظر نہیں
آ سکتا لیکن اس کے غیر معمولی بڑے کان اور اس کے جڑے
مٹ ایک بات بتاتے تھے کہ مرنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ
جان کا بھائی کمن ہے۔ پیٹرن نے تصویر کا کنٹینر پڑھا تو
اسکے کچھ اور بڑھ گئی۔ اخبار میں مرنے والے کا نام جیک
السا تھا۔ پیٹرن بہت دیر تک مسم کھڑا رہا۔ ایک منٹ
بعد وہ اضطراری کیفیت میں اپنے ڈارک براؤن بالوں کو
اٹکھنے سے کچھنے لگا اور پھر اس نے یک لخت ہی اپنا ہاتھ
پہن لیا۔ اس نے مرنے والے کی تصویر پھر دیکھی۔

مردہ شخص کے جمولتے ہوئے بائیں بازو پر ایک
امان تھا، جو آستین پھٹ جانے کی وجہ سے نظر آ رہا تھا۔
والی کی چوڑی ہڈی پر بھی ایک نشان تھا جیسے کسی نے چینی
لٹائی پر کچھ بنا دیا ہو۔ پیٹرن نے اخبار آہستہ سے ایک
طبلہ رکھ دیا۔ اسے ثبوت مل چکا تھا کہ مرنے والا کمن ہی
ہے۔ اس کی کلائی پر پیدائشی نشان موجود تھا، شاید پولیس
نے اس کی شناخت میں کوئی غلطی کی تھی۔

پیٹرن خود فراموشی کے عالم میں اپنے سوٹ کیس کی
طبلہ بڑھ رہا تھا۔ ایک سو اتنی میل کا فاصلہ پیٹرن نے
مٹ چار گھنٹے میں طے کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ جمی لیو کے
مردہ خانے میں داخل ہوا۔ یہ مردہ خانہ کیلی فورنیا، میکسیکو کی
مرحد کے نزدیک واقع تھا۔ مردہ خانے کی عمارت میں تازہ
اہرے کی وجہ سے بھیجی جھنکی مہک تھی۔ پیٹرن کو دیکھتے ہی
ایک شخص آگے بڑھا۔

”میں مسٹر جمی لیو ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو۔“
”میں..... میں.....“ پیٹرن کی آواز بھرا گئی۔ اس
نے تموک ننگے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے جو شخص کل پل
کے حادثے میں فوت ہوا، وہ میرا بھائی تھا۔“
”مسٹر جیک؟“ مسٹر جمی نے تصدیق چاہی۔

”نہیں۔ اس کا نام کمن ہے۔“ پیٹرن نے
وضاحت کی۔ جمی لیو چالیس سال کا موٹا تازہ شخص
تھا اور شکل صورت سے وہ مردہ خانے کا انچارج نہیں لگتا
تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بھی سنجیدہ تھیں لیکن ہونٹ کچھ اس
طرح الگ الگ تھے، جیسے وہ ہنس رہا ہو۔
”میں معذرت خواہ ہوں جناب۔“ جمی نے کہا۔

”یہاں کمن نامی کسی کی.....“
”میں جانتا ہوں۔“ پیٹرن نے اس کی بات کاٹ
دی۔ ”ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن اگر تم مجھے ایک نظر
لاش دیکھنے دو تو.....“ پیٹرن نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل
نہیں کیا۔

جمی لیو نے اپنا منجھا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں
آنکھائی جیک کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جناب! اور میں نے
ہی ان کی لاش شناخت کی تھی۔“
”لیکن میں خود لاش دیکھنا چاہتا ہوں..... صرف
ایک نظر۔“

”ناممکن۔“ جمی نے کمر درے لہجے میں جواب دیا۔
”ہمارے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے اور پھر لاش بری
طرح سخ ہو چکی ہے۔“

پیٹرن کھول کر رہ گیا۔ ”سنو مسٹر جمی۔“ اس کے لہجے
میں آگ بھری ہوئی تھی۔ ”مجھے بتائیں کہ وہ میرا بھائی ہے
بھی یا نہیں۔ میری دعا ہے کہ لاش کمن کی نہ ہو لیکن تم اب
شرافت سے مجھے وہاں لے چلو۔ میں لاش خود دیکھوں گا
تا کہ مجھے اطمینان ہو سکے۔“

جمی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اسے گھورا اور جواب
دیے بغیر ہال کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ پیٹرن بھی اس کے
پیچھے چل رہا تھا۔ وہ دونوں ایک بج بسترے کمرے میں داخل
ہوئے جہاں چار بیٹھوں والا ایک اسٹریچر ایسی میز پر رکھا ہوا
تھا جس کے اوپر شیشے کی چھت تھی۔ لاش پر سفید چادر پڑی
ہوئی تھی۔ اس کے باوجود پیٹرن نے ایک ہی نظر میں اندازہ
کر لیا تھا کہ مرنے والا کمن ہی کی طرح طویل القامت
ہے۔ لاش کے پاؤں اسٹریچر سے کافی باہر تھے۔

جمی لیو کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ اس نے بڑی

مہارت سے چادر پیروں سے ہٹاتے ہوئے سینے پر رکھ دی مگر لاش کا چہرہ اب بھی ڈھکا ہوا تھا۔ پیٹرن نے ننگے بدن اور سفید پیروں کو بغور دیکھا جو اسٹریچر سے باہر تھے۔ مرنے والا یقیناً چھ فٹ آٹھ انچ لمبا ہوگا اور یہی ممکن کی بھی قیامت تھی۔

”میں اس کا.....“ پیٹرن کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ خود کو بہت کمزور اور بیمار محسوس کر رہا تھا۔ ”میں باقی جسم بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو بڑا صدمہ ہوگا مشر۔“ جی نے بڑی بے رحمی سے کہا اور لاش کے چہرے سے بھی چادر ہٹادی۔ پیٹرن نے جو کچھ دیکھا وہ واقعی کرناک تھا۔ چہرہ اس بری طرح سے سخ ہو چکا تھا کہ اس کی شناخت ناممکن تھی۔ لاش کے بال ممکن کے سر کے بالوں کی طرح دراز اور سیاہ تھے۔ چہرے کے عمومی خدو خال بھی ممکن کی طرح تھے۔ پیٹرن اسٹریچر کی دوسری طرف چلا گیا۔ لاش کا بالیاں ہاتھ ران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر کلائی دیکھی اور دم بخود رہ گیا۔ کلائی پر موجود پیدائشی نشان اب غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ دس بارہ ٹانگے لگے ہوئے تھے۔ پیٹرن نے سر اٹھا کر جی کو گھورا۔

”یہاں یقیناً کسی نے پاگل پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی کلائی کا نشان کس طرح غائب ہو گیا؟“ جی کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ پیٹرن نے اپنی جیب سے اخبار کا تراشا نکالا اور جی کی آنکھوں کے سامنے لہرائے لگا۔ ”ذرا اس تصویر کو فور سے دیکھو..... یہ حادثے کے فوراً بعد لی گئی ہے اور اس میں کلائی پر پیدائشی نشان بھی موجود ہے۔“ مردہ خانے کے انچارج نے اخبار کا تراشا اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔

”ممکن ہے یہ پیدائشی نشان ہو لیکن میری رائے میں تصویر کی طباعت کے وقت اس پر سیاہی کا دھبا آ گیا ہے۔“ اس نے تراشا واپس پیٹرن کو دیا اور پھر سفید چادر لاش پر ڈالنے ہوئے کہا۔ ”کچھ اور کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ ”ہاں..... اس کا کوٹ اور پرس کہاں ہیں؟“ پیٹرن نے پوچھا۔ جی نے فوراً ہی ایک بیچ کی طرف اشارہ کر دیا جہاں پتلونوں اور کوٹوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

”اس میں تلاش کرلو۔“ پیٹرن بیچ کی طرف بڑھا اور اسی وقت چھت پر لگی ہوئی سبز بتی روشن ہو گئی۔ جی نے جلتی ہوئی بتی دیکھ کر کہا۔ ”آپ آرام سے کپڑوں کا جائزہ لیں جناب..... میں اوپر

انمول موتی

☆ سبوں شخص کتنا بد نصیب ہے دنیا میں فقیروں جیسی زندگی جیسے گا اور قیامت میں امیروں جیسا حساب دے گا۔

☆ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل نیکی کا زمانہ نہیں رہا، اصل میں وہ لوگ انسان سے نیکی کا بدلہ چاہتے ہیں لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ نیکی کا بدلہ اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا، ان کے لیے ہر زمانہ نیکی کا ہے۔

☆ وہ شخص زندگی کی کوئی جنگ نہیں ہار سکتا جو برداشت کرنے کا فن جانتا ہو۔

☆ وقت گھر سے سمندر میں گرا ہوا موتی ہے جس کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔

☆ خوب صورت لوگ لازمی نہیں کہ اچھے ہوں لیکن اچھے لوگ ہمیشہ خوب صورت ہوتے ہیں۔ (مرسلہ: محمد شفیع حسنین۔ نیکو راہچی)

سنہری باتیں

☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔

☆ کسی پر اعتراض نہ کرو جب تک کہ اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔

☆ موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔

☆ انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے جب وہ وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ مانگتا ہے

☆ انسان ایک دکان کی طرح ہے اور زبان اس کا تالا ہے جب تالا کھلتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ دکان کو تسکے کی ہے یا سونے کی۔

☆ ماضی کی غلطیوں پر رونا اور اوجھڑنا نامعقولہ خیر ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے۔

(مرسلہ: عبدالباری رومی انصاری۔ قصور شری)

محبت اور دوستی

یہ دو چیزیں ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہیں مگر ایک چیز ان دونوں کے کلزے کر سکتی ہے اور وہ چیز ہے غلط فہمی۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

ہاں۔ شاید کوئی اور آیا ہے۔“

ہیٹرن نے کپڑوں کا جائزہ لیا لیکن پہلی ہی نظر میں اس نے اعجاز کو لیا کہ ان کپڑوں میں سے کوئی بھی کسٹن کا نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی کسٹن کے پسندیدہ سائز کی نہیں ہے۔ وہ عام طور پر پندرہ نمبر کی قمیض پہنتا تھا۔ ایک کونے پر سرخ رنگ کا پرس بھی پڑا تھا اور ہیٹرن کو معلوم تھا اس کا بھائی ایسے شوخ رنگوں کا کبھی انتخاب نہیں کرتا۔

”جیک ٹیکر۔ 315۔ آروہلی۔ کیلی فورنیا۔ قد چھ فٹ 10 انچ۔ وزن 220 پونڈ۔ عمر 32 سال۔“

پرس میں پچاس ڈالر کے نوٹ موجود تھے۔ کسٹری کے مختلف کارڈ اور ایک پرائیویٹ سائمنٹ کارڈ بھی موجود تھا۔ اس کے مطابق جیک ٹیکر تیارگو پلانٹ میں ملازمت کر چکا تھا۔ کارڈ پر موجود تصویر کا چہرہ لمبا اور دبلہ تھا، بال کالے تھے، شاید یہ اسی شخص کا چہرہ تھا جس کی لاش اسٹریچر پر لیٹی تھی۔ ہیٹرن نے آروہلی کا ایڈریس ازبر کر کے اس پر ڈال دیا اور اسٹریچر کی طرف دیکھے بغیر سڑکیاں نہ ہٹا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اور وہ اول فول باتیں کر رہا تھا۔ کیا یہ لاش کسٹن کی تھی؟ اسے اب بھی یقین نہ آیا۔ مرنے والا اس کا اپنا بھائی ہے لیکن پیدائشی نشان کہاں آگیا؟ نشان تصویر میں بہت واضح تھا۔ یقیناً کسی نے جان بوجھ کر نشان مٹانے کی کوشش میں وہاں ٹانگے لگا دیے۔ اوپر مردہ خانے کے دفتر میں ایک سیاہ رنگ کی ٹیبل تھی جو کام میں مصروف تھا اور جب ہیٹرن اس کے قریب گیا تو وہ سوگوار اعجاز سے سر ہلانے لگا۔ سڑک پر آگیا تھا تاہم صنوبر کے درختوں کی ہلکی ہلکی جھک ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہماری ہماری قدم اٹھاتا ہوا اپنی سفید رنگ کی کار کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں کسی دوسرے آئین کی گونج سنائی دی۔ اس نے برق رفتاری سے مڑ کر دیکھا۔ ایک سرخ اسپورٹس کار اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹس بھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک سیکنڈ تک وہیں کھڑا رہا۔ کار پوری رفتار کے ساتھ اس کی طرف آ رہی تھی، اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف چمکانک لگا لی اور اپنی کار کے ہونٹ پر گرا۔ اسی لمحے ساتھ ایک ایسی زوردار آواز سنائی دی جیسے ٹین کے ہزاروں ڈبے یکساں کی... نچ اٹھے ہوں۔ اس کی کار بری طرح ڈولی۔ ہونٹ ٹھٹھکیا اور وہ کار کی دوسری جانب گر پڑا۔

ہیٹرن نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے اور فوراً ہی کیچڑ آمیز گھاس سے اٹھ گیا۔ وہ دور ہوتی ہوئی اسپورٹس کار کا نمبر دیکھنا چاہتا تھا لیکن تاریکی نے اس کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھا اور اسپورٹس کار کے سائے کا تعاقب کرنے لگا۔ اسے علم تھا کہ وہ اسپورٹس کار کی گرد کو بھی نہ پاسکے گا لیکن اس نے کوشش کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کی کار کے اگلے حصے سے زوردار آواز بلند ہوئی اور جھٹکے کی وجہ سے اسٹیرنگ وھیل اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ کار موڑ پر ہی رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کار کا گلا گھاسہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ وہ کار سے نکل کر سڑک پر ہی کھڑا ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اسے بخوبی اعجاز ہو چکا تھا کہ یہ شخص حادثہ نہیں تھا۔ اسپورٹس کار میں جو کوئی بھی تھا، اس نے جان بوجھ کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جو کچھ بھی ہوا، وہ اچانک ہی رونما نہیں ہوا بلکہ یقینی طور پر کوئی اسپورٹس کار میں مردہ خانے کے باہر اس کی گھات میں تھا۔ سازش کا یہی ثبوت کافی تھا کہ اسپورٹس کار والے نے اپنی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔ بات واضح تھی، کسی نے اسے قتل کرنے کی ہمر پور کوشش کی تھی۔

ہیٹرن نے اپنی پیشانی کا پیتا پوٹھا، یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ اس کی جان کا دشمن کون تھا؟ ہیٹرن نے سوچا..... کیا اس سازش کا آغاز مردہ خانے کے تھانے ہی سے ہوا تھا..... مگر کیوں؟ جھنجھلا کر ہیٹرن نے آنکھیں مگڑیں۔ اس پر حملے کا تعلق یقینی طور سے لاش کی شناخت کے معاملے سے تھا۔ اسے اب یقین ہو گیا کہ مرنے والا کسٹن ہی ہے اور کوئی جان بوجھ کر اس کی شناخت میں غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی نے لاش کی کلائی سے پیدا کی نشان مٹانے کی کوشش کی تھی۔

ہیٹرن کو اسی وقت سازش کا اعجاز ہو گیا تھا جب اس نے کسٹن کی لاش دیکھی تھی لیکن اس وقت تک وہ خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ لاش اس کے بھائی کی نہیں۔ تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مرنے والا کسٹن کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اب کسٹن بھی وہیں نہیں آئے گا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور گردن جھکائے ہیٹرن اپنی کار... کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے ایک راہ گیر سے پولیس اسٹیشن کا پتا پوچھا اور پھر کچھ سوچ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے کار چلا رہا تھا کہ کمزور تاثر جواب نہ دے جائیں۔ کار کا ڈرائیور بری طرح مل رہا تھا مگر ہیٹرن

سوچ رہا تھا کہ وہ پولیس والوں کو کیا بتائے گا.....

315 ایک بلاک چھوڑ کر کوئے کا گھر تھا۔ سفید رنگ

کے باعث یہ مکان دور ہی سے چمک رہا تھا۔ پورے میں رنگ برنگے پھول اور خوشبودار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ صحن میں چڑی کے درخت قطار کی شکل میں ارد گرد اگے ہوئے تھے۔ یہاں پیٹرن کو احساس ہوا کہ فن تعمیر میں درختوں اور عمارت کا توازن کتنا اہم ہوتا ہے۔ دروازے پر ایک بڑا گول کنڈا لگا ہوا تھا اور خود دروازہ بھی غیر معمولی حد تک بلند تھا، شاید آٹھ فٹ بلند..... پیٹرن نے ڈور بیل کا بٹن دبا یا۔ ایک لمحے بعد ہی اندر سے کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازے پر جو شخص نمودار ہوا وہ اتنا طویل القامت تھا کہ دروازہ اس کے جسم سے بھر گیا۔ یہ شخص کس سے بھی طویل القامت نکلا۔ وہ پیٹرن کے سنے ہوئے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”کیا تم جیک ٹیکر سے واقف ہو؟“ پیٹرن نے پوچھا۔

”میں اس کا بھائی تک ٹیکر ہوں۔ کیا بات ہے؟“

”میں تم سے حادثے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ پیٹرن نے کہا۔

تک کچھ ہچکچایا مگر ایک لمحے بعد ہی اس کے بڑے بڑے جڑے جارحانہ انداز میں بولے۔ ”مگر کیوں..... تم کون ہو؟“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ مرنے والا تمہارا بھائی تھا؟“

پیٹرن نے سوال کیا۔ ”میں صرف یہی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے شک ہے کہ جی لیو کے مردہ خانے میں موجود لاش میرے بھائی کی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اس پورے محاطے میں کوئی گھپلا ہوا ہو۔“

طویل القامت شخص ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کے لہجہ اور روپے کی جارحیت اب ہوا ہو چکی تھی۔ ”اوہ..... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اندر آ جاؤ، میں بھی مسلسل اسی کتے پر غور کر رہا ہوں مگر دوسروں کا خیال ہے کہ لاش جیک ہی کی ہے۔“ وہ باتیں کرتا ہوا پیٹرن کو ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے اتنی بے رخی سے پیش آیا۔ دراصل آج دن براشوورس مینی اور پولیس کا عملہ مجھے تنگ کرتا رہا ہے۔ ان لوگوں کو صرف سوال کرنے کا شوق ہے اور میرا خیال تھا کہ تم بھی کوئی سرکاری اہلکار ہو گے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ پیٹرن نے فراخ دلی سے کہا۔ اس نے تک ٹیکر کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ یہ مشکل تیس تیس سال کا ہوگا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور سفید قمیص کی ایک

کمن ایک ہفتہ قبل ہی اپنے گاؤں سے جنوبی علاقوں کے کاروباری دورے پر گیا تھا۔ پانچ دن تک وہ پیٹرن کو مختلف سروس اسٹیشنوں کے لیے پالش فراہم کرنے کے آرڈر بھیجتا رہا۔ پیٹرن نے کمن کے ساتھ مل کر چند ماہ پہلے ہی کار پالش کا کاروبار شروع کیا تھا۔ انہیں جلد ہی کاروبار میں کامیابی ہوئی تھی۔ کمن نے سلا کا شعبہ سنبھال لیا تھا جبکہ سائٹس کرکریٹ ہونے کی وجہ سے پیٹرن پالش کی تیاری کا نگران تھا۔

گزشتہ دو دن سے کمن نے نہ تو کوئی آرڈر بھیجا اور نہ ہی اپنی خیریت سے مطلع کیا تھا لیکن کمن ایسا انسان نہیں تھا جو مصائب کا شکار ہو جائے۔ وہ اپنے کاشوین ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ بھائی اور کاروبار کو فراموش کر دے۔

وہ بڑی احتیاط سے کار چلاتا تھا لیکن ہائی وے چوکی کے عملے نے اخبار والوں کو بتایا تھا کہ سرسبز پڑاؤ سے میل کی رفتار سے دوڑتی ہوئی ہل میں کمن کی بھی جیک کمن نے پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زندگی میں بھی تجاؤ نہیں کیا تھا۔ ایک معاہدہ بھی تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والی کار بھی جیک ٹیکر کی ملکیت تھی۔

رات ساڑھے نو بجے کا عمل تھا جب پیٹرن نے پولیس اسٹیشن کے سامنے اپنی کار پارک کی۔ یہ عمارت کئی ٹورینا کے قدیم طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ ڈیوٹی سارجنٹ نو جوان تھا اس لیے اس نے پیٹرن کی ہر بات پر مکمل توجہ دی اور پھر شنڈی سائٹس لے کر کہا کہ اس وقت اس کے پاس عملے کی کسی ہے۔ وہ اب صبح ہی پیٹرن کی شکایت پر کوئی کارروائی کر سکے گا۔ ”ٹھیک ہے۔“ پیٹرن نے غمی سے کہا۔ اس کے کوٹ کی آستین غالباً اسپورٹس کار سے بچنے کی کوشش میں بغل کے پاس سے پھٹ گئی تھی جس میں ریت بھری ہوئی تھی پیٹرن نے ریت بھاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”315۔ آر ویلی کس طرف ہے؟“

”سامنے والے دروازے سے نکلو گے تو وہی سڑک آ رہی ہے۔“ سارجنٹ نے کہا۔

پیٹرن اس کا ٹھکرے ادا کر کے پولیس اسٹیشن سے نکل آیا اور سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے مکانات پر 315 نمبر ڈھونڈنے لگا۔ یہ نمبر اسے لاش کے پرس سے ملا تھا۔ وہ جیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہی ایک صورت تھی جس سے کمن کی موت پر روشنی پڑنے کا امکان تھا۔

”سوڈا اور استعمال کرو؟“ اس نے پیئزن سے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ پیئزن نے جواب دیتے ہوئے تک ٹیکر کو
 ایک بار پھر غور سے دیکھا جو بوتل کا کارک نکالنے کے لیے
 جدوجہد کر رہا تھا لیکن کارک اندر پھنس گیا تھا۔ وہ ایک بڑی
 ڈیسک کی دروازہ کھول کر اسکو دروازے پر تھام کر لے گیا اور پھر
 اس نے اسکو دروازے کی مدد سے کارک نکال کر مشروب
 دودھیا گلاسوں میں انڈیل دیا تھا۔ پہلے ہی گھونٹ میں
 پیئزن کو اپنا سینہ جلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس نے پروا نہ کی
 اور تک سے پوچھا۔

”کیا تم لوگ یہاں بہت عرصے سے رہتے ہو؟“
 ”نہیں۔“ بلند قامت تک نے اپنا گلاس خالی کرتے
 ہوئے کہا۔ ”مونا میں میری جاگیر ہے، میں وہیں تھا کہ
 اخبار میں جب تک کی تصویر دیکھی۔ میں آج ہی یہاں آیا
 ہوں۔“ اس نے اپنے گلاس میں ایک بار پھر مشروب انڈیل
 لیا۔ ”مجھے بہت دکھ ہوا، یہ قصبہ میرے لیے بالکل اجنبی
 ہے۔ میں صرف لاش لینے آیا لیکن اب رک گیا ہوں کیونکہ
 وہ لاش مجھے جب تک کی ہرگز نہیں لگتی۔“

”میں بھی اخبار میں تصویر دیکھ کر یہاں آیا ہوں۔“
 پیئزن نے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے میں سارا جنت.....!“
 ”اوہ..... وقت ہو گیا ہے۔“ تک ٹیکر نے گھڑی
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں محذرت خواہ ہوں لیکن گیارہ بجے
 سے پہلے مجھے انشورنس کمپنی کے منیجر کو فون کرنا تھا۔ یہاں کا
 فون خراب ہے لہذا مجھے سڑک پار پبلک فون تک جانا ہوگا
 لیکن تم یہیں ٹھہرو، مجھے تم سے مزید کچھ باتیں کرنی ہیں۔ تم
 انتظار کر سکتے ہو؟“ اس نے پیئزن سے پوچھا۔ پیئزن نے
 اثبات میں سر ہلادیا۔

”شکریہ..... میں بس ابھی آیا۔ تم مشروب سے دل
 بہلاتے رہو۔“

پیئزن گلاس میں مشروب ڈال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
 وہ تک کی واپسی کا منتظر تھا۔ بیس منٹ گزر گئے اس کو محسوس
 ہوئے پھر اُدھا کھٹا ہو گیا مگر وہ اُدھاس نہیں آیا۔ پیئزن نے
 یہاں سے چل دیئے کا ارادہ کیا لیکن کوئی ناویدہ بات اسے
 رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ اس مکان اور دیو قامت
 بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دس منٹ اور
 گزر گئے۔ وقت گزرنے کے لیے اس نے مختلف کمروں کا
 جائزہ لیا۔ ہر چیز غیر معمولی حد تک بڑی اور طویل تھی۔ بسز،
 چھری، کانٹے، حتیٰ کہ ٹوتھ برش تک سب ہی بڑے
 تھے۔ وہ باورچی خانے میں گیا۔ یہاں گوشت مارکیٹ

آستین پر سیاہ رنگ کا باقمی بچ لگا ہوا تھا۔ وہ پیئزن کو تھکا تھکا
 سا رنگ۔ تک ایک صوفے میں دھنس گیا اور اس نے دوسرے
 صوفے پر پیئزن کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ پیئزن کو اندازہ ہی
 نہیں ہوا کہ یہ صوفہ کتنا بڑا ہے۔ وہ عام انداز میں اس پر بیٹھا
 ہی تھا کہ اس کے پاؤں زمین سے چند انچ اوپر اٹھ گئے۔
 اس نے حیرت سے ٹکڑے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز غیر معمولی حد
 تک بڑی اور چوڑی تھی۔ دیوان کی بس کی طرح لگ رہا تھا
 اور کونے پر ٹاشٹے کی میز اتنی بلندی کہ عام آدمی کے شانے
 تک اس میں چھپ سکتے تھے۔

تک ٹیکر نے پیئزن کی حیرت کا اندازہ کر کے
 مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ جب تک کے سپنوں کا محل ہے، میرا
 بھائی میری ہی طرح چوڑا چکلا تھا۔ اسے عام کمروں میں
 رہنے سے نفرت تھی۔ اس کے گھٹنے میز سے ٹکراتے رہتے
 تھے اور سردروازے سے ٹکرا جاتا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی
 کہ ایک دن وہ اپنی پسند کا گھر بنائے گا۔“ تک نے اپنے
 بازو دھرتے ہوئے پیئزن کو بتایا۔ ”اور یہ مکان اس نے
 اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق تعمیر کرایا۔ ہمارے
 چچا رابرٹ کا انتقال ہوا تو ساری جائداد اور دولت ہم دو
 بھائیوں کو مل گئی۔ جب تک نے اپنے حصے کی رقم یہ مکان تعمیر
 کرانے میں صرف کر ڈالی۔“ تک نے بات ختم کر کے
 طویل سانس لی اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”تم مجھے یہ بتاؤ..... مشر.....“
 ”پیئزن۔“

”شکریہ..... ہاں تو مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں مردہ شخص پر
 اپنے بھائی ہونے کا شبہ کیوں ہے؟“

”قدو قامت کے اندازے کی وجہ سے۔“ پیئزن
 نے آگے جھک کر کہا۔ ”اور پھر کسی نے لاش کی کلائی سے
 پیدائشی نشان مٹا کر وہاں ٹانگے لگانے کی بھی زحمت کی ہے۔
 یہ کام اس کی موت کے بعد کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ
 جب میں مردہ خانے سے باہر آیا تو کسی نے مجھے چل کر
 ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔“

”ہاں..... میں نے بھی پولیس کو اپنے خدشات سے
 آگاہ کیا تھا۔“ تک ٹیکر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”لاش
 بظاہر تو جب تک ہی کی لگتی ہے لیکن میرے بھائی کے کان اتنے
 بڑے نہیں تھے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک شیلف کی
 طرف گیا جہاں سے اس نے بڑی سی ٹرے نکالی۔ ٹرے
 میں مشروب کی ایک نئی بوتل اور غیر معمولی طور پر بڑے
 گلاس رکھے ہوئے تھے۔

قابل غور

”ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا..... ابو آپ آفس ہر روز نہ جایا کریں، بس میرے ساتھ کھیلا کریں۔“

باپ نے پیار سے کہا: ”بیٹا اگر آفس ہر روز نہیں جاؤں گا تو آپ کے لیے چیزیں کون لائے گا؟“

”تو روز مت جایا کریں بس جمعے کے جمعے چلے جایا کریں بچے نے کہا۔“

باپ نے سمجھاتے ہوئے کہا: ”بیٹا اگر میں صرف جمعے کے جمعے جاؤں گا تو وہ مجھے آفس سے نکال دیں گے۔“

بچے نے مصومت سے کہا: ”ابو آپ مسجد بھی تو جمعے کے جمعے جاتے ہیں مگر اللہ پاک نے تو آپ کو کبھی اپنے گھر سے نہیں نکالا۔“

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ محل ہزارہ)

”میں تم جیسوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ اور پھر اس نے جی لیو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم نے مردہ خانے سے تک ٹیکر کونوں کر کے میرے بارے میں بتایا تھا اور پھر اس نے مجھے قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔“

”شت اب۔“ تک نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اتنا چننے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس والوں تک تمہاری آواز نہیں پہنچ سکے گی۔ اب ذرا سا بھی شور مچایا تو ابھی اور ای جگہ تمہارا بھی کام کر دوں گا۔“

پیٹرن نے اپنی آواز ذرا دھیمی کر لی مردہ انتہائی تلی اور غصے کے عالم میں باتیں کرتا رہا۔ ”تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تا کہ وہ تمہارے بھائی جیک کی جگہ لے سکے۔ اسی طرح تم نے بل پر چاٹنے کا ڈراما رچایا۔ تک ٹیکر! شاید تم نے اپنے بھائی کو بھی قتل کیا ہے لیکن تم اسے حادثاتی موت اس لیے قرار نہیں دے سکتے کہ جیک کی لاش گولیوں سے چھنی تھی اور تمہیں کسی ایسے تبادل کی ضرورت تھی جسے ہلاک کر کے تم حادثے کا ڈراما رچا سکو اور..... اور وہ تبادل ممکن..... میرا بھائی تھا۔“ پیٹرن نے ایک طویل سانس لے کر اس مرتبہ سرگوشی کے سے اعزاز میں پوچھا۔

”تمہارے بھائی کی لاش کہاں ہے تک! شاید تم نے وہ خانے میں دبا دی ہوگی۔“

تک ٹیکر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ہاں، تم ذہن آدی ہو..... وہ خانے میں ہی تم بھی دفن کر دیے

میں استعمال ہونے والے دور لیفر بیٹر رکھے ہوئے تھے اور ایک بڑا دروازہ دوسری سمت کھلتا تھا۔ وہ اس دروازے سے پھر آیا جہاں پر کیسولین کی بدبو تھی۔ ایک ہی قدم کے فاصلے پر گیراج نظر آیا۔ اس نے گیراج کی عقی جلائی تو اچانک ہی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے پورے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے دیکھا کہ گیراج میں ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور یہ وہی کار تھی جس سے اسے کچلنے کی کوشش کی تھی.....

پیٹرن کار کی ہیڈ لائٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ کار کے سامنے والے حصے پر ڈیٹ پڑے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ وہی گاڑی تھی جو اسے کچلنے کی کوشش میں اس کی گاڑی سے ٹکرانی تھی..... وہ بڑی پھرتی سے ہر خانے کی تلاشی لینے لگا لیکن ان میں سے کچھ نہیں ملا۔ پھر وہ ڈک کی طرف لپکا جس میں اسے دور سالے اور اسکیٹنگ کے جوتے ملے۔ ایک کونے میں کوئی پارسل بھی پڑا تھا۔ پیٹرن نے تیزی سے پارسل کھولا۔ اس میں جوتوں کا جوڑا رکھا ہوا تھا۔ بڑے سائز کے جوتے جن پر پندرہ نمبر صاف لکھا تھا۔ اسی نمبر کے جوتے ممکن بھی استعمال کرتا تھا۔ مزید تلاشی پر اسے آکسفورڈ کی ایک ٹیس ملی اور پھر پیٹرن کو یقین ہو گیا کہ مرنے والا کسٹن ہی تھا کیونکہ اسے یہ ٹیس بہت پسند تھی۔ پیٹرن نے کئی مرتبہ اپنے بھائی کو اس ٹیس میں دیکھا تھا.....

پھر اچانک ہی پیٹرن اچھل پڑا کیونکہ اس کے عقب میں کوئی طیش بھری سرگوشی کر رہا تھا۔ ”تم یہاں کیسے چل آئے؟“

پیٹرن نے پلٹ کر دیکھا۔ باورچی خانے کے دروازے پر تک ٹیکر اور مردہ خانے کا انچارج جی لیو کھڑے تھے۔ تک کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔

”تو تم نے اپنے بھائی کے جوتے تلاش کر ہی لیے۔“

تک پوچھا کہ لیکن اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ”کوئی بات نہیں..... چلو اب اندر آ جاؤ..... زیادہ ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن کو بھی غیر ضروری تکلف نہ دو..... چلو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ لاش تمہارے بھائی کی ہے اور تمہیں میں نے یہی بل کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

کئی سیکنڈ تک پیٹرن کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس نے جی کو گھور کر دیکھا اور جب بولا تو اس کی آواز انتہائی مضبوط تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کے اعصاب لوہے کے بنے ہوں۔

جاؤ گے اور اس کام کے لیے تہ خانہ ہی مناسب جگہ ہے۔
مجھے اس بات کا قلق ہے کہ تم نے نمکن کے جوتے اور قمیض تلاش کر لی۔“

”قلق..... مگر مجھے خوشی ہے کہ تم انہیں ضائع نہیں کر سکے۔“ پیٹرن نے زہر خند سے کہا۔

”شاید تم جیسے بلند قامت شخص کو اندازہ تھا کہ غیر معمولی سائز کے جوتے دکانوں پر یہ مشکل ہی ملتے ہیں۔ شاید تم انہیں خود استعمال کرنا چاہتے تھے۔“

”ممکن ہے۔“ نک ہنس پڑا۔ ”مگر تم باتیں بہت کر رہے ہو۔“

بادرچی خانے میں آ جاؤ اور اب بالکل خاموش رہو۔“ نک ٹیکر کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی انگلی پستول کی لمبی پرتختی۔ پیٹرن نے سوچا کہ یہ وقت تک کوڈ بوج لینے کا

نہیں۔ پیٹرن ہماری قدم اٹھاتا ہوا بدرچی خانے میں آ گیا۔ نک نے گیراج کا دروازہ بند کیا تو پیٹرن نے پوچھا۔ ”تم نے اپنے بھائی جیک کو قتل کیوں کیا؟“

”دولت کے لیے دوست۔“ نک نے پستول ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اب مجھے وہ ساری دولت مل جائے گی جو چچا اس کے نام کر گئے تھے۔“

نک اب ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ادھر چلو۔۔۔۔۔۔ میں کچھ پناہ چاہتا ہوں۔“

کمرے میں سب سے پہلے پیٹرن داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نک اور پھر جی تھا۔ نک نے اپنے گلاس میں مشروب

انڈیلا اور جی غیر قیمتی کیفیت میں میز کے پاس کھڑا ہوا۔ اس کے سرخ گالوں پر اب زردی مچی اور اس کی انگلیاں

اضطرابی انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے یہ سب پسند نہیں۔ اسے یہاں مارنا مناسب

نہیں ہے کیونکہ پولیس اسٹیشن بہت نزدیک واقع ہے۔“

”تم خاموش رہو، بالکل بڑھے۔“ نک نے اسے جھڑک دیا۔ ”سب سے اچھی بات یہی ہے پولیس اسٹیشن بالکل

قریب ہے۔ پولیس والے یہ سب کچھ اپنی ناک کے نیچے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ پھر اس نے گلاس اٹھاتے

ہوئے کہا۔

”تم جی بہت بڑے پاگل ہو۔ ہر معاملے کو پیچیدہ بنا کر رکھ دیا۔ میرا خیال تھا صرف دو افراد ہی قتل کرنا پڑے گا

لیکن نہ جانے تم کہاں سے فک پڑے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ کسی سٹریمن کا بھائی بھی ہو سکتا ہے۔“ اور پھر اس نے ذرا

سخت لہجے میں کہا۔ ”چلو تمہیں بھی تہ خانے کا راستہ

دکھادیں۔“

پیٹرن ایک قدم پیچھے ہٹا تو اس کے شانے سے ٹکرا کر ایک بڑا فرش لیپ نیچے گرنے لگا۔ پیٹرن کو اچانک احساس

ہوا کہ اس کی طاقت واپس آ رہی ہے۔ اس کا خون کھول رہا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اچھلا اور اس نے فرش لیپ کو دو بوج لیا۔

اس کے اعصاب سمجھتا نہ تھے۔ اسے یقین تھا کہ ایک ہی گولی اس کا خاتمہ کر دے گی لیکن جب وہ پلٹا تو تک

اپنا پستول اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا۔ پیٹرن نے کسی دیوانے کی طرح۔۔۔۔۔۔ لیپ کو کھمایا۔ لیپ کافی بھاری تھا

لیکن پیٹرن کو صرف یہ احساس تھا کہ کوئی نادیہ طاقت اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ نک کے چہرے پر بھی تعجب

کے تاثرات تھے۔ پیٹرن نے جیسے ہی لیپ کھمایا پستول سے دھواں نکلنے لگا لیکن لیپ کا ایک حصہ بروقت ہی نک کے

ہاتھ پر پڑا تھا۔ پیٹرن کو یوں لگا جیسے پستول کے پرکل آئے ہوں۔ ہتھیار فرش پر گر گیا اور پھسلتا ہوا میز کے نیچے چلا

گیا۔۔۔۔۔۔ جی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن وہ پیٹرن کی جانب بڑھنے لگا۔ پیٹرن دونوں ہاتھوں سے بھاری بھر کم لیپ کو

مستقل سمٹھا رہا تھا۔ جی کچھ اور آگے بڑھا تو پیٹرن کا عجیب و غریب ہتھیار اس کے پیٹ پر ضرب لگا تا ہوا گزرا گیا۔ جی کا

سانس رکنے لگا۔ وہ پیٹ پیٹلے اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔۔۔۔۔۔ لیپ اب بھی چکر کھا رہا تھا۔ مشروب کی بوتل،

گلاس، ٹرے، شیف پر سب سے ہوئے کھلونے، سب ہی اس کی زد میں آ کر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔

نک ایک بار پھر پیٹرن کی طرف بڑھنے لگا۔ پیٹرن نے اس مرتبہ اس دیو قامت شخص کے چہرے کا نشانہ لیا اور

لیپ کو آخری چکر دے کر ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ اس کا نشانہ اتنا صحیح ثابت نہیں ہوا کیونکہ نک کے چہرے پر پوری چوٹ

نہیں لگی تھی مگر پھر بھی نک گال پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا تھا۔ پیٹرن نے ایک بار پھر لیپ اٹھالیا اور نک پر آخری ضرب لگانے کا

ارادہ ترک کر کے لیپ کو دیوانہ پر پٹ دیا کیونکہ نک انتہائی تکلیف میں تھا۔ وہ کسی پرانی موٹر کے انجن کی طرح کھاس

رہا تھا۔ سرخ قالین پر تر پڑتے ہوئے اس نے خون تھوکا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ بتدریج زرد ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔۔

پیٹرن نے دوڑ کر پستول اٹھالیا اور نک کی طرف بڑھنے لگا۔ اب تک اپنے قتل میں انگلیاں ڈال کر کچھ نکالنے

کی جدوجہد کر رہا تھا۔ پیٹرن نے اس کے قتل کو دیا اور چند لمحوں کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ نک کس مصیبت میں

جٹا ہے۔ اس نے اپنے دونوں گالوں میں روٹی ٹھونکی ہوئی

تھی جو لپک کی ضرب سے حلق میں چلی گئی تھی۔ پیٹرن نے روٹی کا ایک چھوٹا سا گولا اس کے حلق سے کھینچ لیا۔ وہ تک سے چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ طویل القامت شخص نے حلق سے روٹی نکل جانے کے بعد جلدی جلدی سانس لی اور پھر روٹی کا ایک اور گولا خود ہی حلق سے نکال کر پھینک دیا۔ اب اس کا چہرہ بہت دہلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے چہرے کو بھاری بھر کم بنانے کے لیے گالوں کے اندر روٹی کے بھائے رکھے تھے۔ پیٹرن نے اسے بغور دیکھا اور فوراً ہی پہچان گیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کی تصویر اس نے مردہ خانے میں پڑے ہوئے شناختی کارڈ پر دیکھی تھی۔

”تو تم اپنے بھائی کے ہمیں میں تھے۔“ پیٹرن نے بڑی حیرت سے کہا۔ ”تم ہی نے یہ عجیب و غریب مکان بنایا ہوگا اور تم نے خود ہی اپنی موت کا بھی ناکر رچایا۔“ تک اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا لیکن قریب ہی جی لیو پیٹ میں لگی ہوئی چوٹ سے کراہتے ہوئے بولا۔

”میں..... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”م..... میں اس کے ساتھ شریک ضرور تھا لیکن میں نے کسی کو خراش تک نہیں پہنچائی۔ میں پھانسی پر لٹکنا نہیں چاہتا، میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ جی اب اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا پیٹرن کو دیکھ رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ رم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ ”مجھے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ میں نے تمہارے بھائی کو جبک کی حیثیت سے شناخت کرانے کی کوشش کی۔ یہ جبک ٹیکر ہی تھا جس نے کسن کے سر پر روزنی چیز ماری تھی اور پھر اسے اپنی سرسبز میں ڈال کر کار اسٹارٹ کر دی اور پل سے دے ماری۔ اس نے مجھے پچیس فیصد رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔“ جی بڑی آسانی کے ساتھ سب کچھ اگل رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔

”اس نے مجھے لالچ دیا تھا کہ اپنے چچا کی جائیداد کا ایک چوتھا حصہ میرے نام کر دے گا۔ اس کے چچا نے یہ وصیت کی تھی کہ جبک کو جائیداد سے سو ڈالر ہفتے لے گا لیکن یہ زیادہ رقم چاہتا تھا۔ اس کا چچا اسے پسند نہیں کرتا تھا لہذا اس نے اسے عیشت دولاکھ ڈالر نہیں دیے بلکہ اس کے بھائی تک.....!“

”ایک سنٹ مبر کرو۔“ پیٹرن نے اسے ٹوک دیا۔ ”تمہارے کہنے کا مقصد یہ تو نہیں کہ تک ٹیکر کا کوئی وجود تھا؟“ ”بالکل تھا۔“ جی نے کہا۔ ”چچا کی وصیت میں لکھا تھا کہ اگر جبک مر جائے تو تک کو اس کے بھائی دولاکھ ڈالر عیشت دے دیے جائیں لیکن وصیت کی رو سے اگر تک مرتا تو جبک کو

اپنے بھائی کا حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے گزشتہ ہفتے جبک نے موٹا نا جا کر تک کو قتل کر دیا اور اس کی لاش چھپادی پھر یہ تک کا ہمیں بدل کر واپس آیا۔ دونوں بھائیوں میں کوئی فرق نہیں تھا، بس تک کے گال بھرے بھرے تھے۔ جبک کی کسن سے ملاقات حال ہی میں ہوئی تھی۔ جب دو غیر معمولی طویل القامت افراد مل جائیں تو ان میں دوستی ہو ہی جاتی ہے پھر اس نے کسن کو ہلاک کر دیا۔ یقین کرو کہ جبک اپنے گالوں میں روٹی کے بھائے رکھ کر بالکل تک لگتا ہے۔ اس نے وکیل تک کو اپنے تک ٹیکر ہونے کا یقین دلادیا ہے۔“ جی لیو نے اپنی بات ختم کر دی تو جبک ٹیکر اسے خونی نظروں سے گھورنے لگا۔

”میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔“ پیٹرن نے اپنی کپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ.....!“

پیٹرن کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی پورچ میں کسی کے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ باہر نوجوان سار جنت کھڑا تھا۔

”تم لوگوں نے کیا شور مچا رہا ہے؟“ اس نے غرا کر پوچھا۔ اور پھر اس کی نظر پیٹرن کے ہاتھ میں دبے ہوئے ہسٹول پر پڑی۔ ”اوہ.....“ اس نے سیٹی سی بجائی۔ ”تم یہ ہتھیار پھینک دو، ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

”میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں۔“ جی چلایا۔ ”میں پولیس کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“ ”یہ تمہیں ایک چچی کہانی سنائے گا۔ اس وقت بظاہر خوفزدہ ہے۔ تم اس کی بات پر توجہ دو سار جنت۔“ پیٹرن نے پولیس آفیسر سے کہا اور پھر جبک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”اور اس کا خاص خیال رکھو۔“ جبک ٹیکر اب بھی فرش پر بیٹھے بیٹھے کھائیں رہا تھا۔ پیٹرن مسکراتے ہوئے مزید بولا۔ ”یہ طویل القامت شخص اپنے چچا کا ترکہ حاصل کرنے کے لیے دنیا کی نظروں میں خود کو ہلاک کر چکا ہے۔“ ”کیا تک رہے ہو؟“ پولیس آفیسر نے حیرت سے کہا۔

”کیا مذاق کرنے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔“ ”نہیں جناب۔“ پیٹرن نے بڑے عمل سے کہا۔ ”آپ کو تفصیل سننے میں کچھ دیر لگے گی لہذا کرسی پر تشریف رکھیں۔“ پیٹرن خود بھی صوفے میں دھنس گیا۔ اس نے ایک سکرین لگا دیا اور پھر حلق صاف کرتے بولا۔ ”ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی رئیس چچا کے دو بیٹے تھے، دونوں ہی..... دیو قامت.....“

قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے

دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پر فکر داستان

شکست کی فتح

ماہر جاوید معمل

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی بازی مات کر لیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا ہے ایمان... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوٹ کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ از حد ضروری ہوتا ہے البتہ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کر ڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہو گئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھا گئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔





کے والد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔“ خدا بخش کی آواز لرز رہی تھی۔

نور کے والد نے لافاذ لے کر سرخ جوڑے کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ غم پر چمکیا لاکام تھا اور یہ واضح طور پر وہیں کا لباس نظر آتا تھا۔ اشفاق مہرا نے لافاذ سمجھا کر دیوار پر دے مارا اور بے دم سے ہو کر تاقین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی نور کی طرح دیوار سے ٹیک لگائی۔ پاس ہی نور کی بڑی بہن بسمہ بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کے بازو کو یوں تھام رکھا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو کھاتا ہے۔

اسی دوران میں نور کی والدہ زلفت بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ نور اور بسمہ کی سگی والدہ تو نہیں تھیں مگر آفت کی اس بیماری گھڑی میں ان کا چہرہ بھی درد کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرش پر گرا ہوا سرخ جوڑا اٹھایا اور پھر بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آ بیٹھیں۔ انہوں نے بڑی نرمی سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوڑھے ملازم خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ مالکن کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل گیا۔ زلفت بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”مہرا صاحب! یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔“

”تو کس طرح کروں میں اپنی مدد آپ؟“ مولوی اشفاق مہرا نے زخمی آواز میں کہا۔ ”اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں؟ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے..... اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔“

”نہیں مہرا صاحب! لیکن..... جو کچھ بھی ہو رہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیاں راہ تو نکالنا ہی پڑے گی.....“

”اور وہ درمیاں راہ کیا ہے؟“ اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھ کر غمیر پوچھا۔

”مہرا صاحب! کچھ بھی ہے..... وہ لوگ..... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اگر ان سے صلح کی بات ہو جاتی ہے تو پھر وہ پورے طریقے سے اور عزت کے ساتھ اپنی بسمہ کو لے کر جائیں گے..... ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں بلکہ ابھی ان سے ہر طرح کی لکھت پڑھت بھی ہو سکتی ہے لیکن.....“

زلفت بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔

وہ دسمبر کے چوتھے ہفتے کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ بے حد تاریک، بے حد سرد اور بارش میں پھیلی ہوئی۔ بھی بھی بجلی زور سے چمکتی تھی اور کچھ سی ویر بعد بادل دھاڑنے لگتے تھے لیکن بادلوں کی دھاڑوں کے علاوہ کبھی کچھ دھاڑیں نہیں جو درد دیوار کو لرز رہی تھیں۔ نور، جس کا پورا نام عین النور تھا۔ ان دھاڑوں کو سنتی تھی تو سرتاپا لرز جاتی تھی۔ یہ انسانوں کی دھاڑیں تھیں، وحشی انسانوں کی دھاڑیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقص کر رہے تھے اور انہوں نے اس قدیم حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار حویلی کے مضبوط چوٹی چھانک پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ کی کوشش تھی کہ وہ دیواروں پر بانس کی لمبی سیزھیاں لگا کر اندر گھس جائیں اور کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیرونی دیوار کے بالائی کنارے تک اپنے ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حویلی میں موجود لوگ اندر سے ان پر خشت باری کرتے تھے، یا پھر طویل لاشیوں کے ذریعے انہیں بیرونی دیوار پر سے دھکیل کر نیچے گرا دیتے تھے۔

حویلی میں موجود تمام عورتیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں اور ہر ہر کمرے پر رہی تھیں۔ اس کمرے سے باہر سڑ پھرے دار موجود تھے تاہم ان کے چہرے بھی حالات کی نشانی کے سبب تاریک دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کی تعداد تین کے قریب تھی۔ ان میں چھ سات نوجوان لڑکیاں تھیں، باقی درمیاں عمر کی یا بڑی عمر کی خواتین تھیں۔ تیسری سالہ نور بے دم ہو گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ایک قیامت ان کے سر پر ہے اور کسی بھی وقت ان پر ٹوٹ سکتی ہے۔

باہر سے کسی شرابی شخص کی للکارنی ہوئی آواز آئی۔

”اوائے مولوی مہرا! ہم منڈے کو سہرا باندھ کر لائے ہیں۔“

تیری دمی کو ہمارے ساتھ جانا ہی جاتا ہے۔ زندہ یا پھر مردہ۔ اب بھی وقت ہے سوچ لے۔ تیرے حق میں چنگا یہی ہے کہ اس کو تیار کر دے۔“

نور نے دیکھا، اس کے والد مولوی اشفاق مہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ، جیسے کمرے کی پرانی دیوار پر لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں ان کا بوڑھا ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا لافاذ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی کپڑا جھلک دکھ رہا تھا۔ بوڑھے ملازم خدا بخش نے نور

جانے والی خشت باری میں بھی تیزی آگئی تھی۔

سبھی ہوئی خواتین روبروی تھیں اور ان میں سے کئی ایک کے ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلٹے چلے جا رہے تھے۔ زلفت بیگم نے ہسمہ کو اپنے گلے سے لگایا اور اس کا منہ سرچنے لگیں۔ وہ بے چاری سرتاپا کانپ رہی تھی۔ نور کی خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے اسے ہاتھوں میں لے کر لکڑی کی ایک چوکی پر بٹھایا۔ خالہ عریفہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا آواز میں کہا۔ ”نہ میری دھی، اتھر پونچھے۔“ بیٹیاں ہمیشہ اپنے ماں بیو کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ دیکھنا رب سوتا تیری مدد کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب کے ویری کل تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔ ساری مصیبتیں دفع دور ہو جائیں گی۔“ زلفت بیگم نے ایک ملازمدار کی کو خفیف اشارہ کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹا تھا اور مٹی کا ایک بڑا سا روغن پیلا تھا۔ پیالے میں مٹھی ہوئی مہندی تھی۔ خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے دوپٹا ہسمہ کے جھکے ہوئے سر پر ڈال دیا۔ وہ سسکیوں سے روبروی تھی۔

بادل ایک بار پھر زور سے گر جا اور اس کی آواز، باہر سے بلند ہونے والے لکڑیوں اور دھاڑوں میں گمٹنے ہوئے لگی۔

زلفت بیگم نے ہمت جمع کر کے اپنی بات مکمل کی۔ ”لیکن اگر خدا خواستہ۔۔۔۔۔ خدا خواستہ۔۔۔۔۔ یہ لوگ اندر کھس آئے اور۔۔۔۔۔ دو چار اصوات ہوئیں۔۔۔۔۔ تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

ہسمہ نے سبھی ہرنی کی طرح نور کی طرف دیکھا اور اس کی گرفت اپنے باپ کے بازو پر کھمبا اور سخت ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن زرد دکھائی دینے لگے تھے اور ایسی ہی زردی اس کے ریشمی رخساروں پر بھی کھنڈی تھی۔ وہ خوش شکل تھی۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ نکستی کیے ہوئے لمبے بال چوٹی کی صورت میں کمر کی طرف گئے ہوئے تھے مگر ابتلا کے ان لمحوں میں وہ بالکل بے ترتیب اور ہراساں تھی۔ کسی ایسی چیز یا کی طرح محفوظ پناہ گاہ میں کھس جانا چاہتی تھی جس پر نکلیے بیچوں والا عقاب چھٹ رہا ہو۔

مولوی اشفاق مہرا کی خاموشی دیکھ کر زلفت بیگم کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے بوڑھے ملازم خدا بخش کو آواز دی۔ وہ مؤدب انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ زلفت بیگم نے کہا۔ ”خدا بخش اتم برا بڑے والی بیٹھک خالی کرواؤ۔۔۔۔۔ اور بھائی جی سے کہو کہ ان لوگوں سے گل بات کرنے کے لیے، ان میں سے تین چار بندوں کو اندر بلائیں۔ پر کسی کے پاس کوئی تھپتھپا رہی نہیں ہونا چاہیے۔“

اس موقع پر اشفاق مہرا نے کچھ کہا تھا مگر بس، ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے تین چار گھنٹے کی جان لیوا کشمکش نے انہیں اندر سے بالکل توڑ ڈالا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

یہی وقت تھا جب انگریزوں کے زمانے کی اس دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ یوں لگا کہ ناک چنری اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بڑی دیوار ہمارے ہو کر گری ہے۔ اس دھماکے نے کمرے میں موجود خواتین کو چلانے پر مجبور کر دیا۔ ہسمہ بھی دہشت زدہ ہو کر باپ سے چٹ گئی۔ مولوی مہرا خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ ملازم خدا بخش ان کے ساتھ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواروں کے قریب شور وغل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکڑی اور لوہے کے مضبوط پھانک کو توڑنے کی کوششیں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ چھت پر سے کی

نور نے اپنی بڑی بہن کی حالت دیکھی اور سر کا حقہ حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ شاؤ واد رہی روٹی تھی۔ رونا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا لیکن آج جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو گرم آنسوؤں کی دھاریں سی اس کے سر در رخساروں پر بہنے لگیں۔ وہ جیسے اندر سے پختا چر ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا، اس سے تھوڑی دور فرش پر تانے کی ایک گول طشتری پڑی تھی۔ اس طشتری میں مٹی کے قریب ایک درجن دیبے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی روشن نہیں تھا۔ کچھ دیبے اوندھے اور کچھ سیدھے تھے۔ نور کی دادی ان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور درختوں اور جھاڑیوں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں پر اور بارش نالے کے کناروں پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل دھاڑ رہے تھے۔ مگر حویلی کی بیرونی دیوار کے قریب سے بلند ہونے والی دھاڑیں اب باند پڑ گئی تھیں۔ خشت باری کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ۔۔۔۔۔ حویلی کی چھوٹی بیٹھک میں بات چیت شروع ہو گئی ہے۔ نور سوچنے لگی۔

کیا یہ بات چیت کامیاب ہو سکے گی؟

کیا وہ قیامت ٹل جائے گی جو دبیر کی اس طویل

رات میں اس حویلی کی دیواروں کے باہر منڈلا رہی تھی؟

کیا مہر خاندان کی عزتیں بچ جائیں گی؟

کیا اپنی عزت و آبرو کا دفاع کرتے ہوئے اس کے ابا، اس کے تایا، اس کے دونوں ماموں اور بہنوں بھائیوں کو اپنی جائیں نہیں گنوا دیں گی؟ سوال تو بہت تھے لیکن جواب کوئی نہیں تھا۔

عین النور نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور خود کو ارد گرد کے ماحول سے کانٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور وہ اکثر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سب سے الگ تھلک۔۔۔۔۔ کم گو۔۔۔۔۔ اپنی ہی سوچوں میں کم رہنے والی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔۔۔۔۔ نور کو نیند تو نہیں آئی مگر ایک تھکن سی اس پر طاری ہونے لگی۔ اس تھکن نے اس کی شدید ترین تشویش اور گہرا ہٹ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ویسے بھی وہ نسبتاً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے حالات سے لڑنا آتا تھا۔۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی لڑائیوں میں وہ بہت مرتبہ ہاری بھی تھی۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگی۔۔۔۔۔ وہ اس ہولناک رات تک کیسے پہنچی ہے؟ کس طرح کے واقعات نے کس طرح کا رخ اختیار کیا کہ آج وہ اور اس کے خاندان والے اس قیامت کے دہانے پر ہیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی لیکن بڑی تفصیل سے واقعات کی پرتیں کھولنے لگا۔ وہ عارضی طور پر یہی سمجھ لیکن اپنے ارد گرد کے دہشت ناک ماحول سے تھوڑے فاصلے پر پہنچی گئی۔ بارش، گرج، للکاریں، وحاشیں، ڈری ہوئی سرکوشیاں، چلتے پھرتے بے تاب قدموں کی آوازیں۔۔۔۔۔ سب کچھ ساعت میں دھندلا سا گیا۔ ماضی دور اور ماضی قریب کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے چلتے گئے۔

☆☆☆

عین النور نے گجرات سے آئے تحصیل بھالی کی طرف موراء والی نام کے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اب تو وہاں ہنگامی سڑک پہنچ چکی تھی مگر نور کے بچپن میں وہاں صرف کچا راستہ تھا، ہنگامی سڑک تک جانے کے لیے ان لوگوں کو تانگوں وغیرہ پر کوئی دس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ نور نے ایک بھر سے پڑے آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد مولوی اشفاق اور تایا غلیل مہرا علاقے کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نور سے بڑی دو بہنیں بتول اور ہسمہ تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ تینوں بہنوں کا بچپن اسی گاؤں کے کھیتوں کھلیاؤں اور سرسبز نیلیوں پر کھیلتے کودتے گزرتا تھا۔ تایا غلیل بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مہمرن

جو تقریباً نور ہی کی ہم عمر تھی۔ اس کے کزن شرجیل اور عثمان تھوڑے سے پڑھا کھاتے لیکن کھیل کود میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

نور کے بچپن اور لڑکپن کی یادیں بڑی سہانی تھیں۔ ماموں اور تایا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر بھر کے بچوں میں سب سے چھوٹی وہی تھی۔ اسے خصوصی پر وٹو کول ملتا تھا۔۔۔۔۔ برسات کے موسم میں آموں کے باغوں میں جھولے، سردیوں کی سنہری دھوپوں میں وسیع لان کے اندر کھیل کود اور کینڈے کے پودوں میں تیتلیوں کا تعاقب۔۔۔۔۔ گرمیوں میں چاندنی راتیں اور کشادہ چھت پر بچھی ہوئی بہت سی چار پائیاں۔۔۔۔۔ کہانیاں، چٹکے اور شریر سرگوشیاں۔۔۔۔۔ اور بہار۔۔۔۔۔ بہار کا موسم تو جیسے نور کے دل میں کھب جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں ایک وسیع پھلواڑی تھی جو ان کی اپنی ہی ملکیت تھی۔ اس پھلواڑی میں ایک جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ نور کی والدہ، دادی جان، چھوپیاں دو مہمانیاں اور ان کے بچے اکٹھے ہوتے تو اس باغ میں بہار پر بہار آ جاتی۔ ایک بہت بڑی درہی بچھائی جاتی۔ اس پر ایک درخت کے ساتھ گاؤں کی لگا کر دادی جان کے بیٹے کی جگہ بنائی جاتی۔ ایک جانب ڈھولک رکھ کر گانے گائے جاتے، وہیں پر کھلے میں بکوان بنائے جاتے اور کھیل کود ہوتا۔ ایسی محفلوں میں خاندان کا کوئی مرد شریک نہیں ہوتا تھا اور اونچی دیواروں والے باغ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

گاؤں کی خوشگوار زندگی میں خوشی کی ایک تازہ لہر اس وقت آتی تھی جب سردیوں کے گلابی موسم میں بڑے پیر جی کا میلا آتا تھا۔ اسے عرف عام میں امنالے کا عرس کہا جاتا تھا۔ قرب و جوار میں اس میلے کی دھوم تھی۔ لوگ دو ماہ پہلے سے ہی اس موقع کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ چوڑیاں، پراندے اور جوتے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ چڑھاوے کی چادریں تیار ہوتی تھیں۔ بچوں کی تیاری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ میلا پورا ہفتہ جاری رہتا تھا۔۔۔۔۔ اور ہر بار اہل علاقہ کو بہت سی سنہری یادیں دے کر رخصت ہوتا تھا۔

بچپن میں نور بھی اس میلے کو بڑی روانی سے امنالے کا میلا کہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لفظ ”امنالا“ نہیں بلکہ امنال والا ہے۔ یعنی اسن اور محبت والا۔ بڑے پیر صاحب کا مکمل نام پیر برکات امنال والا تھا۔ وہ زندگی بھر پیار اور محبت کا درس دیتے رہے تھے۔ کہا

پیار محبت اور پالیسی سے کام لیتے رہے ہیں، پر اب دمکیوں پر اتر آئے ہیں۔“

”کیا کہتے ہیں وہ؟“ نور نے بھولین سے پوچھا تھا۔
”کہتے ہیں کہ ہمارے اباجی زبان دے کر مکر رہے ہیں، حالانکہ اباجی نے کوئی زبان دی ہی نہیں تھی۔ وہ سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور طاقت کے زور پر اس کو جج بنانا چاہتے ہیں۔“

نور نے کہا۔ ”تو اباجی..... پولیس والوں کو کیوں نہیں بتاتے۔ وہ جو جھوٹوں والے لیے سے اٹھل آیا کرتے ہیں، وہ اباجی کے دوست ہیں۔ اباجی نے کہا تھا کہ وہ تھانیدار ہیں۔“
”وہ جھوٹے تھانیدار ہیں نور۔ یہ جو دھری طفل ہے اس کے تعلقات تو بڑے بڑے تھانیداروں سے ہیں۔ ویسے بھی اس طرح کی باتیں پولیس وغیرہ تک نہیں پہنچا کر جاتیں۔ بڑے بوڑھے خود ہی پیٹھ پر فیصلہ کر لیتے ہیں۔“

”تو پھر کیوں نہیں کرتے فیصلہ؟ ہم اپنی پیاری آپ کی شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔ کئی اور کی مرضی سے نہیں۔“
وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے پریشان کن باتوں سے دور رکھا جاتا تھا پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابا اور تایا کے چہرے بٹے رہتے تھے۔ دونوں ماموں جواں سال تھے۔ وہ کسی وقت بہت طیش میں نظر آتے تھے۔ ایک دن اس نے جھوٹے ماموں کو چھت پر بیٹھ کر بڑے غصے میں مسواک چباتے اور اپنی راضی بھی صاف کرتے دیکھا تھا۔ گھر میں پچائیت وغیرہ کا ذرہ بھی چل رہا تھا۔

پھر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوتا محسوس ہوا۔ نور کو پتا چلا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اباجی کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور ان پر سے ہلائ گئی ہے۔

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آپنی بتول کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اپنے خاندان میں ہی ایک دور کے رشتے داروں میں آپنی کی بات ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی لیکن نور ان دنوں کچھ اداس بھی رہا کرتی تھی۔ اس کی آپنی بیاہ کر اس سے دور جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خوش اطولی سے انجام پا گیا اور اس کی آپنی شادی کے بعد اپنے بیاہ کے شہر چلی گئی۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا..... اور یہ کچھ عرصے تک ٹھیک بھی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں دوبارہ بے چینی پائی جانے لگی۔ معاملہ وہی کھاپری برادری والوں کا تھا۔ انہوں نے بات اپنے دل سے نکالی

جاتا تھا کہ وہ جانی دشمنوں کو جائز دوستوں میں بدل دیتے تھے۔ ان کی بابرکت ذات کی وجہ سے بہت سے خاندانوں اور برادر یوں کے جھوٹے بڑے بھٹکے ہوئے ختم ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت سے میلے کا نام امنان والے کا میلا پڑ گیا تھا۔

نور نے ساتویں کا امتحان ”موراں والی“ کے ہائی اسکول سے ہی پاس کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً تیرہ سال تھی..... مچھلی بہن بسمہ کوئی پندرہ سال کی اور بڑی بہن بتول انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو ڈھائی سال پہلے میٹرک کر چکی تھی۔ اسکول کے بعد اب وہ کالج جانا چاہتی تھی اور کالج جانے کے لیے اس کا گھرات جانا ضروری تھا۔ وہاں وہ اپنے کچھ تنہائی عزیزوں کے پاس رہ سکتی تھی۔ نور کے والد مولوی اشفاق بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کافی ہوگئی ہے، بتول اب سلائی کڑھا کر سکھ لے..... اور اگر زیادہ بات ہے تو پھر آئرش کے مضامین لے کر پرائیویٹ ایف اے کر لے۔ بتول بڑوں کی ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ بڑی بہن بتول سے نور کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب آپنی بتول کے بارے میں نور کو پتا چلا کہ وہ کالج نہیں جائے گی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی کہ اب اسے آپنی کی مزید اربابینی میسر رہے گی۔

ہاں، وہ بڑے اچھے دن تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر پھر ایک ایسی نوک و محسوس ہونے لگا کہ گھر میں سب اچھا نہیں ہے۔ بڑے کچھ پریشان تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے ملاحظہ مشورے کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی تھیں پھر ایک دن نور کو بسمہ سے پتا چلا کہ چودھری طفل نے اپنے بڑے بیٹے ابدال احمد کے لیے آپنی بتول کا رشتہ مانگ رہا ہے..... اور یہ رشتہ آپنی سمیت گھر میں کسی کو بھی قبول نہیں۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کھاپری برادری کے چودھری طفل کے دونوں بیٹے استہا کے بڑے بھٹکے تھے۔ لڑائی جھگڑا، زمینوں پر قبضے، نئے بازی..... کون سی ایسی بات تھی جو ان میں موجود نہیں تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چودھری طفل بھی کچھ کم نہیں رہا تھا۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ کچھ دھما پڑ گیا تھا مگر فطرت تو وہی تھی۔

بڑی بہن بسمہ نے سرا سیمہ لہجے میں نور کو بتایا تھا۔
”یہ کھاپری برادری والے بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پہلے تو

نہیں تھی۔ ایک روز ماں نے اسے بتایا۔ ”تمہارے ابا باغ والی اپنی زمین بچ رہے ہیں۔“
 ”پر کیوں امی؟ وہاں تو ہم جمعولے ڈالتے ہیں، اتنا مزہ کرتے ہیں۔“ وہ مصحوبیت سے بولی تھی۔
 ”وہ زمین کھاپڑا والوں کی زمین کے ساتھ لگتی ہے اور وہاں آئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔“
 ”جھگڑا ہوتا تو زمین بچ دی جاتی ہے؟ اور جھگڑا ہوتا کیوں ہے امی؟“
 ”جنہوں نے جھگڑنا ہوتا ہے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور تمہارے ابا اور تایا خواہواہ کی دھمکی سے بچتا چاہتے ہیں۔“
 ”تو دھمکی سے بچنے کے لیے ہم اپنی زمین کیوں بیچیں۔ وہ لوگ بچ دیں نا۔“
 ”جس کا زیادہ زور چلتا ہے اس کی بات بھی چلتی ہے۔“ ماں نے آہ بھر کر کہا تھا۔

وہ زمین بک گئی جہاں نور کے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ نہ صرف زمین بک گئی بلکہ چند ماہ کے اندر اندر حالات اتنے خراب ہوئے کہ ابا اور تایا نے اپنی باقی زمین بھی فروخت کر دی۔ اور آبائی گاؤں موراد والی کو اور کجرات کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور آ گئے۔ نور ان دنوں آٹھویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔
 لاہور کی ایک نئی رہائشی کالونی میں ان لوگوں نے دس دس مرلے کے دوپٹے بنائے مگر خریدے تھے۔ دونوں گھروں میں مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ایک گھر تایا کے لیے اور دوسرا ان کے لیے تھا۔ نور کو یہاں ایک اچھے اسکول میں داخلہ دل گیا۔ تایا کے بچوں کو بھی مناسب جگہوں پر داخلہ مل گئے۔ بسہ اب میٹرک پاس کر چکی تھی اور یہاں مسئلہ پھر وہی کانچ میں داخلہ کا تھا۔ نور کے ابا جی تذبذب میں تھے۔ بہر حال تایا جان کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور ابا جی ایک قریبی کانچ میں بسہ کا داخلہ کرانے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو نور کے والد کی طرح اس کے تایا بھی مذہبی ذہن رکھتے تھے اور انہی کی طرح باریش بھی تھے مگر مولوی جی کا ساتھ صرف نور کے ابا جی کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت سلوک اور یکاگرت کے باوجود تھوڑا سا فرق بھی موجود تھا۔ تایا جان کے گھر میں ٹی وی، ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے پینٹ شرٹ اور دیگر جدید لباس پہنتے تھے اور گھر میں کچھ آزادی

دکھائی دیتی تھی مگر نور کے گھر میں چونکہ صرف بیٹیوں نے ہی پرورش پائی تھی، اس لیے یہاں ماحول قدرے سخت تھا۔ پردے اور نماز روزے کی پابندی تایا جان کے گھر سے تھوڑی زیادہ تھی۔ سوبائیل فون تو ان دنوں موجود ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ مگر عام فون بھی ان کے گھر میں کبھی نہیں لگوا یا گیا۔ یوں تو تایا کی جان بھی پردہ کرتی تھیں لیکن نور کی امی باقاعدہ برقع پہنتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے گھر میں اکثر ایک طرح کا تانڈا پیدا ہو جاتا تھا۔ ابا جی غلطو تقریبات میں شرکت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شادی کے موقع پر اضافی رسموں سے بھی انہیں اختلاف تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہر میں آ جانے کے بعد نور کے لیے چند ماہ تک تو روز و شب بڑے اچھے سے رہے۔ یہاں کی تیز رفتار زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں سب کو دشواری پیش آئی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اسکول میں نور کی ایک دو سہیلیاں بھی بن گئیں۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ انہی دنوں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ نور نے سومیٹرک دوڑ میں حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آئی۔ اسے ایک چھوٹا سا کپ بھی ملا۔ وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو امی جان، تائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بسہ کانچ سے واپس آ چکی تھی۔ اس نے نور کا پھولا ہوا بستہ دیکھا تو پوچھا۔ ”اوتے، یہ کیا گھسیا ہوا ہے اس میں؟“

”تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟“ نور نے اٹا اس سے سوال کیا۔
 بسہ نے بیٹے کے اندر ہی کپ کو ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ”کوئی سخت سی چیز لگ رہی ہے۔“

”سخت سی چیز ہے اور سخت محنت کر کے جیتی ہے بھی۔“ نور نے کہا اور بیٹے سے کپ نکال کر بسہ کو دکھایا۔
 بسہ خوش ہوئی۔ ”کس چکر میں ملا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”تمہاری بہن دوڑ میں پہلے نمبر پر آئی ہے۔۔۔۔۔ سو میٹرک دوڑ۔“

بسہ تھوڑا سا چوکی پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”اوتے تیرا بیڑا ترے۔ تو نے دوڑ میں حصہ لیا ہے؟“
 ”بتا تو رہی ہوں۔“

بسہ نے کہا۔ ”ابا جی کو پتا چل گیا نا۔۔۔ تو ٹھیک ٹھاک جھاڑیں پڑیں گی۔ ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔“
 ”مگر بسہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے کوئی تیراکی۔۔۔ میں تو حصہ نہیں لیا۔ دوڑ میں ہی لیا ہے نا۔۔۔۔۔ اور وہ بھی حجاب پہن کر۔“

”مگر تو دوڑی تو ہے نا پھر تلی بیگم۔ دڑ گئے تو مارے ہیں نا تو نے؟“

”میری کسی بات پر یہاں تو کوئی خوش ہی نہیں ہوتا۔“
نور نے منہ بنایا۔ ”آپنی یا تمہاری ہر بات کی تعریف ہوتی ہے۔ مجھے تو جیسے ایک کونے میں ڈالا ہوا ہے۔ اباجی تو رحم کی نظر ہی نہیں ڈالتے۔ لگتا ہے ان کی نگاہ میں ہی نہیں ہوں۔“
”غیبت کہیں کی۔“ بسمہ نے اس کا کان مروڑا۔
”بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے۔ بس یہ جو چیری دکھری رگ ہے نا اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں بھی سمجھی۔“
”کیا دکھری رگ ہے میری؟“

”یہ جو ہر وقت رسالے پڑھتی ہے..... کسی کونے میں گھسی رہتی ہے..... اور نمازیں بھی قضا کر دیتی ہے۔“
”کب نمازیں قضا کرتی ہوں میں؟“ نور نے لڑاکی مرغی کی طرح پر پھیلانے۔ ”کب کونے میں گھسی رہتی ہوں..... اور رسالے کو تو ہاتھ لگائے، آج مجھے پورا ایک مہینا ہو گیا ہے۔“

”تو یہ تو ہے..... پورا ایک مہینا۔ ابھی پرسوں اتوار کو چھت پر بیٹھی کیا پڑھ رہی تھیں؟“
”وہ رسالہ نہیں تھا، اسکول کا میگزین تھا۔ اسپورٹس کے صفحے دیکھ رہی تھی۔“ نور تک کر بولی۔

شاید یہ بحث مزید آگے چلتی مگر اسی دوران میں بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بسمہ نے نور کا چھوٹا سا کپ جلدی سے اس کے اسکول بیگ میں گھسایا اور بیگ کو بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اندر آنے والے اباجی ہی تھے۔ وہ آج کل لاہور کے مضافات میں کچھ زمین خرید کر وہاں چھوٹے چھوٹے رہائشی پورشن وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے..... اور اس سلسلے میں بڑے ماموں مراد کے ساتھ مل کر کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو بازار میں ایک دکان بھی خریدی تھی جہاں وہ اسلامی کتب کی ہول سیل کا ارادہ رکھتے تھے۔

اپنی کامیابی اور کپ کے حصول کی خوشی نور کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے روز اس نے والدہ کو بھی اپنا حلیہ ہوا کپ دکھایا۔ والدہ خوش ہوئیں لیکن انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو اس سے پہلے بسمہ کہہ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”نور! بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دے۔ اب تم نے میٹرک کا امتحان دینا ہے اور یہ کوئی آسان نہیں ہوتا۔“

”آپ مگر نہ کریں۔ میں پاس کر لوں گی۔“ وہ بے پروائی سے بولی اور الہز انداز میں چار پائی پھیلاتی ہوئی

دوسری طرف کل گئی۔

اس سے اگلے روز جب وہ اسکول پہنچی تو اسکول میں اسپورٹس کی ٹیچر مسز نبیلہ وجدان نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فزیکل ٹریننگ میں باقاعدگی سے حصہ لے اور خاص طور سے رنگ میں۔ اس کی رنگ اچھی ہے اور وہ محنت کرے تو مقابلے جیت سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ ”ٹیچر! شاید میرے گھر والے بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔“

”ہائیں۔“ مسز وجدان نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ تم ایک محنت مندر سرگرمی میں حصہ لے رہی ہو اور وہ بھی چار دیواری کے اندر۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟“

وہ بولی۔ ”ٹیچر! دراصل..... میرے ابا جان..... اس معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ شاید وہ منع کر دیں۔“

”کبھی بھی نہیں کریں گے۔ تم کسی دن مجھے ان سے ملو۔ میں خود بات کر دوں گی۔“ مسز وجدان نے پورے یقین سے کہا۔

نور نے یہ بات بڑی بہن بسمہ کو بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اسے اباجی سے اجازت لے کر دے۔ نور کی نسبت بسمہ اور بول کی بات اشفاق صاحب ذرا نرمی سے سن لیتے مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ بسمہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دو تین دن کوشش کرتی رہی کہ اس حوالے سے تھوڑا بہت اباجان کو بتادے..... تاکہ اگر انہیں بعد میں پتا چلے تو وہ بہت زیادہ ناراض نہ ہو جائیں مگر نور اور بسمہ میں سے کوئی بھی یہ بات اباجی کے سامنے زبان پر نہ لاسکیں۔ رہیں والدہ تو ان کی والدہ صاحب کے سامنے سنی ہی کم ہو جاتی تھی۔ اشفاق صاحب آج کل ویسے بھی ذرا ناخوشگوار موڈ میں تھے۔ تعمیری کام کے سلسلے میں کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ آتے اور ان کی پیشانی کا بل دیکھ کر ہی نور کو سمجھ جاتی کہ بسمہ آج بھی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

تین چار روز بعد دونوں بہنوں نے یہ کوشش ویسے ہی ترک کر دی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ایک دن اسپورٹس ٹیچر مسز وجدان نے پھر نور کو اسٹاف روم میں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ ”نور! تم نے اپنے والد صاحب سے بات نہیں کرائی؟“

وہ جواب پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ ”ٹیچر! آج کل وہ کنسرکشن کر رہے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ اب بھی

کی بہت تعریف کی۔ اسے ٹرائی ملی اور تقریبی سرٹیفیکیٹ بھی۔

اس مرتبہ اس کی یہ کامیابی چھٹی نہیں رہ سکی۔ تباہ کئے گھر میں بھی سب کو ہوتا چل گیا تھا لہذا ہم نے ضروری سمجھا کہ ابا جان کو بھی یہ بات خود بتادی جائے۔ اس روز ان کا موڈ بھی دلہے پر ہوتا تھا نہ مغرب کے بعد ہم نے اوڑھنی تختی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹی اور ابا جان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ٹرائی ابا جان کو دکھائی۔ ”یہ کس کی ہے؟“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”نور کی..... اسکو لے لی ہے۔“

”مگر اس کے نمبر تو اتنے اچھے نہیں تھے؟“

”اباجی! اس نے دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ یہ دیکھیں یہ سرٹیفیکیٹ بھی ہے۔“ مولوی اشفاق مہر کی پیشانی پر بے ساختہ ایک ہل نمودار ہو گیا۔ سرٹیفیکیٹ اور ٹرائی دیکھنے کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں آہستہ سے ایک طرف رکھ دیں اور بولے ”وہ خود کہاں ہے؟“

”ڈڈ..... ڈروری بھی کہ آپ کو برائے لگے۔“

”ڈر تو اللہ کا ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں کون سا بیٹھے رہتا ہے تم لوگوں پر پابندیاں لگانے کے لیے۔“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر آواز دی۔ ”عین انور! کہاں ہو عین انور!“ وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارتے تھے۔

نور ڈری ڈری سی باپ کے بستر پر پانچنی کی طرف آ بیٹھی۔ وہ نہنڈا جیسے لہجے میں بولے۔ ”دیکھو بیٹی، ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ وہ سوچ ہی نہیں کتے۔ ان کی رائے اور مشورے میں بھلائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کھیل کود، اچھل پھاند لڑکوں کے کام ہیں۔ لڑکیاں پڑھائی اور گھر گھر رستی کے کاموں میں ہی اچھی لگی ہیں۔“

”بس اباجی! بچہ نے ہی زور دیا تھا کہ تھوڑا بہت.....“ آواز اس کے گلے میں اٹکی گئی۔

”کیا تھوڑا بہت؟“ وہ ٹھیک درست کر کے بولے۔

”جی کہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھوڑا بہت..... ہونا چاہیے۔“

”تو بچی، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تم اور بھی تو کچھ کر سکتی ہو۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ قرأت اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لے سکتی ہو۔ پھر تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ سلائی کڑھائی کے کچی ٹیشن ہوتے ہیں.....“

”ٹھیک ہے..... ابا جان..... میں کوشش کروں گی۔“ اس نے کہا۔

لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، جب بھی موقع ملے مجھے ان سے ضرور ملواؤ..... اور دیکھو اگلے مہینے ایک اچھا انونٹ ہے۔ ہمارے اسکول کی لاہور کی تمام براجز کے مشترکہ کھیل ہو رہے ہیں۔ تم ان میں حصہ لو۔ تھوڑی محنت کرو تو پہلی، دوسری پوزیشن حاصل کر سکتی ہو۔“

”مجھے کرنا کیا ہوگا بچہ؟“

”کچھ بھی نہیں۔ فزیکل ٹریننگ کا پریڈ تو ہوتا ہی ہے، اس میں باقاعدگی سے حصہ لو۔ پھر بیٹے میں دو روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رنگ کی ٹریننگ ہوتی ہے، جو کہ تو ہوں گے تمہارے پاس؟“

”نہیں بچہ! لیکن میں لے لوں گی۔“ وہ بولی۔

”شاباش۔ تم ضرور آگے بڑھو گی۔ ایک اچھی

”اسپورٹس“ ہو گی۔“ انہوں نے اس کا کندھا چھو دیا۔

نور خاموشی سے ٹریننگ میں حصہ لیتی رہی۔ سبز و جعدان اس پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ پریکٹیکل کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھیوری بھی سمجھا رہی تھیں۔ ”دیکھو نور! چھوٹے فاصلوں کی دوڑوں میں اسٹارٹنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایٹلیٹ اسٹارٹ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر کرتا ہے تو یہ دسواں حصہ آگے جا کر ایک یا دو سیکنڈ میں بدل جاتا ہے.....“

ایک دن انہوں نے کہا۔ ”نور! دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہارے reflexes بہت اچھے ہیں..... کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم ٹیمپلر وزن ہو۔ کیا تمہاری ٹیمپل میں پہلے بھی کوئی ایٹلیٹ رہا ہے؟“

”نہیں بچہ۔“ نور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن اگر آپ بھاگ دوڑ کو آٹھلیٹس کہیں تو پھر بھاگ دوڑ تو ہم نے خوب کی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم پہلے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے ساتھ بہت بڑا باغ تھا۔ ہم بچن بھائی سارا سارا دن اس میں دوڑیں لگاتے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کزنز نے میرا نام اڑن چھو“ ڈال رکھا تھا۔“

”تم واقعی اڑن چھو بن سکتی ہو نور۔ بس تھوڑی سی محنت اور مستقل مزاجی چاہیے۔“

اسکول کی ”برائچر“ کے مقابلے ہوئے۔ ان میں سویڈش ریس میں بھی نور نے یہ فائل مقابلہ آسانی جیت لیا۔ وہ دوسرے نمبر پر آنے والی کھلاڑی سے کم از کم دو سیکنڈ آگے رہی تھی۔ پھر زکے علاوہ ڈائریکٹر صاحب نے بھی اس

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ”دیکھو عین النور! ہم ایک دیندار گھرانے سے ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، کچھ اصول ضابطے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے دوسرے بچوں کی بہ نسبت تم ان اصول و ضابطوں سے کچھ دور ہو۔ یہ چیز مجھے کبھی کبھی رنج بھی دیتی ہے..... اپنے ان معاملات پر غور کرو اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں، والدین کبھی بھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔“

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اوڑھنی سر سے سر کئے نہ پائے۔ کل اس نے اپنے بالوں کی کچھ کمزور لٹیکیں کاٹی تھیں۔ یہ کنگ اس موقع پر ابا جی کے سامنے آ جاتی تو ان کی خطی ایک دم غصے میں بدل سکتی تھی۔

نور پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی۔ تاہم وہ ان طالب علموں میں سے تھی جو تھوڑی کوشش کے ساتھ امتحان بہ آسانی پاس کر لیتے ہیں۔ پڑھائی جاری رہی اور اس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا شوق بھی ہوتا رہا۔ اسے اب خود بھی رنگ میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق اسے اسکول میں آدمی چھٹی کے بعد ایک پریڈ کی اضافی چھٹی مل جاتی تھی۔ وہ اور اس کی کلاس فیلو شاپنہ اس دوران میں رنگ کرتی تھیں۔ اسکول کا گراؤنڈ خاصا وسیع تھا۔ ایک چکر تقریباً نصف کلومیٹر کا بن جاتا تھا۔ وہ دونوں روزانہ تقریباً چار چکر لگاتیں۔ اس کے بعد کھنے درختوں کے نیچے ایک ہاتھ پر ”اسپرٹس“ یعنی سویٹر کی تیز رفتار دوڑیں لگاتی جاتیں۔ اکثر اوقات مسز وجدان بھی موقع پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو سویٹر کے اسرار و رموز سمجھاتیں۔ اسٹاپ وایج ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی..... اور لگاؤ میں فٹنس لائن پر۔ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ دونوں لڑکیوں کا ٹائم روز بروز بہتر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نور کا۔

ثرانی والے واقعے کے بعد ابا جان اور نور میں دوڑ وغیرہ کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح تعمیراتی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ابا جان کو نور سے جو دو چار شکایتیں تھیں، وہ اس نے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ صبح جلدی اٹھتی تھی۔ نماز میں بے قاعدگی ختم کر دی تھی۔ کمزوری موجودگی میں دوپٹا اپنے سر سے سر کئے نہیں دیتی تھی، اس کے علاوہ پڑھائی پر بھی توجہ دے رہی تھی۔

ایک دن نور اسکول سے گھر آئی تو ہسمہ کو روٹے ہوئے پایا۔ وہ بھی ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی اور اپنے سفید براق یونیفارم میں پیاری لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہسمہ؟“ نور نے بڑی بہن کو بے تکلفی سے ہانپوں میں لیتے ہوئے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔ وہ پہلے تو ناکاتی رہی پھر اس نے بتایا کہ آج گاؤں سے دو بندے آئے تھے۔ وہ ابا جی اور تایا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک دوپاٹیں ہسمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ نور نے پوچھا۔ ہسمہ ناک سے سون سون کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔ ”نورا! ہم حیران ہوتے تھے تاکہ آپ تول والا معاملہ تو ختم ہو گیا..... پھر تایا اور ابا جان گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں کیوں آ گئے۔“

”ہاں، یہ حیرانی تو تھی۔“

”اس کی وجہ امی اور دادی کو بھی معلوم تھی۔ پر انہوں نے کبھی ہم سے ذکر نہیں کیا۔“

”کیا وجہ تھی؟“

”وہ لوگ ابھی تک اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹے نور..... خاص طور سے چودھری کا بیٹا ابدال۔ وہ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہے، چودھری اب کہتے ہیں کہ اگر بڑی کا رشتہ نہیں ہو سکا تو چھوٹی کا..... یعنی میرا رشتہ انہیں دیا جائے۔ اب پچھایت والے بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ ایک نئی بات کہتے ہیں کہ ہمارے گھر والے زبان دے کر انکاری ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک لڑکی کا رشتہ تو دینا ہوگا۔“

”اوہ گاڈ۔“ نور نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ”یہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی کیا بلا ہوتی ہے ان چودھریوں و ڈیروں میں..... خدا کے بندو! شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے اور اس میں لڑکے لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کو گائے بکری کی طرح کان سے پکڑا اور کسی ٹھونسنے سے باندھ دیا۔“ نور کے لہجے میں تشنہ تھی۔

”نہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔“ ہسمہ بولی۔

”اب کیا ہوگا؟“

”ابا جان اور تایا جان کل گجرات جا رہے ہیں۔ کسی ایم پی اے سے بات کرنی ہے انہوں نے تاکہ یہ جھگڑا زیادہ نہ بڑھے۔“

ایم بی بڑے کمزور دل کی تھیں۔ وہ تو جیسے بستر سے لگ گئیں۔ ان کی پیاری کی ایک نہیں دو دو بات تھیں۔ ایک تو ہسمہ والا معاملہ۔ وہ کئی بار بے حد دکھی لہجے میں کہہ چکی تھیں، یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں..... ان

ابا نے بھی منہ سے اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کیا تھا۔
ہاں کھاپریوں کی وڑی ماں زور زوری کرتی رہی۔ کبھی بٹول
کے کپڑے لے آتی، کبھی عید شب برات شروع کر دی۔
اب بات کافی حد تک نور کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔
اس کا مطلب تھا کہ آپ بٹول کی شادی کے بعد باغ والی
زمین کا جو جھگڑا شروع ہوا، اس کی وجہ آپ بٹول کی شادی
ہی تھی اور اب بات وہیں تک نہیں رکھتی تھی۔ وہ لوگ ان کے
ابا کی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ ان
کو دیں، اسے بھی پتا چلا کہ آپ بٹول کی شادی کے بعد ایک
اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابدال کا بڑا چاچا اپنی اے بن گیا تھا۔
انہیں سیاسی اثر رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب
آپ کے بعد وہ سہ ماہی کا رشتہ مانگنا شروع ہو گئے تھے۔

تین چار بیٹے کافی تناؤ میں گزرے پھر یہ معاملہ کچھ
سداھر گیا۔ ابا بھی اب بہتر تھے لیکن اس سارے تعینے نے
ایک نقصان کر دیا تھا اور یہ کافی بڑا نقصان تھا۔ نور نے اپنی
والدہ کو کھو دیا تھا۔ تناؤ بھرے دنوں میں ایک دن ایسا آیا
جب ان کا ایک پہلو بے جان ہو گیا۔ ان پر قاف کا شدید
حملہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ منوں
مٹی کے پیچے پاس ہو گئے۔

ان کی وفات نے نور اور بسہ کو جیسے بنیادوں سے
ہلا دیا تھا۔ والد نے تو ہمیشہ ان سے تحوڑا فاصلہ رکھا تھا، یہ
والدہ ہی تھیں جو ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک رہتی تھیں اور
تینوں بیٹیوں کے ہر طرح کے مسائل کا حتی المقدور سامنا
کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نور ہر وقت غم اور اداسی کے
ایک نا دیدہ حصار میں رہنے لگی۔ میٹرک کا فائنل امتحان سر پر
تھا مگر وہ پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پاری تھی۔ اسپورٹ
والی سرگرمی بھی ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ ویسے بھی وہ امتحان
کے لیے اسکول سے فارغ ہو چکی تھی۔

ایک روز اسپورٹس کی ٹیچر مسز وجدان بالکل غیر متوقع
طور پر ان کے گھر آن پہنچیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس وقت
نور کے ابا جان گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ جو نمی مسز
وجدان نے اپنا تعارف کرنا تھا ابا جان کا پارہ چڑھنا شروع
ہو جاتا تھا۔ مسز وجدان نے نور کے ساتھ دیر تک دلجوئی کی
باتیں کیں۔ پھر اس کے بڑے ماموں مراد کو بھی بلالیا۔ مسز
وجدان نے نور کے ماموں مراد اور بہن بسہ کو بتایا کہ نور
میں اتھلیٹکس کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت موجود
ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے بڑا افسوس ہوگا اگر کسی وجہ سے
نور کا ٹیلنٹ ضائع ہو جائے۔ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں

کی پریشانی کی دوسری وجہ بڑی بیٹی بٹول کے گھریلو حالات
بھی تھے۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ ملتان میں وہ
اپنے سرسرا میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ شوہر غیاث سخت
مزاج کا تھا اور کسی وقت مار پیٹ کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔
دو تین دفعہ وہ ناراض ہو کر میکے آ گئی تھی مگر پھر صلح ہو جاتی تھی
اور شوہر اسے لے جاتا تھا۔

ابا اور تایا جان بار بار گجرات جا رہے تھے۔ کسی وقت
ان کے ساتھ بڑے ماموں بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک
سفر کے دوران میں نور کے ابا جان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف
بھی ہوئی اور وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال پہنچے۔ اس دن
نور کی ای بڑی آرزو تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”ہمارے
بڑے کہا کرتے تھے کھاپریوں سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہ
رکھتا۔ یہ کھوٹے اور خطرناک لوگ ہیں۔ پر تیری دادی.....“
وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

نور نے ماں کو ذرا کرید تو انہوں نے ڈرے ڈرے
لہجے میں کہا۔ ”یہ سب تیری دادی کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ ان
کی کھاپریوں کی دڈی ماں سے اتنی دوستی ہوئی اور نہ یہ
مصیبت ہمارے گلے پڑتی۔“

نور اب قدرے سیانی ہو چکی تھی۔ اب اسے بات کو
کریدنا اور اس کی تک پہنچانا آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ای!
اگر چودھری طفل کی ماں کے ساتھ ہماری دادی کا اشتنا بیٹھنا
تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ہم نے کھاپریوں کو
آپ بٹول کے رشتے کے لیے زبان دے دی کی؟“

”یہ بات کافی پیچھے تک گئی ہوئی ہے نور۔“ والدہ نے
کہا۔ ”یہ دونوں عورتیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اس وقت
تیری آپ بٹول کی عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ کھاپریوں کی
ماں نے بٹول کو کیلیے دیکھا اور کہا کہ اسے تو میں اپنے
پوتے ابدال کی دوہنی بناؤں گی۔ بس اتنی سی بات تھی جو
بہتے بہتے جھگڑ بن گئی۔ کھاپریوں کے ساتھ تمہارے ابا اور
تایا کا کوئی زمین کا جھگڑا بھی تھا لیکن یہ جھگڑا دونوں عورتوں
کی دوستی اور میل جول کے نیچے دبا رہا۔ کھاپریوں کو اس
بات کا لالچ تھا کہ جب بٹول کا رشتہ مل جائے گا تو وہ زمین
بھی خود بخود ان کے پاس چلی جائے گی جس کا جھگڑا تھا۔
بٹول ویسے بھی شکل صورت کی اچھی تھی۔“

نور نے کہا۔ ”ابا جی اور تایا جی کو ان ساری باتوں
کا پتا نہیں تھا؟“

”پتا تھا لیکن اس وقت یہ تو پتا نہیں تھا کہ طفل کے
پتر بڑے ہو کر اسے طرح کے نکلیں گے۔ بہر حال تمہارے

کردار اور ادھر آ کرنا چاہیے۔ اگر نور کے والد صاحب کے ذہن میں کچھ تحفظات ہیں تو آپ لوگ ان سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔“

ماموں مراد بولے۔ ”نچر! ہم نور کے حوالے سے آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر ہر گھر کے اپنے معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بھائی جان سے بات کرنے کا کچھ فائدہ ہوگا۔ یہ آئیل مجھے مار والی بات ہوگی..... اس حوالے سے خاموشی ہی بہتر ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ نور خاموشی سے رنگ میں حصہ لیتی رہے؟“

”جی ہاں۔ اگر اسے شوق ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ اس کے لیے اچھا شوق ہے تو پھر یہ شوق خاموشی سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔“

مسز وجدان نے نور کو مجبور کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی ان سے رابطہ کرے اور فراغت کے ڈھائی تین ماہ میں اپنی ٹریننگ کو آگے بڑھائے۔

نور مناسب قدر اور چہرے جسم کی مالک تھی۔ رنگ بچپن میں گندمی تھا لیکن اب کافی گلہا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نفوس بھی جاذب تھے۔ گو سمہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی نور کے نہایت متناسب جسم اور الہڑپن نے پوری کر دی تھی۔ یہ نوخیز شباب کے دن تھے، اس کے جسم سے جیسے توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ڈٹ کر کھاتی تھی مگر بھاگ دوڑ کے سبب یہ خوش خوراک اس کے ”فکر“ کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔

امتحانات کے بعد نور خاموشی سے مسز وجدان کے پاس ان کی ٹریننگ اکیڈمی میں جاتی رہی۔ مسز وجدان چند سال پہلے تک خود بھی نیٹیکل لیول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں اور انہوں نے ریس کے کئی اہم ایونٹس جیت رکھے تھے۔ انہیں نور میں ایسا اسپارک نظر آ رہا تھا جو اس کو آگے لے جا سکتا تھا۔ نور نے سمہ سے مشورے کے بعد ابا جان اور دادی کو یہی بتایا تھا کہ وہ کوننگ کا ایک کورس اینڈینڈ کر رہی ہے اور یہ سفید جھوٹ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ایک کوننگ کے اسکول میں جاتی تھی مگر وہاں سے فوراً مسز وجدان کی اکیڈمی میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے جوتے اور ٹریک سوٹ وغیرہ بھی وہیں پڑے رہتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے سیکھ رہی تھی۔

میٹرک کا امتحان نور نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ تاہم اس دوران میں اسے رنگ میں کئی چھوٹی چھوٹی

کامیابیاں ملیں۔ اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔ مکمل کے حوالے سے اس پر ایک جنون سا سوار ہونے لگا۔ اس نے ان بڑے ملکی اور غیر ملکی ریز کے بارے میں پڑھا جنہوں نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور کامرانیاں بھیئیں۔ اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہونے لگی۔ وہ جب جب آپہ کی تلخ گھریلو زندگی کو دیکھتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں کے ٹھنڈے روز و شب کو یاد کرتی تھی، اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا شوق فزول تر ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ وہ ایک چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی اور بات فقط دونوں بہنوں کی ہی نہیں تھی، وہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں سے بھی مختلف تھی۔ گزریوں سے کھینا اسے بچپن اور لڑکپن میں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کپڑوں کا بھی بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ خواہ مخواہ شرمانا، چلنوں کے پیچھے چھپنا، لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر خود کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کرنا، بات بات پر ادنیٰ اللہ..... ہائے اللہ مرنی..... جیسے جملوں کا استعمال اور ناز و نزاکت کے سارے انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ اس نادیدہ حصار کو توڑنا چاہتی تھی جو مور اور والی گاؤں کی اکثر لڑکیوں کے ارد گرد موجود تھا۔ بھی بھی اسے لگتا تھا کہ اسے پردے گئے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی اس کی ماں اور ادنیٰ کی زندگی سے بہت مختلف ہو سکتی ہے۔

پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس نے کئی چھوٹے بڑے میڈل اور کپ جیتے تھے۔ وہ یہ سارے انعامات گھر کے پیسٹ میں موجود امی جان کی ایک پرانی جستی پٹی میں لٹائوں کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ سمہ کے علاوہ کسی کو اس تکلیف کا پتا نہیں تھا۔

دوسال پہلے سمہ کو تو کالج میں داخلہ لیا گیا تھا مگر جب نور کی باری آئی تو ابا جان نے برملا کہہ دیا کہ وہ کالج نہیں جائے گی۔ ان کے سخت رویے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر وقت نور کی طرف سے چونکے رہتے تھے۔ ایک روز جب نور... کوننگ اسکول سے (اور دراصل مسز وجدان کی اکیڈمی) واپس گھر آئی تو دادی اور ابا جان میں بات چیت ہو رہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے کچھ اڑتے اڑتے فقرے نور کے کانوں میں بھی پڑے۔ دادی نے کہا۔ ”تو یہ یا اللہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا ہم نے۔ لڑکیاں اکیلی گھونگھٹ لگتی ہیں اور جب دل چاہے واپس آتی ہیں۔ کوئی پوچھنے بتانے والا نہیں۔ مہی نہیں صاف بتا دیتی ہوں اشفاق! تیری اس چھوٹی کے چھن ٹھیک نہیں۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھ۔ لڑکوں

خوشخبری سنائی۔ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے لیے ڈیپارٹمنٹل ٹیم میں شامل ہونے کا زبردست چانس بن رہا ہے۔“

”ڈیپارٹمنٹل ٹیم؟“ نور نے ذرا حیرت سے کہا۔
”جی ہاں! اکثر سرکاری اور غیر سرکاری جگہ اچھے کھلاڑیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور انہیں ”مگرمو“ کرتے ہیں۔ تمہیں واڈا کی سروس کا موقع مل رہا ہے۔“ فرحانہ بیگ نے ایک لیٹر نور کے سامنے رکھ دیا۔

اس لیٹر کے مطابق لاہور سے پانچ چھ ایتھلیٹ لڑکیوں کو ٹرائل اور انٹرویو وغیرہ کے لیے اسلام آباد بلا یا گیا تھا۔ ان میں نور کا نام بھی تھا۔

نور نے لیٹر پڑھنے کے بعد کہا۔ ”لیکن میڈم! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے گھر والے.....“

”ادھو، چھوڑو اس بات کو۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ، تم ٹرائل وغیرہ تو دو۔ یہ کوئی معمولی موقع نہیں ہے۔ کامیاب ہوگئی تو شیک ٹاک معاوضہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ پھر دیکھ لیتا جس طرح بھی کرنا ہوگا۔“

”مگرمیڈم! یہ بات چھی تو نہیں رہے گی بلکہ..... میرا تو اسلام آباد جانا ہی ممکن نہیں ہوگا۔“

”صرف دو دن کی بات ہوگی۔ بہن اور ماموں کو بتا دو۔ والد صاحب کو ابھی نہ بتاؤ۔ انہیں کالج کے تقریبی طور وغیرہ کا کہ دو۔ خدا نخواستہ تم کو غلط کام تو نہیں کر رہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی صلاحیت دے رکھی ہو تو اسے استعمال نہ کرنا بھی بہت بڑی ناشکری ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے والد بھی جلد یا بدیر اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اور پرنسپل صاحب کسی دن اکٹھے ان سے ملاقات کریں اور انہیں تمہارے حوالے سے قائل کریں۔“

”مگرمیڈم.....“

”دیکھو نور!“ میڈم فرحانہ نے اس کی بات کاٹی۔
”کہتے ہیں کہ بچے کا ایک باپ وہ ہوتا ہے جو اسے آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور دوسرا باپ استاد ہوتا ہے جو اسے زمین سے اٹھاتا ہے اور پلندی پر پہنچاتا ہے۔ کیا تم اپنے استاد کو یہ درجہ نہیں دیتی ہو؟“

اس روز میڈم فرحانہ نے اسے نوے فیصد قائل کر لیا۔ وہ خیالوں میں ابھی اور ایک جھپکے مستقبل کا سوچتی ہوئی سہ پہر کے بعد پہنچی۔ تاہم گھر پہنچ کر اسے ایک نئی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دادی اماں اور چچا حارہ اسے مختلف

کی طرح کدڑے مارتی پھرتی ہے۔ لڑکیوں بالیوں والی کوئی شرم کوئی نزاکت ہی نہیں اس میں۔“

”اماں جی! آپ جانتی ہیں، شروع سے ہی ایسی ہے وہ۔ اب بڑی ہو رہی ہے، بطور طریقے بھی آ جائیں گے۔“

”آئے ہائے..... اور کتنی بڑی ہوگئی۔ کوٹھے جتنی ہوگئی ہے۔ کل سیز جیوں پر یوں چڑھ رہی تھی، جیسے کوئی گھوڑی دولتیاں مارتی ہوئی جا رہی ہو۔ نہ سر پر دو پٹا نہ پاؤں میں جوتی۔ میں تو کہتی ہوں جوتل کی طرح اسے بھی گھر میں ہی پابوسی کروادے۔“

”سوچ تو یہی رہا ہوں اماں جی! پر اب بسہ کالج جا رہی ہے۔ بھائی غلطیل کے سارے بچے جا رہے ہیں..... وہ کہے گی، مجھ پر ہی پابندی کیوں؟“

”غلطیل کی بات تو چھوڑ دو۔ وہ تو دیسے ہی اپنی آخرت کو بھلا کے بیٹھا ہوا ہے۔ حج کر کے بندہ دنیا داری سے دور ہو جاتا ہے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بیسے کے پیچھے جو دوڑ پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔ راحت کو دیکھ لے، اسی طرح پتلی کی چادر لے کر بازار چلی جاتی ہے۔ کتنی ہے اب پوڑھی ہوگئی ہوں۔ پر شادی بیاہ پر اس کی تیاریاں دیکھو تو کہیں بڑھا پانظر نہیں آتا۔“

نور پر اساتذہ بنا کر دہاں سے ہٹ آئی تھی۔

کالج میں داخلے کا معاملہ بدستور اٹکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ پھر تا غلطیل کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ کچھ کاردار بسہ اور بڑے ماموں مراد نے بھی ادا کیا۔ نور کو اس شرط پر بمشکل اجازت ملی کہ بڑے ماموں اسے خود کالج چھوڑ کر آیا کریں گے اور لایا بھی کریں گے۔ کالج ان کے شوروم کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

☆☆☆

کالج میں پہنچنے سے پہلے ہی نور کی تموڑی بہت شہرت کالج میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کئی ایک اسٹوڈنٹس جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی ایتھلیٹ ہے۔ اس کی اسپورٹس ٹیچر بھی اس کے نام سے شناسائیں۔ ایک فائدہ نور کو یہ ہوا کہ کئی ٹیچر فرحانہ بیگ ذاتی طور پر مسز وجدان کی دوست بھی تھیں۔ فرحانہ بیگ نے شروع میں ہی نور پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور وہ مراعات بھی دی گئیں جو ایک ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کے لیے ضروری تھیں۔ مسز وجدان اور فرحانہ بیگ کی ہدایت کے مطابق نور مختلف ٹرائلز میں بھی شرکت کر رہی تھی۔ فرحانہ بیگ بہت اچھی کوچ بھی تھیں۔ ایک روز فرحانہ بیگ اور ٹیچر الیاں صاحب نے اسے

”کیا ہو بیٹی؟“ پچھونے پوچھا۔

نور نے اٹک بار نظروں سے پھسکی طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہ..... یہ آپ لوگ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا..... شادی بیاہ کی بات..... اس طرح کی جاتی ہے۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا نہ کچھ بتایا۔ میں نے.....“ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پچھونے گھبرا کر اسے کندھوں سے تھاما اور دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ ”نور پترا! تیرے ابائی گھر میں ہیں۔ ان کے کالوں تک آواز نہ چلی جائے۔ میری بات سن، ذرا ٹھنڈے دل سے.....“

”نہیں پچھو..... نہیں..... میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔“ وہ باقاعدہ رونا شروع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت کم روتی تھی مگر آسو جیسے ہزار مار کر اس کی آنکھوں تک آئے تھے اور آنکھوں میں ہی نہیں پورے جسم میں رواں ہو گئے تھے۔

اب بسمہ بھی اندر آ گئی تھی۔ شاید وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے نور کو اپنے ساتھ لگایا اور ہر اسام لہجے میں بولی۔ ”نوری..... نوری! اوپ ہو جا ابائی نے سن لیا تو مصیبت آ جائے گی۔“ شاید بسمہ کے اشارے پر ہی پچھونے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ بریانی کی خوشبو اب بھی تختوں تک پہنچ رہی تھی مگر اب یہ گندھک کی بو کی طرح نور کی ناک اور اس کے گلے کو چھیل رہی تھی۔ وہ بسمہ کو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے بسمہ! تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا..... کیا تم بھی اس سارے کھیل میں شریک ہو..... کیا تم بھی یہی چاہ رہی ہو؟“ بسمہ بولی۔ ”نہیں نور! ام..... مجھے بھی اباجان نے کل دوپہر ہی بتایا تھا..... اور تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تھا لیکن تمہی بات ہے میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی تم سے بات کرنے کی..... اور پھر رات کو وہ مجھے بازار لے گئے۔ میں واپس آئی تو تم سو رہی تھیں۔“

پچھو بولی۔ ”ان باتوں کو چھوڑو۔ تم سب کو پتا ہے کہ ہونا تو اس گھر میں وہی ہے جو تمہارے ابائی چاہتے ہیں اور ماں بہو بھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لڑکے کی ماں اور بہن نے پچھلے مہینے تمہارے حفیظ انکل کی شادی پر تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بات چیت چل رہی تھی۔“

”کیوں چل رہی تھی بات چیت..... ہاں کیوں چل رہی تھی؟“ نور ترخ کر بولی۔ ”کس نے پوچھا تھا مجھ سے؟

نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اباجان بھی گھر میں ہی موجود تھے۔ لیکن سے بریانی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آج نور نے ذرا لمبی ٹریننگ کی تھی۔ اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس نے بسمہ سے پوچھا۔ ”کھانا تیار ہے؟“

بسمہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کھانا تو دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا لیکن مہمان ابھی نہیں آئے۔“

”کون سے مہمان؟“ نور نے سلاط پر منہ مارتے ہوئے کہا۔

”تیرے مہمان۔“

”میرے مہمان؟ کیا پہیلیاں بھجوا رہی ہو۔ کون آ رہا ہے بھی؟“

بسمہ کی مسکراہٹ جو پہلے ہی پھٹکی سی تھی کچھ اور بھی پھٹکی ہو گئی۔ وہ شاید بولنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی جب پچھو حارہ اندر آئیں۔ نور کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پکڑا کرتے ہوئے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ بسمہ کئی کئی بار جلدی سے باہر نکل گئی۔ نور حیرت زدہ تھی۔ ساتھ والے کمرے سے اباجان کے کہنے کے لیے آواز آ رہی تھی۔ پچھو حارہ نے بڑے دلار سے کہا۔ ”نور! ابھی رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک رشتہ مل جانا، اللہ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اب دیکھ لے تیری خالہ کی تینوں بیٹیاں ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کی ہیں اور اسی طرح بیٹی ہیں۔“

”پچھو! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“ کم سن نور کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ پچھو بولیں۔

”اچھا رشتہ آیا ہے۔ تیرے ابائی کے جاننے والے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ عالم دین ہیں، ان کا بڑا بیٹا ذوالقرنین۔ تیرے ابائی کی شاپ کے ساتھ ہی اس کی شاپ بھی ہے۔ اسلامی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اچھی آمدن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ صرف ایک جڑواں بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بالکل چھوٹی سی فیملی ہے۔ یہ دیکھو۔“

پچھو نے ایک کارڈ سائز تصویر نور کے سامنے کردی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بیس چوبیس سال کا لوجان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ کہنے کو قبول صورت کہا جاسکتا تھا مگر چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی اور سختی تھی۔ جیسے ہر چیز سے بیزار بیٹھا ہو۔

نور نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تصویر میز پر رکھ دی اور اپنا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

ہوئے لہجہ میں کہا۔

یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ نور کو خود یقین نہیں ہو پارہا تھا کہ وہ کھڑکی کی اوٹ سے یہ الفاظ اپنے والد سے کہہ چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جنہوں نے اس طرح کی جرأت اسے عطا کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی والدہ مرحومہ کی ساری محنت زندہ زندگی سہ آئی ہے اور اپنی آپنی بٹول کی ازدواجی زندگی کی ساری تنگیوں بھی اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ہاں، یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ مولوی اشفاق مہرا تیزی سے دروازے کی طرف پلٹے۔ اگلے ہی لمحے دروازے کے تختے اس طرح دھڑ دھڑائے جیسے پورا دروازہ دیواروں سے نکل کر کمرے میں آ کر گرے گا۔ ”دروازہ کھولو، بسمہ دروازہ کھولو۔“ وہ خوفناک آواز میں دھاڑے۔

بسمہ نے بھی ہوئی نظروں سے پیچھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”بھائی جان! ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“ ”میں کہتا ہوں دروازہ کھولو، ورنہ میں توڑ دوں گا۔“ مولوی اشفاق کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ وہ جیسے پھٹ پڑے تھے، شاید ان کا ”بی بی“ بلند یوں کوچھو رہا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا تو مولوی جی کا طیش مزید بڑھے گا اور نتائج مزید برے نکلیں گے۔ پیچھونے کا نچتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ مولوی اشفاق کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا۔ اندر آتے ساتھ ہی وہ جیسے نور پر پل پڑے۔ وہ چلائی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ دسٹے کی ضربیں اس کے جسم پر تواتر سے لگ رہی تھیں۔ کمرے میں کھرام سا جھجک گیا تھا۔ مولوی اشفاق دھاڑ رہے تھے۔ ”بدبخت! زبان چلائی ہے۔ میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔“

بسمہ تڑپ کر باپ کے سامنے آ گئی۔ ”ابا جی نہیں..... پلیز ابا جی.....“

اس نے کئی چوٹیں اپنے ہاتھوں پر سہیں۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناخنوں سے خون بہہ نکلا۔ پیچھو بھی اپنے طور پر انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی سمیت گھر میں موجود دیگر افراد بھی ہانپے کانپے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ مولوی اشفاق غم و غصے کے عالم میں گرج رہے تھے۔ ”تیری یہ جرأت..... تیری یہ ہمت..... بے شرم بے حیا..... اپنے باپ کے منہ پر کا لکل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے مجھے۔ اپنے

کس نے بات کی تھی؟ ابا جی خود کہتے ہیں، اسلام میں بیٹیوں کو قتل دیے گئے ہیں۔ میرا حق کہاں تھا؟ میرا حق کہاں ہے؟ اور یہ کیا بات ہے کہ کالج سے گھر آؤ تو آگے آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور ابھی تو مجھ سے آگے بسمہ ہے۔ ابا جی کے جاننے والوں کو وہ کیوں نظر نہیں آتی؟ انہوں نے مجھ پر ہی کیوں نشانہ لے لیا ہے؟“

”نا شکری کی باتیں نہ کر۔“ پیچھو پہلی بار غصے میں بولی۔ ”ہر ایک کا مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بسمہ بھی... انخواسے کوئی نولی لنگڑی نہیں ہے۔ دیکھنا دو چار ماہ میں اس کا بھی بڑا چنگا برل جائے گا۔ بھائی اشفاق تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔“

”فرض سے نہیں پوچھو۔ شاید ہم پوچھو ہیں ان کے لیے۔ وہ ہمیں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ نہ چاہنے کے باوجود نور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب دروازے پر دھک ہوئی اور تینوں عورتیں خشک گئیں۔ بسمہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ باہر سے ابا جی کی بھاری آواز سنائی دی۔

”بسمہ! تیار ہو گئی ہے عین الانور؟“

”ہاں ابا جی ہو رہی ہے۔“

”جلدی کر دو بھئی! وہ لوگ آنے والے ہیں۔“ ابا جی نے ملامت سے کہا۔

ان کے قدموں کی مدد چپ ابروی۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے اتنا حوصلہ، اتنی ہمت اور جرأت اچانک اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اندر بھی اور ابا جان باہر۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جالی دار کھڑکی تک پہنچی اور کھاتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

”ابا جان۔“

وہ خشک کر رک گئے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

”نور! کیا بات ہے؟“ انہوں نے نرم لہجہ میں پوچھا۔

چند لمحوں کے نہایت بوجھل وقفے کے بعد نور نے کہا۔

”ابا جان! آپ..... ابھی..... میری کوئی بات نہ کریں۔“

مولوی اشفاق مہرا کے چہرے پر جیسے حیرت اور طیش کا دریا بہہ گیا۔ وہ بولے۔ ”مم..... میں سمجھا نہیں..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”ابا جان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے مگر میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ میری بات نہ کریں۔“ اس نے بڑے ٹھہرے

وہ پھر نور کی طرف جھپٹے۔ بڑے ماموں نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

نورایک کونے میں گھسٹھڑی بن کر سٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کانچ کی سفید یونیفارم پر خون کے داغ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خون تھا جو اس کا سر پھینٹنے سے بہا تھا۔ اس کی گھٹئی گھٹئی آواز ایک دردناک فریاد بن کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

پورا گھر ایک طوفان کی زد میں تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ نور کے ابا جان نے کسی ایمر جنسی کا بہانہ کر کے مہمانوں کو فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع سن کر تائی جان اور مہرین وغیرہ بھی بھاگے آئے تھے۔ نور کو گھر میں بی ٹی طیبی امداد دینی تھی اور اس کے سر سے مسلسل بہنے والا خون روکا گیا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تایا حلیل لاہور میں موجود نہیں تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر بات کو سنبھال لیا کرتے تھے۔

”چتا نہیں کہ رابطہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

تاکلی جان نے تقبھی انداز میں سر ہلایا۔ وہ نور اور
بسمہ کو تسلی دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئیں تاکہ شوہر کو کون
کر سکیں۔ پچھو مسلسل نور کو سمجھانے بھگانے میں لگی ہوئی
تھیں۔ مگہ بے باک ہے دادی بھی کوئی کڑوا کیلا لقمہ دے دیتی
تھیں۔ دادی پر اپنے خیال کی عورت تھیں اور ان کی سوچ
یہی تھی کہ لڑکیوں کو سات آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر
مگر ہستی سیکھ لینی چاہیے اور ان کی شادی جلدی کر دینی
چاہیے۔ دادی کی اپنی شادی فقط پندرہ سال کی عمر میں ہوئی
تھی اور وہ پردے کی اتنی پابند تھیں کہ ایک ہی گھر میں رہے
ہوئے انہوں نے ساری عمر اپنے سر اور وجیٹوں کو اپنی
صورت نہیں دکھائی تھی۔

پچھو جا کر وہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہہ رہی تھیں مگر چتا نہیں کہ نور کو کیا ہو تھا۔ مار کھانے کے بعد اور باپ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد نور کے اندر کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک باغی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنے والد اور اپنی دادی کا باغی، اپنے ارد گرد کے حالات کا باغی، اس باغی سے آج سے پہلے نور کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔

پچھو انہیں ایسی تلخ باتیں کرنے سے روک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی ہنوائی بھی کر رہی تھیں۔ ابا جان نے شام تک کالنی میٹم دیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ شام کے فوراً بعد ہی تایا جان کجرات سے لاہور پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ان کے گھر ہی آئے تھے..... انہوں نے ہمیشہ نور سے بہت پیار کیا تھا۔ اس کا پچھا ہوا سر، زنجی کلاٹیاں اور سوچی ہوئی آنکھ دیکھ کر وہ مشندہ رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے سرخ و سپید چہرے پر بس سرخ رنگ ہی باقی رہ گیا۔ نور کا خیال تھا کہ شاید تایا کو دیکھ کر وہ رو پڑے گی لیکن آنسو جو بہت کم ہی اس کی آنکھوں تک آتے تھے، اب بالکل روٹھے ہوئے تھے۔ بس آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے اور ایک انگارہ سا تھا جو سینے میں دھرا ہوا تھا۔

نور کے سر پر پیار دے کر تایا جان دوسرے کمرے

اللہ کے احکام کو مانتے مانتے اللہ کے احکام سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔
”بھائی جان! میں اس بارے میں آپ سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔“

”مگر میں کرنا چاہتا ہوں۔“ تایا غلیل گرے۔ ”مجھے بتاؤ، اپنی روتی سسکتی بچی کو مارکوٹ کر کسی کی ڈولی میں دھکیلنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟“

آوازیں آتا بند ہو گئیں۔ شاید درمیان میں موجود کوئی اور دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا لیکن یہ اعزاز تو ضرور ہو رہا تھا کہ ابا اور تایا میں زوردار ٹکرا رہا ہے۔ چار پانچ منٹ مزید گزرے پھر تایا جان غصے سے بھرے ہوئے..... تھک گئے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کونے میں دیکھی نور کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”چل میری بچی! یہ گھر تیرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اندھا بہرا ہو گیا ہے اس گھر کا سربراہ۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

پچھونے تایا غلیل کو روکنا چاہا پر انہیں بھی زور کی ڈانٹ کھانا پڑی۔ ”تایا بولے۔ ”بس، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گی جب تک تم لوگوں کے دماغ ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں رکھوں گا اسے۔“
قرعہ کمرے سے نور کے ابا جان کی دینی دینی مگر تلخ آواز ابھری۔ ”لے جائیں..... لے جائیں اس ننھے کو۔ میں بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھوں گا یہ مگر نبی ہے میرے لیے۔“

☆☆☆

اس دن کے بعد نور کے سارے روز و شب ایک دم بدل گئے۔ تایا ابا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ تایا کی طرح تائی راحت نے بھی ہمیشہ اس سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر تایا کے تینوں بیٹے، نور کے لیے بالکل بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ وہ شریل، عثمان اور مہرین کے ساتھ ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ مہرین اس سے صرف ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی اور فرخ پھر ایسٹ بن رہی تھی۔

تایا غلیل کافی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی کے لیے بھی ان کی بات کو رد کرنا یا ان سے طویل بحث مباحثہ کرنا ممکن نہیں تھا..... اور نور کے ابا جان سے تو ان کا رشتہ بڑے بھائی کا بھی تھا۔ نور کے ابا جان مولوی اشفاق کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تناؤ پیدا کر سکیں۔ انہوں نے جیسے ایک دم نور

میں ابا جان سے ملنے چلے گئے۔ بسہ نے جلدی سے کوریڈور اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے اتنی بلند ہو گئی کہ دونوں دروازے بھی اس کی گونج کو نہ روک سکے۔ نور کے ابا جان بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر آج تو وہ بھی ان کے سامنے بول رہے تھے۔ تایا کی آواز زیادہ بلند تھی اور پھر وہ بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اڑتے اڑتے کچھ الفاظ بسہ اور نور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”بہت افسوس ہے اشفاق! بہت افسوس ہے۔ تم اپنی ہی بچی کے بارے میں ایسی غلط سوچ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر مار دو اسے یا زندہ گاڑ دو زمین میں۔“

”خدا کے لیے بھائی جان! مجھے بولنے پر مجبور نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کا لاڈ پیار ہے جس نے اس کو اس حال تک پہنچایا ہے۔“

”کس حال تک پہنچایا ہے؟ کیا کر دیا ہے اس نے؟“
مجھے بتاؤ کون سی قیامت توڑ دی ہے اس نے؟ تم سے جیسے کا حق ہی مانگ رہی ہے نا۔ یہی کہہ رہی ہے نا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر شادی اور بال بچے کی ذمہ داری نہ ڈالو اور کیا کہہ رہی ہے وہ؟“

”بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں۔“ نور کے ابا جان نے قدرے دبی آواز میں کہا۔ ”اس کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ دیکھیں..... یہ ہے اس کا سامان جو نیچے پرانی بیٹی سے نکلا ہے۔ یہ بھی دیکھیں.....“

دھانی اشیا کے گرنے اور پٹنے جانے کی آوازیں آئیں۔ ایک کھلے میں نور کو اندازہ ہو گیا کہ بیسٹ میں موجود اس کے کپ اور ٹرائیاں وغیرہ ابا جان کی نظر میں آچکے ہیں..... اور آج دوپہر سے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ ان چیزوں کی برآمدگی کا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ کچھ کتنے دنوں سے چل رہا تھا۔

”تو کیا ہے اشفاق؟“ تایا جان کی بلند آواز دروازوں سے گزر کر نور اور بسہ کے کانوں تک پہنچی۔
”کون سا گناہ کر دیا ہے اس نے۔ کون سی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟ میں پھر کہتا ہوں اشفاق! اس طرح کا کنہ پن تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم

ہوئی۔ لاہور واپس آنے کے بعد نور نے باقاعدگی سے فرحانہ کے کوچنگ سینٹر جانا شروع کر دیا۔ یہ سینٹر کئی برس پہلے فرحانہ بیگ نے مکمل سے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کا اصل نام ”فرحانہ ایجوکیشنل اسکول تھا۔“ اسے عام طور پر ایف اے ایس کہا جاتا تھا اور ایجوکیشنل کے حلقوں میں اس کا نام تھا۔

میڈم فرحانہ بیگ اس ادارے کی روح رواں تھیں۔۔۔۔۔ اور بڑی محنت سے لڑکیوں کو رنگ کی تربیت دے رہی تھیں۔ اپنے اسکول کی دوست شاہینہ سے بھی نور کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ شاہینہ کا تعلق ایک اہلیت کلاس فیل کی سے تھا۔ اس کے والد ایک کامیاب صنعت کار تھے۔ اس نے ایک ہائی فائی کالج میں داخلہ لیا تھا اور اسپورٹس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اکثر سوسائٹی کی دوڑوں میں دوڑیں جیتنے کا آسنا سامنا بھی ہو جاتا تھا۔ ان دونوں کی ٹانگ میں بس انیس بیس کافرق ہی تھا۔ کسی وقت نور اور کسی وقت شاہینہ کی ٹانگ بہتر رہتی تھی۔

دونوں فرصت کے لمحات میں بے تکلف گفتگو بھی کرتی تھیں۔ شاہینہ بھی نور ہی کی طرح دراز قد اور اساتر جسم کی مالک تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی دونوں شاید ہم پلہ ہی تھیں تاہم شاہینہ کے نسبتاً زیادہ خوش حال لائف اسٹائل نے اس میں اضافی نکھار پیدا کر دیا تھا۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کی طرح شاہینہ بھی مستقبل کے خوب صورت پتلے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی اس کی پوری سپورٹ کر رہے تھے۔

ایک روز نور اپنے تایا ابا کے ساتھ ان کی سوزو کی کار میں ڈیفنس کی طرف شاہینہ سے ملنے جا رہی تھی۔ تایا ابا ڈرائیو کر رہے تھے۔ انہیں چار بجے تک شاہینہ کے گھر پہنچنا تھا اس لیے وہ گاڑی تھوڑی تیز چلا رہے تھے۔ ایک چوراہے سے وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ حالانکہ انہوں نے اشارہ دے رکھا تھا پھر بھی فلاحیت سے اور ٹیک کرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے آٹھرایا۔ تایا ابا نے بمشکل موٹر گاڑی اور گاڑی کو کنارے پر لگایا۔ موٹر سائیکل پر دوڑ کے سوار تھے۔ دونوں گرے اور تھوڑی بہت چوٹیں لگی آئیں۔ دوسری طرف گاڑی کے دونوں دوازوں پر لگی ٹھیک ٹھاک گر لیں آئیں۔ تایا جان باہر نکلے تو لوگوں نے ان سے تیزی شروع کر دی۔

تایا نے ایک کدو کھا دیا، وہ تایا سے کہنے لگا ”تایا کر لے۔ نور بھی گھبراہٹ ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے لوگوں کو ۱۲

سے التعلقی سی اختیار کر لی۔ چار پانچ روز بعد ایک شام تایا ابا گھر آئے تو ملازمہ خدابخش نے کیٹوس کا ایک بڑا سا بیگ کندھے پر لاد رکھا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ”لو بھئی نور! یہ میں تمہارے کپ اور ایوارڈ وغیرہ اس نامعلوم کے قبضے سے کال کر لایا ہوں۔“ نامعلوم سے ان کی مراد یقیناً چھوٹا بھائی ہی تھا۔

تایا ابا نے بیگ کی زپ کھولی۔۔۔۔۔ اور اس میں سے ایک بڑا کپ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ کپ ٹیوب لائٹ میں چمک رہا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ”آج میری ملاقات تمہاری ٹیچر میڈم فرحانہ بیگ سے بھی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نور اسلام آباد جائے گی اور میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ بڑی خوش ہوئی ہے۔ اسے تم سے بہت زیادہ امیدیں ہیں اور بات صرف میڈم فرحانہ کی ہی نہیں، تمہارے اکثر ٹیچرز بھی ایک کامیاب ایتھلیٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔“

”پر تایا ابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے اباجی کو بہت ناراض کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے معافی مانگ لوں۔“

”جب معافی کا وقت آئے گا تو وہ بھی مانگ لینا لیکن یہ وقت معافی کا نہیں ہے۔ اس معافی کی کم از کم قیمت یہی ہوگی کہ وہ تمہیں کمرے میں بند ہونے پر مجبور کر دے گا اور پھر چند روز میں تمہارا نکاح پڑھوا کر تمہیں کسی قاری ذوالقرنین کے حوالے کر دے گا۔“

”لیکن تایا ابا!۔۔۔۔۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ انہوں نے نور کی بات کاٹی۔ ”میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تاکی راحت نے بھی اس کا شانہ سہلایا۔ مہربان دیکھی اور حیرت سے نور کے درجنوں کپ اور ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دو روز بعد نور اپنے تایا جان کے ساتھ بذریعہ کوچ اسلام آباد گئی۔ اس نے ٹرائل میں حصہ لیا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اسے فوری طور پر ملازمت تو نہیں ملی تاہم اسے شارٹ لسٹ کر لیا گیا اور پوری امید دلائی گئی کہ وہ جلد ہی ٹیم کی طرف سے منتخب ہوئی نظر آئے گی۔

اسلام آباد کے کونٹ سے نور کے اعتماد میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ اسے سینٹر ایجوکیشن سے ملنے اور ان سے استفادہ ہونے کا موقع ملا۔ اس کے اندر زبردست تحریک پیدا

چند روز بعد انٹر کالج مقابلے شروع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا ایونٹ تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں میڈم فرحانہ لور کو بھرپور پریکٹس کروا رہی تھیں۔ کافی سخت شیڈول تھا۔ ہفتے میں پانچ دن، کم از کم تین گھنٹے تک وہ سخت مشقیں کر رہی تھی۔ پہلے وارم اپ ہوتا پھر جسم اور پٹوں کو لچک دار بنانے والی ورڈز میں ہوتیں۔ ان کو عرف عام میں اسٹریچنگ کی ایکسرسائزز کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد رنگ کا سیشن ہوتا۔ اس تربیتی دورانیے کے علاوہ بھی لور بس دوڑ اور مقابلے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی پریشان کن سوچوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ ہاں، رات کو جب وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹی تو اباجان کی صورت نگاہوں کے سامنے آ جاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی۔ انہوں نے تایا جان سے کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے لے جا میں اس گھنے کو یہاں سے..... میں سمجھوں گا یہ مرنے سے میرے لیے۔“

پچھلے دو تین ہفتوں میں بس ایک بار بسہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوری جیسے کان سے سیدھی تایا کے گھر آئی تھی اور لور سے ملی تھی۔ لور کو گھلے لگا کر اس نے خوب آنسو بہائے تھے اور دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اباجان نے انہیں لور کے ساتھ ملنے سے منع کر دیا ہے۔ ایک دن اس کے لیے پچھو حاجرہ کا فون آیا۔ وہ کسی بی بی او سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”نورا! تیرے ابا جی بہت پریشان ہیں، تیرے بہت دکھ دیے ہیں۔ یاد رکھنا انہیں ناراض کر کے تو کسی خوش نہیں رہ سکے گی، کسی بھی کام میں کامیابی نہیں ملے گی تجھے۔“

”میں کیا کروں پچھو؟“ وہ روہائی ہو کر بولی۔ ”وہ جس شرط پر مجھے معاف کریں گے، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ..... اور اپنی من مرضی سے۔ بالکل جس طرح انہوں نے آپنی تول کی شادی کی۔ اسے ایک ایسے سنگ دل بندے کے حوالے کر دیا جو انہیں ہم سے ملنے تک نہیں دیتا..... جس نے آپنی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے..... مجھے شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگا ہے پچھو۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی تو کیوں نا اس میں اپنے باپ کی خوشنودی شامل کرلو۔“

”آپ شوک کہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی شادی لیکن ابھی نہیں پچھو۔ ابھی..... میں کچھ کرنا چاہتی

ہے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، اسے بھی ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب لور نے ایک دراز قد لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھوٹے اسٹیڈ پر کھڑی کی اور حملہ آور لڑکوں کی طرف چھٹا۔ ”اوئے کیا کرتے ہو۔ بزرگ آدمی ہیں۔“ وہ پکارا۔

”بزرگ ہے تو ساری سڑک کا ماما بن گیا ہے یہ۔“ سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا چلا۔

اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے دراز قد لڑکے سے مستحکم گھٹا ہو گئے۔ دراز قد لڑکے اور درختی جسم کا مالک تھا اور لگتا تھا کہ لڑائی بھڑائی سے بھی واقف ہے۔ اس نے سرخ شرٹ والے کے پیٹ میں ناگ رسید کی تو وہ کراہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے اوپر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے چند کے چلائے مگر پھر دراز قد لڑکے نے اسے اڑ لگا لگا کر سڑک پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی اچھی خاصی دھنکی کر ڈالی۔ موقع پر جمع ہو جانے والے لوگوں نے سرخ شرٹ والے کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر لور کے تایا جان اور دراز قد لڑکے کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اب زیادہ دم خم نہیں تھا۔ چند مہاشائیوں نے سڑک پر گرے ہوئے دوسرے لڑکے کو دراز قد لڑکے کی گرفت سے چھڑایا اور اسے لعنت ملا مت کی۔ اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

دراز قد لڑکے کی قبض کی گریبان بھی پھٹ گیا تھا اور اس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ نکلا رہا تھا۔ وہ لور کے پاس آیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ ”آپ گاڑی میں بیٹھیں اور اٹکل آپ بھی بیٹھیں۔ آپ ٹکلیں یہاں سے، میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔“

”نہیں نہیں جی! لڑائی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو سبقت مل گیا ہے۔ تم بھی جاؤ یہاں سے۔“

ای دوران میں دور سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی سفید موٹر سائیکل کی جھلک دکھائی دینے لگی..... تایا جان نے دراز قد لڑکے سے کہا۔ ”ابھی ٹریفک والے آ جائیں گے۔ تم جاؤ یہاں سے جیٹا۔ وہ دیکھو، وہ غصیٹ بھی نکل رہے ہیں۔“

”میں بھی چلا جاؤں گا لیکن آپ گاڑی میں بیٹھیں۔“ لڑکے نے بڑے اطمینان سے کہا۔

تایا جان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، لور پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ کافی آگے جا کر لور نے مڑ کر دیکھا۔ ان کا مددگار..... ٹریفک سارجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست اعتماد تھا۔

انداز میں کہا۔

”کیا ہم آپ کی ایک تصویر لے سکتے ہیں؟“
 ”نو..... آئی ایم سوری..... مجھے تصویر بنوانا پسند نہیں ہے۔“
 ”نور نے اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔“
 ”او کے..... کوئی بات نہیں۔“ فرہاد نے خوشدلی سے کہا اور کیرامین کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گیا۔
 ”آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں مس نور؟“
 فرہاد نے کہا۔

”جی ہوجیے۔“

”یہاں کافی لڑکیاں حصہ لے رہی ہیں مگر آپ اپنے لباس اور رویے کے حوالے سے سب سے مختلف نظر آ رہی ہیں۔“
 وہ مسکرائی۔ ”میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکی مناسب اور باوقار لباس کے ساتھ بھی اکثر کھیلوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتی ہے۔“
 فرہاد نے کہا۔ ”بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے..... لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کرے آپ آگے جائیں اور بڑے مقابلوں میں حصہ لیں۔ جب آپ اپر لیول پر پہنچتی ہیں تو پھر یہ لباس وغیرہ کے معاملے آڑے آتے ہیں۔“

”میں انشاء اللہ ایسے کسی معاملے کو آڑے نہیں آنے دوں گی۔ ثابت کروں گی کہ اگر ایک عورت میں صلاحیت ہے تو پھر اس طرح کی مجبوریاں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنا اسکارف بھی درست کر رہی تھی۔ اس کا یہ انداز جیسے فرہاد کے دل کو بھارتھا۔

اسی دوران میں نور کی استاد اور کوچ فرحانہ بیگ موقع پر پہنچ گئیں۔ نور کے تایا اور تایا زاد بھائی شرجیل بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے نور کو ”ہیٹ“ جیتنے پر مبارک باد دی اور اگلی ہیٹ کے لیے وش کیا۔ نور اپنی کوچ فرحانہ بیگ سے باتیں کرنے لگی۔ نور کے تایا غلیل بھی اب فرہاد رازی کی کودیکہ چلے گئے۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملے اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ نور کی طرح تایا غلیل بھی فرہاد کے بہت شکر گزار تھے۔

فرہاد رازی بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا نوجوان تھا۔ اس کی خوش گفتاری سے اخلاص اور انصاف جھلکتی تھی۔ فرہاد اور غلیل صاحب تماشائیوں کے درمیان آ بیٹھے۔ فرہاد نے غلیل صاحب کو بتایا کہ ایک والدہ کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ دو بڑے بھائی مستقل طور پر فرانس میں

ہوں..... کچھ بن کے دکھانا چاہتی ہوں.....“

”بن کے دکھانا چاہتی ہو۔“ پھپھو نے تلخ لہجے میں اس کی نقل اتاری۔ ”ڈاکٹر بن رہی ہوں..... انجینئر بن رہی ہوں؟ کچھ شرم کرو نور، کپڑی کھیلنے والوں کی طرح دوڑتی پھر رہی ہو۔ ہمارے خاندان میں کس نے کیا ہے اس طرح کا کام؟ اس سے کیا حاصل ہوتا ہے تم کو.....؟“

”ہو سکتا ہے پھپھو کچھ ہو ہی جائے۔“ نور نے کھوٹی کھوٹی آواز میں کہا۔

”کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔“ پھپھو نے ہنسا کر کہا اور ریسور کریدل پر رخ دیا۔
 وہ وہیں پر کافی دیر تک گم غم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ مہربان نے اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

یہ پنجاب بھر کے کالجوں کے مقابلے تھے۔ نور اپنے کالج کی تمام برانچ کی طرف سے اس کپی ٹیشن میں سویٹزر ریس کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس کی دوست شاپینہ نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لیتا تھا مگر مقابلوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے شاپینہ نوڈ پوار تک کا شکار ہو گئی تھی اور ڈاکٹر ز نے اسے ”ٹین ہفٹے آرام کا مشورہ دے دیا تھا۔“

یہ مقابلے نور کے لیے بڑے سودمند رہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ہونہار ایتھلیٹ کے طور پر سامنے آئی۔ ان مقابلوں کے دوران میں ایک اور اہم بات ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی دراز قد نوجوان سے بھی ہوئی جس نے چند ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی مدد کی تھی اور جیمری کرنے والے اوباش لڑکوں کو سبق سکھایا تھا۔ وہ بڑا فلمی سائین تھا اور اپنی تمام تر سنگین کے ساتھ ابھی تک نور کے ذہن پر نقش تھا۔

مقابلوں کے دوران میں اپنی ”ہیٹ“ میں پہلانا مبر حاصل کرنے کے بعد نور اپنے کھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپ رہی تھی۔ میدان میں تالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
 ”ویل ڈن۔ مبارک ہو۔“ ایک آواز سن کر وہ چونکی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہی کھڑا تھا۔ دراز قد، مضبوط شانے، چمکتی ہوئی پیشانی۔

”اوہ آپ یہاں؟“ نور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
 ”جی ہاں..... میرا نام فرہاد ہے۔ میں ویٹلی سپر اسٹار میں اسپورٹس کے شعبے کا انچارج ہوں۔ یہ میرا کیرامین تویر ہے۔“

”آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ نور نے رسی

ہی واقع ان کے فری کلینک اور ڈسپنسری کا معاہدہ کرے۔
اگلے روز کا فائل مقابلہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ نور یہ مقابلہ
جیت تو نہیں سکی مگر اس نے تیسری پوزیشن حاصل کرنی اور
ڈکٹری اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ اس نے کاسی کا تمغا جیتا۔ یہ کامیابی
بھی معمولی نہیں تھی۔ تایا غلیل نے اسے گلے سے لگایا اور
حوصلہ افزائی کی۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے
بولے۔ ”مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے، ایک دن تم کوئی
بڑی کامیابی حاصل کر کے اس نامقول کا منہ بند کرو گی۔“
نامقول کا لفظ وہ اکثر و بیشتر اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کے
لیے ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ اشفاق جن کو عام لوگ
مولوی اشفاق مہرا کہتے تھے اور جن کا کتابوں کا کاروبار
آہستہ آہستہ جہم رہا تھا۔

انٹر کا لیٹ مقابلوں کے بعد نور کا اکثر فرہاد سے آمتنا
سامنا ہونے لگا۔ فرہاد اور اس کا دوست ڈاکٹر فیضان،
تایا جان کے فری کلینک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔
فرہاد اکثر گھر بھی آ جاتا تھا۔ شربیل اور عثمان سے بھی اس کی
گازلی جھننے لگی تھی۔ بتائیں کیوں نور کو محسوس ہوتا تھا کہ اس
کے دل کی گہرائی میں کسی گوشے کے اندر فرہاد کے لیے
پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت شاید
ایک طرف نہیں تھی۔ اس نے بھی اکثر فرہاد کی گہری آنکھوں
میں اپنے لیے ایک بے نام سانس لرزاں دیکھا تھا۔ وہ ایک
لڑکی تھی، اس کے دور شباب کے کچھ تھننے تھے مگر وہ ان
معاظلوں سے کوسوں دور رہتا جانتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی
تھی کہ اپنے مہربان اور محسن تایا کے لیے کسی بھی درجے کی
معمولی سے معمولی پریشانی کا باعث بنے۔ وہ اپنے حوالے
سے انہیں ہمیشہ سر بلند اور سرخرو دیکھنے کی خواہش مند تھی.....
اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان پر ہزار ہا صدمے سہنے
کے لیے تیار تھی۔

ایک روز بادل گھر گر آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا گھر
میں ہی تھے۔ فرہاد بھی آیا ہوا تھا اور ان کے ساتھ ڈرائنگ
روم میں موجود تھا۔ نور کو ڈرائنگ سینئر جانا تھا۔ بڑے تایا زاد
بھائی شربیل کو کوئی کام تھا اور وہ گاڑی لے کر گیا ہوا تھا۔
ایسے موقعوں پر تایا ابا یا عثمان اسے موٹر بائیک پر لے جاتے
تھے۔ آج بھی یہی پروگرام تھا مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔
”تایا ابا! مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج میرا جانا بہت ضروری
ہے۔“ نور نے ڈرائنگ روم میں جا کر اور ڈرائنگ کمرہ کیا۔
بادل گر رہے تھے اور بارش پر سنا شروع ہو گئی تھی۔
تایا ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”ایسا کرو تم فرہاد

شفٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سیلف میڈ شخص تھا۔ اپنی کوشش سے
ایک ہائی فائی ٹیکنیزین میں ایک اچھی جاب تک پہنچا تھا۔ اس
کے علاوہ اسے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے
ایک چچا باضی میں فرسٹ کلاس کرکٹ میل چکے تھے۔ شاید
وہ مزید آگے جاتے لیکن چوٹ لگنے کے باعث اس فیلڈ کو
خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔
ان کی کسمپرسی دیکھ کر فرہاد کو یہ خیال آیا تھا کہ باضی کے ایسے
باصلاحیت کھلاڑی جو اب گناہی اور تنگ دستی کی زندگی
گزار رہے ہیں، ان کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے۔ آج
کل وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست فیضان علی کے ساتھ مل کر اس
پلان پر کام کر رہا تھا۔

جواب میں غلیل صاحب نے کہا۔ ”بھئی پھر تو ہم
دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ میں نے بھی اپنے
علاقے میں ایک فری کلینک قائم کیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں
کہ وہاں مسحق مریضوں کا حتی المقدور مفت علاج کیا جائے۔“
”اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی طرح میرا تعاون
درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔“ فرہاد نے کہا۔
غلیل صاحب نے کہا۔ ”تعاون کی صورت تو بالکل
موجود ہے بھئی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا ہے۔ ہم
نے دو ڈاکٹرز کا انتظام کر رکھا ہے لیکن کم از کم ایک ڈاکٹری
ضرورت اور ہے۔ اگر تمہارے دوست اپنی سہولت کے
مطابق کچھ وقت دے سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اگر وہ
مناسب معاوضہ چاہیں گے تو وہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔“
”آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں انگل۔“ فرہاد نے
محبت سے کہا۔ ”کسی نیک کام میں حصہ ڈالنے کا موقع ملنا تو
ایک سعادت کی طرح ہوتا ہے۔“

کوئی دو گھنٹے بعد نور کی دوسری ہیٹ ہوئی۔ یہ ہیٹ
بھی اس نے ایک سخت مقابلے کے بعد جیت لی۔ یہ بڑی
اہم کامیابی تھی، سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔
تماشا بینوں میں صرف فیملیئر کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ بڑا اچھا
ماحول تھا، نور کی کلاس ٹیلور نے نور کی اس کامیابی کو بڑی
اچھی طرح ”سیلبرٹ“ کیا۔ اب فائل ہیٹ تھی، اس
میں پنجاب کے انٹر کا لیٹ مقابلوں کی تیز رفتار ترین لڑکی کا
انتخاب ہونا تھا..... نور کے اچھے چانسز موجود تھے۔

دوسری ہیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد جب نور
انکھوڑ میں پہنچی تو تایا غلیل اور فرہاد پرانے شناساؤں کی
طرح بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ تایا غلیل، فرہاد کو
مدعو کر چکے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے اور گھر کے بالکل پاس

بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ یہ تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جائے گا، واپسی پر شرجیل لے آئے گا۔“
 ”لیکن تایا ابا.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں پیٹائی! میں کہہ رہا ہوں تاکہ چلی جاؤ۔“ تایا ابا نے اعتماد سے کہا۔ فرہاد کے پاس چھوٹی سوزوکی مہر ان تھی۔ وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن پھر سہ پہر میں ہی اندھیرا چھا گیا اور تازہ توڑ مینہ برسنے لگا۔ یہ جولائی کا وسط تھا اور مون سون کی دوسری بارش تھی۔ انہیں ریوازا گاڑوں سے غذائی اسٹڈیم کی طرف جانا تھا۔ ابھی وہ نہرو والی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑا موٹر ٹنگ سڑک پر گر گیا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے اور گاڑیاں آسنے سانسے سر جوڑے کھڑی ہیں۔ ایسے شدید موسم میں عام طور پر ٹریفک پولیس بھی دامیں ہائیکس ہو جاتی ہے اور چھٹنی ہوئی سیکڑوں گاڑیاں قدرت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔

”میرا خیال ہے کہ گاڑی موڑ لی جائے۔“ فرہاد نے کہا۔
 ”ہاں، وہ دیکھیں اور لوگ بھی مڑ رہے ہیں۔“ نور نے تائید کی۔

فرہاد نے پھرتی سے گاڑی موڑ لی۔ اب انہیں ایک لمبا چمکاکٹ کرکینال روڈ پر پہنچنا تھا مگر وہ دیتین سوئیٹز دور ہی گئے ہوں گے کہ یہاں بھی ٹریفک جام ملا۔ فرہاد نے بہتر سمجھا کہ گاڑی ریس کورس پارک کی پارکنگ میں لے جائے۔ انہوں نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور سڑک کی صورت حال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش اتنی تازہ توڑ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں ارد گرد کے راستوں پر کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب اگر ٹریفک کھل بھی جاتا تو وہ اتنی جلدی یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

”یہ تو اچھا نہیں ہوا۔“ نور نے قراری سے ہاتھ ملے ہوئے بولی۔ ”میڈم فرحانہ سینئر میں پریشان ہوں گی۔ ادھر تایا جان کو گھر میں مگر ہو گی۔“

”آپ پریشان نہ ہوں نور، وہ سامنے بی سی او نظر آ رہا ہے۔ میں اٹکل ٹیکل کو فون کر دیتا ہوں۔“
 ”ابھی ٹھہر جائیں، بارش تیز ہے۔“ نور نے کہا۔

آدھ پون گھنٹہ بعد گھر پر بارش کچھ دیر کے لیے ہلکی ہو کر پھر تیز ہو جاتی تھی۔ سیدتیج کے نظام میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے ارد گرد کی سڑکوں پر پانی کی سطح بلند ہوتی

جاری تھی۔ آخر نور کے منع کرنے کے باوجود فرہاد نے اپنی جینز گھٹنوں تک اڑی اور فون کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی اور نور کو کشمکش لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی ہی۔ آخر فرہاد واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکیٹ تھا جو اس نے شاپر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی میں مہس کر دروازہ بند کر لیا۔

”ہو گیا فون؟“ نور نے پوچھا۔
 ”بالکل ہو گیا۔“ انکل نے ہی اٹھایا تھا، پریشان تھے۔ انہوں نے سینئر میں فون کیا تو وہاں سے میڈم فرحانہ نے انہیں بتایا کہ نور نہیں پہنچی۔
 ”مجھے بھی پریشانی تھی۔“
 ”نہیں۔ میں نے انہیں پوری تسلی دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ میڈم کو بھی آگاہ کر دیں۔“

اس طرف سے پریشانی ختم ہوئی تو نور نے شاید پہلی بار ارد گرد کے موسم کی نیرنگی پر دھیان دیا۔ دور تک ریس کورس پارک کے خوب صورت سبزہ زار نظر آرہے تھے۔ ان میں درخت تھے اور پھولوں کے تختے تھے..... اور روشیں تھیں۔ یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ مون سون کی اس دھواں دھار بارش میں سمیٹ رہا تھا۔

”یہ لیں جی! کے ایف سی کے برگر۔ مجھے پتا تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔“ فرہاد نے پیکیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے؟“
 ”اگر میں کبھی مجھے دوں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ آپ ہر وقت جسمانی مشقت کی صورت حال میں رہتی ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت آپ کو انرجی کی زیادہ ضرورت ہے۔“
 ”تو پھر عام لوگ اپنے لیے برگر کیوں لے آئے ہیں؟“ وہ ہولے سے سسکرائی۔

”آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔“ وہ اپنے بچکے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے بٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔

اس نے ایک برگر نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور نے ابھی دو بائٹ ہی لیے تھے کہ وہ نکارا۔ ”ٹھہرے ٹھہرے“
 ”مخترمہ! آپ کا ذکر تو یہ رہا۔ یہ میرا دلچسپ برگر ہے۔“ اس نے نور کو الٹی نظر کر اس سے لے کر دوسرا اٹھادیا۔

زنگر واقعی نور کو پسند تھا مگر فرہاد کی اس حرکت میں تھوڑی سی شوخی اور چالاکي نظر آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ

”آپ کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہے۔“ وہ
سنجیدہ ہو گئی۔
”بس..... سواری۔“

وہ ذرا توقف سے گویا ہوئی۔ ”میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر پانی کافی کم ہو گیا ہے۔“
فرہاد نے ہنسنی سانس لی۔ پانی واقعی ایک دم کم ہوتا شروع ہو گیا تھا حالانکہ بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فرہاد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اتنے خوب صورت موقع کو بونہی بھیغ ”غیش رفت“ کے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ کبھی سڑک کو دیکھ رہا تھا، بھیجی آسمان کو۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ نور نے نرم لہجے میں کہا۔
وہ مسکرایا..... اس کی خوب صورت آنکھوں میں
پھر ہلکی سی شوخی عود کر آئی۔ ”اوکے۔“ اس نے کہا اور
گاڑی اسٹارٹ کی۔ تین چار بار سیلف لگایا لیکن وہ
اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ ”ہوجا..... ہوجا۔ میری جان کی دشمن
ہوجا.....“ وہ بڑبڑایا۔

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”مجھے لگتا ہے نور صاحبہ! گاڑی ہم سے متعلق نہیں۔ وہ اس موسم سے تھوڑا سا اور لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔“

”کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہیں..... مثلاً، ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہی جانتے ہیں کہ گاڑیوں میں چور سوچ بھی ہوتے ہیں۔“

”آپ کا خیال ہے میں نے چور سوچ دیا ہے؟“
 ”میرا خیال بھی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ
 حرکت فرمائی ہے۔“

”اوہ گاڈ..... تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں“
فرہاد نے بے بسی کی ادا کاری کی اور جھکے ہوئے انداز میں
سیٹ کی پشت سے ٹپک لگائی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ویسے
برانہ مانے گا۔ کیا آپ کا بھی کوئی چور سوچ ہے؟ میرا مطلب
ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوچ ہے؟“
”یہ کیا سوال ہوا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟“
وہ دھجے لچھے میں بولی۔

”دراصل، مجھے لگا ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوچ ہے جس کے سبب آپ نے اپنی خاص قسم کی دھڑکنوں کو بند کیا ہوا ہے..... پلیز، اس سوچ کو آف کریں۔ دل کو دھڑکنے دیں، آزادی سے..... جب وہ دھڑکے گا تو زندگی کی رگوں میں خون خود ہی اپنے راستے تلاش کرنا شروع کر دے گا۔“

”کر“ ”برگر“ نور کو تھما دیا تھا۔ اب وہ اس کے جھوٹے برگر کو بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ نور کے سارے جسم میں جیسے سنسنی اور انبساط کی ایک لہری دوڑی۔

اس نے بانٹ لیتے ہوئے کن انکھوں سے فرہادی طرف دیکھا۔ وہ یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا اور یہ دلکش شخصیت دن بدن اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔

کولنڈ ڈریک کا سب لے کر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ”یہ راستے بھی کیا چڑھتے ہیں نور! انہوں کو غیر اور غیروں کو اپنا بنادیتے ہیں۔ کسی دقت سوچتا ہو کہ اگر اس روز میں خلاف معمول اس بڑک سے گزر کر آفس نہ جا رہا ہوتا تو آپ سے اور انکل سے کبھی ملاقات نہ ہو پاتی۔“

”ہاں، راستے کیا چن رہے ہیں اور یہ بارش بھی کیا چن رہی ہے..... دوا مجھے بھلے بندوں کو ایک گاڑی میں بند کر کے، فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔“ وہ بولی۔

”تو میں آپ کو فلسفی لگ رہا ہوں؟“
 ”ہاں تو ایسی ہی کئی کر رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔
 ”آپ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔“

”وہیے برا نہ مانیے گا۔ یہ بڑا کھسا پٹا فقروہ ہے۔“
 ”الفاظ اہم نہیں ہوتے محترمہ، ان کا مفہوم اور ان کی
 تاثیر اہم ہوتی ہے۔“

اچانک سامنے آسان پر بجلی کا نہایت دور دراز کڑا
سنائی دیا۔ نور نے بے ساختہ فریاد کا بازو تھام لیا۔ اس کی
ہلکیاں جیسے اس کے سڈول بازو میں کھپ سی گئی تھیں۔ پھر
فورا ہی اس نے ہاتھ ہٹا بھی لیا۔ بارش کی بو چھائی نہیں تیز
ہو گئی۔

فرہاد نے کہا۔ ”آپ بہادر لڑکی ہیں۔ چھوٹی موٹی لڑکیوں سے بہت مختلف۔ لیکن ہیں تو لڑکی۔“ اس کا اشارہ یقیناً اس گرفت کی جانب تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نور نے اس کے بازو پر بنائی تھی۔

وہ اپنے نیلے اسکارف کو درست کرتے ہوئے بولی۔
 "شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

”ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑی سی ”مزید لڑکی“
 ہوتیں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“
”قلموں ڈراموں میں تو لڑکیاں ایسے موقعوں پر ڈر کر قریبی مرد حضرات کے اوپر ہی گر جاتی ہیں۔“

ایکس اب بھی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ نور کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

اب ایف اے ایس کا ٹائم تو گزر چکا تھا، اس لیے نور واپس گھر ہی جا رہی تھی۔ مزنگ چورنگی کے چوراہے پر نور نے ایک بار پھر عقب نما میں جھانکا، نیلی گاڑی عقب میں موجود تھی مگر پھر آگے جا کر وہ نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

رات کو نور در بیک جا گئی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ ذوالقرنین نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ شکوک و شبہات سے الٹی ہوئی تھیں۔ کیا وہ اس بارے میں کسی کو آگاہ کرے گا؟ کہیں وہ یہ بات نور کے گھر اور اس کے اباجی تک تو نہیں پہنچا دے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو اباجی جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ان کا رد عمل کیا ہوگا؟

اس نے سوچا کہ کیا وہ اس حوالے سے پیش بندی کرے اور پہلے ہی تایا بی تایا اور تائی جی کو بتا دے؟ اگلے روز وہ قریبی مارکیٹ میں گئی اور وہاں سے بسمہ کی ایک دوست کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ بسمہ پی سی او سے تایا کے فون پر رابطہ کرے یا خود گھر آ کر اس سے ملے۔ شام سے کچھ دیر پہلے گھر کے فون پر بسمہ کی کال آ گئی۔ نور نے جھوٹے ہی پوچھا۔ ”بسمہ! گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟“

”بس اسی طرح کی خیریت ہے جس طرح کی چل رہی تھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟“ ”نہن..... نہیں..... مگر مجھے پریشانی تھی۔ انٹر کال نیٹ مقابلوں کے بعد میری ایک تصویر اخبار میں بھی پہنچی تھی۔ اباجی کی نظر سے تو نہیں گزری؟“ نور نے بات بتائی۔

”گزری بھی ہوگی تو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ آج کل بالکل کم مسم سے ہیں نور! پی بی جی کی طرف سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔ بھائی غیاث کا رویہ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اتوار کو بڑے ماموں مراد ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آبی بیڑھیوں سے گری ہے۔ ماتھے اور گلانی پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ گری ہیں یا کچھ اور ہوا ہے۔“

نور کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔ اپنے بہنوئی غیاث کا چہرہ اس کی نگاہوں میں محوم گیا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور شاید اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے اکثر پتھری جھرتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب بھی اس کے

”مجھے شاید راستوں کی ضرورت نہیں۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہی میرے لیے کافی ہے۔“ ”دیکھنا۔ ہے چور سوچ۔ بالکل ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز نے نور کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ”اچھا اب چلیں۔ ابھی اندر رہا ہوا ہے گا۔“ ”لیکن..... آپ نے یہ سوچ آف کرنے والا کام ضرور کرتا ہے۔ پلیز..... پلیز۔“

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر اسے لگا کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی طرح ہے۔ اس نے گھبرا کر کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

”تھیک یو..... تھیک یو۔“ فرہاد نے کہا اور نیچے جھک کر گاڑی کا چور سوچ دبا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ پارکنگ سے باہر نکلتے ہی وہ چوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریفک سنکسل بند تھا، انہیں رکنا پڑا۔ دفعتاً نور کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر بائیں جانب کھڑکی ایک ایف ایس گاڑی پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا کرخت شکل اور چھوٹی ڈاڑھی والا جو جوان بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے انجینی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچان سکتی تھی، یہ وہی تھا..... ہاں، یہ وہی تھا۔ پچھو اور بسمہ نے اس کا نام..... ذوالقرنین بتایا تھا۔ یہی تھا جسے اباجی نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے نور ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نور نے گھبرا کر اسٹارٹ کو اپنی ٹھوڑی سے اوپر مٹچ لیا اور اپنا ایک تہائی چہرہ چھپا لیا۔ فرہاد نے اس وقت کوئی مزاحیہ بات کی بھی اور نہ ہی فرہاد نے اس کی بات کی سمجھ آئی تھی اور نہ اس کی ہنسی کی، اس کے اندر تو جیسے ٹھٹھکی سی جگمگ تھی۔ اس نے ایک بار پھر کنکھیں سے ایف ایس پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً وہ مولانا حبیب کا بیٹا قاری ذوالقرنین تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں فرہاد نے بھی نور کی بے چینی کو نوٹ کر لیا۔ وہ بولا۔ ”کیا بات ہے نور..... آپ کچھ پریشان ہو گئی ہیں؟“

”نہیں، پریشان تو نہیں۔“ اس نے بے مشکل خود کو سنبھالا۔ اسی دوران میں سنکسل سبز ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ فرہاد آگے نکل گیا۔ ذوالقرنین غالباً آخر تک نور کو دیکھتا رہا تھا۔ قریباً ایک فلائنگ آگے جا کر نور نے سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ فیلرنگ کی ایف

تصور میں اپنے بہنوئی غیاث کی سخت گیری یا اپنی مرحومہ ماں کی بے بسی آتی تھی، اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے پاؤں جیسے بے ساختہ حرکت کرنے لگتے تھے۔ اس کے سینے میں ترک کی جاگنے لگی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر دکھانے کی ترپ، مرد کے تسلط سے آزادی کی آرزو۔

پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس روز والے واقعے کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ نور اب سوچنے لگی کہ شاید وہ ذوالقرنین تھا ہی نہیں۔ اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے یا شاید اسکارف کی وجہ سے وہ اسے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نور کو پہچان تو لیا ہو مگر فرہاد کو اس کا تازا ذوالبہائی یا ماموں سمجھا ہو۔

☆☆☆

ذوالقرنین نماز روزے کا پابند ایک پرہیزگار نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ والد مولانا صاحب اللہ ایک جانے پہچانے عالم و دین تھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو بچوں کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسی طرح شباب کے بھی۔

ذوالقرنین ان نوجوانوں میں سے تھا جو کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اسے بالغ ہوئے سات برس ہونے والے تھے اور اس کے جسمانی تقاضے شاید اس سے بھی پہلے کے تھے پھر ایک روز اس نے ماں سے کہہ ہی دیا تھا.....

”امی! میرے لیے کوئی ڈھونڈیں.....“

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد اس نے ایک شادی میں پہلی بار مولوی اشفاق صاحب کی دختر عین النور کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی مکمل عبا یا میں تھی۔ ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

”ذوالقرنین! وہ کریم کرم بایا والی ہے جس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔“

اس کے بعد شادی کی پوری تقریب میں ذوالقرنین کی نگاہوں میں اس کا من موہتا چہرہ گھومتا رہا تھا۔ بعد ازاں اسے ایک دن عین النور کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے دل کو یہ لڑکی ہر طرح سے بھائی تھی۔ اس نے کئی شب و روز اس کی سوچ میں کم گزار دیے تھے۔ اس نے آنے والے خوشگوار دنوں کی چاہیں سنی تھیں اور دھڑکنوں کو بے

ترتیب محسوس کیا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آیا تھا جب یہ معاملہ فائل ہونے جا رہا تھا..... اور تب سب کچھ اٹھل پھٹل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر ختم ہو گئی تھی..... اور کچھ دنوں بعد یہ اڑنی اڑنی سی بات دل گرفتہ ذوالقرنین کے کانوں تک پہنچی تھی کہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر تاپا کے گھر میں رہنے لگی ہے اور کھیلوں وغیرہ میں حصہ لے رہی ہے..... چار دن پہلے ذوالقرنین نے مولوی اشفاق کی بیٹی عین النور کو پھر دیکھا تھا اور اس مرتبہ کسی شادی کی تقریب میں نہیں بلکہ بارش کی رجم مہم میں ریس کورس پارک کے سامنے ایک گاڑی کے اندر۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ذوالقرنین کی طرف دیکھ کر بے طرح خشک گئی تھی۔ تب سے ذوالقرنین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ غلط سلط چکروں میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اپنی بہن خدیجہ کو اس صورت حال سے آگاہ کرے..... لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ ایک بار خود اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ ٹھوڑی سی کوشش کر کے اس نے بے تکون بھی لگا لیا تھا کہ نور اس روز جس خوبصورت لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی تھی، اس کا نام فرہاد رازی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کے ہفت روزہ میگزین میں کام کرتا ہے اور آج کل نور کے تاپا خلیل مہرا صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا ہے۔ یہ معلومات اس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ یہ دونوں دوست ایک مقامی تنظیم اصلاح معاشرہ کے کارکن تھے۔ کچھ عرصے سے ذوالقرنین بھی اسی تنظیم کا کارکن تھا۔

☆☆☆

نور ٹریننگ سینٹر ایف اے ایس میں موجود تھی اور اسٹرکچرل کی ورڈ میں کر رہی تھی۔ کوچ میڈم فرحانہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں دیگر لڑکیوں کو اسٹرکشن وغیرہ دینا بھی نور کی ذمہ داری تھی۔ اتنے میں چونکہ ارمان خان غمور ہوا۔ اس نے کہا۔ ”بی بی صیب! ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام ذوالقرنین بتا رہا ہے۔“

نور کی رنگوں میں خون سننا اٹھا۔ اس نے پونی ٹیل کس کر بانڈی۔ اپر پہنا پھر اسکارف لیا اور باہر پہنچی۔ وہ میڈم فرحانہ کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ”السلام علیکم“ کہا۔

”جی فرمائیے۔“ نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

ذوالقرنین کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا تھا۔

وہ واپس ہال کمرے میں جا کر بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندہ جا چکا ہے۔

تین چار دن پھر تیناؤں میں گزرے۔ نور کو اندیشہ تھا کہ شاید کوئی رد عمل ظاہر ہو۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ اب کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ کسی اور سے، اس کی مراد نور کے ابا جان کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟

بہر طور خیریت ہی گزری۔ نور اب فرہاد کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ وہ دو تین بار گھر بھی آیا مگر نور نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ حسب معمول اسے کا بج چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے ماموں مراد کی ڈیوٹی تھی۔ ایف اے ایس کی آمد و رفت تایا ابا کے ذمے تھی۔ تایا اب اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے اور شب و روز اس کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے۔ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے۔ ایک رات نور کھانسی کی دوا لینے کے لیے ابھی تو اس نے چار بجے کے لگ بھگ تایا ابا کو مصلے پر بیٹھے اور اٹک بار آنکھوں سے دعا مانگتے دیکھا۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے دعا ختم کی اور اس سے اٹھنے کی وجہ پوچھی تو نور نے بتایا کہ پونہی رات کے کھانے میں دبی پکڑائی کھالی تھیں جس کی وجہ سے کھانسی ہو رہی ہے۔

وہ مضطرب ہو گئے۔ ”اگر زیادہ مسئلہ ہے تو تو ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ تمہیں اس طرح کی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے۔ سالانہ اینٹ میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہیں ہر طرح فٹ ہونا چاہیے۔“

اس نے تایا ابا کو قہریلی دی اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن شاید بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ وہ فرہاد سے مل کر ریز کر رہی تھی مگر اس گریز میں شاید اس کا دل اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دن دور سے فرہاد کا ستا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے سینے میں ایک درد سا لہریں لینے لگا تھا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں خود ہی سے پوچھا۔ ”کیا تم فرہاد کو چاہتے ہو؟“

جواب نفی میں نہیں تھا۔ اسے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ ان راستوں پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے مکمل پرمکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ایسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے تایا ابا کو ابا جان کے سامنے یا دیگر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے اندر ایک

”اہم بات ہے۔ کیا آپ مجھے بٹھنے کا نہیں کہیں گی؟“ پہلے تو نور کے جی میں آئی کتنی میں جواب دے پھر اس نے خود کو سنبالا اور میڈم کی کرسی پر بیٹھنے ہوئے ہوئی۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے چند لمحوں میں کہہ دیں۔“

”چند لمحوں میں کہنے والی بات ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔“ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کسلی سے سنا ہوگا۔ ورنہ میں کسی اور وقت آ جاؤں گا۔“

”آپ کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں فرمانے والے، آپ نے مجھے گاڑی میں تایا جان کے دوست کے ساتھ دیکھا ہے اور اب اسی سلسلے میں کوئی بے کار بات ارشاد کرنے والے ہیں۔“

”میں آپ کو بھگانا چاہتا ہوں۔ آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔ آپ ایک مذہبی گمراہی سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کے والد مولوی اشفاق ایک عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کیوں ان کو رسوا کرنا چاہ رہی ہو؟“ وہ نور کی طرف دیکھ کر بغیر بات کر رہا تھا۔

”دیکھو مسز اتم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم خود خواہ ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔“

”اگر تمہیں اپنے اچھے برے کی تمیز ہوتی تو اپنے محسن اور اپنے بدخواہ کو پہچانتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔“

”بلکہ میل کر رہے ہو؟ ٹھیک ہے بتا دو جس کو بتانا ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔“

”اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نہیں کئی غلط کام کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ بھی ہو تو انسانیت کے طور پر میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ یہ چلو میں کس کے چھلانگیں مارتا، فٹ بال اور جوڈو کرانے ٹھیکنا، کیا یہ لڑکیوں اور عورتوں کے کام ہیں؟ قدرت نے عورت کو صنف نازک بنایا ہے، اس کی کچھ اور ذمے داریاں ہیں، اس کی محنت مشقت کے کچھ اور میدان ہیں۔“

”ہاں مکن میں برتن دھونا، ڈیروں کیڑے استری کرنا، سستے بازاروں میں جا کر بچوں کے لیے شاپنگ کرنا۔۔۔۔۔۔ یہ ہیں اس کے میدان۔۔۔۔۔۔ تم جیسے لوگ ہیں مسز ذوالقرنین! جنہوں نے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کو مردار بنا کر رکھ دیا ہے، اپنی یہ تقریر تم اپنے پاس رکھو بہت بہتر ہے۔“ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

جنگ سی رہے گی۔ وہ ٹریننگ میں بھرپور حصہ لے رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے تصور میں فرہاد کا ستا ہوا اس چہرہ بھی آ جاتا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر میں سب سو رہے تھے، فون کی بیل ہوئی۔ نور نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرہاد تھا۔ نور کی آواز پہچان کر وہ فوراً بولا۔ ”پلیز نور! فون بند نہ کرنا۔ میں آپ سے بس ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر دھیسے لہجے میں بولی۔ ”کیسے میں سن رہی ہوں۔“

”نور! مجھے لگتا ہے کہ اس روز میں نے گاڑی میں آپ سے جو بے تکلف باتیں کیں، وہ آپ کو بری لگی ہیں۔“ ”بری نہیں لگیں تو ابھی بھی نہیں لگیں۔“ اس نے بہم جواب دیا۔

”میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ ”چلیں، آپ وعدہ کرتے ہیں تو ابھی بات ہے۔“ ”لیکن صرف ایک درخواست ہے میری۔“ ”فرمائیں۔“

”صرف ایک بار۔۔۔۔۔۔ آپ سے دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن فون پر نہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر۔“ ”یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ابھی جو وعدہ کیا ہے وہ آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔“ ”نہیں نور! یقین کریں میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔ اپنی وجہ سے میں آپ کے ماتھے پر ایک چھوٹی سی شکن دیکھنا بھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے آپ کے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہیں، جہاں بھی آپ کہیں۔“ نور صاف انکار کر دینا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں نہ کر سکی۔ کچھ فرہاد کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ وہ اسے سخت جواب نہ دے سکی۔

تایا جان فرنیچر کا کام کر رہے تھے۔ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں چھوٹ جاتے تھے اور پھر گھبراتا چکر لگاتے ہوئے اگلے روز واپس آتے تھے۔ دو روز بعد وہ جانے والے تھے، ان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی ان کے پاس ہی ہوتی تھی، ایک دن کے لیے نور کو رکشا پرائیف اے ایس جانا پڑتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ رکشا پر گئی اور گھبرگ مارکیٹ کی ایک کیفے شاپ میں اس نے آدھ پون گھنٹے کے لیے فرہاد سے بات چیت کی۔ اس نے چادر کا نقاب کیا ہوا تھا اور آنکھوں

پر سن گلاسز تھے۔ فرہاد نے بڑے سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں نور کی سماعت تک اپنے دل کی بات پہنچائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ نور کا جواب بھی حوصلہ شکنی والا نہیں تھا۔ تاہم اس نے دو باتیں فرہاد پر بالکل واضح کر دیں۔ اس نے کہا کہ اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ اس کے بڑوں نے کرنا ہے اور وہ ان کے اس حق میں ایک ذرا سی کمی بیشی کی بھی متحمل نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اس حق کے حوالے سے بہت شرمندہ ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ فی الحال اس کی ساری کی ساری توجہ اپنے کیم کی طرف ہے، اس کے تایا بابا نے جانکی آنکھوں سے جو خواب دیکھا ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔۔ جب وہ اس مرحلے سے نکل جائے گی تو پھر شادی وغیرہ کا معاملہ زیر غور آئے گا۔ تب تک وہ فرہاد سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں ان کے دلوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ موجود رہے گا اور وہ اس حوالے سے دعا گو رہیں گے۔

یہ دوسری شرط کافی کڑی تھی۔ فرہاد نے ہمد منت و ساجت نور سے اتنی سی رعایت لے لی کہ مہینے میں فقط ایک بار وہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے بات کر لیا کریں گے اور وہ بھی فون پر۔

وہ بے حد خوش گفتار تھا۔ اس کی باتوں میں محبت اور لطافت کی ایسی چاشنی تھی کہ نور اس کے پاس سے اٹھ نہیں بارہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نور! میں نے آپ کو پہلی بار شادی کے فتنے میں دیکھا تھا، آپ نے بڑے ظریفانہ پیرے پہن رکھے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ آپ کو بالکل سادہ لباس میں دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو ایک بار پھر رنگین لباس میں دیکھوں۔ لگتا ہے کہ اگلے ہفتے شاید میری یہ مراد پوری ہو جائے۔“

”کیا مطلب؟“ نور نے اپنی لمبی پلکیں جھپکیں۔ ”آپ کے کانچ میں گرٹ گولڈر ہے، چھوٹے نمونے مکمل بھی ہوں گے۔ مجھے رسالے کی طرف سے کوریج کے لیے آنا ہے۔“

بننا سنو تھ نور کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لڑکپن میں جب وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔ ایسا عمو شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اس وقت تو نور کی باقاعدہ ہنسی چھوٹ جاتی تھی جب وہ دیکھتی کہ ابا جان کے ڈر سے ان کا سارا بناؤ

کیوں محوم رہا تھا؟“ اس کا اشارہ فرہادی طرف ہی تھا۔
”کوئی خاص بات نہیں..... یونی انٹرویو کا ماحول
بنارہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔“

شاہین اب بھی تیر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گہری
سانس لے کر بولی۔ ”دیکھو نور! ہمارا آدھل میں کبھی ٹیشن ہے
لیکن ہم دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بھلائی چاہتی
ہیں۔ ہمیں اس طرح کے معاملوں سے دور ہونا چاہیے۔“
”کس طرح کے معاملوں سے؟“ نور نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی
ہو۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں کھینچ کر بیڑی
سے گرا دینے والے، ہمیں اس وقت سارا دھیان اپنے کیم پر
رکھنا چاہیے۔ گوجرانوالہ کی نشو و نما تک بڑی اچھی جارہی
ہے۔ ویسے بھی ایک کھلاڑی خاندان سے ہے۔ وہ فریگی بڑی
فٹ ہے۔ ہم ذرا ڈھیلی پڑیں گی تو وہ ”لیڈ“ لے جائے گی۔“
”چنانچہ تم نے اپنے ذہن میں کیا بنایا ہے۔ وہ تو
بس بات کر رہا تھا مجھ سے.....“

”ساری بات..... بات کرنے سے ہی شروع ہوتی
ہے پھر بات گلے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر ہو۔ ویسے بھی
تم نے ایک بہت بڑا پیسج قبول کیا ہوا ہے۔ والد کو ناراض
کر رکھا ہے اور انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ
کچھ ایسا ہو جائے جو ان کو مزید خفا کر دے۔“

شاہین کی بات میں وزن تھا۔ وہ اندر سے کانپ سی
گئی۔ بہر حال اس نے اپنے تاثرات نادل ہی رکھے اور
موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”اس بارے میں تم بے فکر ہو
ڈیر! باقی جہاں تک نشو و نما ہے۔ اس کا فرد تو ہم
دونوں میں سے کسی ایک نے توڑ ہی دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے
کہ وہ کافی منہ بٹھ بھی ہے، میڈم کے بارے میں کچھ اسی
سیہی باتیں بھی کی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایف اے
ایس کی آڑ میں مال بنارہی ہے.....“

ابھی نور اور شاہین میں بات ہو رہی تھی کہ ان کے
عقب میں کچھ لڑکیوں نے ہونٹک شروع کر دی۔ وہ
گوجرانوالہ سے آئی تھیں اور نشو و نما کی سپورٹر تھیں۔
ان میں سے دو تین نے نشو و نما کی تصویر والے پوسٹر بھی اٹھا
رکھے تھے اور سالانہ مقابلوں میں نشو و نما فیورٹ قرار دے
رہی تھیں۔ انہوں نے شاہین اور نور پر آوازے کئے۔ خاص
طور سے نوکوشانہ بنایا اور اسے نور پینڈ قرار دیا۔

نور کی حمایت کرنے والی لڑکیوں کے ایک گروہ نے
اس ہونٹک کا بھرپور جواب دیا۔ مجھڑے کی صورت حال

سنگھار بھاری اوڑھنیوں کے نیچے چھپ گیا ہے اور وہ زرق
برق کپڑے پہن کر جس طرح لپٹی لپٹاتی ہوئی، تقریب میں
مکئی تھیں اسی طرح وہاں آگئی ہیں۔

لیکن آج وہ خود کو بناؤ سنگھار کے لیے تھوڑا سا مجبور
پارہی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے ہی کام لیا۔ بالکی سی
لپ اسٹک، تھوڑا سا سف پاؤڈر اور بائیں کلائی میں چند
چوڑیاں، لباس بھی زیادہ شوخ نہیں تھا۔ کالج کے وسیع و
عریض گراؤنڈ میں لمبے کا سماں تھا، بے شمار اسٹالز اور تفریح
کے لوازمات تھے۔ اس کی کوئیک شاہین بھی آگئی ہوئی تھی۔
وہ بھی آج کل پوری تندی سے صوبائی سطح کے مقابلوں کی
تیاری کر رہی تھی۔

فرہاد اور چند دیگر اخباری نمائندے اس تقریب میں
چکرارہے تھے۔ فرہاد کے ساتھ ایک خاتون فوٹو گرافر
تھی۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا نور تک آ گیا۔ رسی
کلمات کے بعد بولا۔ ”آپ کو ٹین لباس میں دیکھنے کی
خواہش تو کسی حد تک پوری ہوئی..... مگر..... یہ جو چلن ہے
دشمن ہے ہماری۔“

”اور یہ ہمیشہ دشمن ہی رہے گی۔“ نور نے مستحکم لہجے
میں کہا۔ (چلن سے فرہادی کمراد، نور کا اسراف تھا)۔
”چلیں، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس
 لحاظ سے یہ بھی شکر کا مقام ہے۔“ فرہاد نے نور کے سراپا پر
ایک اچھتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

نور کو اپنے رخساروں پر شرم کی تہماٹھ محسوس ہوئی۔
وہ بولی۔ ”اب اگر آپ کسی اور طرف تشریف لے جائیں تو
بہتر نہیں؟“

”اور کہاں جائیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر طرف
اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

”جی ہاں، الٹو کھجی اچالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔“ نور
نے کہا اور ایک دوست کو پکار ڈیا، ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر یہ۔ شاہین بھی وہاں آگئی۔ وہاں منکا
رسیں اور پوری رسیں ہورہی تھیں۔ کچھ لڑکیوں نے نور اور
شاہین سے کہا کہ وہ بھی ان رسیوں میں حصہ لیں۔

میڈم فرحانہ نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”بھئی یہ
دونوں تو اب اپریلوں کی رز ہیں۔ یہ ان دوڑوں میں حصہ
لیں گی، تو دوسری لڑکیوں کا حق مارا جائے گا۔“

وہ دونوں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور یہ
مقابلے دیکھنے لگیں۔ شاہین ذرا اچھتی ہوئی سی نگاہوں سے نور
کو دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ”یہ لڑکا تمہارے ارد گرد

پیدا ہو گئی۔ منتظمین نے صورتِ حال کو سن بھال لیا۔
 نور نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ٹریننگ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سالانہ صوبائی مقابلے جیتنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے پیچھے اپنے ابا جان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سومیئر کا ٹائٹل جیت گئی تو یہ اتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ ابا جان کا دل موم ہو جائے گا۔ ایک بار وہ خود کو ثابت کر دے پھر ابا جان کی بات ماننے ہوں گے وہ مکمل کامیاد چھوڑ دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی انہونی ہو جاتی اور ابا جان کچھ شرائط کے ساتھ اسے ایک ٹیکس کے ساتھ جڑے رہنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ بہت پُر جوش تھی۔ کسی وقت اس کی ٹائٹنگ 12.90 سینڈ کو چھو جاتی تھی اور یہ ٹیبلنگ کی عمومی ٹائٹنگ سے بہتر تھی۔

ذوالقرنین والا معاملہ بھی بظاہر سرد خانے میں چلا گیا تھا۔ تین چار ہفتے گزر چکے تھے، اس کی طرف سے مزید کوئی رزلٹ سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس "ایڈوجر" میں اس کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ نور ڈرنے اور بچنے والی لڑکی نہیں تھی۔

فرہاد والی صورتِ حال بھی جوں کی توں تھی۔ اس نے نور سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کاربند تھا۔ کسی وقت آتنا سامنا ہو جاتا تو اس کا رویہ اتنا نابل ہوتا کہ کسی کے لیے کسی طرح کے شیعے کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ایک بار چند منٹ کے لیے دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ ہوا۔ یہ مختصر سا بے ضرر رابطہ نور کو بڑا اچھا لگا۔ اس کے اندر جیسے ایک خلا سا پورا ہو گیا۔ ایک بے نام خوشی اس کے اندر پیدا ہوئی۔ ہاں کوئی تھاجو دل کی گہرائی سے اسے چاہتا تھا۔ اس کے لیے دعا کرتا تھا۔ اسے سوچتا تھا اور اس کی آس رکھتا تھا۔ یہ احساس بڑا حوصلہ افزا اور توانائی بخش تھا۔

دوسری طرف شایبہ کے پند و نصائح بھی جاری تھے۔ وہ بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔

اس روز نور نے اقرار نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ نور اور اسپورٹس ایڈیٹر فرہاد رازی کے درمیان کوئی "راز" موجود ہے۔ وہ اکثر اسے فون کر دیتی اور محتاط رہنے کی یاد دہانی کراتی۔

ایک دن نور نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں شایبہ کہ تم خود..... اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگی ہو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم رہو کی پینڈو کی

پینڈو ہی۔ تمہارے بھلے کا کہتی ہوں۔ ان ماڈرن شہری لڑکوں کے داؤ بیچ بتا رہی ہوں تمہیں۔ ٹھیک ہے، نہیں تو نہ سہی۔" اس نے فون بند کر دیا۔

نور اپنی جگہ ٹیٹھی کچھ دیر مسکراتی رہی پھر اس نے شایبہ کو رنگ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کی۔ سوری کرنے کے بعد نور بولی۔ "یار! مذاق کر رہی تھی۔ تمہاری ہمدردی اور محبت ہر شے سے بالاتر ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری حدیں اور میری ذمے داریاں کیا ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ تشوہم دونوں کی مشترک حریف ہے۔ ہمیں اسے ہرانا ہے اور ہر صورت ہرانا ہے۔"

"اور مجھے پتا ہے کہ اسے تم ہی نے ہرانا ہے۔ کل میڈم فرحانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوچ سر مد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں تمہاری ٹائٹنگ میں کم از کم..... کم از کم ایک سینڈ کی بہتری اور آئے گی۔"

"یہ تو اللہ کو پتا ہے اور اصل فیصلہ تو اس دن اور اس وقت ہوتا ہے جب فائل اسپرنٹ لگائی جائے گی اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت معمولی مار جن ہوگا۔"

"یہی تو ہوتا ہے کانے دار مقابلہ۔" شایبہ نے کہا۔ سالانہ ایونٹ میں اب بس تیس روز باقی تھے۔ تناؤ میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ تاپا یا اور ماموں مراد اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس کی ڈائنٹ کا مکمل خیال رکھا جا رہا تھا اور تربیتی سیشن بھی باقاعدگی سے ایڈجسٹ کرائے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت پھپھو حاجرہ کے کہے ہوئے الفاظ نور کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ انہوں نے ایک روز کہا تھا۔ "کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا نور! یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا ہے۔"

ایسے وقت میں وہ کانپ جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتی رہتی۔ "اے رب کریم! مجھ پر رحم فرما۔ اپنے ابا جان کے حوالے سے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، مجھے اس کا ازالہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دے میرے مالک۔ میں اندھی ہو گئی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے راستہ سوچا دے۔"

ایک بار اس کے دل میں آئی کہ سارے اعمیائے بالائے طاق رکھ کر گھر چلی جائے اور ابا جان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اسے معلوم تھا کہ آئی بٹول بھی ملتان سے آئی ہوئی ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ سب مل جل کر اسے اباجی سے

تھا۔ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ایک سال کی عمر تک پہنچے پہنچے تم باقاعدہ بھاگنے لگی تھیں۔ میں تمہیں شکل سے پہچانتا تھا اور تمہیں لان کی گھاس پر لٹا کر تمہاری ٹانگیں دبایا کرتا تھا..... تمہیں وہ باتیں تو یاد نہیں ہوں گی؟“

”کچھ کچھ..... دھندلے دھندلے سے منظر یاد ہیں تایا ابا۔“

”تم تین چار سال کی تھیں، جب میلے کے موقع پر تم سب بچوں نے حویلی کے سامنے والے باغ میں دوڑیں لگائی تھیں۔ تم نے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو ہرا دیا تھا۔ میں نے اس وقت پتا ہے تمہاری تائی سے کہا تھا؟“

وہ سوالیہ نظروں سے تایا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولے۔ ”میں نے کہا تھا یہ نور ہے..... اور نور کی رفتار 299274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔“

نور مسکرا دی۔ مصلے پر پیٹھے ہوئے تایا ابا بھی مسکرا دیے۔ نور کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولے۔ ”آج میں پھر کہتا ہوں۔ تم نور ہو.....“

تایا ابا کی باتوں نے نور میں ایک نئی امنگ، ترمیم پیدا کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر اس کا یہ دل بھی چاہا کہ وہ تایا ابا کو فریاد کے حوالے سے ٹھوڑا بہت بتا دے۔ اشارہ نایب ذکر کر دے لیکن پھر اس نے یہ کام بھی ایمونٹ کے بعد تک اٹھا رکھا۔

☆☆☆

سومیرٹری دوڑ کا ٹریک تھا اور کالج کے گراؤنڈ میں یہ ایک طرح کی فاصل ریسرسل تھی۔ کوچ میڈیم فرحانہ نے کہا۔ ”نورا! تم مجھ کو مقابلہ کل نہیں آج ہے اور یہ تمہاری فاصل ہیٹ ہے۔ اس میں تم نے اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ گھٹنوں پر جھک جاؤ، اپنے پاؤں کو فٹ بلاکس پر پوری طرح ایڈجسٹ کرو۔ نظر ٹارگٹ پر..... اور یہ بات یاد رکھو اشارت کی بے حد اہمیت ہے۔ اوکے..... تم تیار ہو؟“

”یس میڈم!“ نور نے جھکے جھکے اپنا سر اٹھایا اور ٹارگٹ پر لگا گئیں جگادیں۔

”ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ تم نے ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ کانوں کو پمپل کی آواز پر مرکوز رکھو..... ریڈی.....“

نور نے سانس اندر کی طرف کھینچی۔ اس کی تمام تر توانائی جیسے اس کے جسم کے پمپل سے اور خاص طور سے اس کے پاؤں میں جمع ہو چکی تھی۔ اس کے ارد گرد تین چار اسپرٹرز اور بھی تھیں..... ہاں یہ فاصل ریسرسل تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی نور گولی کی رفتار سے اپنے

معافی دلا دیتے لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی بہت پیدا کر پائی..... اور اس نے تایا ابا کی ہدایت کے مطابق سب کچھ سالانہ ایونٹ کے بعد پر چھوڑ دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس ایونٹ میں نور کی کامیابی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ شامینہ کے حوالے سے بھی توقعات بہت بلند تھیں۔ مقابلے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ نور نے آخری پھر کواٹھ کر دیکھا۔ تایا ابا حسب معمول تجھ کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی میں وضو کا یا شاید..... آسودوں کا پانی چمک رہا تھا۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور جینز کی پتلون پنڈلیوں کے وسط تک ڈھٹی ہوئی تھی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ابا جان کی نسبت تایا ابا زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ وہ ہر معاملے کو معروضی انداز میں دیکھنے کے عادی تھی۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے نور کو اپنے قریب بلا دیا۔ وہ قائلین پران کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور کوئی آیت پڑھ کر اس پر پھونکی..... پھر عجیب و غریب سے لہجے میں بولے۔ ”نور بیٹا! تم بہت محنت کر رہی ہو اور یاد رکھو، محنت بھی رائج نہیں جاتی۔ اس حوالے سے دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے قاعدے یقیناً حکم کے ساتھ عمل پیہم کی جو بات کی تھی، وہ اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جب مشکلات کے باوجود عمل پیہم رہتا ہے تو پھر وہ مقام آ جاتا ہے جب خدا بندے سے خود پوچھتا ہے.....

بندے کو بتاؤ تو کیا چاہتا ہے۔“

اس نے تایا ابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو بھی مایوس نہیں کروں گی تایا ابا۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سوچا ہے، اسے عملی شکل دینے کے لیے ہر حد تک جاؤں گی۔“

”مجھے یقین ہے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے اس نامشغول کو دکھانا ہے کہ بیٹے نہ ہوں تو بیٹیاں بھی بیٹوں جیسے کام کر کے اپنے والدین کا سفر خیر سے بلند کر سکتی ہیں۔“

نور کی آنکھوں میں نمی آئی۔ تایا ابا نے اس کا سر چوما۔ ”مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی۔ شریلش اور عثمان پیدا ہو چکے تھے۔ مہرین کی پیدائش ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر جیسے ایک بڑا خلا سا تھا۔ وہی دن تھے جب اشفاق کے ہاں تم نے جنم لیا۔ تم سارے گھر کی اور خاص طور سے میری لاڈلی بن گئی تھیں۔ میں تمہیں سارا سارا دن کو میں اٹھائے پھرتا تھا۔ تم نے صرف سات ماہ کی عمر میں چلنا شروع کر دیا

آچکا تھا۔ وہ بے دلی سے آس کریم کھانے لگی۔ نیچے ہال کمرے میں صورت حال کچھ تبدیل ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تینوں دوستوں میں کسی بات پر غماز چل رہی تھی۔ پھر یہ باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کرنے لگی..... دوستوں میں تفریح کے دوران میں اکثر لڑائی کی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ لڑائی کچھ زیادہ تھی۔ غالباً ان کے درمیان کسی کیسے اور ادھار رقم کی بات ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوبت ہاتھ پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکا جس کا حوالہ سرخ شرٹ تھا، فرہاد کا گریبان دیوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تیسرا دوست ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ہیڈ ویئر اور ایک دوسرے شخص نے بھی مداخلت کی اور یہ مشکل بھیج باؤ کر لیا۔ سرخ شرٹ والا جو آج نیلی دھاری دار قمیض میں نظر آ رہا تھا، بکنا جھکا باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کہ اچانک نور کے دل میں کیا آئی۔ اس نے دونوں فریئڈز سے کہا۔ ”پلیز، تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو..... میں ابھی آتی ہوں۔“

ان دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی سیڑھیاں اترتی اور اس جانب بڑی جدر نیلی قمیض والا کھڑا تھا۔ وہ لڑکا اسے پارلر سے کچھ فاصلے پر اپنی موٹر بائک کو جھلاہٹ میں لکس مارٹا لگ گیا۔ نور نے اپنا اسکارف ٹھوڑی سے اوپر ہونٹوں تک کھسکایا اور اس کے پاس پہنچ کر بولی۔ ”ایلیسیو زنی، میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتی ہوں؟“ ایک اسارٹ لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر لڑکے کے چہرے سے جھلاہٹ رفو چکر ہو گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو؟“

لڑکا چند منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنی موٹر بائک کو پھر سے لاک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نور اس کے ساتھ چند سیڑھیاں اتر کر پارک میں پہنچ گئی۔ یہاں سایہ دار درخت تھے اور پھولوں کے پودے بھی تھے۔ وہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ایک پتھر لی بیچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس میں لڑکے کا نام پرویز معلوم ہوا اور نور پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ دو ڈھائی سال سے فرہاد کا دوست ہے۔ وہ وی سی آر اور کمروں وغیرہ کی ریجنگ کا کام کرتا تھا، اس کی اپنی دکان تھی۔ گفتگو کے دوران میں پرویز نے اچانک چونک کر نور کی طرف دیکھا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”معاف کریں۔ کہیں آپ کا نام نور تو نہیں؟ وہی جو اسپرٹ میں حصہ لیتی ہیں؟“

ٹارگٹ کی طرف بڑھی۔ اب تک اس کا سب سے اچھا ٹائم 12.90 تھا۔ آج وہ اس کو بیٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی توانائی کے ساتھ..... اور جب اس نے فٹس لائن کر اس کی، میڈم فرحانہ اور مسز وجدان کا مشترکہ نمبر نور کے کانوں سے لگرایا۔ وہ اپنے مومٹم میں بیس تیس میٹر تک بھاگتی چلی گئی پھر اس نے مڑ کر اپنی کوچ اور ٹیچر کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسٹاپ واچز تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے دھک رہے تھے۔ نور نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تھا اور یہ رزلٹ اس امر کی نہایت روشن امید تھا کہ وہ کل پہلی پوزیشن حاصل کر لے گی۔ بہر حال حتیٰ فیصلہ توکل میدان میں ہونا تھا۔ نور کی فریئڈز نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر آج اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تو وہ انہیں ٹریٹ دے گی۔ اب وہ اس کے درپے ہو گئی تھیں۔ نور نے سینئر کے فون سے تایا کو کال کی اور انہیں بتایا کہ آج وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کی گاڑی پر آ جائے گی۔

دراصل وہ ایک پختہ دو کاج والا معاملہ کر رہی تھی۔ چار دن بعد عید کا تہوار بھی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا خندہ تو اسے فرہاد کو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ واپسی پر وہ چند منٹ کے لیے بازار میں بھی رک جائے گی اور فرہاد کے لیے کوئی گفٹ بیک خرید لے گی۔

تین فریئڈز فوسکی کار پر ایک قریبی آس کریم پارک میں چلی گئیں۔ نور بالکل پرہیزی ڈائٹ لے رہی تھی، ایک کپ آس کریم کی تمناش تو یقیناً نکل ہی سکتی تھی۔ وہ پارک کی ٹیبلری میں جا بیٹھیں اور آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک نور کی نگاہ نیچے ہال میں ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونکی، وہاں فرہاد موجود تھا۔ اس کے دو دوست بھی تھے۔ تینوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ نور نے ذرا ادھیان سے دیکھا اور اسے دوسری بار چونکنا پڑا۔ فرہاد سے کہیں نہ کہتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کی صورت نور کو شاسگ رہی تھی۔ یہ وہی سرخ شرٹ والا لڑکا تھا جس نے ان کی گاڑی سے موٹر سائیکل ٹکرائی تھی اور پھر تایا ابا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

یقیناً یہ وہی تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے فرہاد کے ساتھ اٹھیلیاں کر رہا تھا..... نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور ذرا، ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس شخص سے فرہاد کی دوستی کب اور کیسے ہوئی؟ فرہاد نے تو بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں کھد بھدی ہونے لگی۔ آرڈر

فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دونوں پریمی پھر ایک ہو چکے ہیں۔
اب بہت جلد تمہیں اپنے مقام کا بھی پتا چل جائے گا۔“
نور کی نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو شاہینہ دتا
نو تھا اس سے کہنی رہی تھی۔ اس نے شروع میں ڈھکے چھپے
انداز میں اسے فرہاد سے دور رہنے کے مشورے دیے
تھے۔ نور سے کہا تھا کہ وہ کہیں اس سے فطرت نہ کر رہا
ہو۔۔۔۔۔ اور اس طرح کی کئی اور باتیں لیکن ایک سوال ذہن
میں اٹھ رہا تھا۔ نور سے فرہاد کا تعارف ایک ایکٹرنٹ کے
بعد اتفاقاً ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اتفاقاً نہیں تھا۔
پرویز نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نور سے ایک بار
پھر رازداری کا وعدہ لینے کے بعد اس نے بتایا۔ وہ سب
فرہاد کی پلاننگ تھی۔ وہ دن رات شاہینہ کے لیے تڑپ رہا تھا
اور اسے واپس اپنے پاس لانے کے منصوبے سوچتا تھا۔ وہ
ایکٹرنٹ جان بوجھ کر گیا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا
پلاننگ کے ساتھ ہوا۔

”تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟“ نور
نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”شاید تم کوئی گواہ مانگ رہی ہو یا کوئی تصویر وغیرہ
دیکھنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا ”لائسنس“ ثبوت دے دیتا
ہوں اور وہ بھی آج ہی بلکہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔“ اس
نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو پرویز صاحب؟“
”دونوں پریمی آج کل ڈینس کے“ اوڈی کافی
ہاؤس“ میں مل رہے ہیں۔ آج بھی ملیں گے۔ اپنی آنکھوں
سے دیکھ لیتا۔“

نور کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز گردش کر رہی تھی۔
اس کا ذہن دھندلا ہوا تھا۔ پرویز نے رخصت ہو کر وہ
سیدھی آکس کریم پارک پہنچی۔ اس کی دونوں دوست بے حد
پریشان تھیں اور وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہی تھیں۔ نور
نے ان سے معذرت کی۔ وہ دونوں شدید الجھن میں تھیں
اور اسی الجھن میں وہاں سے رخصت ہو گئیں کیونکہ نور نے
انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نور نے گھر
فون کیا اور تانی جان کو بتایا کہ اسے تجوڑی سی مزید دیر
ہو جائے گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس کام کے بعد اس نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس
ایر پائیس جا پہنچی جہاں معروف اوڈی کافی ہاؤس واقع تھا۔
وہ بڑی گھری ہوئی روشن شام تھی مگر نور کے لیے اس میں

نور نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ”آپ نے
کیسے اندازہ لگایا؟“
وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ”آپ کا بہت تذکرہ ہوتا
رہتا ہے نور صاحب، وہ۔۔۔۔۔ جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہا
ہے۔۔۔۔۔ ہم کو پتا ہے۔“
”مم۔۔۔۔۔ میں کچھ سمجھ نہیں؟ کون وہ؟“
”آپ سمجھ سکتیں۔۔۔۔۔ تو اب تک۔۔۔۔۔ اس کے چکر
سے نکل چکی ہوتیں۔۔۔۔۔ خیر چھوڑیں۔۔۔۔۔ اب آپ کا مکمل ختم
ہو چکا ہے۔ اب آپ نے خود ہی اس ”آٹو“ چکر سے نکل
جانا ہے۔“

”آٹو؟“ نور کے لہجے میں استعجاب تھا۔
”جی ہاں۔۔۔۔۔ آٹو بتایا جاتا رہا ہے آپ کو۔ میزمری
کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی اور تک پہنچنے کے لیے۔“
نور کے کان سامنے سامنے کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ
میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے روہاسی ہو کر بولی۔ ”کیا۔۔۔۔۔ تم
یہ سب کچھ فرہاد کے بارے میں کہہ رہے ہو؟“
”تو اور کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے۔“

پتا نہیں کیوں نور کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ
دل کو ابی دے رہا تھا کہ یہ پرویز نامی لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے،
بے بنیاد نہیں ہے۔

اس نے اس سے درخواست کی کہ اگر اس نے یہ
بات چھیڑ دی ہے تو پھر اسے ادھر اندر رکھے۔

پرویز تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے نور سے کہا کہ
یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کل کئی جگہ مل کر یہ بات کر سکتے
ہیں۔ نور مل تک کا انتظار کیسے کر سکتی تھی۔ اس نے پرویز کو
مجبور کیا۔ وہ پارک سے اٹھ کر مارکیٹ کی قطعی سمت ایک کیفے
میں آن بیٹھے۔ رازداری کی شرط پر پرویز نے جو کچھ بتایا،
وہ شاید پرویز کے لیے تو بہت زیادہ اہم نہ ہو لیکن نور کے
لیے تھلکہ خیز تھا۔ اس نے کہا۔ ”نور صاحبہ! یقیناً تمہیں یہ سن
کر افسوس ہوگا کہ فرہاد تم سے نہیں تمہاری دوست شاہینہ سے
محبت کرتا ہے اور یہ چکر تمہارے والے چکر سے بھی پہلے کا
ہے۔ فرہاد اور شاہینہ کے درمیان کچھ دوری پیدا ہوئی تھی۔
وہ اپنے گیم میں بہت زیادہ مگن ہو کر اس کو Avoid
کرتے لگی تھی۔ شاہینہ میں حسد پیدا کرنے کے لیے ہی فرہاد
نے تم سے راہ دور سم بڑھائی اور میرے خیال میں وہ اپنے
مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔“

”میں۔۔۔۔۔ نہیں مانتی۔“
”سوری مس! تمہارے مانتے یا نہ مانتے سے کوئی

لے بڑا بھی اور غم ناک بھی۔ وہ تو 12.50 کی ٹائمنگ حاصل کر چکی تھی، پھر اتنا پیچھے کیسے رہ گئی۔ جو اس پر گزری ہے وہ کس دل کو ہٹا ہے۔

ریس ہارنے کے بعد نور کی نگاہ سب سے پہلے اپنے تایا ابا پر ہی پڑی۔ ان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آسوپہ مشکل روکے ہوئے ہیں پھر اس نے اپنی محبوب ٹیچر اور کوچ میڈم فرحانہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی، تماشا بینوں کے اسٹینڈز کی طرف آگئی۔

تایا ابا نے آگے بڑھ کر نور کو گلے لگایا اور پیٹھ چھکی۔
 ”کوئی بات نہیں..... ہار جیت کھیل کا حصہ ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے..... اور ہمت برقرار رکھنا ہے۔“ ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔
 بسہ بھی چوری چھپے یہ ریس دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے کزنوں مہرین، مرثیہ اور عثمان وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آدھے نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا لیکن بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے نور کو تسلی دی۔ ”کوئی بات نہیں۔ پورے پنجاب میں چوتھا نمبر ہے تمہارا۔ آگے اور چانس ملیں گے۔“

یہ ریس نشوونگی نے جیت لی تھی۔ لاہور کی شاہینہ کا دوسرا نمبر آیا تھا۔ نشو اپنی ایسوسی ایشن کے میز کے ساتھ پورے گراؤنڈ میں پھرتی پھرتی تھی۔ اس کی سپورٹرز لڑکیاں ساتھ تھیں۔ نشو خاص طور پر اس جگہ رکی جہاں نور اپنے کوچز اور ساتھیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ یہاں ان سب نے خوب نعرے لگائے اور نعرے اچھالے۔ اسپیکر پر کنفری کرنے والے صاحب نشو کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پیشین گوئی کر ڈالی کہ نشو اسپرٹ کے میدان کا سب سے تائناک..... ابھرتا ہوا ستارہ ہے اور وہ پینٹل گیمز میں بھی میدان مار لے گی۔

”کوئی بات نہیں نور صاحب! ایسے اپ ڈاؤن آتے ہی ہیں۔“ یہ آواز نور کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں فرہاد کھڑا تھا۔ میگزین ”سپر اسٹار“ کا جیہہ اسپورٹ ایڈیٹر۔ اس کے خوبصورت بال پھٹانی پر لہر رہے تھے۔ کتنا محسوس اور سادہ نظر آتا تھا۔ ہاں، یہی شخص تھا جس نے آج ایک نہایت اہم سبک میل نور سے چھینا تھا..... ہاں یہی تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

تاریکی اور نور کے سوا اور کچھ نہیں تھا..... اور پھر وہ جان لیوا کھڑی بھی آئی جب اس نے کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں شاہینہ اور فرہاد کو ہنستے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرہاد فیشن کے طور پر شیٹائی رہا تھا اور شاہینہ ایک کپ سے چمکیاں لے رہی تھی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ پونی ٹیل باندھے ہوئے تھی۔ شاید رنگ کرنے کے بعد سیدھی یہاں آگئی تھی۔ کل اس نے بھی اہم ترین مقابلے میں حصہ لینا تھا۔

وہ شام اور وہ رات نور کے لیے بڑی عذاب ناک تھی۔ تایا ابا نے صدقے کے طور پر بکرے کی قربانی دی تھی۔ مگر میں سب نور کے لیے دعائیں کر رہے تھے، میں مان رہے تھے اور وہ جیسے اندوہ ناتوانی کے اٹھا ہوا پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذرا سستانے کے بہانے وہ بند کرے میں چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس نے فرہاد کو چاہا تھا اور دل و جان سے چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس کی کنواری آنکھوں میں ان گنت ہینوں نے جگہ بنائی تھی۔ وہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا..... اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے گہرے غار میں جا گری تھی۔ اس شخص نے شاہینہ کی محبت پانے کے لیے بڑی بے رحمی سے نور کا استعمال کیا تھا اور وہ بڑی سادگی سے استعمال ہوئی تھی۔

وہ روئی نہیں تھی۔ ان لڑکیوں کو نادان سمجھتی تھی جو نیکے ہنگوئی ہیں لیکن آج اسے خود رونا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک آسوپہانے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے کم محسوس ہوا..... مگر جو غم تھا وہ تو ہر رگ رگ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ واش روم میں جا کر بہت دیر تک منہ دھونے اور چہرے پر لوشن وغیرہ لگانے کے باوجود وہ اپنے رونے کے آثار چھپا نہیں سکی اور اس روز اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جب غم آنکھوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے چھپانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بند کمرے سے باہر سب چمک رہے تھے۔ ان کی امیدیں جوان تھیں اور وہ کل کا انتظار کر رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل جس لڑکی نے سالانہ کھیلوں میں حصہ لینا ہے وہ اندر سے مرنے لگی ہے۔

حوصلے کیسے ٹوٹتے ہیں، توانائی، ناتوانی میں کیسے بدلتی ہے، منزلیں لگا ہوں کے سامنے کیسے دھندلاتی ہیں، یہ نور کو اس روز پتا چلا..... اور ہزاروں لوگوں کے سامنے چلا۔ وہ سو میٹر کی فاصل ”ہیٹ“ تک پہنچ گئی..... مگر وہ پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ دوسرا اور تیسرا بھی نہیں کر سکی۔ وہ چوتھے نمبر پر آئی۔ یہ بہت بڑا اپ سیٹ تھا۔ نور کے سپورٹرز کے

بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ جو دھری غفلت کے بیٹے سے اس کا چچا چھوٹا ہے یا نہیں..... لیکن پھپھو سے کوئی مونہ دیے بغیر بھانکی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ (دیے نور کو اتنا پتا چل چکا تھا کہ جو محتای ایم بی اے یہ مسئلہ حل کر رہا تھا، اسے کامیابی ملی ہے اور وہ کامیابی برادری کے لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب ابا جان اور پھپھو وغیرہ کہیں بسہ کی منگنی کا سوچ رہے ہیں)۔

چند دن بعد نور کا بخار اتر گیا..... اور وہ ایک بار پھر ٹریک پر آگئی۔ اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس نے فراہ سے تصور کو اپنے ذہن سے کمرپنے کی کوشش کی تھی اور بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اسے تو ڈر سا لکھو شایہ سے بھی تھا کہ ایک بے تکلف دوست ہوتے ہوئے بھی اس نے اسے شروع میں ہی اصل صورت حال سے آگاہ کیوں نہ کر دیا۔ اسے فراہ سے دور رکھنے کی کوشش تو کرتی رہی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ شاید اس کی بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ اس سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ فراہ سے بھی دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ڈاکٹر فیضان نے تایا جان کے فری کلینک میں بھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ تایا ابا اس سلسلے میں فراہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا..... انہوں نے ایک اور ڈاکٹر ہائر کر لیا تھا۔ یہ بات اب باپے تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ یہ سب فراہ کا ڈراما تھا۔ مہرین کو بھی اس ڈرامے کا شک ہو چکا تھا۔

سب کچھ بھول بھال کر نور نے ایک بار پھر ایف اے ایس جانا شروع کر دیا۔ اب وہ نیشنل میسرز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے کوچز اس کی طرف سے پڑا امید تھے۔ وہ چھوٹے بڑے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ اس کی ہیڈ کوچ فرحانہ بیگ نے اس کی ایک خالی نوٹ کی..... وہ کسی وقت فاسل اسٹارٹ (غلط شروعات) کر جاتی تھی۔ اہم مقابلوں میں فاسل اسٹارٹ کی وجہ سے بڑے بڑے ایٹھلیٹ ڈس کو الیغائی ہو جاتے ہیں اور ان کے کیرئیرز داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحانہ بیگ نے دن رات محنت کی اور نور کی اس کی کوچنگ کو پچانوے فیصد تک درست کر دیا۔ وہ تکنیک کے ہر پہلو پر توجہ دے رہی تھیں۔ ٹریک پر پوزیشن کیسے لینی ہے..... فٹ بلاکس کا بہترین استعمال کیسے ممکن ہے؟ کس طرح جھک کر اپنے ہاتھوں کو اسٹارٹنگ لائن سے بچ کر آگے۔ فٹس لائن پر پہنچتے ہوئے خود کو کس طرح آگے جھکانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ایونٹ کے بعد نور بیمار ہو گئی۔ اسے بخار ہوا، بعد میں پتا چلا کہ طبریا ہے۔ وہ اس کے لیے بڑے مایوس کن دن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو باری اور دھکاری ہوئی محسوس کرتی تھی حالانکہ تایا اور تانی اس کی دبوکی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ تینوں کزن شرنبل، عثمان اور مہرین بھی ہر طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ ایک روز پھپھو صاحبہ آئیں۔ تانی راحت اس وقت مہرین کو لینے کا بجلی ہوئی تھی۔

پھپھو نے کہا۔ ”بتا کیا ملا تھے اپنے باپ کا دل دکھا کر۔ کون سا میدان مار لیا ہے تو نے جس کی وجہ سے تیرے پالنے والوں کا سراوچا ہو گیا ہے؟ بڑے لیے چوڑے وعدے کر رہے تھے بڑے بھائی جان بھی.....“

”آپ تایا جان کو کچھ نہ کہیں پلیز۔“ نور نے کہا۔ ”انہی کے بے جالاؤ نے تیری بیڑیوں میں دے ڈالے ہیں۔ بھائی جان اور باقی راحت دونوں تصور دار ہیں۔“

”پلیز پھپھو..... پلیز..... چپ ہو جائیں۔“ وہ بینک کے پیچھے سے دکھ آئیں غصے سے نور کو دیکھتی رہیں، پھر لیں۔ ”دیکھ نور! اب بھی وقت ہے سنبھال جا۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑا میڈل اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے پالنے والے اس سے راضی ہوں اور اس کا گھر بس جائے۔ اپنے ابا جی سے معافی مانگ لے۔“

”آپ، معافی کہتی ہیں۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہوں مگر وہ مجھ پر کچھ نرم تو کریں۔ مجھے اس طرح تو کمر سے دھکا دے کر نہ نکالیں۔ میں نہیں کرنا چاہتی ابھی شادی۔“

”تو اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ تیرے دماغ میں کیڑا ہے..... اور وہ کیڑا ابھی ہے کہ تو شاید کوئی بہت بڑی کھلاڑی بننے والی ہے۔ نہیں بے گئی تو۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ جو پیچھے اپنے والدین کی بددعا لیے ہیں وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتے.....“

پھپھو اشارے اس ناکامی کا ذکر کر رہی تھیں جو چند دن پہلے اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اس ناکامی کے پیچھے کیا سنگین حالات تھے۔ کس طرح کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے کئے تھے اور اسے مٹی کا ڈھیر کر ڈالا تھا۔

وہ خود سے ہرگز ناامید نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ کر سکتی ہے۔ اپنے تایا ابا اور اپنے دیگر چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کیا ہوا تھا اور کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پھپھو سے ملنے کی سنا کر چلی گئی تھیں۔ نور ان سے گھر کے حالات پوچھنا چاہتی تھی، خاص طور سے بسہ کے

دوسری طرف نور کی اہم ترین حریف نشوونگی کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے والد اور چچا نہ صرف اسپورٹس میں تھے بلکہ سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ نشو کے اہل خانہ نے اسے پرائیویٹ طور پر انگلینڈ کا دورہ کرایا ہے۔ وہاں اس نے غیر ملکی کوچز سے بھی ”نہیں“ لیے ہیں اور ممکن ہے کہ انگلینڈ سے کوئی کوچ اس کی ٹریننگ کے لیے پاکستان بھی آئے۔

شاہینہ کے حوالے سے اطلاعات تھیں کہ وہ سرگرمی سے تربیت میں حصہ نہیں لے رہی پھر ایک روز نور کی تایا زاد مہرین نے اسے رازداری کے انداز میں خبر سنائی۔ ”مہرین پتا ہے کہ شاہینہ کی شادی ہو رہی ہے؟“

”کیا؟“ نور حیرت زدہ رہ گئی۔

”ہاں جی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا ہے اور لڑکا پتا ہے کون ہے؟“

”وہی ذات شریف جس نے ہمارے روپرور قافلے عامہ کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور اباجان کے فری کلینک میں کردار ادا کر رہا تھا۔“ فرہاد رازی۔ سنا ہے کہ اس چٹ منگنی پٹ بیاہ کے پیچھے فرہاد رازی کا کوئی راز ہے۔“ مہرین نے متنی خیر لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”دونوں نے تعلقات بنارکھے تھے۔ ایک دن شاہینہ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے گر گئی۔ پتا چلا کہ وہ ”پریکٹ“ ہے۔ شاہینہ کے والدین نے فرہاد کو جا بوجھ۔ وہ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ انہوں نے فرہاد کے سامنے دو آپشن رکھے۔ شادی کر دیا پھر بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ شادی بھگتنے کو تیار ہو گیا۔“

نور نے یہ سب کچھ سنائے میں سنا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کی دوست اور کوئی بگ کے ”رنگ کیریئر“ کا اختتام اس طرح ہوگا۔ شاہینہ اور فرہاد کی اس کہانی میں ایک کردار نور کا بھی تھا اور یہ کردار اس سے زبردستی کروایا گیا تھا۔ وہ اس کردار اور اس سے وابستہ ساری سخت یا دلوں کو اب ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

چند روز بعد واقعی شاہینہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کی خبر نور کو ایک مشترکہ فریڈ کے ذریعے ہی ملی تھی۔

نور پوری تحیر ہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھی۔ یہ بڑا کشمکش راستہ تھا۔ وہ تایا جان یا پھر ماموں مراد کے ساتھ صبح منہ اندھیرے ایف اے ایس تک جاتی

تھی۔ وارم اپ ہوتی، اسٹریچنگ کرتی، جب تک کلومیٹر کی دوڑ اور پھر سو میٹر کے ڈیش لگاتی۔ وہ تھک کر چرو ہو جاتی، کئی مرتبہ اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے خون بہہ نکلے گا۔ جب وہ جان توڑ محنت کر رہی ہوتی اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا۔ وہ اپنے تایا جان کو سرخرو دیکھے، تایا جان بھی ہر دستیاب سہولت اس کے لیے فراہم کر رہے تھے۔

تایا زاد بہن مہرین فزیو تھراپسٹ بھی تھی۔ یہ سہولت نور کو گھر میں ہی مل گئی تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتا تو مہرین فوراً اس کی مدد کو آ جاتی۔ ایک روز نور کو گھٹنے میں ہلکا سا کچھاؤ محسوس ہوا۔ تایا کی ہدایت پر مہرین نے فوراً فون پر اپنی سینٹر پرفیورمنس مشورہ کیا اور نور کے مساج میں لگ گئی۔

نور جلد ہی بہتر محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

”مہرین! اس منہ سے تیرا شکر یہ ادا کروں۔“

”اسی منہ سے کر دیا کرو۔ کافی پیارا ہے، جب کس کر پونی ٹیل باندھتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ شاید فلورنس بھی ایسے ہی باندھتی ہوگی دوڑتے وقت۔“

فلورنس ایک طرح سے نور کا آئیڈیل تھی۔ ہر کھلاڑی کا کوئی نامور کھلاڑی آئیڈیل ہوتا ہے۔ نور کے بھی اسی طرح کچھ آئیڈیل تھے۔ سو میٹر کی امریکن ریکارڈ ہولڈر فلورنس۔ جس کی ٹائٹل 10.49 سیکنڈ تھی۔ یہ ٹائٹل ہر اسپرینٹ کے دل و دماغ میں ایک روشن سنگ میل کی طرح جھلکتی تھی۔ اور پھر انڈین ٹی ٹی اوٹا، جس نے بکارتہ میں 11.39 کی ٹائٹل حاصل کی تھی اور پاکستان کی انجیل شمس کا جھلکا ستارہ عبدالخالق جو مردوں کی ٹیٹری میں 10.04 کی ٹائٹل کے ساتھ ایشیا کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔

وہ بھی خود کو ایسے ہی چمکتے دیکھتے ستاروں کے درمیان بان ان کے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ کر گزرتا چاہتی تھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کی آرزو رکھتی تھی۔ تاکہ آبی بول کے شور بھیجے مرد۔ اور ذوالقرنین جیسے مرد۔ اور فرہاد جیسے مرد۔ اس کی حیثیت کو تسلیم کریں۔

مہرین کے جادوئی لمس نے نور کے گھٹنے کا کچھاؤ یوں جن لیا جیسے وہ بھی تھپی نہیں۔

مہرین بولی۔ ”تمہیں پتا ہے نور جب میں نے فزیو تھراپسٹ بننے کا سوچا تھا تو چچا جان (نور کے ابا جی) نے بڑی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ بلیا بننے جا رہی ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمیں

عطا کردی لیکن مہر کی بیدائش کے بعد بھی تمہاری محبت بھی کم نہیں ہوئی۔۔۔۔۔

”آپ کی محبت اور آپ کی توجہ میرے لیے بے حد قیمتی ہیں تایا ابا۔ شاید اسی محبت اور توجہ کی بدولت میں خود کو ثابت کر سکوں اور کسی دن میرے ابا جی بھی مجھے واپس مل جائیں۔“

”کیوں نہیں ملے گا۔۔۔۔۔ ضرور ملے گا۔ بس محنت شرط ہے اور مستقل مزاجی شرط ہے۔ میرا ایمان ہے نور محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ رانگاں جاتی نہیں سکتی۔“

”آپ کا ایمان، میرا ایمان بھی بن چکا ہے تایا ابا۔“

”تم دیکھنا۔۔۔۔۔ اس مرتبہ اللہ تعالیٰ ہمیں محنت کا پھل ضرور دے گا۔ کل میری بات تمہاری سینئر کوچ سے بھی ہوئی ہے۔ وہ بہت تمہارے امید ہیں۔“

اسلام آباد میں ہونے والے قومی کھیلوں کے لیے نور نے بہ آسانی کوالیفائی کر لیا تھا۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب ابتدائی دوڑوں (یعنی Preliminary Heats) کے بعد نور کو فائنل ہیٹ میں حصہ لینا تھا۔ اس ہیٹ میں جو دو تین اہم مد مقابل موجود تھے، ان میں اپنی سن کا بچہ کی ایک لڑکی کے علاوہ ٹشو بکلی بھی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں نور کی ٹیم کاغذ میں تقریباً 0.30 سیکنڈ کی بہتری آئی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ بہتری اسے گولڈ میڈل دلانے میں اہم ثابت ہوگی۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نور میدان میں پہنچی۔ وارم اپ کے دوران میں ٹشو بکلی اسے کڑی نظروں سے گھورتی رہی۔ جیسے نور کو کچھ دیکھ کر خود کو تاؤ دلاری ہو اور اس تاؤ کو اپنی انرجی بناتی ہو۔ نور نے بھی اس کی گرم نگاہوں کا جواب گرم نگاہوں سے ہی دیا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹشو نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پھونک مار کر اپنی پیشانی سے ہٹایا اور سر گوشی کرتے ہوئے آگے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ آج پینڈو واپس پنڈ چلی جائے گی۔

گولڈ میڈل ہیٹ اسٹارٹ ہوئی۔۔۔۔۔ پوزیشن لی گئی۔۔۔۔۔ پھل کی آواز کے ساتھ ہی ایٹھلیٹس کے رگ پٹھوں نے بجلی کی طرح رسائیں کیا اور وہ اپنے پاؤں سے فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے ٹارگٹ کی طرف چھپیں۔

پھل کی آواز کے فوراً بعد ہی نور کو محسوس ہوا کہ آج اس کا اسٹارٹ بہت اچھا نہیں تھا۔ بہر حال وہ بجائے میں اپنا ہنڈ رڈ پرسنٹ دے رہی تھی۔ یہ سارا تقریباً 50 قدم کا مکمل تھا، شاید ایک دو قدم زیادہ۔ تقریباً پندرہ قدم کے بعد نور نے اسٹارٹ کی کمی کو دور کرنے کے لیے اضافی توانائی

سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر تم فزیکس پوسٹ نہ بنو۔۔۔۔۔ اور دیگر ہزاروں لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں نہ آئیں تو پھر اس تھراپی کے حوالے سے ایک ٹیمیل دوسری ٹیمیل کی مدد کیسے کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسی تنگ نظریوں سے نکلنا پڑے گا۔“

وہ بہت ہی کھن اور مشقت والے دن تھے۔ نور کو ایف ایس سی کا امتحان بھی دینا تھا۔ ٹیچرز کے ساتھ مشورے سے اس نے اس امتحان کو اگلے سال تک ملتوی کر دیا اور تمام تر توجہ رنگ پرم کوڑر بھی۔ پرنٹ میڈیا کے کئی لوگ اسے اپنے صفحات پر ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جیسے۔۔۔۔۔ ایک شخص کی وجہ سے۔۔۔۔۔ پورے میڈیا سے ہی الٹیک ہو گئی تھی۔ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی تصویر اترواتی تھی اور وہ بھی اسٹارٹ کے ساتھ۔ رنگ کے وقت بھی اس کا لباس سب سے علیحدہ اور باوقار ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایتھلیٹ کا ظاہری حلیہ اور لباس وغیرہ اس کی راہ میں بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی، اسے لگے کہ اس کے پاؤں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا تایا ابا اس کے پاؤں کی طرف موجود تھے، ان کے ہاتھ میں ایک آکسٹنٹ کی ٹیوب تھی۔ وہ اس کے ایک زخمی پاؤں پر دوا لگا رہے تھے۔

”تایا ابا! آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”اپنی بیٹی کے زخم پر مرم کر رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟“

”تایا ابا۔“ وہ ٹھنک کر رہ گئی۔ ”زخم کہاں ہے۔“

”زیادہ رنگ کی وجہ سے تھوڑی سی سرخی آئی ہے۔“

”میری بیٹی۔ ایتھلیٹ کے پاؤں کی تھوڑی سی سرخی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اس معاملے میں غفلت نہ کیا کرو اور کل کا دن ریست کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔“

وہ تایا ابا کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کا سر چوم لیا۔ اس کے پاؤں کو سہلاتے ہوئے بولے۔ ”جب تم چھوٹی سی تھیں، میں تمہیں دو بوج کر تمہارے پاؤں پر لگ گدی کیا کرتا تھا۔ تم جس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ بہت لگ گدی ہوتی تھی تمہیں توڑوں پر۔۔۔۔۔ یاد ہے نا؟“

”ہاں تایا ابا۔۔۔۔۔ اور آپ کو میرے کندے پاؤں بہت برے لگتے تھے۔ آپ مجھے جوتے یا جپل کے بغیر چلنے نہیں دیتے تھے۔“

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ ”شاید یہ تمہاری محبت ہی تھی جس کے صلے میں اللہ نے پھر مجھے اپنی بیٹی بھی

لگائی۔ اس وقت نشو اس سے قریباً چار پانچ فٹ پیچھے تھی۔
 اپنی سن والی لڑکی کا فاصلہ زیادہ تھا مگر پھر نور کو لگا کر نشو سے
 اس کا فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی دائیں آنکھ کے
 گوشے سے دیکھا، نشو آگے بڑھتی ہوئی شبیہ نظر آرہی
 تھی۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے برابر آنے کے
 بعد چند انچ آگے نکل گئی ہے۔ ریس دیکھنے والوں کا
 شور فلک شکاف تھا۔ آخری مرحلہ بے حد جاں نسل تھا۔
 آخری چودہ پندرہ قدموں میں نور نے جسم و جاں کی پوری
 توانائی صرف کی اور فٹس لائن پار کر لی۔

وہ ایک بار پھر ہار چکی تھی۔ نشو نے ریس جیت لی
 تھی۔ نور کا خیال تھا کہ وہ دوسرے نمبر پر آئی ہے مگر جب
 فوٹو فٹس کا رزلٹ سامنے آیا تو وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ اپنی
 سن کالج کی ارم نے نہایت ٹھوڑے مارجن سے اس سے
 دوسری پوزیشن بھی چھین لی تھی۔ ان دونوں کا فرق صرف
 0.08 سیکنڈ رہا تھا۔

نور بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کی سانس
 ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی۔ جھجکی ہار کے موقع پر اس نے
 اپنے ساتھیوں اور اپنے تایا جان کی طرف دیکھا تھا مگر اس
 مرتبہ اسے یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر گھنٹوں میں سر
 دے پیٹھی رہی۔ آخر اسے اپنی کمر پر تایا جان کے شفق ہاتھ
 کا تس محسوس ہوا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس کے
 قریب بیٹھ گئی تھی اور اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ نور کے
 آنسو اکثر اس سے روٹھ جایا کرتے تھے۔

لیکن اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔
 سینے میں ایک پھکی سی جڑ آزاد ہونا چاہتی تھی، وہ ضبط کیے
 بیٹھی رہی۔ تایا جان اس کے کانوں میں تسلی آمیز سرگوشیاں
 کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں پر ڈھول کی تھاپ حاوی
 ہو رہی تھی..... اور وہ نعرے حاوی ہو رہے تھے جو نشو جھکی
 کے سپورٹرز بلند کر رہے تھے۔ ان گھول میں نور کے دل میں
 خیال آیا۔ کہیں واقعی یہ اباجی کی بددعا تو نہیں جو جان توڑ
 کوشش کے باوجود اسے کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بند تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو شکل ہی
 دکھانا نہیں چاہتی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔
 تایا جان تو اپنے ماہانہ دورے پر سحرات چلے گئے تھے لیکن
 تائی راحت اور تینوں کزنز تو گھر میں ہی تھے۔ پہلے مہرین
 دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اب شرجیل بار بار دستک دے رہا تھا،
 گاہے بگاہے تائی راحت کی آواز بھی آرہی تھی، اس آواز

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے چاہا حاصل کریں اپنی دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(شہمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسالے کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ سب صرف پاکستان کے لیے ہیں۔

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریکس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سینٹین ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 021-35895313 ٹیکس: 35802551

اباجی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے،
میں خوش نہیں ہوں..... میں بہت دکھی ہوں..... وہ بولتی
چلی گئی۔

انہوں نے اپنا گھٹنا چمڑانے کی کوشش کی مگر نور کی
گرفت مضبوط تھی۔ وہ برہمی سے بولے۔ ”یہ کیا تماشا لگا رہا
ہے۔ پیچھے ہٹو۔“

مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ پھپھو نے ڈرے
لہجے میں کہا۔ ”چلیں معاف کر دیں بھائی جان..... بڑے
معاف ہی کیا کرتے ہیں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہے یہ.....“
انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ”پیچھے ہٹو۔ مجھے نماز
پڑھنے جانا ہے۔“

”پہلے آپ مجھے معاف کریں اباجی۔“ اس کی آواز
میں بے پناہ کرب تھا۔
وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ”اچھا ٹھیک ہے.....
پیچھے ہٹو۔“

دھانچہ کھڑے ہوئے اور دواش روہم کی جانب بڑھ گئے۔
اگلے روز عید تھی۔ دونوں گھروں کا ہمیشہ سے یہ دستور
رہا تھا کہ عید انکسے ہی مناتے تھے بلکہ اس میں پھپھو کا
گھر انابجی شریک ہوتا تھا۔ پھپھو کے شوہر عرصہ پہلے انتقال
کر چکے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں تھوڑا سا حزن بھی شامل
تھا۔ نور کی والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی بڑی عید تھی۔ عید
کی رات نور نے اپنے گھر میں ہی گزار لی۔ اگلے روز پھپھو
اور آئی بتول نے نور کو سنبھایا۔ پھپھو نے کہا۔ ”دیکھو
نور! تمہارے اباجی نے تمہیں گھر آنے کی اجازت تو دے
دی ہے لیکن ان کی اصل ناراغی اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ
تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ شادی پر رضامند ہو جاؤ۔ وہ تم دونوں
بہنوں کے فرض ہے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔“

”پھپھو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے
لیے آپ سب کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیوں مجھے کچھ دیر
کے لیے مزید اپنی محبت کے سامنے میں نہیں رکھ سکتے؟“
”یہ محبت ہی تو ہے نور۔“ آئی بتول نے گفتگو میں
حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اباجی، جنہیں اپنے گھر کی ہوتے دیکھنا
چاہتے ہیں۔“

”انہوں نے آپ کو اپنے گھر کی، دیکھ ہی لیا ہے
نا..... اس سے ان کو کچھ تسلی ہو جانا چاہیے۔“ نور کے لہجے
میں تپ تھپی۔

”ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے نور۔“ پھپھو نے
کہا۔ ”اور تیرے لیے تو بہت اچھا رشتہ آیا تھا..... تیری وجہ

سے وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا۔ دین دار، مکاؤ اور بڑوں کے سامنے سر جھکا کر رکھنے والا۔ آج کل ایک مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہے اور بالکل فی سبیل اللہ۔ اس عمر میں اتنی خدا خونی کم کم ہی ہوتی ہے۔“

نور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی..... اور دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں، بسہ مرین اور دیگر کزن موجود تھے۔

رات کو ایک بار پھر چھپو کا قہر اس کے کانوں میں گونجنے لگا..... ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا.....

”ہوں۔“ اس نے سر کو بیزاری سے حرکت دی اور کروٹ بدل لی۔

بے شک ذوالقرنین کی ایک بات نور کو اچھی لگتی تھی کہ اس نے ایک موقع پر فرہاد کو نور کے ساتھ کار میں دیکھنے کے باوجود، یہ بات اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس نے بعد میں بھی اپنے گھر میں یا نور کے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا (حالانکہ ایک موقع پر نور کو ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسے بلک میل کرنے کی کوشش نہ کرے) لیکن جہاں تک ذوالقرنین کے لیے پسندیدگی کا تعلق تھا، یہ سوال خارج از نصاب تھا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے نور کے دل و دماغ میں جو آئیڈیل تھا، وہ بالکل اور طرح کا تھا۔ نرم مزاج، خوش گفتار، خوش لباس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرنے والا۔ اس کی صلاحیتوں کو پھیلنے پھولنے کا موقع دینے والا۔ بے شک مذہبی لیکن روشن خیال۔

وہ سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں تو کوئی ہوگا جو اس کے لیے ہوگا۔ جو اس کے مطابق ہوگا۔ اسے اس کی ساری بشری خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ چاہے گا۔

☆☆☆

عید گزر چکی تھی۔ ذوالقرنین کی روزمرہ مصروفیات پھر شروع ہو چکی تھیں۔ عصر تک اپنی کتابوں کی دکان پر رہنے کے بعد وہ قریمی مسجد میں چلا جاتا تھا اور بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے لیے پھر دکان پر جانا ہوتا تھا لیکن آج چونکہ بارش ہو رہی تھی، اس لیے وہ جلدی گھر آ گیا۔ شيروانی اتار کر بیٹرگر پر لٹکائی۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی، اپنی چھوٹی ہوا رڈ اڑھی سے بارش کے قطرے جھاڑے اور تھکا تھکا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

سہانا موسم ہر کسی پر اثر کرتا ہے۔ دل میں کچھ ٹھونے سے پھوٹتے ہیں، چاہے وہ دل کسی کا بھی ہو۔ مولانا حبیب اللہ کے بیٹے قاری ذوالقرنین کا بھی ہو۔ ہاں اپنی تمام تر

شرافت، نجابت اور حیا داری کے باوجود اس کا دل دھڑکتا تھا، اس کی رگوں میں خون کی پورش ہوتی تھی۔ اس نے بارہا خود کو بھجایا تھا..... وہ اسے بھول کیوں نہیں پاتا۔ وہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نہیں ہے، وہ کیوں اپنی زندگی کو ایک مسلسل ناہواری کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ دل ہی کیا جو بان جائے۔ اس نے اسے پہلی بار شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ عورتوں والے پورشن میں تھی اور اپنا اسکارف کھول کر باندھ رہی تھی۔ بس ایک جھلک ہی تھی، دلکش چہرے کی، لیے شہر رنگ بالوں کی اور شرعی آنکھوں کی۔ وہ جھلک قاری ذوالقرنین کے اندر گہرائی تک پہنچتی ہوئی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ ”بھائی! آج تم جلدی آگئے؟“

”بس، بارش ہو رہی تھی، ایسے موسم میں گاہک وغیرہ کہاں آتا ہے۔“

”امی آج بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی دیکھنے جانا ہے.....“

”خدیجہ! کہا بھی ہے کہ ابھی تو ڈرے دن ٹھہر جاؤ۔“

”ایسا کیوں ہے بھائی، تم تو خود ای سے کہا کرتے تھے کہ..... شادی بیاہ میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے اور اب دیر پر دیر کیے جا رہے ہو۔“

”دراصل..... میں اپنے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے پتا ہے، وہ ٹھکانے پر کیوں نہیں ہے۔“ خدیجہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

شروع میں ذوالقرنین نے نور کے حوالے سے اپنے سارے احساسات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے تھے۔ یہ کوئی نا جائز احساسات نہیں تھے مگر ذوالقرنین نے خود کو جس خول میں چھپا رکھا تھا، وہ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک نہایت دین دار لوجوان کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ اصلاح معاشرہ نامی تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لوگ اس کی شرافت کی مثالیں دیتے تھے۔ اب عالم دین مولانا حبیب اللہ کا یہ بیٹا کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذوالقرنین کے نزدیک یہ بہت معیوب صورت حال تھی۔

اس نے اپنی سوچوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر سات تہ خانوں کی گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔ صرف..... اور صرف خدیجہ ایسی تھی جو ان تہ خانوں کی گہرائی میں سے کچھ ڈھونڈ لاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کسی شدید ذہنی کوفت کا

”ہاں۔ کبھی کبھی، عام سے انداز میں۔“

”اسے شک تو نہیں ہوا کہ تم کون ہو؟“

”نہیں۔ اس نے بھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کہیں دیکھا

بھی ہوگا تو بھول چکی ہے۔“

بین سے گفتگو کے بعد بھی ذوالقرنین ویریک جاگتا رہا۔ کھڑکیوں سے بارش کی پھواریں ٹکرائی تھیں اور دل میں جلتی رنگ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ نور کی آواز، اس کی آنکھوں کے رنگ، اس کا دلکش لب و لہجہ اور پھر خوشی کے عالم میں پیشانی کی ایک چھوٹی سی سلوٹ..... سب کچھ اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کا دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک بار نور سے پھر ملاقات کرے اور اسے اس ”سستی لا حاصل“ سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اسے سمجھائے کہ اس کی جدوجہد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔

☆☆☆

نور آہستہ آہستہ گھسٹ کے بعد صدمے سے نکل رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ”ایف اے ایس“ سے واپس آئی تھی اور تھکی باری سی بستر پر دراز تھی۔ ذرا سستانے کے بعد وہ مغرب کی نماز پڑھتا چاہ رہی تھی۔ اسی دوران میں تایا ایا اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ”گاؤں چلنا ہے؟“

”گاؤں؟“

”بھئی، بھول گئی ہو تم۔ امنالے کا میلا آگیا ہے۔ تمہاری داوی تو ایک مہینے سے تیار یوں میں لگی ہیں۔ پچھلی دفعہ وہ لوگ اکیلے چلے گئے تھے مگر میرا خیال ہے اس دفعہ ہمیں ضرور جانا چاہیے۔“

امنالے کا میلا یعنی پیر امنال والے کا میلا..... اس میلے کا ذکر ہی اپنے ساتھ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سہری یادیں لے آتا تھا۔ دل میں ایک ترک سی جاگتی تھی لیکن آج کل نور کا ترقی شیلڈ بھی ٹائٹ چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کتنے دن رکتا ہوگا تا بابا؟“

”کم از کم پانچ دن لیکن تم ضرور جاؤ۔ ایک تو تمہارا موڈ بہتر ہوگا۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس نامعقول کے آس پاس رہنے کا موقع ملے اور اس کے دل میں مزید نرمی پیدا ہو۔“ نامعقول سے تایا اب کی مراد ہمیشہ کی طرح نور کے ابا جی ہی تھے۔

وہ چپتا چاہتی تھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ آخر وہ آمادہ ہو گئی۔ ٹریڈنگ سینٹر یعنی ”ایف اے ایس“ سے پانچ چھ دن کی چھٹی اس شرط پر مل گئی کہ وہ اسٹرینجک وغیرہ کی درزیں

شکار ہے۔ وہ نور کے حوالے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھی کیونکہ وہ بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی (اب کچھ عمر سے اس نے بھائی کے اصرار پر کالج میں اصلاح معاشرہ تنظیم کی داغ بیل بھی ڈالی تھی) اسے کالج میں نور کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی تو بھائی سے شکر کرتی۔

خدیجہ بولی۔ ”ذوالقرنین! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ عید کے موقع پر وہ واپس اپنے والد اشفاق صاحب کے گھر چلی گئی تھی۔ معافی وغیرہ بھی مانگی ہوگی اس نے..... مگر اب پھر تایا کے گھر میں ہے..... اور وہ بھاگ دوڑ والی روٹین بھی جاری ہے۔ پتا نہیں وہ کیا نکالنا چاہتی ہے اس میں سے.....؟“

”اپنے والد سے ملوئی اس کی؟“ ذوالقرنین نے پوچھا۔ ”مکمل صلح تو نہیں ہوئی، ورنہ وہ واپس تایا کے پاس کیوں جاتی شاید اتنا ہوا ہے کہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ شاید اس نے کچھ مہلت وغیرہ مانگی ہو۔ کسی وقت مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔“

”مہلت کس لیے چاہتی ہے۔ وہی بھاگ دوڑ ہی ہے نا اور اس میں وہ بری طرح ناکام ہوتی ہے۔“

”یہ جو کھلاڑی اور فن کار وغیرہ ہوتے ہیں ذوالقرنین! ان کے ذہن میں ایک بار جو کیزا مٹ جائے وہ آسانی سے نہیں لگتا۔ خود کو خراب کر رہی ہے۔ اتنی پیاری ہے، اتنے اچھے گھر سے ہے مگر خود کو مصیبتوں میں پھنسا رہی ہے۔ مولوی اشفاق کے لیے یہ کتنی شرمندگی کی بات ہوگی کہ ان کی بیٹی اس طرح کے کاموں میں پڑی ہوئی ہے۔“

”ایسے بندے کو اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔“

”لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں

پھنسنے کے بعد ہدایت پائے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے کالج میں سنا تھا کہ گوجرانوالہ کی ”چیپ پیپن ایتھلیٹ“ نشوونگہ کے ساتھ نور کا زبردست ٹاکرا چل رہا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نور کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ جہاں کہیں کوئی ایونٹ ہوتا ہے اور یہ دونوں اکٹھی ہوتی ہیں جھگڑا ہوتے ہوئے رہ جاتا ہے۔“

”بس بس! معاملے ہیں نا خدیجہ جن کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے کو احسن سمجھا جاتا ہے۔ باہر کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو بتایا ہے اور وہی اس کے لیے بہتر ہے۔“ پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”تم خود بھی تو اس سے ملتی ہو نا؟“

خاموش بیٹھا رہا۔

نور اور ہسمہ نے باقی شاپنگ ادھوری چھوڑ دی۔ موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ نور بڑبڑا رہی تھی۔ ”نہیں کہاں سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اب اگر یہ سامنے آیا تو منہ توڑ جواب ملے گا۔“

اگلے روز دادی اور پھوپھی کی فیملی کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی فیملیاں، تین گاڑیوں پر سوار گاؤں روانہ ہو رہی تھیں۔ ماموں کو ایک روز بعد آنا تھا۔ بہت عرصے بعد نور کو لاہور سے باہر نکلنے اور اپنی مصروفیات کو بریک لگانے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ تاجا جان والی گاڑی میں سوار ہوتی لیکن وہاں دادی بیٹھی ہوتی تھیں اور نور کو معلوم تھا کہ وہ پورے راستے میں اس کی والدہ مرحومہ کو نشانے پر لیے رکھیں گی اور نور کو مادر پدر آزاد قرار دے کر اس کے لئے لیں گی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں پھوپھو اور کزن موجود تھے۔

گجرات سے آگے نکل سڑک پر ایک گھنٹے کا سفر تھا اور کچے پکے راستے پر تقریباً دو گھنٹے کا نہایت دشوار سفر طے کرنے کے بعد وہ بالآخر مورواں والی گاؤں پہنچ گئے۔ (ہسمہ کے رشتے والا معاملہ حل ہو چکا تھا۔ ایک ایم این اے کے خاصن تھا۔ اب اس حوالے سے انہیں کھاپری برادری کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ چودھری مغل کی والدہ وڈی اماں آج کل بیمار تھیں اور نور کی دادی اس کی خبر گیری بھی کرنا چاہتی تھیں۔)

مورواں والی میں وہ بڑے پُر لطف دن ثابت ہوئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ روٹن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میلے کی قدیم روایت کے مطابق تین دن پہلے علاقے کے لوگوں نے رضا کارانہ طور پر ہر طرح کا آئینہ اسلحہ تھانے میں جمع کرادیا تھا لیکن یہ اسلحہ تھانے میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ رسم کے مطابق بلند بالا مزار کے سامنے سات آٹھ بڑی چار بانیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر سفید چادریں بچھائی جاتی تھیں اور لوگ اپنے اپنے ہتھیار لا کر یہاں رکھتے جاتے تھے اور تھانے کے محراب سے لوگوں کو لیتے جاتے تھے۔ ایک لوگوں ہتھیار یا ہتھیاروں کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ مزار کے بات یہ تھی کہ اس میں ناجائز اسلحہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس اسلحے کے لیے بالکل علیحدہ طریقہ کار تھا۔ یہ اسلحہ لوگ رات کی تاریکی میں جمع کراتے تھے۔ جو ضروری سمجھتے، وہ اپنا منہ سر بھی ڈھانپ لیتے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں مستطیل شکل کی ایک طویل کوشٹری تھی۔ تاکہ

جاری رکھے گی اور ڈائنٹ کے حوالے سے بھی پوری پابندی کرے گی۔ ہسمہ اور نور دوسرے دن بازار گئیں تاکہ روانگی کے حوالے سے کچھ شاپنگ کر سکیں۔ شاپنگ کرتے ہوئے ہسمہ ذرا تھک گئی تو وہ دونوں ایک جوس کارنر میں داخل ہو گئیں۔ ابھی انہیں میز پر بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ نور نے دیکھا کسی شخص نے ہسمہ کو مخاطب کیا ہے۔ ”ہسمہ بہن! کیا میں دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

ہسمہ اور نور نے ایک ساتھ اس شخص کی طرف دیکھا۔ نور بے طرح چونک گئی۔ وہ ذرا الترقین تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسٹک میں تھا۔ سر پر پچیلے چاشیے والی گول ٹوپی تھی۔

ہسمہ اور نور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”یہ کیا تیزی ہے؟“ نور نے غصے سے کہا۔

”پلیز..... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف..... صرف دو چار منٹ۔“

نور کا دل چاہا کہ وہ اپنی کرسی کو پیچھے جھک کر اٹھ کھڑی ہو مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنا جواب درست کرتے ہوئے جیسے لہجے میں بولی۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ ہمارا پیچھا کر رہے تھے؟“

”میں شرمندہ ہوں لیکن خدا کو اہ ہے، میں کسی بری نیت سے یہاں موجود نہیں ہوں۔ صرف آپ کی بھلائی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ حسب عادت نظریں جھکائے جھکائے بولا۔ پچھلی ملاقات کی نسبت آج اس کا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

”معاف کیجیے۔ ہم ناہانج نہیں ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔“ ”میری توجہ ہے کہ آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود مجھ نہیں پار ہیں۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ایک ایسے راستے پر چل رہی ہیں جہاں آپ اور آپ کے نہایت نیک نام والد صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں ہیں۔“

”آپ کس حوالے سے مجھے لپکھو دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی نا سمجھ جاہل ہوں؟“

”ایسا ہوتا تو پھر اتنے دکھ کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔“

”جیسے آپ گمراہی فرما رہے ہیں، وہ ہمارے نزدیک نہیں ہے اور یہ بحث اتنی طویل ہے کہ..... آپ کے بال

سفید ہو جائیں گے۔“ نور نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہسمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ذوالقرنین کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا مگر وہ اپنی جگہ

جانے نہ دیتی مگر ان کا رویہ بدستور سمجھاؤ کارہا۔ تایا جان کے سامنے وہ بول تو نہیں سکتے تھے مگر دونوں بھائیوں میں مکلی والی گرجیوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نور خود کو اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

گاؤں سے واپس آ کر نور پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ پانچ چھ روز کی کپوری کرنے کے لیے اس نے اضافی محنت کی۔ اسٹریٹکس کا یہ ایونٹ دراصل واپڈا میں ملازمت کے حوالے سے تھا۔ صوبے کی چار پانچ ٹاپ رنز بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ نور نے سو میٹز کے ٹرائلرز میں سخت جدوجہد کی۔ فائنل ہیٹ میں اس نے اپنی اہم ترین حریف ٹیوہلی کو 0.75 سیکنڈ کے ساتھ شکست دی (حالانکہ میڈی طور پر رشو کو ایک غیر ملکی کوچ کی خدمات بھی حاصل تھیں اور وہ ٹینٹل گیمز میں ٹائٹل مقابلہ بھی جیت چکی تھی)۔

اس فتح کے بعد نور کو قوی امید ہو گئی کہ وہ اگلے قومی مقابلوں میں بھی شکو بچھا سکے گی۔ اس ایونٹ کی فتح سے نور کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک مناسب جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تایا جان پر اس کے اخراجات کا جو اضافی بوجھ پڑ رہا تھا وہ کم ہو گیا۔ مثلاً اگر پہلے اس پر 30 ہزار ماہانہ خرچ ہو رہا تھا تو اب یہ خرچ چودہ ہزار رہ گئی۔ تنخواہ کے علاوہ نور کو کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔ نور خود شہر تھا کہ شاید دو یا تین مہینے پھر اس کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری دل چستی سے میگا ایونٹ یعنی ٹینٹل گیمز کی تیاری میں لگی رہی۔ اس نے تایا جان کے کہے کو اپنا ”نوٹو“ بنالیا تھا۔ محنت اور مسلسل محنت، اس یقین کے ساتھ کہ صلہ مل کر رہے گا۔ سخت تربیت اور رنگ کے دوران میں بھی وہ کئی بار یہ جملہ زیر لب دہرانے لگی تھی..... ”مسلسل محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔“

اس کی ٹائمنگ اب کسی وقت 11.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی۔ اس کا اور اس کے کوچ کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل یا کم از کم سلور میڈل تک پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

میگا ایونٹ ٹینٹل گیمز میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ نور کا ورٹنا چھوٹا سا کیڑی ٹینگ بنی ہوئی تھی۔ وہ کہیں آنے جانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی تایا یا ماموں کے ساتھ کہیں موٹر بائک پر بھی چلی جاتی تھی مگر اب تایا یا ماموں کا حکم تھا کہ وہ صرف گاڑی استعمال کرے گی۔ ایسے موقعوں پر چوٹ لگ جانا یا کسی طرح اُن فٹ ہو جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

چندی اینٹوں کی بنی ہوئی اس قدیم کونٹری کی موٹی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں پر لوہے کے قریبا ایک مربع فٹ کے ڈھکے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ ہر خانے کا نمبر تھا۔ اپنے غیر لائسنس ہتھیار لوگ ان خانوں میں رکھتے اور چابی اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ محلے کے اختتام پر رات کے وقت یہ لوگ اپنے ہتھیار نکال کر لیے جاتے تھے۔ عدلوں گزرنے کے باوجود اس معاملے میں کبھی کوئی ٹرو بڑ نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنے ہی ہتھیار لے کر جاتا تھا اور اگر پولیس کو نا جائز اسلحے کے مالک کی کچھ خبر ہو بھی جاتی تھی تو مطلق باز پرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سب اس محلے کی بے مثال اور انوکھی روایات تھیں یعنی غیر قانونی کام بھی بے حد ایمانداری کے ساتھ۔ اس حوالے سے لوگوں کے عقیدے اتنے پختہ تھے کہ کوئی اغراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ محلے کے سات روز میں علاقے میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ چوری، رسا گیری اور جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں بھی ناپید ہو جاتی تھیں۔ یہ تھا امن والے کامیلا۔

نور اور ٹیوہلی کے دیگر بچوں بڑوں نے اپنی ساری سنہری یادیں تازہ کیں۔ آبائی مکان کا بڑا حصہ اور ملحقہ باغ تو بک بکے تھے مگر دریا کی طرف پرانی حویلی اب بھی دونوں فیملیوں کی ملکیت تھی اور وہ یہاں پھر پور تفریح کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی بڑی اچھی کھلاڑی نکلی ہے اور اخباروں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ کچھ آنکھوں میں وقتی سانس بھی مگر کچھ کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور بیگانگی کی جھلک تھی، جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں..... تم ہمارے گاؤں کی سیدی سادی لڑکیوں کو کیا راستہ دکھا رہی ہو۔ مولوی اشفاق کی بیٹی ہو کر تم کس راستے پر چل رہی ہو۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جوانی سنبھالو، اپنا گھر سنبھالو، بال بچے دار بنو، لڑکیوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔

میلے میں ایک دن صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز نور، ہسمہ، مہرین اور ٹیوہلی کی دیگر لڑکیاں بھی کہیں اور خوب تفریح کی۔ ہاں نور کو کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے ایک اہم ایونٹ میں حصہ لینا تھا اور اس میں ٹیوہلی آ رہی تھی۔

گاؤں میں قیام کے دوران نور نے ایجابی کی دلجوئی کی کافی کوشش کی۔ ان کی خدمت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے

وزارت کھیل کی طرف سے صوبائی سطح پر کوئی ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم ہو رہی تھی۔ انڈر 16 لڑکیوں میں سے قابل جو ہر تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ ٹرائلز نور کے کالج کے وسیع و عریض میدان میں ہوتا تھے۔ انتظامیہ نے نور کو بھی سینئر ایٹلیٹ کی حیثیت سے دعوت نامہ جاری کیا ہوا تھا۔

وہ ایونٹ کے روز کالج پہنچی تو وہاں رش لگا ہوا تھا۔ شامیانوں کے پیچھے مختلف شہروں سے آنے والی بے شمار چھوٹی لڑکیاں موجود تھیں۔ نور پر انکشاف ہوا کہ نشوونما بھی آئی ہوئی ہے۔ نشوونما کی موجودگی اسے ہمیشہ نگاہری مرکز بنی تھی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس نے بھی آتا ہے تو شاید وہ نہ آتی۔

نور کے ساتھ ہمسہ اور مہرین بھی آئی ہوئی تھیں۔ ہمسہ حسب معمول رقبے میں تھی۔ تقریب میں ایک موقع پر وہی ہوا جس کا نور کو غدشہ تھا۔ نشوونما پھوٹنے سے ہل بازی شروع کر دی۔ ہمسہ کو ”ڈاکو“ کہا گیا۔ (کیونکہ اس نے برقع پہن رکھا تھا) نور کو دیکھ کر ”پینڈو..... پینڈو“ کے نعرے لگائے گئے..... اور بات صرف ہونگ تک ہی نہیں رہی۔ ہجوم میں سے کسی لڑکی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور نور کا اسکارف کھینچ کر اتار دیا۔ یہ بدتمیزی مہرین سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس کے بال کھینچے۔ ان لوگوں کو تو شاید یہانہ ہی چاہیے تھا۔ ایک دم لڑائی شروع ہو گئی۔ کئی لڑکیاں مہرین اور ہمسہ پر ہل پڑیں۔ ہمسہ کا برقع پھٹ گیا، وہ گر گئی۔ ہمسہ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس بالکل دھیمے مزاج اور دلچسپ جسم کی تھی، ٹھیک سے دفاع بھی نہ کر سکی۔ اپنی بڑی بہن کو یوں بے بس دیکھ کر نور تماشائی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے بھڑکنے، نشوونما چلائی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ نور نے اسے کھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ اسی دوران میں ایک مہنی لڑکی کے ہاتھ میں کسی ٹوٹی ہوئی کرسی کا پایہ آ گیا تھا۔ وہ نور پر چھٹی اور تاک کر اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ مضبوط لکڑی کے پائے کی دو تین شدید ضربیں نور کو لگیں۔ نشوونما کی تعداد زیادہ تھی۔ صاف محسوس ہوا کہ انہوں نے یہ سب پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔

ایک موقع تھا جب نور نے خدیجہ کو دیکھا۔ اس کا گلابی اسکارف تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ وہ اصلاح معاشرہ کے نمیل ونگ کی جزل سیکریٹری تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ وہ حملہ آور لڑکیوں پر چھٹی۔ ایک دو منٹ کے لیے ٹھیک خاک مارا ماری ہوئی۔ کئی لڑکیوں کو چوٹیں آئیں پھر نشوونما سپورٹرز پسپا ہو گئیں۔ کالج کی انتظامیہ اور گارڈز وغیرہ بھی

آگے اور دونوں گروپوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ نور کو سب سے پہلے اپنی ٹانگ کی فکر ہوئی۔ اس نے ٹانگ پر وزن ڈالا اور پھر چل پھر کر دیکھا۔ چوٹ ابھی گرم تھی..... اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ بہر حال کھٹنے کے پاس ایک بڑا نیل نمودار ہو چکا تھا۔ اس میں سے ٹھوڑا سا خون بھی رستا تھا۔ اس نیل کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ ہنگامے میں جان بوجھ کر نور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس واقعے پر میڈم فرحانہ اور ڈیپارٹمنٹ کے اسپورٹس ہیڈ نے شدید رد عمل ظاہر کیا..... نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی پوائنٹ آؤٹ ہو گئی تھی۔ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نشوونما اس لڑکی کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائی جائے مگر پھر فزکس کھٹیاں بچنا شروع ہو گئیں۔ گوجر والوالہ سے دو تین بااثر افراد کی کالیں بھی آئیں۔ مختلف ذریعوں سے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو بھی اپروچ کر لیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ معاملہ صلح معافی پر ختم ہوگا۔ ویسے بھی نور کسی شدید چوٹ سے بچ گئی تھی۔ میڈم فرحانہ اسے اپنے ساتھ لے کر آ رہو پیڈک اسپتال پہنچیں۔ اس کی ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ کیے گئے اور نیل ہونے کے بعد اسے ضروری ٹریٹ منٹ بھی دی گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے تین چار روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا مگر چار پانچ روز آرام کے بعد جب نور ٹریک پر پہنچی اور اس نے باقاعدہ رنگ شروع کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا اب تک نظر آیا ہے۔ اس کا متاثرہ کھٹنا پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہی کھٹنا تھا جس پر شروع شروع میں کچھ دھمکس ہوا کرتا تھا مگر بہترین فزیکل ٹریننگ سے یہ کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس سخت چوٹ نے اس کچھ آکود دوبارہ نمودار کر دیا تھا۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ چار پانچ روز تک تو نور نے کسی کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ امید پالی تھی کہ شاید دوڑنے سے اور روئین میں آنے سے کھٹنے کی حالت بھی معمول پر آ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ تکلیف میں کمی کے بجائے اضافے کا احساس ہوا..... وہ اس صورت حال کو مزید راز نہ رکھ سکی۔ ڈیپارٹمنٹ کی کوچ اور منیجر وغیرہ بھی آگاہ ہو گئے۔ ایک بار پھر اس کی چوٹ اور ”ٹریٹ منٹ“ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہڈی میں ہائپر لائن فریکچر کا اندیشہ تو ”سی ٹی اسکین“ وغیرہ سے دور ہو گیا مگر ایک دو سبب متاثر تھے..... تفصیلی معائنے کے بعد محکمے کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”مس نور! آپ کو کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا پڑے گا۔“

پر لگنے والی چوٹ کتنی معز ہوتی ہے۔ وہ بہت فکر مند تھی۔ اس روز ڈاکٹر سے مل کر جب نور کو گھر پہنچی تو کافی افسردہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تایا جان کو اس خبر سے کیسے آگاہ کرے۔ دوسری طرف اسے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند روز کے آرام کے بعد دوبارہ ٹریک پر آ جائے گی۔

گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ دراصل اسے نور نے ہی بے حد ”ریکوئسٹ“ کر کے بلایا تھا۔ یہ وہی لڑکی خدیجہ تھی جس نے ہنگامے کے روز ڈاٹ کر نور اور اس کی فریڈنڈ کی مدد کی تھی۔ وہ ”عمایا“ میں تھی اور تائی جان اور مہرین کے ساتھ لی وی لاونج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

نور اسے دیکھ کر گرجوٹی سے گلے ملی۔ ”سوری خدیجہ! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ وہاں ٹریننگ سینٹر میں ایک لیچر سنا پڑ گیا تھا۔“ نور نے ڈاکٹر اور اسپتال والی بات کو لی۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تائی جان اور مہرین سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں آپ کی بہن کے سببی ملنا چاہتی تھی مگر وہ شاید دوسرے گھر میں ہیں۔“ نور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”ان کو بھی تو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا برقع بھی پھٹ گیا تھا ان کا۔“

”ہاں، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”اور آپ؟“

”آپ کی مہربانی سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملاقات تو پہلے بھی ہوئی تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ایک دن آپ اس طرح ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوں گی۔“

”نہیں بھئی نور! آپ تو ہمارے کالج کا بلکہ پورے شہر کا ایک روشن نام ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی دے۔“ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اب پھر روٹین کی ٹریننگ کر رہی ہیں۔“

نور کو سینے میں غم کی لہری محسوس ہوئی۔ خدیجہ اور نور کے درمیان میں تیس منٹ تک گفتگو کا دور چلا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ خدیجہ، نور سے قریب دو سال سینٹر تھی۔ وہ اب نور کو بے لطفی سے ”تم“ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور نور کو یہ اچھا لگ رہا تھا۔

خدیجہ نے کہا۔ ”اب ہم اس گروپ کی طرف سے پوری طرح الٹ ہو گئے ہیں۔ ان ”پرک“ شوتنگروپوں نے کسی بھی موقع پر گزربڑکی تو متوڑ جواب ملے گا۔ انشاء اللہ۔“

وہ روپائی آواز میں بولی۔ ”لیکن ڈاکٹر! دو بیٹھے آرام کے بعد تو صرف تین بیٹھے نہیں گے۔ میں اتنی جلدی فارم کیسے حاصل کر پاؤں گی؟“

”تو پھر آپ..... میرا مشورہ مانیں۔ ان مقابلوں سے دستبردار ہو جائیں۔ جلد بازی کر کے آپ اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال دیں گی۔“

یہ الفاظ برق کی طرح نور کے حواس پر گرے۔ ”تجس..... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ دل ہی دل میں نکار کر بولی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے..... ”مس نور! ابھی آپ کی عمر پانچ سال ہے۔ آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آئندہ سال قوی ایونٹ میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ بہتر کارکردگی دکھائیں۔“

”اوہ فو۔“ اس نے کرب کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ تو ایک ایک دن گن کر گزار رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب ایک سال کی بات کر رہے تھے۔

میدیم فرحانہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اس کی باڈی میں ریکوری کی زبردست صلاحیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس بارہ روز کے مزید آرام سے یہ فٹ ہو جائے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے امکان نظر نہیں آ رہا۔ ویسے میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو اس لڑکی کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ نور کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔“

”وہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔“ فرحانہ بیگ نے کہا۔

”کیس ہوا تو پھر کیسوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ”میں نے اس واقعے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر وہ دوسرے گروپ کی لڑکیاں مدد کو نہ آتیں تو نور اور اس کی چار پانچ ساتھیوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔“

”جی ہاں۔ وہ ہمارے کالج کی ہی ایک آرگنائزیشن کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بڑا برداشت قدم اٹھایا۔“

نور نے ابھی تک تایا جان اور ہسمہ وغیرہ کو اپنی ہولناک افتاد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تاہم مہرین کو کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھنٹے کی اندرونی سازش

”لو بھئی! تمہارا یہ کام بھی ہو گیا۔“ وہ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے دبے دبے جوش سے بولے۔
پھر ان کی نگاہ نور کے چہرے پر پڑی اور وہ ذرا ٹھکے۔ ”خیریت تو ہے نوری؟“ انہوں نے پوچھا۔
”بس یونہی..... سر میں تھوڑا سا درد تھا۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”تو آرام کرو نا بیٹی! کل تو تمہاری پرکٹس بھی نہیں ہے۔“
”جی تایا ابا۔“ اس نے اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تایا ابا کو دکھانے کے لیے اس نے پیکٹ کھولا۔
شوہرین کر بھی دیکھے، تعریف بھی کی اور شکر یہ بھی ادا کیا لیکن اس کے دل پر جو زور رہی تھی، وہی جانتی تھی۔

تایا ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نور! تمہیں پتا ہے چاند پر پہلا شخص کون پہنچا تھا؟“
”جی..... نسل آرم سٹرک۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”دوسرا؟“
”دوسرے کا نام..... نہیں..... دوسرے کا نام یاد نہیں۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ کچھرا۔ ”اپنے بے بیٹھے نمبروں کو ذہن میں رکھو۔“ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔
وہ دروازہ بند کر کے جیسے سسک اٹھی۔

☆☆☆

ایونٹ سے چھ سات دن پہلے تایا ابا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نور پوری طرح فٹ نہیں ہے لیکن پوری طرح پُر عزم ہے اور ہر صورت ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ ٹھکے کے سینئر ڈاکٹر کے علاوہ بھی ایک دو بہترین اسپیشلسٹ اسے زیر معائنہ رکھے ہوئے تھے۔ نور کو کوشش کے باوجود اپنی بہترین ٹائمنگ حاصل نہیں کر پاری تھی اور یہ اس کے لیے بے حد تکلیف وہ بات تھی لیکن ایک جنون تھا، ایک دیوانہ پن تھا، وہ ہر صورت میگا ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ ایک وجدان سا تھا اس کے اندر..... اس نے مسلسل محنت کی ہے۔ اپنی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے ضرور صلہ ملے گا..... مل کر رہے گا۔ یہی تو کہتے تھے تایا جان بھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ اس مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئی جس کا انتظار وہ ایک عرصے سے کر رہی تھی.....

(جاری ہے)

اچانک نور کو خیال آیا۔ ”خدیجہ! آپ آئی کیسے ہیں؟“
”بھائی! ساتھ ہے۔ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔“
”ارے یہ کیا بات ہوئی۔“ انہیں باہر بٹھا دیا ہے۔
”تائی جان یوں نہیں۔“ کہا بھی تھا اسے اندر لے آؤ لیکن مانی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ ذرا..... تنہائی پسند ہے۔
خدیجہ ہنسی۔ ”تنہائی پسند بھی..... اور آج اس کا روزہ بھی ہے، کچھ کھائے پیے گا نہیں۔“
”لیکن خدیجہ! انہیں ڈرائنگ روم میں تو بٹھا دیتیں۔“
نور نے کہا۔

”چلیں، پھر سبھی..... اس وقت تو کافی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ رست واپ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ لوگ اجازت دیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

نور اور مہرین اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ ان کی ایف ایکس گاڑی پندرہ بیس قدم دور کھڑی تھی۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ نیچانے کیوں یہ نیل گاڑی نور کو جانی پہچانی سی لگی..... جب خدیجہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو نور کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ ڈوائفر ٹرین تھا قاری ڈوائفر ٹرین۔ تو کیا خدیجہ، ڈوائفر ٹرین کی بہن تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے نور کے رشتے کی بات چلی تھی؟ وہ کافی دیر تک اس غیر متوقع اتفاق کے حوالے سے سوچتی رہی۔ کہیں خدیجہ کی یہاں آمد کے پیچھے بھی تو کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی؟

اپنی چوٹ کے بارے میں نور کے دل و دماغ میں تہلکہ سا چا ہوا تھا مگر وہ کسی پرغا ہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر امید کو روشن رکھے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ چند دن کے مکمل آرام سے وہ نابل ہو جائے گی۔ گاہے لگا ہے نشوونگی اور اس کے گرد پ کے حوالے سے بھی اس کے اندر شدید غم و غصہ نمودار ہوتا تھا مگر اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان لوگوں سے لڑائی مول لینا آسان نہیں ہے۔

اس نے بند کمرے میں ہلکی چٹکی ورزش کر کے اپنی چوٹ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ اٹا نکلا۔ اسے سمجھنے میں تیز درود شروع ہو گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تایا ابا تھے۔ انہیں ابھی تک نور کی فٹنس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ یہ ایکسپریس ڈیلیوری شوڈ تھے جو انہوں نے یو ایس اے سے منگوائے تھے۔